

# نہد سبیل



کتابخانه

## ”جناب من“

السلام وعلیکم!

ناول ”زندہ صدیاں“ پیش خدمت ہے۔ پہلے کسی ناول کے دیباچے میں، میں نے لکھا تھا کہ ”صدیاں میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، جب بھی میں کوئی انوکھی کہانی لکھنا چاہتا ہوں، میرا ذہن صدیوں میں کھوجاتا ہے۔ گزرے ہوئے ادوار مجھے اپنے اندر کھینچ لیتے ہیں اور میں ان سے اس قدر قریب ہو جاتا ہوں کہ پھر ان سے دور ہونے کو دل نہیں چاہتا۔“

صدیوں سے اس قدر قربت ”صدیوں کا بیٹا“ سے ہوئی تھی جو ماہنامہ ”جاسوسی ڈائجسٹ“ میں 12 سال تک قسط وار چھپی تھی۔ اس کے بعد تو لاکھوں صدیاں مجھ پر عیاں ہو گئیں۔ میں نے تو ابھی تک صرف چند صدیاں ہی لکھی ہیں لیکن باقی صدیاں میرے ذہن میں پوشیدہ ہیں۔ صدیوں کے بیٹا کے بعد صدیوں کی بیٹی، صدیوں کا مسافر اور نہ جانے کون کون سی صدیاں۔ تازہ ترین ”زندہ صدیاں“ ہیں۔

جی ہاں! صدیاں کبھی نہیں مریں گی، گزرا ہوا ہر دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، مہینے سالوں میں اور سال صدیوں میں جمع ہوتے رہیں گے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر صدیوں لکھا جائے گا اور ہر صدی کی کہانی نئی اور انوکھی ہوگی۔

تو فی الحال ان زندہ صدیوں میں سے کچھ صدیوں کی کہانی پیش خدمت ہے۔ اس میں مہا بھارت سے لے کر مصر، یونان اور صدیوں کے جس دور کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ پوری تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے چنانچہ اسے صرف ایک فلکشن ہی نہیں تاریخ سمجھ کر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

باقی لکھنے کے لیے ایم اے راحت اور پڑھنے کے لیے آپ سلامت رہیں۔ انشاء اللہ۔

آپ کا

ایم اے راحت

”آپ کا نام؟“

”گوتم بھنساالی۔“

”پتا کا نام؟“

”نہیں معلوم۔“

”کیوں؟“

”ماتا پتا نے مجھے مندر کو دان کیا تھا۔ اس سے مندر کے بڑے پجاری شری بھگونت گو سواری تھے۔ جنہیں میرے ماتا پتا کے بارے میں پتہ تھا، لیکن جب کسی کو مندر کو دان کیا جاتا ہے تو پھر وہ شونستان ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا نام اس کے نام کے ساتھ نہیں جڑا ہوتا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ کی عمر کتنی ہے؟“

”لاکھوں سال۔“

”اتنی لمبی زندگی آپ نے کیسے پائی؟“

”سنت بنی راج کھتری کی کرپا سے۔“

”وہ کیسے؟“

”لمبی کہانی ہے۔“

”مختصر کر کے بتائیے۔“

”گنیش جی مہاراج نیا جیون پا چکے تھے۔ چکر سواری نے انہیں ہاتھی کا سر دے دیا تھا۔ سنت بنی راج، رانی شوادری کے دربان تھے اور رانی شوادری امرت جل پا چکی تھی۔ انہیں نئے چاند کی رات کا انتظار تھا۔ امرت جل پورن ماشی کی رات پیا جاتا ہے۔ سنت بنی راج کو امرت جل کا پتہ چل گیا اور انہوں نے امرت جل چرا لیا۔ ویسے ہی دوسرے برتن میں انہوں نے پانی بھر کر رکھ دیا جسے رانی شوادری نے امرت جل سمجھ کر پی لیا، لیکن اسی رات سانپ کے کاٹنے سے وہ مر گئیں۔ بنی راج کو ایسا ہتک چڑھا کہ وہ محل سے بھاگ آئے اور تھائیسر میں آجے۔ میں اس سے شیو مندر میں گھنٹہ بجانے کا کام کرتا تھا اور کوروتی دیو کنیا تھی۔ وہاں اور بھی دیو کنیا تھیں مگر میرا سن کوروتی میں الجھ گیا۔ میں اس کا دیوانہ تھا، مگر وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔“

پھر ایک دن لکا یک دو پہری میں میں نے کوروتی کو بنی راج کھتری کی آغوش میں دیکھا اور میرے تن من میں آگ لگ گئی۔ بنی راج انہیں امرت جل کے بارے میں بتاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ بھاگوان تو اتنی سندر ہے کہ میرا من چاہتا ہے کہ سارا جیون تیرے ساتھ بتاؤں۔

”جیون ہوتا ہی کتنا ہے مہاراج!“ کوروتی نے کہا۔

”اگر میں تجھے امر کر دوں تو.....“  
”آپ؟“

”ہاں.....“ بنی راج بھگت نے کہا۔ ”اور مہاراج! ناری کے دوار بڑے بڑے بھگتوں کے پیٹ کھل جاتے ہیں۔“ سو بنی راج مہاراج نے پوری کھانا سادی۔ تبھی ان کا انت ہو گیا، کوروتی نے ان کی گود میں بیٹھے بیٹھے ان کا ٹیٹو دبا کر انہیں نرک پہنچا دیا، مگر اس بیچ میں نے بھی ساری باتیں سن لی تھیں۔ مجھے کوروتی سے زیادہ امر جیون سندر لگا اور بنی راج نے جو جگہ بتائی تھی اس طرف بھاگ نکلا تلاش کرنے پر مجھے پتیل کی وہ گڑوی مل گئی تھی جس میں امرت جل بھرا تھا۔ میں نے گڑوی منہ سے لگا کر کچھ گھونٹ ہی لئے تھے کہ کوروتی بھی وہاں آگئی۔ اس نے بڑے غصے سے مجھے لات ماری اور گڑوی اچھل کر نیچے گر گئی۔ میں نے اس سے تھوڑا سا جل پیا تھا۔ کوروتی نے مجھے چھوڑ کر گڑوی پر چھپنا مارا اور اسے اٹھا لیا، اس میں ابھی کافی جل تھا جسے وہ غٹا غٹ پی گئی، پھر اس نے خونی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ وہ میری دھن بن گئی تھی، بس مہاراج! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آدھا امرت جل پینے سے ہم امر ہوں گے یا نہیں۔ پھر بعد میں ہمید کھل گیا۔ کوروتی نے مجھے ہلاک کرنے کی دسیوں کوششیں کیں مگر موت مجھ سے دور چلی گئی تھی، وہ کامیاب ہو کر بھی ناکام رہی۔ تب میں مندر سے نکل بھاگا۔ اس لمحے سے میں نے اس سے بچنا شروع کر دیا اور یہ میرے پیچھے لگی رہی، بعد کی خبریں آپ کو پتہ ہیں۔“

”اپنی طویل ترین عمر آپ نے کیسے گزاری؟ میرا مطلب ہے مجھ سے ملنے سے پہلے؟“

”لبی کہانی ہے۔ یہ میری خوشبو سونگھتی پھر رہی تھی۔ میرے من میں یہ ڈر تھا کہ کہیں یہ کوئی ایسا علم نہ سیکھ لے جس سے یہ میرا خاتمہ کر دے، مجھے پتہ تھا کہ جو میں کرتا ہوں وہی یہ بھی کرتی ہے۔ میں بڑے بڑے جوجیوں اور سنیا سیوں سے ان کے علم سیکھتا تھا اور انہیں مار ڈالتا تھا کہ وہ کسی اور کو اپنا گیان نہ دے دیں۔ تبھی ایک مہمان سنیا سی سے میں نے زاویوں میں کھولنے کا گیان سیکھا۔“

”زاویوں میں کھولنے کا گیان؟“

”ہاں یوں تو..... آج کے دور میں جب تم نائی سے حجامت بنوانے جاتے ہو..... نائی سمجھتے ہونا؟ جواب، ہیز ڈرلیر اور ہیز آرلسٹ کہلاتے ہیں اور جن کی دکانیں ہیز کنگ سیلون کہلاتی ہیں تو پہلے انہیں نائی کہا جاتا تھا تو میں کہہ رہا تھا کہ ان دکانوں میں شیشے لگے ہوتے ہیں ان شیشوں کے جوڑے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھو تو دوشیشوں کے جوڑے میں تمہارا اثریر چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی چوڑائی کم ہوتے ہوتے ایک کبیر کی طرح رہ جاتی ہے۔ یہ زاویوں کا کھیل ہے۔ اسی طرح کے زاویے سورج کی اور چاند کی روشنی میں بنتے ہیں۔ ان زاویوں میں تاریخ چھپی ہوتی ہے۔ سنسار میں زندگی کے پہلے دن سے آج تک کی کہانی ان زاویوں میں چھپی ہوئی ہے بس ان کے رخ پہچان لو۔ سو میں نے زاویوں کا گیان سیکھا جس کی وجہ سے کوروتی سے بچا رہا اور ابھی بہت سے گیان سیکھے۔“

”قارئین! گوتم بھنسا لی کی عمر لاکھوں سال! خاندان لا پتہ۔ تھائیر کے قدیم مندر میں پوجا کا گھنہ بجاتے تھے۔ رنگ کالا، نقوش بے حد بھدے، قد پانچ فٹ دو انچ، کمر پر کو بڑ لکھا ہوا۔ اس وقت ایک شاندار تھری پیس سوٹ میں ملبوس میرے سامنے موجود ہیں۔“

”ہاں ایک سوال اور بھنسا لی صاحب۔“

”ہی۔“

”حال مجھے۔ کوروتی ہی جو ابھی بہت خوبصورت ہیں، جوانی میں بے حد حسین ہوں گی، ظاہر ہے آپ ان کے

ذوق حسن پر پورے نہیں اترتے ہوں گے اس لئے وہ آپ سے دور رہیں، آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ کوئی ایسا علم سیکھیں جس سے آپ جوان اور خوبصورت نظر آئیں۔

”میں ایسا علم جانتا ہوں۔“

”اگر آپ چاہتے تو کسی بھی دور میں کسی خوبصورت جوان کی حیثیت سے کوروتی جی کے سامنے آکر ان کا پیار حاصل کر سکتے تھے۔“

”یہ..... یہ اسے دھوکہ کون دے سکتا ہے، زمانے بھر کی چنڈال، جیون بھر میں اس کے آس پاس رہا، کیونکہ میں اس سے پریم کرتا تھا، مگر یہ میری باس پہنچاتی تھی، مجھے ہر روپ میں جان لیتی تھی، تمہیں خود معلوم ہے۔“

”اے کبڑے! زبان سنبال کر بول، چنڈال کے کہا۔“ کوروتی نے غصے سے کہا۔  
”ہاں، ہاں، غلطی سے منہ سے نکل گیا تھا۔“

”پیارے قارئین! گوتم بھنسا لی کا کافی تعارف آپ سے ہو چکا ہے۔ اس وقت میرے ڈرائنگ روم کے فرنیچر کے دو صوفوں پر میرے یہ دونوں مہمان براجمان ہیں۔ گوتم بھنسا لی اور کوروتی جی۔ کوروتی کا حلیہ آپ کو بتا دوں، حسین نقوش و نگار، بے حد متناسب جسم، بڑی پردقار شخصیت کی مالک ہیں، قد بھی دراز ہے ایک بے حد قیمتی ساڑھی میں ملبوس ہیں۔ سب سے خوبصورت ان کی آنکھیں ہیں۔ صدیوں کی طرح سوتی ہوئی۔“

”جی کوروتی جی! اب آپ سے سوالات کر سکتا ہوں؟“

”جی!“

کوروتی جی کی آواز بھی بہت دلکش ہے تو اب میں ان سے سوالات کرتا ہوں۔

”کوروتی دیوی! بھنسا لی مہاراج نے جو کہانی سنائی ہے وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں.....!“

”آپ انہیں مار دینا چاہتی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”مجھے اس سے نفرت ہے۔“

”اب بھی؟“

”ہاں اب بھی، مگر تم نے اس سے میری صلح کرا دی ہے۔ پر اس سے کہو کہ اب کبھی میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ کتنے ہی روپ بدل کر میرے پاس آئے ہیں اسے پہچان لوں گی۔ اب اس کیلئے یہی ٹھیک ہے کہ یہ مجھ سے دور دور رہے۔ ورنہ میرے من میں اس کیلئے کرودھ رہے گا۔“

”آپ کی عمر بھی لاکھوں سال ہے۔“

”ہاں۔“

”زندگی کے ان لاکھوں سالوں کا تجربہ بھی عجیب ہوگا؟“

”تمہیں سب کچھ تو بتا اور دکھا چکی ہوں۔ امرت جل پینے کے بعد میرے جیون میں بڑی اونچ نیچ آئی، پھر ایک

دھرماتما نے مجھے میری پسند کا راستہ دکھایا۔

”آخری سوال! آپ دونوں سے۔“



حالانکہ میرے ذہن میں اس کی پوری وجہ موجود ہے۔ لیکن کسی کی دل آزاری سے کیا فائدہ۔ میں نے بڑے بڑے ادیبوں کی محفل میں بیٹھ کر دیکھا ہے۔ انہوں نے خود اپنی ذات کو تاج محل بنا لیا ہے لیکن بس چھوڑیں۔ میں بہک رہا ہوں اور بہکنا نہیں چاہتا۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں ایک فکشن رائٹر ہوں، مختلف جرائد اور رسائل میں لکھتا ہوں اور طویل عرصے سے لکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری بیسار کتابیں بازار میں آچکی ہیں جن کی تعداد پر لوگ حیرت کرتے ہیں لیکن میں کیا عرض کر سکتا ہوں میرا نام ڈیٹان عالی ہے آپ بڑے بڑے بک سٹالوں پر میری کتابیں دیکھ سکتے ہیں۔ میرا اپنا خصوصی شعبہ تاریخ ہے اور دنیا کی تاریخ پر میں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن انہوں نے میرے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ یہ خوبصورت گھر میرے والد نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ انہوں نے میرے لئے بھائی بہن نہیں چھوڑے مجھے ہی پر انحصار کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ البتہ تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں انہوں نے میرے ساتھ کسی بخل سے کام نہیں لیا اور مجھے تعلیم دلائی۔ ممکن تھا کہ ایک مخصوص تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں کسی اچھی جگہ ملازمت کر لیتا۔ کوئی کاروبار کر لیتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ بچوں کی بہت سی کہانیاں لکھیں اس وقت جب بچہ تھا پھر دوسری تحریروں کی طرف آیا اور تقریباً ہر موضوع پر لکھا، لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ تاریخ سے مجھے بہت زیادہ دلچسپی رہی اور جب بھی کبھی موقع ملا تو میں نے تاریخ پر کچھ نہ کچھ لکھ ڈالا۔

لکھنے کیلئے مطالعہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ بیسار کتابیں میری لائبریری کی زینت ہیں اور میں نے ان سے بہت استفادہ حاصل کیا ہے چونکہ والدین دنیا سے چلے گئے اور کوئی ذمہ داری نہ تھی اس لئے کہیں نوکری وغیرہ کرنے کو بھی جی نہ چاہا اور لکھ لکھ کر ہی زندگی کے دن گزارے معاوضہ مل جاتا تھا جو میری ضرورتوں کیلئے کافی تھا۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا فطرت کا حصہ تھا۔ اچھے اچھے ہوٹلوں میں جا کر بیٹھتا تھا اور آپ کو اپنا رازدار بنانے کیلئے کہتا ہوں کہ حسن پرستی میری فطرت کا ایک بڑا جزو ہے۔ صنف نازک اور خوبصورت چہرے گویا زندگی کی بیساکھیاں ہوتی ہیں اور میں نے ان بیساکھیوں سے ہمیشہ رابطہ رکھا۔ چنانچہ بہت سی بیساکھیاں میری دوست رہیں اور ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اس دن میں ایک خوبصورت کلب میں اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایسی جگہوں پر حسن کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ایک سے ایک حسین چہرہ لیکن کسی نہ کسی کی ملکیت کسی نہ کسی کے ساتھ میرے جیسے تمہا لوگ بھی تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آپ کو پسند آئے وہ آپ کی ملکیت بن جائے دیدہ وری بھی ایک بہترین مشغلہ ہے چنانچہ اس وقت میں دیدہ وری میں مشغول تھا کہ وہ وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئی۔ منفرد تھی بلاشبہ منفرد تھی حسین و جمیل چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں انتہائی حسین تراش کے ہونٹ سفید رنگ جس کے ہارے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گہرے میک اپ سے بے نیاز ہے اور اپنی اصل شکل میں ہے۔ بہت ہی متناسب بدن اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے جسم پر بہت ہی سادہ لیکن قیمتی اور اچھی تراش کا سوٹ یعنی اس نے بہت زیادہ مائڈرن بن کے بدن کی کساوت کی تکلیف نہیں اٹھائی تھی۔

میں نے اسے دیکھا اور زیادہ دیکھا پھر اس کے پیچھے دیکھا کہ اس کے عقب میں کون سا بھوت چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس نے اڑتی اڑتی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنے لئے بیٹھنے کی جگہ تلاش کرتی رہی اتنی حسین لڑکی کے ساتھ اگر کوئی بھوت ہوتا تو بھاگ کر پہلے اس کیلئے بیٹھنے کی جگہ بناتا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ تنہا ہی ہے۔ ہال میں اس وقت تقریباً ساری میزیں بھری ہوئی تھیں اس نے بے بسی کی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے لئے جگہ نہ

”پوچھیں۔“

”آپ کو پتہ ہے کہ آپ جیتے رہیں گے۔ کیا آپ دنیا کے آخری دن تک جینا چاہتے ہیں۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں اپنی بات کر رہی ہوں۔ اس کپڑے کے من کا بھید میں نہیں جانتی۔ پر ماتمانے جیون کو دو روپ دیئے ہیں زندگی اور موت، منٹ کو زندگی کے بعد موت کا مزا چکھنا ہوتا ہے۔ بھگوان کی سوغند وہی اچھا ہے سب کچھ کرنے کے بعد تم سوچتے ہو کہ اب کیا کریں۔ بس یہاں سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ تمہیں لوگ ملتے ہیں تمہارے من میں ان کا پیار جاگتا ہے تم انہیں پیار کرتے ہو وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں مر جاتے ہیں تمہاری آتما تو منٹ جیسی ہے دل و دماغ سب کچھ وہی ہے تم روتے رہ جاتے ہو کیونکہ تم نہیں مرتے۔“

”گویا آپ کو یہ دائمی زندگی پسند نہیں۔“

”نہیں میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں مر جاؤں۔“ کیا شعر یاد آیا۔

ہوں کو ہے نشاط کار کیا کیا  
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا  
”اور تم کیا کہتے ہو گوتم بھنساں!“  
”وہ ٹھیک کہتی ہے۔“

”یعنی اب حیات یا تمہاری اپنی زبان میں امرت جل پی کر تم خوش نہیں ہو جبکہ تم دونوں نے حیات ابدی پانے کیلئے ایک انسان کو بھی قتل کر دیا تھا۔“

”میں نے نہیں اس نے۔“ گوتم بھنساں نے کوروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کوروتی نے ناک سکود کر گردن پھیر لی۔

”قارئین! میں نے ایسے دو انسانوں کا انٹرویو آپ کے سامنے پیش کیا جو خود بھی نہیں جانتے کہ ان کی عمر کتنی ہے بس لاکھوں سال کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تاریخ کے لحاظ سے یہ لاکھوں سال کروڑوں سال تک پہنچ جاتے ہوں کیونکہ دنیا کی صحیح عمر کا تعین تو آج تک نہیں کیا جاسکا بڑے بڑے سائنسدان اور محقق دنیا کی عمر کے بارے میں اپنے تجزیے بیان کرتے ہیں خود ہمارا مذہب اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہتا۔

اصل بات تو وہی جانتا ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی اور اس کا ہر وہ راز جو اس نے راز رکھا چاہا دنیا کے آخری دن تک راز ہی رہے گا۔ بھلا کس کی مجال ہے جو اسے منکشف کر سکے۔ ہاں ہم خاک کی پستے اپنی بساط بھر دماغ دوڑاتے ہیں اور اپنے طور پر بہت سے مفروضے تیار کر لیتے ہیں۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ان دو افراد کا انٹرویو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا لیکن آپ ابھی تک میرے ہارے میں کچھ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں.....؟ جناب! میں ایک فکشن رائٹر ہوں۔ ادیب بہت بڑی چیز ہوتا ہے وہ ادب لکھتا ہے اور ادب کا ادیب لوگوں میں بہت بڑا مقام ہے ہم جیسے بے ادب لوگ بھلا اس مقام تک کہاں جاسکتے ہیں کہ خود کو ادیب کہیں۔

خیر..... تو میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ میں ایک فنکشن رائٹر ہوں۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ میرے ملک میں ادب نہیں بکتا فنکشن بکتا ہے اب اس پر بحث میں بالکل نہیں کروں گا کہ ادب کیوں نہیں بکتا اور فنکشن کیوں بکتا ہے

پاکر مایوس ہو گئی ہے۔ ایسے معاملات کی مجھے کافی مہارت ہے، تکلیف کی ضرورت نہیں تھی، میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

”ہیلو.....! آپ ادھر آجائیے۔“

اس نے چونک کر میری صورت دیکھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلنشین مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ نازک نازک قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

”تشریف رکھئے۔“

”شکریہ۔“ اس نے مترنم آواز میں کہا، پھر بولی۔

”اس وقت آپ نے میری بڑی مدد کی ہے۔ اصل میں پہلی بار اس کلب میں آئی ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہاں اتنا رش ہوگا۔“

”اور اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ ہال میں اتنا رش ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ آپ میرے قریب آ گئیں۔“

اس نے ہنسی لگا ہون سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔

”میں قریب تو نہیں آئی۔“

”نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ میری میز پر آ گئیں۔“

”جی.....جی.....جی.....جی! اور آپ کا شکریہ۔“ اس نے کہا اور ایک طائرانہ نگاہ چاروں طرف ڈالی، پھر بولی۔

”اچھی گید رنگ ہے۔“

”ہاں!“

”آپ اس کلب کے مستقل ممبر ہیں۔“

”نہیں بس کبھی کبھی آ جاتا ہوں۔ کچھ میری شناسائیاں ہیں۔“

”کیا کرتے ہیں؟“

”سیر و سیاحت، زندگی سے خوشیاں کشید کرتا ہوں۔“

”واہ! اچھا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ؟“

”رائٹر ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں۔“

”ارے واہ..... ویری گڈ۔“

”آپ کو کہانیاں پسند ہیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“

”کہیں باہر سے آئی ہیں؟“

”ہاں اپنے گھر سے آئی ہوں۔“ وہ بولی اور اس کی ہلکی سی ہنسی سماعت سے ٹکرائی۔

”میرا مطلب ہے۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟“

”یہیں اسی شہر میں۔“

”اچھا..... اچھا تو اسی شہر میں رہتی ہیں اور اس کلب میں پہلی بار آئی ہیں۔“

”یہ کوئی انہونی تو نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں انہونی تو نہیں ہے..... خیر زیادہ تو نہیں بول رہا میں اگر آپ کو ناگوار ہو۔“

”ارے بابا..... ایسا احقانہ تکلف کیوں کیا جاتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے آپ نے مجھے اپنی میز پر جگہ دی ہے میں بھی یہاں تھوڑا سا اچھا وقت گزارنے کیلئے آئی ہوں۔ ہم آئے سانسے ہیں۔ ظاہر ہے آپ بھی چپ اور میں بھی چپ، یہ کوئی عقل کی بات ہوگی۔“

”قطعی نہیں، قطعی نہیں۔“ میں نے اس کی بات سے خوش ہو کر کہا۔

”تو یہ مشغلہ ہے آپ کا..... اور.....“

”نہیں بس یہی ہے۔“

”کیا لکھتے ہیں۔“

”کلشن لکھتا ہوں، فینٹسی پر لکھتا ہوں، زندگی کے اور بھی دوسرے بہت سے شعبے جن میں ایک انفرادیت کا حامل ہوں۔“

”یقیناً..... یقیناً..... آپ نے کہا تھا کہ آپ کو تاریخ سے بھی دلچسپی ہے۔“

”ہاں، تاریخ تو میرا بہترین موضوع ہے اور جب بھی مجھے کبھی موقع ملتا ہے اس پر کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتا ہوں۔“

”ٹھیک..... واقعی تحریر نگاری بھی کمال کی چیز ہے۔ تاریخ کا جہاں تک معاملہ ہے تاریخ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا ہے، لیکن ان میں ایک عجیب سا رخ اختیار کیا گیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے من و عن نہیں لکھا جاتا۔“

”آپ تاریخ پڑھتی ہیں؟“

”صدیوں کی تاریخ..... صدیوں کی تاریخ.....“ اس کے لہجے میں کھویا کھویا پین پیدا ہو گیا۔ میں نے اس پر غور کیا، اس کی عمر دیکھی تو خیریت تھی، لیکن اس کی باتیں بڑی نستعلیق تھیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی اور میں نے بے اختیار سوال کر دیا۔

”بڑی اعلیٰ معلومات ہیں آپ کی، یہ آپ کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتی، آپ کی عمر کیا ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔

”بریں بات، بہت پرانا جملہ ہے کہ عورتوں سے ان کی عمر نہیں پوچھنی چاہئے۔“

”چلے ٹھیک ہے۔ آج یہ مسئلہ بھی شاید حل ہو ہی جائے۔ کیونکہ میرا واسطہ ایک ایسی خاتون سے ہے معاف کیجئے گا خاتون کہنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“

”نہیں..... وہ مختصر ابولی۔“

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خواتین اپنی عمر کیوں چھپاتی ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟“

”بہتونی کرتی ہیں۔ مرد کی آنکھ بہت تیز ہوتی ہے، وہ حقیقتوں کو بالآخر تلاش کر ہی لیتا ہے۔ چاہے کوئی اپنی عمر چھپانے کیلئے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے اور میں آپ کو سچ بتاؤں کہ وہ عورت کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ آپ دیکھئے نا وہ اپنی عمر چھپاتی ہیں اور مرد اس عمر کو جان جاتا ہے، اپنے چہرے چھپاتی ہیں اور طرح طرح کے میک اپ کرتی ہیں، لیکن مجھے ایک بات بتائیے کہ جتنے کاسمیٹکس ایجاد کئے گئے ہیں وہ مردوں ہی نے کئے ہیں۔ کسی بھی عورت کو ایک بھیانک میک اپ کا روپ دے کر مرد اسے والہانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے تو عورت سمجھتی ہے کہ اس نے بڑی فتح

خیر..... ہم اپنی گفتگو کے دوران یہاں تک پہنچ گئے کہ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی، یعنی آج کی رات میرے لئے ایک کامیاب رات تھی اور اس کلب میں آنا نہایت مبارک۔ میں نے اس سے اس کے گھر کا پورا پتہ سمجھ لیا، بہت سی ذاتی بات چیت ہوئی لیکن کبھی کبھی وہ عجیب سے انداز میں سبک سی جاتی تھی جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو، پھر اتنا وقت ہوا کہ ہمیں اٹھنا پڑا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی کار موجود تھی، کلب سے باہر آ کر میں نے اسے پینکشن کی کہ اگر وہ چاہے تو میں اسے اس کے گھر پر ڈراپ کر دوں۔

”وہ میری گاڑی ہے۔“ اس نے ایک قیمتی بی ایم ڈبلیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر میرے سر میں کھلبلی ہونے لگی، بی ایم ڈبلیو کی قیمت آپ جانتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس نے جس علاقے کا پتہ بتایا تھا وہ بھی انتہائی پوش علاقہ تھا۔ گویا بڑی آسامی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب تک کی گفتگو کے دوران جو میرا اس سے تعارف ہوا تھا اس میں اس نے بھی بتایا تھا کہ وہ تنہا اپنے گھر میں رہتی ہے۔ والدین وغیرہ کے بارے میں معلومات کی تو اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا کہ بات اپنی ذات تک محدود رہنی چاہئے۔ یہ بہت ہی فرسودہ طریقہ ہے کہ ہم انسان کی گہرائیوں میں آخر تک جاننے کی کوشش کریں۔ مجھے یہ انداز پسند نہیں..... مجھے بھی نہیں پسند تھا۔ میں نے تو بس اخلافاً پوچھ لیا تھا۔ ان لوگوں کیلئے مغفرت کی دعا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جنہوں نے اتنی خوبصورت لڑکی پیدا کر کے مجھے اس سے دوستی کا موقع دیا۔

اس رات اپنے گھر میں آ کر اس کے بارے میں جاننے کب تک سوچتا رہا۔ خوابوں میں بھی وہی نظر آتی رہی۔ اتنی ہی دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے دوسرے دن شام کی چائے پر مجھے بلایا تھا اور فرمائش کی تھی کہ اپنا بہت ہی خوبصورت سا سوٹ پہن کر آؤں، یہ فرمائش بھی میرے لئے بہت حوصلہ افزا تھی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کئی پبلشرز کے فون آئے۔ کچھ نے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کچھ نے اپنے مسودوں کے بارے میں پوچھا، میں نے سب سے نہایت عاجزانہ معذرت کر لی اور کہا کہ میں آج بے حد مصروف ہوں اور واقعی آج کا دن میں نے اپنی ذات کو بنانے سنوارنے میں گزارا اور وقت مقررہ پر تک رسک سے درست ہو کر سولہ گھنٹہ میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ جملہ خواتین کیلئے مخصوص ہے اور انہی پر چلتا ہے لیکن شاید میں نے بیس گھنٹہ کر ڈالے تھے۔ خوشبوؤں میں بسا آخر کار اس کا لیشان کوٹھی پر پہنچ گیا، جس کا دروازہ آٹومیک تھا۔ یعنی جیسے ہی میں اس کے گیٹ پر پہنچا دروازہ کھل گیا اور ایک آواز سنائی دی۔

”براہ کرم کار اندر لے آئیے۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ الیکٹرانک ہے۔ تھوڑا رعب پڑ گیا تھا میرے اوپر، لیکن ایک رائٹر جانتا ہے کہ کتنی ہی بڑی شخصیت کے سامنے کیوں نہ ہو اسے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ہوتا ہے ورنہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے چاہے اس کی اپنی اوقات کچھ بھی ہو۔

گاڑی پورچ میں روکی تو وہ باہر نکل آئی۔ اس کی فطرت میں بے پناہ سادگی تھی۔ اس وقت بھی گھریلو قسم کا لباس پہنے ہوئی تھی، لیکن حسن و جمال میں یکساں۔ اس کیفیت میں بھی وہ اتنی ہی حسین نظر آ رہی تھی۔ بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اندر لے گئی۔ اس کا ڈرائنگ روم بھی بے پناہ خوبصورت تھا۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ۔ میں نے پسندیدگی کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کروڑوں کی مالک ہے لیکن اس نے کلب میں یہ بھی بتایا تھا مجھے کہ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا وہ تنہا ہے۔

مجھے بٹھا کر اس نے کہا۔

”میں ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور میں سوچنے لگا کہ ڈیٹان عالی جی! اب کے ہاتھ بڑا لمبا لگا ہے، یعنی بے مثال حسن و جمال کی مالک یہ لڑکی تم سے ذرا متاثر نظر آتی ہے، مگر بے بڑی ابھی ہوئی چیز بالی سی عمر یا اور باتیں آسانی۔

حاصل کر لی اور اس مرد کو شہید کر دیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا جناب! وہ کاسٹیکس پہننے کا ایک گرہ ہے۔ اگر کوئی خوبصورت سی لپ اسٹک یا اسی طرح کی کوئی اور چیز عورت اپنے چہرے پر لگائے اور مرد اس سے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرے تو پھر وہ چیز کون خریدے گا۔“

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔  
”واہ! آپ یقین کریں میں پھر حیران ہو گیا ہوں۔ آپ بڑی خوبصورت گفتگو کرتی ہیں۔“  
پھر اس خوبصورت گفتگو کے ساتھ کھانے پینے کی خوبصورت چیزیں طلب کی گئیں اور ہم دونوں تھوڑی دیر میں بہت بے تکلف ہو گئے۔

”عالی! آپ کی دن میرے گھر آئیں۔“  
”کسی دن..... یہ تو زیادتی ہے آپ کی۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ چلی جائیں گی تو میرا وقت کیسے گزرے گا۔“

”دیکھنا میں غلط تو نہیں کہتی تھی کہ آپ لوگ بڑے شکاری ہوتے ہیں اور ایک لمحے میں اپنے شکار کی ایسی تیسی کر دیتے ہیں۔“ اس کے انداز میں بڑی محبوبیت تھی۔ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔  
”معاف کیجئے گا کیا آپ کی ایسی تیسی ہوئی؟“  
میرے اس سوال پر وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی، پھر بولی۔  
”نہیں۔“

”پھر کیا فائدہ۔“ میں نے مایوسی کی شکل بنا کر کہا۔  
”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، اچھی باتیں کر لیتے ہیں آپ اور سب سے بڑی بات میں یہ کہتی ہوں کہ آپ کا شعبہ ایسا ہے جس سے مجھے بے حد دلچسپی ہے، لیکن آپ نے اپنا نام ڈیٹان عالی بتایا نا۔“  
”جی..... جی..... جی!“

”عالی صاحب آپ کتنا ہی کچھ لکھ چکے ہوں، دنیا کے بارے میں آپ کی معلومات کتنی ہی زیادہ ہوں لیکن یہ دنیا اس سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ اس کا تجربہ مجھ سے زیادہ شاید کسی کو نہیں ہو سکتا۔“  
”اور میرے سر میں کھلبلی ہو رہی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ اتنی نوعمری میں آپ اتنی بڑی باتیں کس طرح کر لیتی ہیں۔“

”فرض کیجئے میں نوعمر نہ ہوں۔“ وہ بولی۔  
”تو میں کل ہی دن میں جا کر کسی اچھے سے آئی ہسپتال میں اپنی نظر چیک کراؤں گا۔“ وہ پھر ہنس پڑی، اس کی ہنسی بے حد دلکش تھی اس نے کہا۔

”نظر دھوکہ بھی کھا جاتی ہے کبھی کبھی کسی انسان کے اندر اتنے انسان چھپے ہوتے ہیں کہ اگر وہ انہیں نکال نکال کر باہر رکھے تو سب ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور دیکھنے والا ہوش و حواس کھو بیٹھے۔“

”آپ کو دیکھ کر تو کوئی پاگل ہی ہوگا جو ہوش و حواس میں رہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ہم لوگ بڑی دلچسپ اور مزیدار باتیں کرتے رہے۔ آپ خود تصور کریں، ایک بے حد حسین لڑکی آپ کے سامنے بیٹھی ہو اور آپ ایک لکھاری ہوں، یعنی لکھاری میں نے خاص طور سے اس لئے کہا کہ ہماری حسیات کچھ زیادہ تیز ہوتی ہیں، اگر ہم انسانی صفات سے روشناس نہ ہونے پائیں تو اس کے بارے میں لکھ کیا سکتے ہیں۔

واپس آئی تو ایک ٹرائی دھکیلتی ہوئی لار ہی تھی جس پر ایک مشروب کے انتہائی خوبصورت برتن سجے ہوئے تھے۔ میں دنگ رہ گیا، اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو جگ پر جو مینا کاری کی گئی تھی وہ سونے سے کی گئی تھی، گلاس بھی اسی سیٹ کے تھے۔ بہر حال یہ صرف اندازہ تھا میرا اور نہ موجودہ دور میں سونا اپنی قیمتوں کے لحاظ سے بالکل بے قیمت ہو گیا ہے، کوئی اسے نہیں پوچھتا۔

اس نے مشروب کے دو گلاس بھرے ایک میری طرف بڑھایا اور بولی۔  
”جناب! ڈیشان عالی!“

”اور اگر میں آپ کو رانی کو روتی کہوں تو کیسا رہے گا۔“

”کوئی کسی کو کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ بس کوئی بد نما لفظ نہ ہو۔“

”آپ یہاں بالکل تنہا رہتی ہیں۔“

”ہاں! بالکل تنہا..... مجھے تنہائی پسند ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ اپنی کچھ کتابیں لے کر آئیں گے۔ ان پر میرے لئے خوبصورت جملے لکھ کر۔“

”ارے ہاں غلطی ہو گئی۔ میں آپ کو اپنی کتابوں کا پورا سیٹ پیش کروں گا۔“

”جھوٹ مت بولیں عالی صاحب! آپ نے سوچا ہوگا کہ پہلے آپ میری اوقات تو دیکھ لیں۔ اس کے بعد اتنی قیمتی کتابیں مجھے پیش کریں۔“

”نہیں..... نہیں یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تاریخ پر آپ نے کیا کیا لکھا ہے۔“

”بہت کچھ۔“

”تحقیق کہاں سے کی ہے۔“

”اس کیلئے بھی بکس ہی دیکھتا ہوں۔ اصل میں ہم نے تاریخ میں بھی بڑی گڑبڑ کڑالی ہے۔“

”میں یہی کہنا چاہتی تھی کہ تاریخ جب تک مستند نہ ہو بے مزہ ہو جاتی ہے۔“

”اچھا ایک بات بتائیے آپ مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کو بھی تاریخ سے دلچسپی ہو۔“ میں نے کہا۔

”بہت زیادہ..... بہت زیادہ۔“

”میری نگاہوں میں آپ انتہائی پراسرار شخصیت ہیں۔“ میں نے کہا اور وہ ہنس پڑی، پھر وہ بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے پراسرار کہانیاں بھی لکھی ہیں۔“

”ہاں! میں نے آپ سے کہا تھا کہ زندگی کے لاتعداد موضوعات پر میں نے لکھا ہے۔“

”پراسراریت میں آپ نے کیا کیا لکھا ہے۔“

”بیشار باتیں..... اب میں کیا کیا عرض کروں۔ واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے اپنی کتابیں لانی چاہئے تھیں تاکہ آپ

ان سے نہیں مجھ سے روشناس ہو جاتیں۔“

”آپ سے تو میں روشناس ہو چکی ہوں۔ آئیے میں آپ کو اپنی تاریخ دکھاؤں۔“

”آپ کی تاریخ؟“

”ہاں!“

ہم نے مشروب کے گلاس خالی کئے اور میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ کوشی کافی وسیع تھی۔ ہر چیز بڑے کمال کی، لیکن

جس کمرے میں وہ مجھے لے کر داخل ہوئی اسے دیکھ کر تو میں دنگ رہ گیا۔ دروازے سے داخل ہو کر اس نے روشنیاں جلائیں اور پورا کمرہ جگمگانے لگا، لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے میں ہلکا سا فرنیچر تھا لیکن اس کی دیواریں دروازے اور کھڑکیوں میں لٹکے ہوئے پردے عجیب و غریب کیفیت کے حامل تھے۔ اس میں مصریونان، یورپ، امریکہ اور دنیا کے ہر قدیم دور کے مناظر دیواروں پر پینٹ کئے گئے تھے۔ پردوں تک پر بڑے حسین مناظر پینٹ کئے گئے تھے۔ اتنی بے مثال چیز کہ انسان دیکھے اور دیکھتا رہ جائے۔ مجھ پر بھی بڑا اثر ہوا تھا اور میں تعریفی نگاہوں سے ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ تو واقعی میری توقع سے کہیں زیادہ کی بات تھی۔ میں نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”بیٹھے.....“ میں خاموشی سے بیٹھ گیا، پھر میں نے کہا۔

”یہ سب کیا ہے مس کوروتی۔“

”دنیا..... سنسار..... کائنات..... کیا سمجھے۔“

”نہیں سمجھ پایا۔“

”میں نے کہا تھا نام سے ڈیشان عالی کہ مجھے بھی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔“

”ہاں لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اتنی دلچسپی ہوگی کہ آپ نے پوری کائنات ہی اس ہال نما کمرے میں سمیٹ لی۔“

”عالی ہر چہکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ یہ محاورہ تمہیں پتا ہوگا، تم نے مجھے دیکھا مجھ سے تعارف حاصل کیا، لیکن جیسا کہ

میں نے تم سے کہا کہ کبھی کبھی انسان کچھ نہیں سمجھ پاتا۔ میرے بارے میں تم کیا سوچتے ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تاریخ ہوں..... ڈیشان عالی میں بذات خود تاریخ ہوں۔ میں نے تاریخ کے لاتعداد ادوار دیکھے ہیں، میں نے

تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں دنیا کی تاریخ میں لاتعداد کردار خود ادا کر چکی ہوں۔ سمجھ رہے ہوتا۔“

”سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میری عمر کے بارے میں تم نے پوچھا تھا اب بتاؤں میری عمر کیا ہے۔“

”بتا دیجئے۔“

”لاکھوں سال..... لاکھوں سال..... میری عمر لاکھوں سال ہے، لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی زندہ وجود نہیں ہوں

مجھے چھو کر دیکھو میں ایک مکمل شخصیت ہوں۔ لیکن میرے لاکھوں روپ ہیں۔ بدلتے ہوئے ادوار کے ساتھ میرے

لاکھوں روپ۔“

دفعتاً مجھے زور کی ہنسی آگئی تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”ہنسے کیوں؟“

”وہ جو کہتے ہیں ناکہ اونٹ جب پہاڑ تلے آتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ بلندی کیا چیز ہوتی ہے۔ اگر آپ کا نام

واقعی کوروتی ہے تو میڈم کوروتی آپ مجھ سے بڑی گلشن رائٹر ہیں، یقینی طور پر اگر آپ چاہیں تو بڑی اعلیٰ کہانیاں لکھ سکتی ہیں

اور وہ بھی ہر موضوع پر۔ آپ نے واقعی مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔ خاص طور سے یہ سب کچھ دیکھ کر تو میں دنگ رہ گیا ہوں۔

آپ نے تمہارا کر اگر یہ سب کچھ کیا ہے تو آپ جادو گرئی ہیں۔“

وہ پھر اسی دلکش انداز میں ہنس دی۔

”میں نے تمہیں بتایا تاکہ میں تاریخ ہوں۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ کر تاریخ سے ناواقفیت کے باوجود کبھی کبھی لوگ اپنے آپ کو تاریخ دان کہہ دیتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے علم میں بڑے سقم ہوتے ہیں وہ تاریخ کے بہت سے پہلوؤں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

میں نہیں جانتی کہ دنیا کی تاریخ میں تم کون سے پورشن میں کام کرتے ہو۔ دنیا کی تاریخ تو بہت وسیع ہے ہم بھلا اس کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں اور جہاں تک میری بات ہے تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے بھی تاریخ پر کافی محنت کی ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اس میں ایک کردار بن کر شامل ہوئی ہوں۔ اگر یقین نہ کرو تو ٹھہرو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی۔ میں ہلکے سے فرخنجی کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس وسیع و عریض ہال نما کمرے میں بہت سے دروازے تھے۔ چوڑے چوڑے اور بہت بڑے بڑے۔ ان کا اندازہ میں نے ان پردوں سے لگایا تھا جو ان دروازوں پر نہایت خوبصورتی سے لٹکے ہوئے تھے اور ان پردوں پر ماضی کے ادوار کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔

وہ ایک ایسے پردے کی جانب جا رہی تھی جو سادہ تھا اور اس پر کوئی تصویر نہیں بنی ہوئی تھی۔ اس نے پردہ ہٹایا اور اس کے پیچھے چلی گئی اب مجھے یہ سب کچھ انتہائی پر اسرار اور اگر سچ بیان کروں تو کسی حد تک خوفناک لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔ میں نے اسے غلط سمجھا ہو۔ وہ واقعی کوئی پر اسرار ہی کردار ہے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں..... کیا یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن یہ بھی کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ میں اس طرح سے یہاں سے فرار ہو جاؤں جبکہ ابھی تک اس کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آئی تھی میں خاموش نگاہوں سے اس سفید پردے کو دیکھتا رہا اور میری آنکھیں ہال میں پکراتی رہیں۔

دفعتاً ہی مجھے ایک پردہ درمیان سے ہٹا ہوا محسوس ہوا۔ یہ اس سفید پردے کے برابر کا پردہ تھا۔ پردہ دو حصوں میں تقسیم ہوا اور اس میں سے جو کوئی نمودار ہوا اسے دیکھ کر واقعی میری ہوا کھسک گئی۔ یہ دو لمبے چوڑے قد و قامت کے آدمی تھے جن کے جسموں پر انتہائی عجیب و غریب لباس تھا۔ زمانہ قدیم کے اس دور کا لباس جب انسان تہذیب سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسے اپنا جسم ڈھکنا آچکا تھا اور اس نے پتھر کے ہتھیار بنائے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا حلیہ بالکل ویسا ہی تھا۔ وہ آگے بڑھے تو میں نے ان کے چہرے دیکھے تھے۔ سیاہ۔ سنگ مرمر کی طرح سفید ان پر نہ آنکھیں تھیں نہ ناک تھی نہ ہونٹ تھے۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس دو اسٹیچو لگتے تھے لیکن یہ اسٹیچو متحرک تھے۔ پتھر کے ہتھیار ہاتھوں میں لئے وہ چند قدم آگے بڑھے میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھ پر حملہ آور ہونے والے ہوں لیکن وہ دونوں طرف اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے چوہدار یا دربان کسی کی آمد کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اور پھر اس کی آمد ہوئی وہ ایک نوجوان اور حسین و شیزہ تھی۔ انتہائی مضبوط بدن کی مالک چہرے کے نقوش میں وحشت اور بربریت تھی۔ بڑی آنکھیں خوبصورت انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر رنگین مٹی سے نقوش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سر پر پتوں کا تاج تھا اور حسین کھنکر پالے بال دونوں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پتھر کا ہتھیار تھا اور آنکھوں میں شدید وحشت لیکن اگر ایک مرد کی حیثیت سے اس کے سراپے کا اندازہ لگایا جاتا تو اس میں دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اس پردے سے باہر نکل آئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اسی وقت چھت سے ایک روشن دائرہ نیچے اترا اور فرش پر ایک جگہ منعکس ہو گیا۔ آنے والی کا رخ اسی دائرے کی طرف تھا۔ وہ بالکل اسی طرح کیٹ واک کرتی ہوئی آ رہی تھی جس طرح ماڈلز کیٹ واک پیش کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ آگے بڑھتی ہوئی وہ اس دائرے کے درمیان آ کھڑی ہوئی اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

”میں ایلا بار بروسا ہوں۔ زمانہ قدیم میں اس وقت میرا ظہور ہوا جب تہذیب کی چٹیاں کھل رہی تھیں اور انسان اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایلا بار بروسا نے انسان کو تہذیب کے قریب لانے کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں اور اس نتیجے میں وہ تاریخ میں رقم ہو گئی۔“ اس نے کئی پوز دیئے اور اس کے بعد واپسی کیلئے مزگئی۔ اس کا پورا بدن ہیجان انگیز تھا۔ جسے دیکھ کر بڑے بڑے زائد اپنے ایمان پر قابو نہ پاسکیں۔

میرا سانس بدن میں جنبش کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ وہ پردے کے پیچھے غائب ہوئی تو دونوں چوہدار بھی اندر چلے گئے۔ میں دیر تک اس پردے کو دیکھتا رہا پھر میں نے سبھی ہوئی نظروں سے اس ہال نما کمرے کے اس دروازے کو دیکھا جس سے میں اندر آیا تھا۔ لیکن اب اس دروازے پر بھی ایک پردہ پڑا ہوا تھا بس ایک رخ سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ وہ دروازہ ہے جہاں سے میں کوروتی کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہی دوسرا پردہ ہٹا۔ اس دوسرے پردے پر جو تصاویر بنی ہوئی تھیں وہ کچھ اور تھیں اور اس پردے سے بھی جو کوئی برآمد ہوا اسے دیکھ کر میں ایک بار پھر ششدر رہ گیا۔ ایک حسین و جمیل عورت تھی ملکہ کے لباس میں ملبوس۔ یہ لباس بھی یقینی طور پر زمانہ قدیم کی تراش تھی وہ اسی طرح کیٹ واک کرتی ہوئی آگے آئی اور اس دائرے میں آ کھڑی ہوئی پھر اس کی دلکش آواز ابھری۔

”میں زلوبیا ہوں..... ملکہ زلوبیا۔“ اس کے بعد وہ اپنی تاریخ بیان کرنے لگی اور اسی طرح کے پوز دے کر واپس اس دروازے کے اندر چلی گئی۔ اس دروازے سے بھی جو چوہدار باہر نکلے تھے وہی چہرے تھے ان کے یعنی سپاٹ اور بے نقوش لیکن ان کے جسم پر اس علاقے کا لباس تھا جس سے زلوبیا کا تعلق تھا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک پردے سے وہ دونوں نمودار ہوئے اور اس پردے سے جو عورت نمودار ہوئی وہ بھی قابل دید تھی یہ خاصی دلکش لیکن ایک عجیب و غریب چہرے کی مالک تھی وہ آگے آئی اور دائرے میں آ کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا۔

”میں سیف ہوں..... میری داستان زبان زد عام ہے ہم جنس پرستی میں میرا کردار بھر پور تھا اور صحیح معنوں میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ میں نے ہی ہم جنس پرستی کی داغ بیل ڈالی اور انسان کو جنس کے نئے طریقے سکھائے۔“ اس کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

جن پردوں کے پیچھے سے یہ مختلف کردار برآمد ہو رہے تھے ان کی ایک ترتیب تھی اور ان پردوں پر بنی ہوئی تصاویر سے ان کرداروں کا تعلق تھا۔ اب میری نگاہیں اس دوسرے پردے پر جمی ہوئی تھیں اور میری اپنی معلومات کے مطابق اس پردے کا تعلق یونان سے تھا اور پھر وہاں سے جو شخصیت برآمد ہوئی وہ حسن میں بے مثال تھی۔ اسے دیکھ کر انسان واقعی اپنے حواس کھوسکتا تھا۔ کھڑے کھڑے نقوش حسین ترین وجود خوبصورت لباس جس سے بے لباسی کہیں زیادہ کم ہوتی ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی اور دائرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں سائیکی ہوں یونان کا ایک مشہور کردار کیو پڈ میرا محبوب تھا اور آج بھی ہے۔ میں اپنی تاریخ میں بے مثال ہوں۔“ اس نے چند پوز دیئے اور اس کے بعد جو دوسرے پردے سے عورت برآمد ہوئی وہ جنگ و جدل کے لباس میں موجود تھی انتہائی خوبصورت اور بے مثال اس کے پاس جنگی ہتھیار تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آئی اور پھر اس نے اپنا تعارف لراتے ہوئے کہا۔

”میں ہیلن ہوں“ ثرائے کا وہ مشہور کردار جو تاریخ میں امر ہو گیا ہے۔ ہیلن آف ٹرائے۔“ ہیلن کے جانے کے بعد مصر کی قلو پیٹرا برآمد ہوئی اور اس کے چہرے سے جو سلگتا ہوا سا گداز فک رہا تھا وہ ناقابل فہم تھا۔ میں شاید دنیا کا واحد انسان ہوں جس نے گزرنے والی تاریخ کے بعد ملکہ حسن اور نوجوانوں کی شکاری قلو پیٹرا کو





دیکھا وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا۔

وہ ایک انتہائی خوبصورت باغ تھا۔ میں سبز گھاس پر گرہا تھا۔ باغ میں پھولوں کے کج تھے۔ جن پر کھلے ہوئے پھول مہک رہے تھے اور ہر طرف ایک عجیب و غریب ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی یہاں درخت بھی تھے اور ان درختوں پر پھل لگے ہوئے تھے۔ سامنے سفید سنگ مرمر کے ایک مخصوص طرز کے فوارے بنے ہوئے تھے۔ جن سے پانی اچھل رہا تھا۔ میرے بدن پر کچلی طاری ہوگئی یہ کیا ہوا میں کہاں سے کہاں آگرا۔

اسی کچلی کے دوران میری نگاہ اپنے بدن پر پڑی تو میں اچھل پڑا۔ یہ لباس..... یہ لباس میرے جسم پر کہاں سے آیا۔ عجیب و غریب ہندووانہ لباس تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، اچانک ہی مجھے کہیں سے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں یہ نسوانی آوازیں تھیں میری گردن اس طرف کھوم گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ چار لڑکیاں تھیں بہت ہی پرانے طرز کے ہندووانہ لباس پہنے ہوئے وہ میری ہی طرف آ رہی تھیں۔

ارے باپ رے..... میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ..... یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ میری نگاہیں ان چاروں لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں وہ چاروں ہنسی ہوئیں میری طرف آ رہی تھیں اور پھر وہ میرے پاس پہنچ گئیں۔

”جاگ گئے، آپ کنسی مہاراج!“

”کنک..... کون..... کون.....“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”چلیں اب انہیں..... اشان کر لیں، پھر بھوجن کر لیں۔ بھوجن تیار ہے۔“

”تت..... تم کون ہو..... مم..... مم..... میں کہاں ہوں؟“

”لو کنسی مہاراج پھر گئے۔ ایک تو ان سے کہا جاتا ہے کہ بھنگ نہ پیا کریں۔ منٹ بھنگی ہو کر رہ جاتا ہے، پر کنسی مہاراج کو تو ٹھنڈائی پینے کا اتنا شوق ہے کہ اس کے بغیر یہ جی ہی نہیں سکتے۔ ارے مہاراج رات بھر بگیا میں پڑے رہے ہیں۔ بھگوان نہ کرے ٹھنڈ لگ گئی تو یہ نہانما سا شریر چڑمڑ ہو کر رہ جائے گا۔ چلے چلے۔“

لڑکیوں نے میرے بازو پکڑے اور مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میں صبح معنوں میں چکرایا ہوا تھا۔

”آئیے..... بھنگ کا نشہ سب سے برا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے آپ سے کہ تاڑی پی لیں، دارو پی لیں لیکن بھنگ نہ

پیا کریں..... بھنگ منٹ کو پتا نہیں کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔“

”مم..... میری بات تو سنو..... میری بات تو سنو۔“

”آئیے..... آئیے سن لیں گے، اچھی طرح سن لیں گے، پہلے آپ کا نشہ اتار دیں۔“

وہ مجھے لیے ہوئے اس عمارت میں داخل ہو گئیں، جو تھوڑے فاصلے پر نظر آ رہی تھی میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ یہ ہو کیا گیا ہے؟ میں ہوش میں ہوں یا نہیں؟ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ یا جاگ رہا ہوں..... لیکن وہ خواب نہیں تھا وہ لوگ مجھے لئے ہوئے اس قدیم ترین سنگ مرمر کی عمارت میں داخل ہو گئیں جو اس باغ کے آخری سرے پر تھی۔ عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ مجھے کئی غلام گردشوں سے گزارتی ہوئی بالآخر ایک جگہ لے کر آئیں۔ انہوں نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے گئیں۔ پہلے کبھی میں نے کمرہ کے اندر حوض بنے ہوئے نہیں دیکھے تھے لیکن یہاں ایک حوض نظر آ رہا تھا جس میں جھللاتا ہوا سافید پانی تھا۔ مجھے یہاں لاکر انہوں نے دفعتاً ہی مجھے حوض میں دھکا دے دیا اور میں گر پڑا وہ لوگ خوب ہنسیں میں پانی میں پھوں پھوں کرنے لگا اور وہ باہر نکل گئیں، کچھ لمحوں کے بعد ایک لڑکی اندر آئی اس کے ہاتھوں میں ایک لباس تھا۔

”لیجئے کپڑے پہن لیجئے..... باہر بھوجن لگ گیا ہے۔“

میں صبح معنوں میں ایک عجیب و غریب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کچھ کبھی نہیں سکتا تھا۔ پانی سے نکل آیا، بدن خشک کیا اور جو کپڑے وہ لے کر آئی تھی وہ پہن لئے۔ وہ بھی ہندووانہ طرز کے ہی کپڑے تھے۔ میں یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کرنا کیا چاہئے۔ کوروتی نے نجانے مجھے کس جنجال میں پھنسا دیا ہے، البتہ اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کوئی خطرناک ہی عورت ہے..... بہت ہی خطرناک۔ اب تک اس کا جو کردار سامنے آیا تھا اس نے مجھے پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔

جیسے ہی میں نے اس کمرے کے دروازے سے باہر قدم نکالا وہی چاروں مجھے نظر آئیں جو اب تک میرے سامنے رہی تھیں۔ پھر مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں زمین پر دسترخوان جیسی چیز بچھی ہوئی تھی اور وہاں پر ناشتے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں نے بہر حال ناشتہ کیا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”اور اب آپ ظاہر ہے سوئیں گے، یہ تو آپ کی پرانی عادت ہے۔ آئیے۔“ انہوں نے کہا اور اس کے بعد ایک اور کمرے میں لے جا کر مجھے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس وقت میری کیفیت ایک چھوٹے سے بچے جیسی ہو رہی تھی، میں سخت حیران تھا کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو میں نے کہا۔

”اے سنو..... تم سنو!“ لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا تو میں نے ایک کی طرف اشارہ کر دیا اور وہ عجیب سے انداز میں مسکرانے لگی۔ دوسری لڑکیاں اس سے مذاق کرنے لگیں۔ نجانے وہ کیا سمجھی تھیں، تو ان میں سے ایک کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

”چل آج تیری باری ہے۔“ تینوں لڑکیاں باہر نکل گئیں اور جس لڑکی کو میں نے اشارہ کیا تھا اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور میرے پاس آ گئی۔

”کنسی مہاراج! آپ بھی دن کے راجہ ہیں۔ حالانکہ بھگوان کی سوگند رات جتنی سندر ہوتی ہے دن میں وہ بات کہاں۔“

”بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ..... کیا سمجھ رہی ہو تم۔“ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا اور وہ میرے نزدیک ہی بستر پر بیٹھ گئی۔

”جو سمجھ رہی ہوں کیا غلط سمجھ رہی ہوں۔“

”ہاں میرا خیال ہے غلط ہی سمجھ رہی ہو؟“

”تو پھر صبح آپ بتا دیں۔“

”اگر تم سنجیدگی سے میرے کچھ سوالات کے جواب دو تو میں تمہارا احسان مانوں گا۔“

”ارے آپ تو عجیب عجیب سی باتیں کر رہے ہیں کنسی مہاراج۔ دای ہوں میں آپ کی..... آپ نے اتنا منہ لگا لیا ہے تو ہم آپ سے انٹی سیدھی باتیں کر لیتے ہیں ورنہ ہم تو باندیاں ہیں، لو کرنا یاں ہیں ہم آپ کی۔“

”میں کون ہوں؟“ میں نے سنجیدگی سے سوال کیا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

”لو! اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہے اور ابھی تک ہوش نہیں آیا۔“

”جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ تم نے خود کہا ہے کہ تم دای ہو۔ اس وقت مجھ سے دای بن کر بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی، پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مہاراج..... آپ کنسی مہاراج ہیں۔ راج کٹھ کے راج لیکھک۔ آپ راج کٹھ کی تاریخ لکھتے ہیں۔ آج آپ کو

کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے شاید ورنہ ہوش میں آ جاتے ہیں۔“

”اور میرا نام کنسی ہے۔“

”تو اور کیا ہے۔“ وہ تازہ بھرے اعزاز میں بولی اور پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا میرے سر پر وہ سمٹ کر بیٹھ گئی اور اس نے میرا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔

بتا چکا ہوں آپ کو کہ حسن پرستی میری فطرت کا ایک حصہ ہے اپنے آپ کو ذرا بھی کوئی صاحب کردار آدمی نہیں کہوں گا۔ زندگی میں اس کے علاوہ اور کتنی کیا۔ کوئی رشتہ نہ نانا بس اپنے طور پر ایک چنگ کی طرح ڈولتا رہتا تھا اور یہ چنگ کسی کے بھی ہاتھ میں آجائے ہاں ہو میرے معیار حسن پر اور یہ لڑکی بلکہ وہ چارو لڑکیاں یعنی وہ باقی تینوں بھی کافی حسین و جمیل تھیں۔

میں نے اس کے زانوں سے سر نہ اٹھایا اور کہا۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”جینی.....“

”ہاں تو جینی۔ تم نے مجھے بتایا کہ میں راج لکھک ہوں اور کنسی ہے میرا نام۔ سنو میری کسی بات پر حیرت مت کرو۔ آج میرا مانگ کچھ زیادہ ہی الجھ گیا ہے۔“

”نا..... نا..... نا..... مہاراج! آپ ہمارے مہاراج ہیں ہم تو آپ کی سیوا کیلئے ہر لمحے تیار رہتے ہیں۔ حکم کریں۔“

”مجھے میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتاؤ۔“

”بس مہاراج آپ یہیں اسی محل میں رہتے ہیں۔ یہ آپ کی جگہ ہے۔ بڑا محل پیچھے ہے۔ یہاں آپ رہتے ہیں اور ہم آپ کی داسیاں ہیں آپ رام کٹھا لکھ رہے ہیں اور بہت بڑا سامان ہے آپ کا۔“

”ٹھیک..... جینی بتایا تم نے اپنا نام۔“ میں نے کہا تو اس نے گردن ہلا دی تب میں نے کہا۔

”دیکھو جینی..... واقعی تمہارا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ آج مجھے بھنگ کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ لیکن تم باقی تینوں سے یا کسی اور کو یہ مت بتانا کہ کیا کیفیت ہے۔“

”جو آگیا ہو مہاراج۔“ جینی نے کہا اور اس کے بعد وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی بڑا سر دھل رہا تھا۔ نجانے کب تک وہ یہ عمل کرتی رہی اور مجھے گہری نیند آگئی۔ جاگا تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ جینی چلی گئی تھی اور میں بستر پر آرام سے سو رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور گرد کے ماحول کو دیکھا اور میرا دل دہل کر رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیوں۔ یوں گزرے ہوئے لمحات مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ کوروتی کے گھر میں تھا اور وہاں مجھے عجیب و غریب تجربات ہوئے تھے لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہئے سب سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عمارت کا جائزہ لے لیا جائے ہو سکتا ہے حالات کے بارے میں مجھے کچھ اور پتا چل جائے۔

چاروں لڑکیاں شاید عمارت سے باہر نکل گئی تھیں ویسے بھی یہ عمارت بہت زیادہ وسیع نہیں تھی بس میری ہی رہائش گاہ تھی۔ لیکن بہت ہی نفیس سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی جینی طور پر بڑا محل جس کے بارے میں مجھے جینی نے بتایا تھا اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگا۔

پھر میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں بیسار کتابوں کے اٹھارے تھے لیکن یہ کتابیں بڑی عجیب و غریب تھیں نجانے کیسے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کتاب اٹھائی اسے کھول کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ سنسکرت میں لکھی گئی تھی لیکن اس کا ایک ایک لفظ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ کتاب کے اوپر دیکھا ہوا تھا اور لکھنے والے کا نام برہمہ تھا۔ برہمہ کی کتاب وید جس کے بارے میں امریکن لائبریری میں میں نے ایک مضمون پڑھا تھا ہندو مائیتھالوجی کے بارے

میں تحقیق کرتے ہوئے مجھے پتا چلا تھا کہ سنسکرت میں لکھی گئی کئی کتابیں ہندو مذہب کیلئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی میں ایک وید بھی تھی گیتا اور رامائن کے بارے میں بھی مجھے علم تھا۔ اس میں ہندو دھرم کے بارے میں خاصی تفصیلات موجود تھیں۔

میں نے وہیں بیٹھ کر اس کتاب کے اوراق کھول لئے سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میں سنسکرت جانتا تھا جبکہ بڑے بڑے ہندو پنڈت بھی مکمل سنسکرت سے واقف نہیں تھے۔ عام لوگوں کی تو بات ہی الگ ہے لیکن سنسکرت میں لکھی ہوئی اس کتاب کا مفہوم میرے سامنے پوری طرح نمایاں تھا۔

مہینا پور کے راجہ بھرت کی آٹھویں نسل کا راجہ کور تھا۔ جس کی اولاد کوروں کے نام سے مشہور ہوئی اور اس نسل کی چھٹی پشت میں راجہ چتر برج پیدا ہوا۔ جس کی حکومت بہت وسیع تھی۔ راجہ چتر برج کے دو بیٹے تھے ایک کا نام آشر تھا اور دوسرے کا نام پنڈا۔ آشر بڑا لڑکا تھا لیکن وہ آنکھوں سے اندھا تھا۔ اس لئے چتر برج کی موت کے بعد حکومت پنڈا کو ملی اور اس کی اولاد پاٹڈ کہلائی۔ راجہ پنڈا کے ہاں بھی پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑا پنڈا دریودھن تھا جبکہ آشر کے ایک سوا یک بیٹے تھے۔ جو درانیوں سے پیدا ہوئے لیکن اندھا ہونے کی وجہ سے حکومت آشر کو نہیں ملی تھی۔ یہ ساری تفصیل سنسکرت میں تھی اور میں اسے بڑی آسانی سے پڑھے جا رہا تھا۔ لیکن میری اپنی حیرت کی کوئی انتہاء تھی۔ مجھے اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں اور میں نے اسے بند کر دیا لیکن میرا ذہن بری طرح سوچوں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ ہوا کیا ہے آخر ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ میں کوروتی کی اس کتاب کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ جس کا نام تاریخ تھا اور اس تاریخ میں خود میں بھی ایک کردار بن گیا تھا۔ لیکن کوروتی کیا وہ بھی اس دور میں موجود ہے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور اسی وقت وہی لڑکی جینی اندر داخل ہوئی اس نے بڑے ادب سے کہا۔

”شما چاہتی ہوں مہاراج..... آپ کیلئے ایک سندس آیا ہے۔“

میں نے نگاہیں اٹھا کر جینی کو دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ بے شک اس سے بہت زیادہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن جس کردار میں میں یہاں موجود تھا اس میں تھوڑی سی سنجیدگی ضروری ہے میں نے کہا۔

”کس کا سندس ہے؟“

”میں اسے بلاتی ہوں۔“ جینی نے کہا اور دروازے کی طرف رخ کر کے بولی۔

”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“

آنے والا ایک خاص لباس میں ملبوس آدمی تھا۔ اندر داخل ہو کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ سامنے کئے پھر انہیں زمین پر ٹکا کر سر جھکا یا اور اس کے بعد سیدھا ہو گیا۔

”ہم سندس ہیں مہاراج..... راجہ جگت سنگھ کے۔“

”ہاں بولو!“

”شام کو راج سبھا میں آپ کا بلاوا ہے۔ رخصت آجائے گا آپ تیار رہئے گا۔“ یہ راجہ جگت سنگھ کون تھا اور راج سبھا کیا چیز تھی اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن جس چکر میں پھنس گیا تھا اس کے تحت بڑی سمجھداری سے کام لینا تھا۔ کوروتی تو سرے سے غائب ہو گئی تھی اور مجھے ان الجھنوں میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جان بچانے کیلئے اپنی ذہانت سے بھی کام لینا تھا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے رخصت آئے گا تو ہم آ جا میں گے۔“



سندس یعنی قاصد نے گردن خم کی اور واپس چلا گیا۔ سبھی وہیں پر موجود تھی اور میری طرف بیٹھی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس کے جانے کے بعد وہ بولی۔

”سندس مل گیا مہاراج!“

”ہاں.....!“

”پر ایک وعدہ کرنا ہوگا آپ کو۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی اور میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں بولو!“

”آپ کو تیار ہم کریں گے۔“

میں کیا جواب دیتا اس بات کا اس کی حرکت کا مطلب میں سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ خاموش ہی رہا اور وہ ہنستی ہوئی واپس چلی گئی اور پھر اس وقت شام کے چھپنے فضاؤں میں اتر آئے تھے جب وہ دوبارہ آئی اس کے پیچھے انہی چاروں میں سے دو اور لڑکیاں بھی تھیں جو اپنے ہاتھوں میں ایک عجیب سا لباس اٹھائے ہوئے تھیں۔ یہ لباس کئی رنگوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے خوبصورت قدیم طرز کے جوتے بھی تھے۔ سبھی نے جیسے مجھے اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ ہر چیز میں اپنا پاؤں اڑائے رہتی تھی، میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”چلئے مہاراج اشان کر لیجئے۔“

”اب بار بار اشان کرنا ضروری ہے کیا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تو اور کیا.....“ وہ شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔ باقی دونوں لڑکیوں کے چہروں پر رقابت کے نقوش نظر آرہے تھے۔ کمینہ سبھی نے اپنے ہاتھوں سے میرا لباس اتارا اور اپنے کپڑوں سمیت حوض میں اتر گئی۔

ڈیٹان عالی بے شک ایک دل چینک نو جوان تھا۔ جدید دنیا کی جدیدیت سے پوری طرح آشنا۔ کوئی آگے نہ پیچھے ہٹتا اور کہانیوں ہی سے اتنا معاوضہ مل جاتا تھا کہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ ایک خوبصورت سا گھر، کار، عمدہ ہوٹلوں اور کہانیوں ہی سے اتنا معاوضہ مل جاتا تھا کہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ ایک خوبصورت سا گھر، کار، عمدہ جہاں تک دنیا کی رنگینیوں کا تعلق تھا تو ایک شاعر یا ادیب اگر حسن کائنات سے متعلق نہ ہوتا تو وہ اچھی نثر لکھ سکتا ہے نہ اچھا شعر۔ میں اس بات کا دل سے قائل تھا اور وجود ذن سے قطعی منکر نہیں تھا۔ چنانچہ میری زندگی میں بھی بہت سی رنگینیاں تھیں، لیکن جن حالات کے تحت اس انوکھی دنیا میں آیا تھا اس کی بات ہی کچھ اور تھی، غالباً کوئی کہانی کا تاریخ کے کسی دور کو اس طرح اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا کہ خود اس دور میں ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہو یہ میری زندگی کی سب سے انوکھی بات تھی۔

مختصر یہ کہ سبھی کی اجارہ داری چل رہی تھی اور اس نے مجھے بنا سنوار کر دلہا بنا دیا تھا۔ مانتے پر تلک لگانے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔

”نہیں سبھی یہ میں نہیں لگاؤں گا۔“

”کیوں مہاراج..... راج سبھا میں جا رہے ہیں تلک نہیں لگائیں گے۔“

”نہیں۔“

”سند رگینیں گے۔“

”نہیں بس جتنا لگ رہا ہوں اتنا ہی کافی ہے۔“ میں نے کہا اور سبھی نے منہ بنا کر چندن کی پیالی ایک طرف رکھ دی۔

پھر باہر سے اطلاع ملی کہ رتھ آگیا ہے۔ رات ہو چکی تھی باہر نکلا تو چھ گھنٹوں کا انتہائی خوبصورت جھنگاٹا ہوا رتھ دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ رتھ بان گھنٹوں کے پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں قریب پہنچا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور مجھے سہارا دینے کیلئے میرے پاس آگیا، اس کے سہارے سے میں رتھ میں سوار ہوا، تنہا ہی تھا۔ میرے بیٹھنے کے بعد رتھ بان نے رتھ آگے بڑھا دیا۔ جب میں نے باہر کے ماحول کو دیکھا، گھر دروازے، گلیاں بازار سارے کے سارے انوکھے اور منفرد..... آہ اگر میں کبھی واپس اپنی دنیا میں پہنچا اور میں نے اس دور کی کہانی لکھی تو مجھ سے اچھی کہانی کوئی نہیں لکھ سکے گا، کیونکہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں گا۔

سفر ایک انتہائی عالی شان محل پر ختم ہو گیا، جس کے بڑے دروازے پر کوئی درجن بھر چوہدار کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے سلامی دی اور رتھ آگے بڑھ کر ایک جگہ جا کھڑا ہوا، یہاں بھی کچھ لوگوں نے میرا استقبال کیا تھا۔ انہوں نے مجھے راج لیکھک یعنی شاہی مورخ یا لکھنے والا کہہ کر مخاطب کیا تھا اور مجھے بڑے احترام سے اندر پہنچایا گیا تھا۔ ایک انتہائی وسیع و عریض جگہ تھی جو بے شک محل کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد تھی لیکن اسے بھی کھلا رکھا گیا تھا اور وہاں جو سماں بندھا ہوا تھا ناقابل یقین تھا۔ بیٹھا لوگ نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے روشنیاں اتنی تھیں کہ ماحول جھنگاٹا رہا تھا۔ لیکن یہ بجلی کی روشنی نہیں تھی بلکہ دوسرے طریقوں سے انہیں بنایا گیا تھا۔

ایک بڑے سے سنگھاسن پر مہاراج جگت سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جگت سنگھ کی تاریخ کا مجھے کوئی پتا نہیں تھا۔ لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس علاقے کا راجہ ہے۔ بہت سے خدام مورچل جھل رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پر نام کیا۔

”آؤ راج لیکھک بیٹھو راج سبھا میں ہم تمہارا سواگت کرتے ہیں۔“

ایک اور شخص نے میری رہنمائی میری نشست پر کی اور میں بیٹھ گیا، راجہ جگت سنگھ نے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی تھی۔

اعراء اور صاحب اقتدار جاگیر دار وغیرہ آتے رہے اور نشستیں بھرتی گئیں۔ یہاں تک کہ کسی نقارے پر چوٹ پڑی اور فضا اس نقارے کی آواز سے گونج اٹھی، گویا یہ مہمانوں کے آجانے کے آخری وقت کا اظہار تھا۔ کیونکہ اس کے بعد سبھا کے کام شروع ہو گئے۔ طاق طاق دیئے روشن کئے جانے لگے، حالانکہ پہلے یہاں کافی روشنی تھی لیکن یہ دیے شاید کسی رسم کے تحت جلانے جا رہے تھے۔ پھر پندرتوں نے کھانا شروع کر دی اور پھر حسین لڑکیوں کی ٹولیاں بتوں کے سامنے رقصاں ہو گئیں، کچھ دیر تک یہ سماں جاری رہا اور میں ہر لمحہ ذہن میں منضبط کرتا رہا کہ شاید کبھی اس پر لکھنے کا موقع ہی مل جائے، نقارے پر دوبارہ چوٹ پڑی اور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ جیسے کائنات کی نبض رک گئی ہو، وقت ساکت ہو گیا ہو، سبھی ایک رقصہ ایک طرف سے نکل کر باہر آئی، رقص کے انتہائی حسین اور جھلملاتے لباس میں ملبوس، آدھے چہرے پر نقاب لگائے وہ آئی اور جگت سنگھ کے سامنے جھک گئی، پھر سیدھی ہوئی اور یہاں موجود تمام لوگوں کی جانب دیکھا۔

میں دنگ رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو، کریمیں سمٹ کر انسانی بدن اختیار کر گئی ہوں، چاندنی رقص کرنے لگی ہو، اس نے اپنے رقص کا آغاز کیا اور سانس رک گئے، ساز سچنے لگے، دیکھنے والوں کے دل اس کے قدموں تلے چل رہے تھے۔ میں بھی بڑا ساکت و جامد ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ آنکھیں جن پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اس لڑکی کیلئے تو سلطنتیں تباہ ہو سکتی ہیں، جیسا کہ تاریخ میں بیٹھا روایات ہیں جیسا کہ وہ بہت سے کردار ہیں جو مجھے دکھائے گئے تھے اور جو تاریخ کے پردوں سے نمودار ہوئے تھے۔ یعنی اس وقت جب کوروتی مجھے اس ہال میں لے گئی تھی۔ میں اس پر نگاہیں جمائے نجانے کیسے کیسے خوابوں میں کھو گیا۔

رقاصہ جی تو ذکر ناچ رہی تھی اور اس کا پورا بدن سوسوہل کھا رہا تھا۔ پھر وہ تھک گئی اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ ناچ ختم ہو گیا اور لوگ بدحالی دینے لگے تو رقصہ نے وہیں زمین پر بیٹھ کر ٹھنڈو کھولے اور انہیں ہاتھوں میں سمیٹ کر وہاں سے آگے بڑھ گئی اس وقت میں بے خودی کے عالم میں تھا۔ ایسا حسین وجود اگر میری کہانی کے کسی صفحے پر اتر آئے تو لوگ دیوانے ہو جائیں بشرطیکہ وہ اسے میری آنکھ سے دیکھیں۔

راج سبھا میں نجانے کیا کیا ہو رہا تھا۔ لیکن میں اس طلسم میں کھو گیا تھا۔ میں کب اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پیچھے چل پڑا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس وہ آگے تھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے پتا نہیں لوگوں نے مجھے اس کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ کہیں سے کوئی روک ٹوک نہ ہوئی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کہ وہ محل سے باہر نکل آئی۔ پتا نہیں اس کا ٹھکانہ کہاں تھا۔ پیچھے کیا ہو رہا ہے یہ کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن اب جو ہو رہا تھا وہ ہوتا رہے میں اس کے پیچھے چل پڑا ہوں۔ دیکھوں تو یہ کون ہے کہاں جاتی ہے بس کچھ نادریدہ تار تھے جو میرے اور اس کے بیچ بندھے ہوئے تھے اور میں کھینچا چلا جا رہا تھا۔ میں نے تمام دوسوے دل سے نکال دیئے تھے اور خاموشی سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ نجانے کتنا فاصلہ طے کیا گیا اور اس کے بعد مجھے جنگل نظر آیا۔ یہ پراسرار لڑکی اس طرف کیوں آئی ہے؟ دل میں ایک تجسس نے سرا بھارا رات کا وقت تاریک جنگل جہاں ہاتھ کو ہاتھ تا بھائی دے۔ کہیں سے درختوں کی چھت بٹے تو تاروں کی چھاؤں میں لڑکی کا ہیولہ نظر آجائے۔ نجانے کتنا سفر طے کیا گیا۔ ایک لمحے کے اندر اندر ذہن نے دل پر دستک دی اور میں نے سوچا کہ کہیں کوئی بہت ہی سنسنی خیز بات نہ ہو جائے کہاں تک اس کا پیچھا کروں گا؟ وہاں لوٹ جاؤں گا۔ لیکن اب اتنی دور نکل آیا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہاں کہاں اور کیسی ہوگی۔ یہ راز میرے دل میں راز ہی رہ جائے گا۔

آخر دیکھوں تو سہی رقصہ جس نے محفل لوٹ لی تھی کہاں جا رہی ہے لیکن حیرانی کی بات تھی چھوٹی سی عمر میں اتنا بڑھتا ہونا بھی کمال کی بات تھی کوئی جوان لڑکی تو رات گئے ان جنگلوں میں گھسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ بڑے اطمینان سے آگے جا رہی تھی میرے بدن کے روکتے کھڑے ہو گئے تھے۔ جنگل آگے چل کر اور خطرناک ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں سے پکڑے الجھ رہے تھے۔ کون جانے کب کوئی ناگ لکھ لکھ اور ناگ سے لپٹ جائے۔ کوئی زہریلا بھجوا پاؤں میں ڈال لے۔

لڑکی کئی بار چلتے چلتے رکی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مضبوط ڈوری میرے اور اس آگے جانے والی لڑکی کے بیچ بند بھی ہو جو مجھے کھینچ رہی ہو۔ وہ رکتی اور اس کے بعد پھر چل پڑتی اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی چل پڑتا۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا اور اب سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر نما قلعہ نظر آ رہا تھا۔

سب کچھ انتہائی خوفناک اور سنسنی خیز دلچسپ بات یہ تھی کہ میں اس وقت دوہری شخصیت کا مالک تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں کہانی کا رڈیٹان عالی ہوں لیکن جس ماحول میں آیا ہوں وہ تاریخ کا کوئی قدیم دور ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں بڑا دلچسپ تصور تھا۔

نوجوان لڑکی اطمینان سے قلعہ کے اندر داخل ہو گئی اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے درمیان چلتی ہوئی آخر کار ایک چبوترے کے پاس رک گئی پھر اس نے چبوترے کی تین ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں عبور کیں اور اوپر آگئی پورا قلعہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور میرے دل میں خوف کا سمیرا تھا۔ پتا نہیں یہاں کیا ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹوٹے قلعہ کی پراسرار دیواریں مجھے لگ لیں۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں دن میں آنے والوں کے دل ہول جائیں یہ تو پھر رات کا وقت تھا۔

پھر مجھ سے نہ رہا گیا لڑکی نجانے کون ہے اور کیا ہے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں اس کے

راستے میں مزاحم ہو جاؤں اور اس سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ چنانچہ میں نے خود بھی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گیا، لڑکی جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی پھر چبوترے پر تیز روشنی پھیل گئی لڑکی نے ایک دیا روشن کیا تھا۔ دیے کی روشنی بہت تیز تھی۔ اتنی تیز کہ دور دور تک کا ماحول نظر آئے میں نے اس لڑکی کو دیکھا جس کا رخ اب میری جانب ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں یہ مسکراتی آنکھیں اس قدر دلکش تھیں کہ دل کھینچ کر باہر نکل جائے یوں لگ رہا تھا جیسے ننھے ننھے دیے روشن ہو گئے ہوں اور اس روشنی میں اس کا چاند جیسا چہرہ بھی خوب چمک رہا تھا۔ جسے نقاب چھپائے ہوئے تھی پھر اس کی آواز ابھری۔

”قریب آ جاؤ اتنی دور کیوں کھڑے ہوئے ہو۔“

اور نجانے اس آواز میں کیا سحر تھا کہ میں کھینچا چلا گیا اور اس اپسرا کے عین سامنے پہنچ گیا لڑکی کی آنکھیں بدستور مسکرا رہی تھیں۔ جیسے اس کے انگ انگ میں دیئے جل رہے ہوں نجانے یہ روشنی کہاں سے منعکس ہو رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مرے پیچھے پیچھے کیوں چلے آئے۔“

”تم کون ہو؟ اور میرے دل کے تار تم سے کیوں بندھے ہوئے ہیں۔“

”میرا بھید جانو گے؟“

”ہاں! کتنی خوبصورت ہوتم۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔“

”میں جو ہوں اسے جان کر حیران رہ جاؤ گے۔“

”کون ہوتم؟“ میں نے حیرانی سے کہا اور لڑکی نے اپنے کان کے پاس کوئی چیز تلاش کی اور اس کے بعد اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔ مجھے اتنی زور کا چکر آیا کہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھنے پڑے اور میں دیوانوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ یہ کوروتی تھی لیکن پہلے سے کہیں زیادہ حسین اتنی حسین کہ انسان اسے دیکھ کر اگر اسے نہ پاسکے تو خودکشی کر لے میں اسے پاگلوں کی طرح گھورتا رہا تو وہ ہنسی اس کے دل کش دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے اور میں سحرزدہ سا اسے دیکھتا رہا۔

”کوروتی.....“

”ہاں! میں۔“

”کوروتی کیا میں پاگل ہو جاؤں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ اس نے کہا اور پھر ہنس پڑی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟“

”صدیوں کا سفر تم نے کتنے لمحوں میں طے کیا ہے تمہیں معلوم ہی نہیں ہے عالی کہ تم اس وقت کون سے دور میں ہو۔“

”مگر کوروتی کیا میرے لئے اس دور سے واپسی ممکن ہوگی۔“

”ہاں..... کیوں نہیں! کیا تم اتنی سی دیر میں اکتا گئے ہو۔“

”نہیں اکتا یا نہیں ہوں۔ مجھے کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ڈیٹان عالی ہوں ایک کہانی کا لیکن یہاں مجھے کیا کہا جا رہا ہے۔“

”راج لیکھ..... لیکھ کا مطلب ہے لکھنے والا اور تم سنسار کی صدیوں پرانی تاریخ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے

ہو جب کھو گئے تو وہ اتنی سچ ہوگی کہ اس سے بڑا سچ اور کوئی نہیں لکھ سکے گا۔ میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ اگر ہم ماضی کی کسی تاریخ میں جاتے ہیں تو ہمیں اس تاریخ ہی کا ایک کردار بننا پڑتا ہے، ورنہ اجنبی ماضی میں کسی اجنبی کردار کی بھلا کیا گنجائش ہے ماضی تو وہ ہے جو بیت چکا ہوتا ہے۔

ہاں اگر اسی ماضی کے کسی کردار پر قبضہ جمالیا جائے تو بات بن سکتی ہے اب تم مجھے کوروتی کے نام سے جانتے ہو لیکن اس دور میں مجھے شکاک کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ شکاک ایک ساحرہ جو ناچنے والی کے روپ میں سامنے آتی تھی اور اس کا چہرہ ڈھکا رہتا تھا۔ تم راج لیکھک ہو۔ اس دور کے راج لیکھک جس نے مہا بھارت کے بارے میں بھی لکھا۔ بے شک تمہیں مہا بھارت کی تفصیلات معلوم نہیں ہوں گی لیکن لگے ہاتھوں میں تمہیں مختصر طور پر بتا دوں، تم نے خود اپنی لکھی ہوئی کتاب میں دیکھا کہ چتر برج مہاراج کے بیٹوں کی بات ہو رہی تھی لیکن ہستنا پور کے راجہ بھرت کی آٹھویں نسل کا راجہ کور جس کی اولاد کوروں کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نسل کی چٹھی پشت میں راجہ چتر برج پیدا ہوا جس کے دو بیٹوں میں مہا بھارت کی جنگ ہوئی، ایک کا نام آشر جو آنکھوں سے اندھا تھا اور دوسرا پنڈا۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہیں سے کام شروع ہوا۔

آشر کو ہستنا پور کی حکومت نہیں ملی اور اسے اپنی آنکھوں کے نہ ہونے کا بہت دکھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پنڈا کے بعد حکومت پنڈا ہی کے بیٹوں کو ملے گی چتر برج کی اولادوں میں سے دوسری نسل کا سب سے بڑا بیٹا در یودھن تھا۔ لیکن اس نے کبھی پنڈا کے سامنے یہ بات منہ سے نہیں نکالی تھی۔ البتہ اس کی دھرم پتی رانی کندھاری جو کندھار کے راجہ کی بیٹی تھی بری طرح پریشان رہتی تھی کہ حکومت اس کے بیٹوں کو نہیں ملے گی۔ بس اس کے من میں یہی بات تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے پنڈا کے بعد کی حکومت اس کے بیٹے در یودھن کو مل جائے اور اس کیلئے اس نے ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا، اس منصوبے کو اس نے اپنے پتی سے بھی چھپائے رکھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آشر اپنے بھائی پنڈا سے بڑی محبت کرتا ہے تو آشر کے پاس پہنچ کر اس نے کہا۔

”مہاراج ایک عجیب و غریب سپنا دیکھا ہے میں نے۔ آپ یقین کرو یہ سپنا میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”کیا سپنا؟“

”میں نے دیکھا مہاراج کہ آسمان سے ایک تار اٹھنا اور ایک روشن کیر بنانا ہوا میرے چروں میں آگرا۔ میں نے ڈری ڈری آنکھوں سے اس چیز کو دیکھا جو میرے پیروں میں آ پڑی تھی تو وہ چڑے میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی۔“

”کتاب.....“ آشر نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں مہاراج میں نے اس کتاب کا چڑا کھولا تو مجھے اس میں راجہ پنڈا کی جنم کنڈلی نظر آئی۔“

”ارے.....“ آشر حیرت سے بولا۔

”کیا تم نے اس کی کنڈلی کو کھول کر دیکھا۔“

”پریشانی تو اسی بات کی ہے۔“

”کیوں؟“ آشر حیرانی سے بولا۔

”میں نے اسے کھول کر دیکھا اس میں بڑی عجیب باتیں لکھی ہوئی تھیں۔“

”بتاؤ تو سہی..... مجھے بتاؤ تو..... کیا انوکھی باتیں تھیں۔“

”میں نے جنم کنڈلی دیکھی اور پڑھی تو اس میں انوکھے انکشافات پائے۔ اس میں لکھا تھا کہ راجہ پنڈا کی موت اس عمر میں ہوگی جب اس کے پانچ بیٹے ہوں گے اور وہ اپنی حکومت کے گیارہ برس پورے کر چکا ہوگا۔“

”اور.....“

”لکھا تھا مہاراج! کہ پنڈا کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوگی۔ وہ ایسی جگہ مرے گا جہاں عام لوگ نہیں مرتے۔“

”اوہ بھگوان..... تم نے یہ سپنا کیوں دیکھا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ راجہ پنڈا ہم سب سے بڑی محبت کرتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پنڈا کی موت کے بعد ہستنا پور کی حکومت ہمارے بڑے بیٹے کو ملنی چاہئے لیکن یہ تو سب کچھ بھگوان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا بھی نہیں چاہئے کہ پنڈا مر جائے۔“

”بھگوان نہ کرے وہ میرا بھائی ہے۔“ آشر نے کہا۔

”پر ایک بات میرے من میں دکھ پیدا کرتی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ مہاراج خاندانی ریت کے مطابق پنڈا کے بعد حکومت در یودھن کو ملنی چاہئے مگر میرا خیال ہے حکومت در یودھن کے بجائے ارجن کو ملے گی کیونکہ پنڈا کے بیٹوں میں وہی سب سے بڑا ہے۔“

”اگر حکومت ارجن کو بھی ملے تو ہمیں اس سے کیا وہ بھی تو ہمارا اپنا ہی ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن بہت سے لوگ اس بات کو نہیں مانیں گے۔“

”نامائیں۔ ہمیں حکومت نہیں چاہئے اور پھر ابھی پنڈا کی عمر ہی کیا ہے بس بیٹے تو دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔“ آشر نے کہا اور کندھاری مسکرائے لگی اس کی یہ مسکراہٹ آشر نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن کندھاری نے کہا۔

”میری ایک رائے ہے مہاراج!“

”کیا۔“

”آپ یہ سپنا سے بتادیں۔“

”اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں پنڈا کی جنم کنڈلی تو اس کے پاس محفوظ ہوگی۔“

”ہاں مجھے پتا ہے اس کی جنم کنڈلی بھی بنائی گئی تھی۔ بڑے بڑے پنڈتوں نے اس کی یہ جنم کنڈلی بنائی تھی پتا نہیں مہاراج چتر برج نے اسے دوسروں کے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ بھی پنڈتوں ہی نے کہا تھا۔“

”آہ..... تو آپ کو یہ بات معلوم ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“

”تو آپ نے اس بارے میں کیا سوچا۔“ کندھاری نے پوچھا۔

”بس میں سوچ رہا ہوں تمہاری بات کو اسے بتاؤں یا نہیں۔“

”اس سے کہو کہ وہ اپنی جنم کنڈلی کھول کر دیکھے۔“

”اور اس کی وجہ پوچھی اس نے تو؟“ آشر نے سوال کیا۔

”تو پھر تم اسے بتا دینا کہ اس کی بھابی اس کیلئے پریشان ہے اس نے ایک سپنا دیکھا ہے۔“ آشر سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے خود بھی گردن جھٹک دی۔

”ٹھیک ہے میں اس بارے میں اسے بتا دوں گا۔“

راجہ پنڈا نے آشر کی تشویش سنی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں بھائی جی اگر بھگوان نے میری موت اسی طرح لکھی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”نہیں پنڈا میں جانتا ہوں کہ عورت کی بات قابل توجہ نہیں ہوتی، لیکن اگر تم چاہو تو صرف ہمارے من کی شافی کیلئے جنم کنڈلی کھول کر دیکھو جو پنڈتوں نے بنائی تھی، یوں بھی تم نے اپنی جنم کنڈلی آج تک کھول کر نہیں دیکھی۔“

”اور اگر بھائی جی کی بات سچ نکل آئی تو؟“ پنڈا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ہم اس کا کوئی اوپائے کریں گے پنڈتوں کو بلائیں گے ان سے پوچھیں گے کہ کیا کیا جائے۔“

”ٹھیک ہے، میں صرف آپ کی آگیا کی پالن کیلئے یہ سب کچھ کروں گا۔“ پنڈا نے احترام سے جواب دیا۔

جنم کنڈلی خزانے میں نہایت محفوظ جگہ رکھی ہوئی تھی۔ پنڈا نے اسے منگوایا اور طویل عرصے کے بعد اس نے اپنی قسمت کے لکھے کو کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا، وہ اسے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی دعائیں اور اشلوکوں کے بعد لکھا تھا۔

”اور پنڈا کی عمر کا ایک مخصوص حصہ اس سے جب اس کی حکومت کے گیارہ سال بیت جائیں گے اس کیلئے خراب ہوگا اس کی موت سانپ کے کاٹے سے ہوگی اور یہ امنٹ ہے۔“

پنڈا کی آواز لرز گئی، اس نے حیران لگا ہوں سے آشر کو دیکھا اور جنم کنڈلی کو آگے پڑھنے لگا۔ بہت سی باتیں تھیں لیکن سب سے اہم بات یہی تھی کہ جو رانی کندھاری نے سپنے میں دیکھی تھی پنڈا حیران رہ گیا تھا اور آشر کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

”عجب کی بات ہے بھائی جی مہاراج! اس میں تو وہی سب کچھ لکھا ہوا ہے۔“ اس کی آواز کی لرزش آشر نے بھی صاف محسوس کی تھی۔ اب جبکہ موت کی تصدیق ہو گئی تھی تو پنڈا کے اندر ایک پچھل سی گئی، اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑتا جا رہا تھا۔



”کیا کیا جائے یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔“

”یہ تو اچھا نہیں ہوا بھائی جی مہاراج۔“ پنڈا عجیب سے لہجے میں بولا۔

”اس سے تو بہتر تھا کہ ہم اس جنم کنڈلی کو کھول کر ہی نہیں دیکھتے۔“

”نہیں پنڈا اس کا دیکھنا اچھا ہی ہوا مجھے دکھ ہے کہ یہ بات میری زبانی تمہارے کانوں تک پہنچی۔ بھگوان نے سنسار میں اپنے بہت سے روپ چھوڑے ہیں۔ کبھی کبھی انسان پر برا وقت بھی آتا ہے اور اس کا ستارہ برج میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پنڈت اشلوک پڑھ کر اور پوجا کر کے بری گھڑی ٹال دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سارے پنڈتوں کو جمع کر لو اور بھگوان کی ترن شروع کرادو۔“

”ٹھیک ہے بھائی جی مہاراج.....“

آشر چلا گیا، لیکن پنڈا کا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ موت کا خوف اس کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے محل کے کونے کونے میں سانپ لہرا رہے ہوں۔ کالے زہریلے سانپ جن کی زبانیں اسے ڈسنے کیلئے باہر نکل آئی ہوں اور جن کی نغصی نغصی چمکدار آنکھیں لپٹائے ہوئے انداز میں اسے گھور رہی ہوں۔

کنڈلی کو واپس خزانے میں رکھ دیا گیا، لیکن پنڈا بری طرح پریشان تھا اور دوسری طرف رانی کندھاری کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں درودھن کے راجہ بننے کے خواب لہرا رہے تھے اور وہ اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ دیکھیں اب کس وقت راجہ پنڈا کے مرنے کی خبر آتی ہے۔ آشر سے اس نے ساری تفصیل معلوم کر لی تھی، پھر وہ بولی۔

”تو کیا آپ نے اس بارے میں راجہ پنڈا کو کوئی ہدایت دی۔“

”ہاں! مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ خبر عام ہو جائے.....“ آشر نے کہا اور بولا۔

”ہم لوگ بھگوان کی کیرتن کرائیں گے اور اس سے پرارتھنا کریں گے کہ پنڈا اس کشت سے نکل جائے۔“

کندھاری نے نفرت بھری نگاہوں سے اس اندھے کو دیکھا جس نے سارا جیون بھائی کے کلزوں پر گزار دیا تھا اور کبھی اپنا حق مانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اپنے بیٹے گدی پر بیٹھیں، اس نے سوچا کہ درودھن سے بھی اس بارے میں بات کر لی جائے اور اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے درودھن کو بلا بھیجا۔ درودھن اپنی ماما کے چرنوں کو چھو کر ایک جانب بیٹھ گیا۔

”میں نے تجھے اس وقت ایک ایسے کام سے بلایا ہے درودھن جسے سن کر میں نہیں جانتی کہ تیرے من میں کیا خیال ابھرنے، لیکن میری بات غور سے سن۔“

”ایسی کیا بات ہے ماما جی۔“

”کیا تو نے کبھی یہ سوچا درودھن کہ تو چتر برج کا سب سے بڑا پوتا ہے۔“

”وہ تو میں ہوں۔“

”راجہ پنڈا کے بیٹے بھی تو ہیں جن میں سب سے بڑا رجن ہے۔“

”ہاں ہیں..... اور رجن میرا بھائی ہے۔“

”پنگے سنار میں سارے رشتے اپنے لئے ہوتے ہیں۔ منٹ سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے اس کے بعد رشتے ناطوں کے بارے میں۔ راجہ پنڈا کو حکومت صرف اس لئے مل گئی کہ تیرا باپ اندھا تھا۔ ورنہ بڑے ہونے کے ناطے سے حکومت تیرے پتا کو ہی ملنی چاہئے تھی۔ پرانتو میں جانتی ہوں کہ راجہ پنڈا نے یہ بات کبھی نہیں سوچی ہوگی کہ حکومت..... حکومت کے اصل حقدار درلودھن کو ملے کیونکہ تو مہاراج چتر برج کا سب سے بڑا پوتا ہے مگر تیرے اندر ایک بہت بڑی خامی ہے درلودھن! وہ یہ کہ تو ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے جو کسی طور حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ درلودھن نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ آج اسے احساس ہوا کہ حکومت کا جائز حقدار واقعی وہ خود ہے اور جب یہ احساس اس کے من میں جاگا تو گرمی کی تیز لہریں اس کے تن بدن میں دوڑ گئیں۔

”آپ نے ٹھیک کہا ہے ماما جی حکومت ارجن کے بجائے مجھے ملنی چاہئے۔“

”تو غور سے سن اور میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ میں ہی نہیں بلکہ تیرے ماما جی یعنی راجہ کندھار بھی یہی کہتے ہیں کہ راجہ پنڈا تجھے حکومت کبھی نہیں دے گا، لیکن اگر پنڈا مر جائے تو بھی حکومت اس کے بیٹے کو نہیں ملے گی، جب تک کہ آشر زندہ ہے۔ حکومت آشر کو ہی ملے گی اور اس کے نام پر تو گدی سنبھالے گا۔ کیونکہ اب تو موجود ہے اور جوان ہو چکا ہے۔ کیا تو اس کیلئے تیار ہے۔ درلودھن!“

”تیار کیا ہوں ماما جی یہ کام تو ہونا چاہئے۔ بھگوان کی سونگند اس سے پہلے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا، مگر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چاچا جی ہمیں اس طرح نظر انداز کر دیں گے یہ تو انہیں خود کرنا چاہئے۔“

”اس سنار میں کوئی کسی کیلئے کچھ نہیں کرتا درلودھن! اپنا حق مانگو..... ناطے تو چھین لو..... وہ لوگ ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں جو آگے بڑھ کر اپنا حق نہ چھین لیں۔“ کندھار نے کہا اور درلودھن گردن ہلانے لگا، تب کندھار نے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی اور درلودھن کی آنکھیں خوشی سے چمکتی رہیں۔ آخر میں اس نے گردن ہلا کر کہا۔

”ٹھیک ہے ماما جی اب تم دیکھو گی کہ درلودھن ایسا کیا بھی نہیں ہے۔ میں خود کو حکومت کرنے کا اہل ثابت کر دوں گا۔“ درلودھن نے کہا اور ماں کے چرن چھو کر باہر نکل گیا۔

پنڈا کا سکون ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا تھا۔ موت کے بھیانک ہاتھ اسے اپنی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ایک ایک چیز سے چونکتا تھا۔ بس ہر سے یہی خطرہ رہتا تھا کہ ابھی کہیں سے کوئی سانپ نکلے گا اور اسے ڈس لے گا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ جس کا احساس مہامنتری کو ہو گیا اور انہوں نے اس سے یہ سوال کر ڈالا۔ پنڈا خود بھی ان سے یہ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی گئی۔

مہامنتری کو اس نے سارے حالات بتائے اور منتری بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

”آپ نے اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے مہاراج کہ جنم کنڈلی میں یہی بات لکھی ہے۔“

”ہاں! پر اس کو نانا لہو کا منتری اور اس کیلئے میرے من میں ایک ترکیب آئی ہے۔“

”کیا مہاراج.....؟“

”میں چاہتا ہوں منتری جی کہ ایک ایسا مینار بنایا جائے جو زمین سے بہت اونچا ہو۔ اس مینار پر ایک ایسی جگہ ہو جہاں میں رہ سکوں۔ راج پاٹ کے سارے کام میں وہیں بیٹھ کر کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ کام جتنی جلدی

ممکن ہے ہو جائے۔ مجھے اپنے چاروں طرف سانپ ہی سانپ نظر آتے ہیں۔“

”آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔ آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے اسے میں جلد پورا کر دوں گا۔“ مہامنتری نے کہا۔ راجہ پنڈا کا حکم تھا۔ دیر کس بات میں ہوتی۔ تھوڑے ہی دن کے اندر اندر راج محل سے کچھ فاصلے پر ایک ایسا مینار تعمیر ہو گیا جس کے اوپر ایک خوبصورت رہائشگاہ بنائی گئی تھی۔ مینار اتنا سپاٹ اور چمکتا تھا کہ اس کے اوپر اگر چوٹی بھی چڑھنا چاہتی تو پھسل کر گر جاتی۔ راجہ پنڈا نے اپنے لئے خاصا معقول بندوبست کر لیا تھا۔ پھر وہ مینار کی اوپری رہائشگاہ میں منتقل ہو گیا۔

رانی کندھاری کو بھی یہ ساری معلومات مل رہی تھیں۔ اس نے کنڈلی میں جو تبدیلیاں کرائی تھیں وہ بھی بہت بڑا کام تھا۔ لیکن یہ کام اس نے بڑی محنت سے کر ڈالا تھا۔ راجہ پنڈا کی جنم کنڈلی میں وہی کچھ لکھا تھا جو رانی کندھاری چاہتی تھی۔ دوسری طرف راجہ پنڈا اس عمل کو کر کے کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی حفاظت کیلئے جو اقدامات کئے تھے اس کے خیال میں وہ کافی تھے۔ مینار کے چاروں طرف سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا اور انہیں ہدایت تھی کہ اگر نغسا سا کیڑا اکوڑا بھی اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اسے کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ راجہ کیلئے جو غذا لائی جاتی اسے بھی اچھی طرح دیکھ لیا جاتا۔ اس طرح مینار محل کی حفاظت کے اقدامات نہایت اطمینان بخش تھے۔ مینار محل میں جو بھی آتا اسے ہدایت تھی کہ وہ اپنا لباس اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر راجہ صاحب کے پاس آنے کی کوشش کرے۔ عام طور سے کھانے پینے کی چیزیں ایک مخصوص ذریعے سے اوپر پہنچائی جاتی تھیں۔ ملنے جلنے والے پر بھی خاص طور پر پابندی تھی۔ یعنی صرف ایسے لوگ راجہ سے ملاقات کیلئے آ سکتے تھے جن پر راجہ کو مکمل بھروسہ ہوتا۔ یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ کہیں کوئی سازش نہ کی جائے۔ حالانکہ سازش کرنا والوں کا کوئی تصور راجہ پنڈا کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس کی حکومت کافی مستحکم تھی۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ پنڈا کا خیال تھا کہ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ حکومت صرف مینار تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ لنگا کے کنارے ہجاریوں کی ایک فوج بیٹھادی گئی تھی جو دن رات ملائیم چپ چپ کر راجہ پنڈا کی تقدیر کا یہ سیاہ داغ دھونے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ راجہ پنڈا کا خیال تھا کہ جب یہ جیوتی کہہ دیں گے کہ راجہ پنڈا کا ستارہ برج کی محوسٹ سے نکل آیا ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا اور معمول کے مطابق اپنے کام جاری کر دے گا۔

لیکن بعض اوقات سب کچھ ایک حقیقت بن جاتا ہے جسے عام حالات میں ایک وہم کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ راجہ پنڈا کی خوراک کیلئے جو کچھ آتا تھا اسے اچھی طرح دیکھ بھال کر لایا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت راجہ پنڈا نے خوبصورت سیبوں میں سے ایک خوشنما سیب اٹھایا تو اسے اس میں ایک سوراخ نظر آیا۔ نغسا سوراخ جس کے گرد کا حصہ خشک تھا۔ سیب کو دیکھ کر راجہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لوگوں نے اس کیلئے بھیجے جانے والے پھل پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ اگر توجہ دی جاتی تو یہ کانا سیب راجہ پنڈا کی خدمت میں کس طرح آتا۔ کس کی یہ بھال ہوئی۔ اس نے غصے سے یہ فیصلہ کیا کہ کل سیب لانے والے کو سزا دے گا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ تقدیر خود اس کا فیصلہ کرنے والی ہے۔ کانا سیب اٹھا کر اس نے ایک جانب رکھ دیا اور پھر ایک دوسرا سیب اٹھا کر اسے دانٹوں سے کترنے لگا۔ لیکن اتفاقاً طور پر ہی اس کی اٹھانے کا سیب کی جانب اٹھ گئی تھی۔ سیب کے سوراخ میں سے کوئی پتلی سی چیز آہستہ آہستہ باہر نکل رہی تھی۔ راجہ اس ہلتی ہوئی چیز کو دیکھ کر یہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہے۔ وہ پرتجسس انداز میں اس کے پاس آ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی آنکھیں ٹول و دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ کانے سیب میں سے ایک ننھا پتلا سا سانپ نکل رہا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے سیب کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا اور باہر نکلنے کے بعد دفعتاً ہی اس کا جسم بڑھنے لگا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سیاہ زہریلا مانپ بن گیا جس کے نچلے حصے پر سفیدی نظر آرہی تھی۔

راجہ کے پورے بدن کی قوتیں سلب ہو گئیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگے۔ باہر جا کر اپنے آدمیوں کو آواز دے لیکن یوں لگتا تھا جیسے راجہ کے تن بدن میں جان نہ رہی ہو۔ سانپ کی پراسرار نگاہیں راجہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی زبان اندر باہر نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ پھیل گیا تھا اور وہ خوفناک انداز میں راجہ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راجہ چند ساعت اسی طرح کھڑا رہا۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی، اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن سانپ اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے اچھل کر راجہ کی گردن پر دانت گاڑ دیے۔ راجہ نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن پکڑنا سانپ پھسل کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔

راجہ کی گردن سے خون بہنے لگا۔ راجہ خوف و دہشت سے چیخا چاہتا تھا لیکن یہ لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز گھٹ گئی ہو۔ کچھ لمحے اس کے ہاتھ تشنجی انداز میں پھیلے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے جسم میں نیلا ہٹ دوڑ گئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ سانپ اپنا کام ختم کر کے واپس اپنی جگہ آیا، پھر اس کا حجم اسی طرح گھٹنے لگا، پھر وہ سیب کے اندر داخل ہو گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راجہ کی موت اس طرح ہو جائے گی۔

چنانچہ حالات معمول کے مطابق رہے۔ دوسری صبح راجہ جھروکوں میں نہ آیا۔ نیچے کھڑے ہوئے پہریداروں کو تشویش ہوئی، پھر جب دیوان اس سے ملنے کیلئے آیا تو اس نے راجہ کے بارے میں پہرے داروں سے پوچھا پہرے داروں نے جواب دیا کہ آج صبح سے راجہ جھروکوں میں نہیں آیا۔ دیوان کو حیرت ہوئی اور پھر اس نے معلومات کرنے کی غرض سے وہ تیاریاں مکمل کر لیں جن کے ذریعے اوپر جایا جاسکتا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں پورے ہستنا پور میں کہرام مچ گیا۔ وہی ہوا جو راجہ کی جنم کنڈلی میں تھا۔ راجہ پنڈا کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر گیا تھا۔

کنڈلی کا لکھا بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ بات ختم ہو گئی۔ دوش کسے جاتا تھا لیکن اس کے بعد راجہ پنڈا کے پانچوں بیٹوں نے حکومت کا دعویٰ کر دیا۔ ان دعویٰ کرنے والوں کے نام ارجن، سہد یو، جد ہشتر، بھیک سین اور نکل تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اصول کے مطابق پنڈا کی اولاد کو حکومت ملنی چاہئے۔ دوسری طرف آشر کو کندھاری نے اکسانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں جانتی ہوں تم اپنے بھائی سے بہت پریم کرتے تھے۔ مگر اب وہ اس سنسار میں نہیں ہے حکومت سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے اور چتر برج کے خاندان کے سبھی لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت اب تمہاری ہے اور چونکہ حکومت کے کام تم نہیں سنبھال سکتے اس لئے چتر برج کے سب سے بڑے پوتے کی حیثیت سے در یودھن تمہارے نام سے حکومت کرے گا۔ آشر نے یہ بات مان لی اور راجہ بن گیا، لیکن اصل راجہ در یودھن ہی تھا جو بے حد چالاک، سنگدل اور مکار نوجوان تھا۔ اسے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ پانڈوں نے سلطنت کے دعویدار ہونے کا اعلان کیا ہے اور وہ آئندہ اس کی حکومت میں کوئی رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

چنانچہ اس نے اس بات پر سوچنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف آشر کو بھی ارجن، سہد یو، جد ہشتر، بھیم سین اور نکل کی کارروائیوں کا علم ہو گیا۔ ان پانچوں نے وہ رشتے نہیں نبھائے جو ان کے اور پنڈا کے درمیان تھے۔ پانچوں ہی باغیوں کی شکل میں نظر آنے لگے اور حکومت کو گرانے کے منصوبے بنانے لگے۔ جن کا علم اکثر آشر کو ہو جاتا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر ڈالیں گے۔ ادھر در یودھن بھی خاص طور سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ آشر اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر در یودھن پانڈوں کی تباہی پر اتر آیا تو پانڈوں کو جان بچانا بہت مشکل ہو جائے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکیں۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ پانڈوں کو شہر بدر کیا جائے۔ لیکن جب در یودھن کو اس بارے میں پتا چلا کہ آشر پانڈوں کو شہر سے باہر آباد کر رہا ہے تو اس نے معماروں کے سربراہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان میں بلدیو چند سردار تھا۔ در یودھن نے کہا کہ پانڈوں کیلئے شہر سے باہر گھر تعمیر کریں اور جب بلدیو چند اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

”بلدیو میرا پتا اندھا ہے اور اندھا ہونے کی وجہ سے مہاراج چتر برج نے انہیں حکومت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن جب اس کے پاس در یودھن کی آنکھیں کھنچ گئیں تو پنڈا کی حکومت بھی اس کے پاس آگئی۔ اگر آشر حکومت کے قاتل ہوتا تو پہلے ہی حکومت اسے قتل نہ ل جاتی جبکہ وہ حکومت کا حقدار بھی تھا۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اصل حکومت آشر کی نہیں بلکہ میری ہے۔“

”اوش مہاراج..... اوش..... یہ بات میں ہی کیا سب جانتے ہیں۔“ بلدیو چند نے کہا۔  
”تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ راجاؤں کے حکم زندگی کی امانت ہوتے ہیں اور اگر کوئی انسان یہ امانت کھو بیٹھے تو پھر اسے موت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔“

بلدیو چند نے گہری نگاہوں سے در یودھن کو دیکھا۔ چالاک آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ در یودھن کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور بولا۔

”ہاں مہاراج! میں جانتا ہوں۔“

”اور تم ہمارے خاص آدمی کہلاؤ! میں یہ چاہتا ہوں۔“

”جی مہاراج! آپ مجھے بتائیں کہ وہ خاص کام کیا ہے؟“

”سنو! یہاں سے یہ فیصلہ کر کے اٹھو کہ تم کو جو کچھ میں کہوں گا اسے انجام دے سکو گے یا نہیں۔“

”فیصلہ آپ کریں گے مہاراج! جب آپ نے بلدیو پر بھروسہ کیا ہے تو پھر اس فیصلے کی بات نہ کریں۔ بلدیو کا فیصلہ وہی ہوگا جو مہاراج کے ہونٹوں سے نکلے گا۔“

”بدھائی ہو بلدیو بدھائی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ پانڈوؤں کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے اور تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ارجن اور اس کے بھائی راجہ پنڈا کی حکومت پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ راجہ پنڈا کا بھائی ابھی جیتا ہے اور حکومت کیلئے اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ نہیں بھی ہوتا تو مہاراج چتر برج کا سب سے بڑا پوتا میں ہوں اور حکومت مجھے ملنی چاہئے۔ یہ حکومت پنڈا کی اپنی نہیں ہے کہ جو اس کے بیٹوں میں آسانی سے تقسیم ہو جاتی۔ یہ پنڈا کے باپ کی ہے اور پنڈا کو اسی لئے ملی تھی کہ اس کا حقدار آنکھوں سے اندھا تھا۔ اب یہ حق میرا جتا ہے۔ یہ ارجن حکومت کا حقدار کیوں بن رہا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں مہاراج!“

”اس کا مطلب ہے وہ باغی ہے۔ باغیوں کی سزا کیا ہوتی ہے بلدیو۔“

”موت سرکار موت۔“ بلدیو چند سفاک لہجے میں بولا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ یہ موت اس طرح واقع ہو کہ ہمارے پتائی کو بھی پتا نہ چل سکے۔ اسی لئے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا مہاراج..... بلدیو کیلئے کیا حکم ہے۔ بلدیو وہی کرے گا جو مہاراج چاہیں گے۔“

”سنو! مکان تعمیر کرنا تمہاری ذمہ داری ہے جہاں پانڈو جائیں گے تم اس میں جو مصالح استعمال کرو گے وہ رال اور راکھ کا ہونا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں چنگاری دکھانے سے ہی بھڑک اٹھتی ہیں، پھر یوں ہوگا کہ ایک رات پانڈوؤں کا یہ گھر جلتی ہوئی مشعل میں تبدیل ہو جائے گا اور پنڈا کی اولاد کو حکومت ملنے کا قصہ ختم ہو جائے گا اور یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ ہاں تمہارے ساتھ کام کرنے والے معمار اور کارگر تمہارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں گے؟“

”آپ اس کی چٹنا نہ کریں مہاراج! بس مجھے من میں رکھیں۔“



”ہاں یہ ہمارا کام ہے کہ ہم تمہیں من میں رکھیں۔“

”ٹھیک ہے مہاراج! آپ جو حکم دیں گے وہی ہوگا۔“

”چنانچہ اس طرح پانڈوؤں کو شہر سے نکالا گیا..... لیکن وہ خاموش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت آشر کی ہے اور درودھن ان کا دشمن ہے۔ وہ ہر طرح سے ان کی خلاف بھی کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی بھی سلسلے میں سرکشی نہیں کی اور خاموشی سے اس گھر میں چلے گئے جو ان کیلئے رال اور راگھ سے تعمیر کرایا گیا تھا۔ لیکن کچھ تجربہ کاروں نے مکان سے اٹھنے والی خوشبو اور اس کی تعمیر کیلئے استعمال ہونے والے مصالحوں کو غور سے دیکھا تو انہیں پتا چل گیا کہ مکان کی تعمیر میں رال اور راگھ استعمال کی گئی ہے جو کسی بھی وقت ہلکی سی چنگاری سے بھڑک سکتی ہے اور یوں پنڈا کی تمام اولاد رال اور راگھ کے بنے ہوئے اس مکان میں راگھ بن سکتی ہے۔

چنانچہ تمام پانڈے چوکنے ہو گئے۔ وہ شدید خوفزدہ ہو گئے تھے اور دن رات خوف سے جاگ کر گزارتے تھے۔ حالانکہ وہ جرات مند تھے لیکن آشر کی حکومت نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔

تب ایک رات ارجن نے اپنے چاروں بھائیوں بھیم سین، بدیشتر، سہد یو اور کل کو جمع کیا اور اپنی ماں رانی کنتی کو بھی بلایا۔

”میں ایک بار پھر تمہیں راجہ دہتر آشر اور درودھن کے اس خیال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں جو ہمارے باپ کے سگے بھائی ہیں۔ ہم پانڈوؤں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے باپ راجہ پنڈا نے ان لوگوں کے ساتھ کبھی برائی نہیں کی اس کے باوجود وہ لوگ ہمیں صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور ان کی پہلی خواہش ہے کہ حکومت کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے اور ہم لوگوں کو جو سلطنت کے دعویدار ہیں چل دیا جائے تاکہ سلطنت خطرے سے محفوظ رہ جائے۔ اس سلسلے میں ہم ان کی آنکھوں کا سب سے بڑا کاٹنا ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو چاہئے کہ اس سلسلے میں خاموشی اختیار کریں اور آنے والے وقت کا انتظار کریں تاکہ ایک مضبوط حیثیت سے ہم اپنے اس دعوے کا اظہار کریں جو ہمیں اس حکومت پر ہے۔“

رانی کنتی جو پنڈا کی بیوی اور پانچ بیٹوں کی ماں تھی سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کے سوریگاشی بھتی نے کبھی آشر کے خلاف ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جو اس کے یا اس کی اولاد کے خلاف ہوتا، لیکن درودھن نے باپ کی شہ پاکر وہ سب کچھ کر ڈالا تھا جو انہوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا، تب اس نے کہا۔

”میرے بیٹو! پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟“

ارجن آگے بڑھا اور بولا۔

”ماتا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس گھر کی تعمیر میں کیا استعمال کیا گیا ہے۔“

”کیا مطلب ارجن؟“ رانی کنتی حیران رہ گئی تھی۔

”ماتا جی یہ گھر رال اور راگھ سے بنایا گیا ہے۔ سو اب ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم خود اس گھر کو آگ لگا دیں اور خاموشی کے ساتھ یہاں سے کہیں دور نکل جائیں۔ مجھے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ یہ ہیں کہ بھیل نامی ایک عورت ہمارے گھر میں آگ لگانے کیلئے مخصوص کی گئی ہے۔ وہ اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ یہاں آئے گی اور اس گھر کو راگھ کا ڈھیر بنا کر چلی جائے گی۔ مگر ہم اس شہرت سے فائدہ اٹھائیں گے، بھیل اور اس کے بیٹوں کو جلا کر راگھ کر دیں گے تاکہ جب چلے ہوئے گھر سے ان کی لاشیں ملیں تو لوگ یہی سمجھیں کہ پانڈوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔“

رانی کنتی نے یہ بات پسند کی اور یہی ہوا۔ پانڈوں نے بھیل اور اس کے پانچ بیٹوں کو اس مکان میں زعمہ جلا دیا

پورا مکان آن کی آن میں شعلوں میں گھر گیا اور بھیل اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ آگ میں جل کر خاک ہو گئی۔ درودھن کے جاسوس نے اس عورت اور اس کے پانچ بیٹوں کے جلنے سے یہ سمجھا کہ پانڈے اپنی ماں سمیت جل کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ درودھن کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی اس کی دلی مراد برآئی تھی۔ اب روئے زمین پر ان کا کوئی دشمن نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے محفوظ سمجھنے لگا۔

دوسری طرف پانڈو اپنی وضع قطع بدل کر اور نام تبدیل کر کے جنگل سے شہر میں آگئے اور کنپلا میں آباد ہو گئے۔ یہ مقام ہندوستان کے ضلع فرخ آباد کی تحصیل قائم گنج میں واقع ہے اور آج کل اس کا نام کنپل ہے۔

کنپل پہنچ کر پانڈوں نے یہاں کے راجہ کی لڑکی دروپدی سے مشترکہ شادی کر لی، یعنی پانچوں بھائی دروپدی کے بھتی تھے۔ ان کے نزدیک یہ مشترکہ شادی باہمی اتحاد و محبت کا سبب تھی۔ دروپدی کے متعلق یہ طے کیا گیا کہ وہ ان بھائیوں کے ساتھ بہتر بہتر روز باری باری سے رہا کرے۔ چنانچہ پانڈو ایک نئی حیثیت سے کنپل میں مشہور ہونے لگے۔ ان کی شجاعت اور اقبال مندی کے قصے دور دور تک پھیل گئے۔ پانڈوؤں کی پیشانی سے اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے۔ اس لئے ان کی عظمت اور شان دن بدن بڑھتی رہی۔ ان کی شان کے قصے کنپل سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے اور جلد ہی یہ اطلاع کو روؤں تک بھی پہنچ گئی۔

درودھن کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب وہ دشمنوں سے محفوظ تھا اور راج پاٹ کے کاموں کو نہایت دلچسپی سے انجام دے رہا تھا۔ رانی کندھاری بھی بہت خوش تھی۔ اس کا باپ راجہ قدھار جو قدھار کا راجہ بھی تھا۔ درودھن کو حکومت مل جانے کی خوشی میں بیٹا راجہ کو اس کی توسیع کیلئے بیٹا راجہ کو اس کی توسیع کیلئے بیٹا راجہ کو اس کی توسیع کیلئے بیٹا راجہ کو اس کی توسیع کیلئے بیٹا راجہ کی پیشکش کر دی۔ رانی کندھاری ہر طرح سے اپنے باپ کے ساتھ تھی اور وہ سب کچھ کرنے کیلئے درودھن کو مجبور کرتی تھی جو اس کا باپ کہتا تھا۔ آشر کی حیثیت صرف ایک مہرے کی تھی جو ان ماں بیٹوں کے کہنے پر ایک خانے سے دوسری خانے تک چل رہا تھا۔

درودھن اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جس سے اسے قرب و جوار کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں پانڈوؤں سے تو اب اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔ ان سب کا سنسار میں اب کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے وہ بے فکر ہو گیا تھا۔

لیکن یہ بے فکری زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ آہستہ آہستہ ایسی خبریں ملنے لگیں جن سے درودھن متشکر ہونے لگا اسے علم ہوا تھا کہ کنپلا اور اس کے قرب و جوار میں پانچ ایسے بھائی ابھر رہے ہیں جن میں پانڈوؤں کی خصوصیات نمایاں ہیں، گوان کے نام بدلے ہوئے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ راجہ پنڈا کی اولاد میں سے ہوں جن کے نام ارجن، بھیک سین، جدہشتر، نکل اور سہد یو تھے۔

چنانچہ درودھن نے اس واقع کی تحقیقات کرنے کیلئے چند افراد کو مختص کر دیا اور اس کے آدمیوں نے اسے جو اطلاعات دیں وہ بڑی ہی تعجب خیز تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ پانڈوؤں کے جلنے کی اطلاع غلط تھی۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور کنپل میں مقیم ہیں۔ ان پانچوں بھائیوں نے کنپلا کے راجہ کی بیٹی دروپدی سے باہمی شادی کر لی ہے۔ درودھن کو یہ ساری تفصیلات سن کر بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے سوچا کہ پانڈوؤں نے اپنی جرات مندی سے حالات کا مقابلہ کر ہی لیا۔ وہ جلنے سے بھی بچ گئے اور انہوں نے ایک ایسی مضبوط حکومت بھی حاصل کر لی جو آگے چل کر ہستنا پور پر حملہ بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے دن رات کوئی نئی چال چلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ لیا اور اپنے چچا زاد بھائیوں سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی کوشش کی اور ان کی

طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہیں ہستنا پور آنے کی دعوت دی۔

پانڈوؤں نے کوروؤں کی یہ دعوت قبول کر لی اور ہستنا پور پہنچے۔

دریودھن نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاصی خاطر تواضع کی۔ دونوں خاندانوں میں حکومت کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہوا۔ طے یہ پایا کہ اندر پت جسے اب پرانی دہلی کہا جاتا ہے مع آدھی سلطنت کے پانڈوؤں کے قبضے میں رہے گی اور ہستنا پور کوروؤں کے زیر نگین رہے گی۔ حکومت کی اس تقسیم کے بعد سلطنت کے بہت سے امیروں نے پانڈوؤں کی اقبال مندی، جرأت مندی اور بلند ظرفی کو دیکھ کر ان کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پر دریودھن بظاہر تو خاموش رہا لیکن اس کے اندر خاصی تشویش پیدا ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں پانڈوؤں کی تباہی کے منصوبے بنانے لگا۔ راجہ آشر جو صرف نام کا حکمران تھا اور سچ مچ کا اندھا حکمران تھا۔ اس کی حیثیت تو ایک طرح سے ختم ہو کر رہ گئی تھی اور لوگ اب دریودھن کو ہی راجہ سمجھنے لگے تھے، لیکن دریودھن کے دل کی حالت بہت خراب تھی۔

پانڈوؤں کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اس پر اس کا دل ندامت کرتا تھا۔ لیکن حسد کی آگ اس کے وجود کو جلا کر خاستر کئے دے رہی تھی۔ امیروں اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کی اطاعت پر بظاہر وہ خاموش رہا، لیکن اس کے دل میں پانڈوؤں کی تباہی کے بہت سے منصوبے تھے۔

دوسری طرف ارجن، جد ہشتر اور اس کے سارے بھائیوں نے مل کر سلطنت کو وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنی فوجوں کو لے کر مختلف علاقوں کی سمت چل پڑے۔ چونکہ بھگوان بھی پانڈوؤں پر مہربان تھا۔ اس لئے پانڈوؤں نے جو سوچا وہی ہوا۔ چاروں باہمت بھائیوں نے بھگوان کی مدد سے ساری دنیا میں اپنا تقارہ بجا دیا اور ہر ملک کے فرمان رواؤں، امیروں اور راجاؤں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا لیا۔ یہ چاروں بھائی فتح و نصرت سے کامیاب و کامران ہوئے اور ان علاقوں سے جو انہوں نے فتح کئے تھے بیٹھار زر و جواہرات لے کر اپنے دار الحکومت اندر پت میں پہنچے۔ ان کے پہنچنے پر ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور ان کے اہتمام میں جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

دریودھن نے جب پانڈوؤں کی یہ شان، یہ عظمت اور رعب و جلال دیکھا اور ان کی سلطنت کی وسعت پر نظر کی تو اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کا خیال اس کے دل میں جیزی سے سراٹھانے لگا اور اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے وہ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔

دریودھن کے دربار میں بہت سے مکار، حیلہ باز قسم کے لوگ جمع تھے۔ وہ دن رات ان سے مشورے کرنے لگا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ کسی طرح پانڈوؤں کا اقتدار اور اقبال ختم کر دے اور اپنی سلطنت کو وسیع تر کرے۔ چالاک درباریوں نے بالآخر دریودھن کو ایک مشورہ دیا اور اس مشورے پر عمل کرنے کیلئے دریودھن دن رات غورو خوض کرنے لگا۔

اس زمانے میں جوا کھیلنے کا رواج عام تھا۔ چالاک درباریوں نے دریودھن کو جوئے میں کوروؤں کی قسمت کا پانسہ پلٹنے کا مشورہ دیا اور ایک خاص قسم کی چوس پر جوا کھیلنے کو کہا۔ اس مقصد کیلئے یہ طے پایا کہ جوا کھیلنے کیلئے ایک ایسا پانسہ بنایا جائے جو ہر بار دشمن کے خلاف پڑے۔

دریودھن کو یہ تجویز بے حد پسند آئی اور اس نے اس خاص قسم کے پانسہ سے جد ہشتر، ارجن اور ان کے باقی بھائیوں سے جوا کھیلنے کا ارادہ کیا۔

جب یہ سب کچھ طے ہو گیا تو اس نے بڑی لجاجت اور ملاعبت کے ساتھ جد ہشتر، ارجن اور ان کے باقی بھائیوں کو ہستنا پور آنے کی دعوت دی۔

جد ہشتر جواب اندر پت کا راجہ تھا۔ اپنے چچا زاد بھائی کی مکاریوں کو نہ سمجھتا تھا۔ اپنی بے خبری میں ہستنا پور پہنچا تو دریودھن نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور خوب اچھی طرح اس کی مدارت کی۔ اس نے ان پانچوں بھائیوں کے اعزاز میں بڑی بڑی دعوتیں کیں اور سارے امراء اور رؤساء سے بڑے بڑے فخر کے ساتھ ملایا۔ جیسے ان سے بڑا اس کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہے۔ اس نے بڑی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ پانچوں میرے بھائی ہیں اور اس نے اپنے پانچوں بھائیوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت تقسیم کر دی ہے۔

لوگوں نے اس بات کا بڑا چرچا کیا اور خود جد ہشتر اور اس کے بھائی بھی اپنی یہ شان و عظمت دیکھ کر پہلے سلوک کو بھول گئے، کیونکہ وہ سچے تھے۔

تفریح کے طور پر دریودھن نے جد ہشتر کو جوا کھیلنے کیلئے کہا۔ پانڈوؤں کو چونکہ دریودھن کی عیاری کا علم نہ تھا اس لئے وہ بغیر کسی حیل و حجت کے جوا کھیلنے کیلئے راہی ہو گیا۔ اس پر دریودھن نے اپنا وہی مخصوص پانسہ نکالا اور کھیلنا شروع کر دیا، تھوڑی ہی دیر میں پانڈو اپنا سب کچھ ہار بیٹھے اور اب بات ملک و مالک پر جا پہنچی، لیکن پانسہ جب بھی پڑتا دریودھن ہر چیز کا مالک بنتا چلا گیا، لیکن دریودھن نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔

جب پانچوں بھائی اپنی بیوی دروپدی کو بھی ہار گئے تو دریودھن نے ایک آخری بازی اس شرط پر لگانے کو کہا کہ اگر پانڈو جیت جائیں تو انہیں ان کا سب ہارا ہوا مال و ملک اور بیوی واپس کر دی جائے گی اور اگر ہار جائیں تو وہ آبادی چھوڑ کر جنگل میں چلے جائیں اور وہاں بارہ سال تک پرندوں اور چرندوں کے ساتھ زندگی گزاریں اور جب جلا وطنی کی یہ مدت ختم ہو جائے تو واپس وہ آبادی میں آئیں اور ایک سال تک گمنا کی زندگی بسر کریں، کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ کون ہیں اور اگر یہ راز کھل گیا تو انہیں پھر بارہ سال جلا وطنی بھگتنی ہوگی۔

بد قسمت پانڈو اپنی سچائی کی وجہ سے اور دریودھن کی چالاک مکاری اور چال بازی کی وجہ سے یہ آخری بازی بھی ہار گئے۔ شرط کے مطابق انہوں نے شہر کی سکونت ترک کر کے جنگل میں بسیرا کر لیا اور یوں بارہ سال کیلئے دریودھن نے پانڈوؤں سے اپنی حکومت کو محفوظ کر لیا۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ دریودھن راج کرتا رہا، یہاں تک کہ بارہ سال گزر گئے۔ بارہ سال پورے ہو چکے تھے۔ پانڈے دکن کے قریب ملک وائن میں آئے اور یہاں انتہائی گمنا کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے۔

دریودھن نے اپنے چچا زادوں کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی، لیکن اسے کہیں ان کا سراغ نہ ملا اور پھر پانڈے جب حسب شرط ایک سال تک گمنا کی حالت میں رہے اور جب جلا وطنی کی تمام شرائط پوری ہو گئیں تو پانڈوؤں نے اس وقت کے ایک بہت بڑے شخص کو اپنی بنا کر دریودھن کے دربار میں بھیجا اور ملک کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

دریودھن پانڈوؤں کی زندگی کے بارے میں سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پانڈے اس طرح واپس آجائیں گے اور پھر اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ اول تو وہ ان بارہ سالوں میں پانڈوؤں کو بھول ہی گیا تھا اور اپنے دور حکومت میں اس نے بیٹھار فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کا رواج دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اب یہ پانڈے نجانے کہاں سے آگئے تھے۔

چنانچہ دریودھن بھلا اس بات کو کیسے تسلیم کر لیتا۔ اس نے اس مطالبے کو رد کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانڈوؤں نے جنگ کا اعلان کر دیا۔

دریودھن کو اپنی فوجوں پر بڑا ناز تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو سامان جنگ سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔



سواروں، پینسٹہ ہزار چودہ سو گھوڑے سواروں اور ایک لاکھ نو ہزار چار سو پچاس پیادہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس خوفناک جنگ میں اس بھاری تعداد میں سے صرف بارہ آدمی زندہ بچے تھے۔ چار آدمی کوروؤں کے لشکر میں سے جن کے نام یہ تھے۔

ایک برہمن کرپا چاریہ جو فریقین کا استاد تھا اور مالک سیف و قلم تھا۔ درون نامی ایک عالم کا بیٹا اشوتھان جو کرپا چاریہ کی طرح فریقین کا استاد تھا۔ کرت برما نامی ایک شخص جو یادو خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور دریودھن کے باپ کا رتھ بان جس کا نام بنجی تھا۔

آٹھ آدمی پانڈوؤں کے لشکر میں سے بچے تھے۔ پانچوں پانڈو بھائی۔ سانک نامی یادو خاندان کا ایک فرد۔ دریودھن کا سوتلا بھائی یویو چھ اور آٹھویں شری کرشن جو اپنی شہرت کی وجہ سے بے نیاز بیان ہیں۔

شری کرشن اس زمانے میں سادھو کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگ انہیں اوتار مانتے تھے۔ ان کے بارے میں بیشمار روایتیں مشہور تھیں۔ ان کے بارے میں مختلف عقیدے مروج ہیں۔ بعض انہیں دنیا بھر کے تمام فریبیوں کا سردار اور حلیہ گروں کا گرد مانتے ہیں اور بعض ان کی پیغمبری کے قائل ہیں اور بعض انہیں بھگوان کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

مہابھارت میں مکاری اور غداری کا انجام سامنے آگیا تھا۔ دریودھن کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے لشکری اور خاندان کے لوگ بھی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

کوروؤں کے خاندان کی تباہی اور دریودھن کے قتل کے بعد پانڈوؤں کے خاندان کا جذہ مشر ممالک ہندوستان کا فرمانروا ہوا اور ساری دنیا میں اس کی سلطنت کا شہرہ ہوا۔ مہابھارت کے بعد پورے تیس سال تک جذہ مشر نے حکومت کی، لیکن وہ درویش منش تھا۔ اس نے خود ہی دنیا کی حقیقت اور ماہیت پر غور کر کے تحت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس نے چاروں بھائیوں کو ساتھ لے کر گوشہ نشینی میں بقیہ زندگی گزار دی اور اسی عالم میں دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔

اس کے بعد جذہ مشر کے چچا زاد بھائیوں نے حکومت کی، پھر پانڈوؤں کے خاندان میں ارجن کی اولاد میں سے تیسری نسل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا ہر طرح کی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ نہایت عادل اور انصاف پسند تھا اور اس کے دور میں کتاب مہابھارت لکھی گئی، جو ایک شخص بھشم نامی نے لکھی تھی۔

ہندو عقیدہ جو کچھ بھی کہتا ہو ہمارا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ دنیا میں حضرت آدمؑ سے پہلے کوئی خاکی نہیں پیدا ہوا اور طوفان نوح کے بعد حضرت نوحؑ کی اولاد یعنی سامؑ یا فث اور حام اس دنیا کی آزادی اور اختیار کا باعث بنے اور ظاہر ہے یہ ہندوستان بھی انہی کی اولادوں سے آباد ہوا۔ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ نے اپنے تینوں بیٹوں یعنی یا فث، سام اور حام کو از روئے کھیتی باڑی اور کاروبار کا حکم دے کر دنیا کے چاروں اطراف روانہ کیا۔

سام حضرت نوحؑ کے سب سے بڑے بیٹے اور چائین تھے۔ ان کے فرزندوں کی تعداد ننانوے تھی۔ عرب کے تمام قبیلے حضرت سامؑ کی اولاد سے ہیں اور ان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور لقب جو حضرت سامؑ کے بیٹے ہیں ان کا بیٹا عجم کا مورث اعلیٰ ہے اور لقب کے اس بیٹے کا نام کیمورث ہے۔ کیمورث کے چھ بیٹے ہیں۔ سیانک، عراق، فارس، شام، تور اور دمنان۔ کیمورث کے بیٹے جس جگہ گئے وہ جگہ ان کے نام سے موسوم ہوئی اور وہاں انہی کی اولاد آباد ہوئی۔ سیانک کے بڑے بیٹے کا نام ہوشنگ تھا اور عجم کے تمام بادشاہ ”یزدجرد“ تک اس کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے دوسرے بیٹے یا فث باپ کی ایما پر مشرق اور شمال گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کے ہاں بھی بہت سے بیٹے پیدا ہوئے، جن میں سب سے زیادہ مشہور بیٹا ترک نام کا ہے۔ ترکستان کی تمام قومیں یعنی مغل، ازبک

لیکن رانی کندھاری اس جنگ کا سن کر بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ راجہ کندھارمر چکا تھا اور اس وقت اس کا بھائی کندھار پر حکمرانی کر رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے دریودھن کا آلہ کار ہی تھا اور ہمیشہ اس کے آگے سر جھکائے رہتا تھا۔

رانی کندھاری اب خاصی بوڑھی ہو چکی تھی، لیکن بہر صورت اس نے بیٹے کے لیے ایک بار پھر سفر کیا۔ دھن راج مہاراج کی تلاش میں انہی غاروں تک گئی تھی۔

غار کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ دھن راج مہاراج اسی حجرے میں ہیں۔ حالانکہ تھوڑے عرصے پہلے دھن راج مہاراج اپنے حجرے سے باہر آئے تھے۔ رانی کندھاری ان کے باہر آنے کا سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

طویل عرصے کے بعد دھن راج مہاراج کی بات کانوں میں پڑی تھی۔ حالانکہ آخری بار اس نے انہیں ہڈیوں کے بچر کی شکل میں دیکھا تھا۔ لیکن سادھو سنتوں کی باتیں سادھو سنت ہی جانتیں۔ رانی کندھاری کو اندازہ تھا کہ دھن راج مہاراج بہت بڑے رشی اور مہی ہیں۔ اس لئے ان کی موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

چنانچہ اس بار بھی وہ دھن راج مہاراج سے نہ مل سکی اور واپس اپنے محل میں آ گئی۔

ایک طرف دریودھن اپنی فوجوں کی تیاریوں میں مصروف تھا اور مہابھارت کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سے رانی کندھاری سادھو سنتوں سے اور جادو ٹونوں سے اس جنگ کو روکنا چاہتی تھی، کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ دریودھن اس جنگ میں مارا جائے گا۔ حالانکہ اس کے باقی بیٹے بھی جنگ میں شریک ہونے کیلئے تیار تھے، لیکن اسے سب سے زیادہ دریودھن پیارا تھا اور وہ دریودھن کی زندگی کے بارے میں سخت غلغلہ کا شکار تھی۔

انہی حالات میں اس کی ملاقات ایک ایسے سادھو سے ہوئی جس نے اسے ایک خاص بات بتائی۔

سادھو نے رانی کندھاری کو بتایا کہ اگر رانی کندھاری ایک خاص جاپ کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو برہنہ دیکھ لے تو دریودھن کا بدن ان تمام آفات سے محفوظ ہو جائے گا جو اس پر نازل ہونے والی ہوں گی۔

رانی کندھاری اس پر تیار ہو گئی اور اس نے دریودھن کو ہدایت بھیج دی۔

لیکن ایک بہت بڑے شخص نے جو ان کیلئے اوتار کی حیثیت رکھتا تھا۔ دریودھن کو مشورہ دیا کہ وہ ماں کے سامنے برہنہ نہ جائے اور کم از کم ستر پوشی کیلئے پھولوں کا ایک ہار پہن لے۔ دریودھن نے اس شخص کے مشورے پر عمل کیا۔

رانی کندھاری نے جاپ مکمل کرنے کے بعد جب دریودھن کو دیکھا تو اس کے حلق سے ایک دلدرد چیخ نکل گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پھولوں کا یہ ہار جن حصوں کو اس کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہے وہی اس کی موت کا باعث بن سکتے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔

عظیم الشان معرکہ جنگ شروع ہونے والا تھا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وقت آگیا جب انہیں جنگ کرنا تھی۔

یہ عظیم الشان معرکہ جنگ ”کل جگ“ کے شروع کے دور میں برپا ہوا۔ دونوں لشکر اس بری طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے کہ الامان الحفیظ۔

اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی اور اس طرح سے ہوئی کہ دونوں طرف کے لشکریوں کو حریفوں اور حلیفوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔

اس جنگ میں کوروؤں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر گیارہ کشتوں پر اور پانڈوؤں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر سات کشتوں پر مشتمل تھا۔ کشتوں کی اصطلاح کے مطابق ایک کشتوں اکیس ہزار چھ سو بہتر فیل سواروں، اتنے ہی سانڈ

ترکمانی سب انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ یافت کے دوسرے مشہور بیٹے کا نام جمن ہے۔ ملک جمن کا نام اسی پر ہے۔ تیسرے بیٹے کا نام آرریسی ہے۔ اس کی اولاد دہلی ملکوں کی سرحد پر بحر ظلمات تک آباد ہوئی۔ اہل تاجیک بھی اسی نسل سے ہیں۔

حضرت نوح کا تیسرا بیٹا حام اپنے والد گرامی کے حکم سے دنیا کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور اس کو آباد اور خوشحال کیا۔ حام کے چھ بیٹے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ ہند، سندھ، جش، انرج، ہرمز اور بویہ ان سب بیٹوں کے نام پر ایک ایک شہر آباد ہوا۔ حام کے سب سے بڑے بیٹے ہند نے ہندوستان ملک اپنایا اور اسے خوب آباد اور سرسبز و شاداب کیا۔ حام کے دوسرے بیٹے سندھ نے ملک سندھ میں قیام کیا۔ ٹھٹھہ اور ملتان کو اپنے بیٹوں کے نام سے آباد کیا۔

ہند کے ہاں چار بیٹے ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ پورب، دکن، بنگ اور نہروال۔

جو ملک اور شہران ناموں سے مشہور ہیں وہ انہی کے آباد کئے ہوئے ہیں۔

ہند کے بیٹے دکن کے گھرتین بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام مرہٹ، کنبہ اور تلنگ ہیں۔ آج کل دکن میں جتنی قومیں آباد ہیں وہ سب انہی کی نسل میں سے ہیں۔

ہند کے چوتھے بیٹے نہروال کے ہاں بھی تین بیٹے ہوئے جن کے نام بھروج، کنہاج اور مالداہ ہیں۔ ان تینوں کے نام پر بھی مختلف شہر آباد ہوئے بہت سے شہروں میں ان کی اولادیں آج تک آباد ہیں۔

ہند کے تیسرے بیٹے کی اولاد نے ملک بنگال آباد کیا۔ اس کی اولادیں بھی آج تک بنگال میں آباد ہیں۔ ہندو عقیدے کے مطابق ست یک، تریا یک، دوا پر یک اور کل یک آتے جاتے رہتے ہیں اور کسی بھی یک میں جس شخص کا اختتام ہوا اسی یک میں اس شخص کی دوبارہ نمود ہوتی ہے اور ان یکوں کے درمیان اتنے طویل برسوں کا فاصلہ طے ہوتا ہے کہ انسان تصور نہیں کر سکتا۔

بہر حال یہ ہندو عقیدہ ہے اور چچا کلی کی کہانی بھی اس عقیدے سے تعلق رکھتی ہے۔ مہا بھارت ہو چکی۔ ہندوستان میں کوروؤں کا پانڈوؤں کا دور ختم ہو گیا، مہاراج کی حکومت آئی جنہوں نے حکومت کے سرداروں اور اپنے بھائی بندوں کی مدد سے اور مشورے سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور ملک کو آباد کرنے اور حکومت کو بہتر طریقے پر چلانے کیلئے سخت محنت کی۔ مہاراج نے زراعت کی طرف بھی بہت زیادہ توجہ دی اور بیٹھار نئے شہر آباد کئے۔

ان نئے شہروں میں بہار آباد کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ مہاراج نے دور دور سے اہل علم کو بلوا کر اس شہر کو آباد کیا۔ شہر میں بیٹھار مدرسے اور عبادت گاہیں بنوائیں اور نواحی محاصل کی آمدنی کو ان عبادت گاہوں کے مصارف کیلئے وقف کر دیا۔ مہاراج نے سات سو برس حکومت کی اور اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کی حالت بالکل بدل گئی۔ اس نے شاہان ایران کے ساتھ ہمیشہ خلوص و محبت کا برتاؤ کیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کا بھتیجا ناراض ہو کر فریدون کے پاس چلا گیا اور اس سے اپنے چچا کے خلاف مدد کی درخواست کی۔

فریدون نے ایک بہت بڑی فوج اس کی مدد کیلئے روانہ کی اور جب اس کی فوجا سربراہ ہندوستان آیا تو اس نے بہت سے آباد شہروں کو ویران کر دیا۔

مہاراج نے جب یہ عالم دیکھا تو اس نے اپنے ملک کا ایک حصہ دے کر اپنے بھتیجے کو راضی کر لیا اور چند عہدہ اور قیمتی اشیاء فریدون کو بطور تحفہ بھیجیں۔

مہاراج کے آخری زمانے میں سنگھد پپ اور کرناٹک کے زمینداروں نے آپس میں مل کر پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا۔ طرفین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ مہاراج کا بیٹا لڑائی میں مارا گیا۔ مہاراج کی باقی ماندہ فوج زخمی اور

پریشان ہو کر بھاگ نکلی اور اپنے مال و اسباب اور ہاتھیوں کو میدان میں ہی چھوڑ گئی۔

مہاراج نے جب یہ خبر سنی تو اسے سخت طیش آیا۔ وہ دم بریدہ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس پیچ و تاب اور غم و غصہ کا اصل سبب یہ تھا کہ سرکشی دکن کے معمولی زمینداروں کی تھی۔

مہاراج نے اس شکست کا انتقام لینے کا پکا ارادہ کر لیا، لیکن اس زمانے میں بادشاہ ایران کے حکم سے ایرانی سردار سام بن نرمیان ہندوستان فتح کرنے کیلئے پنجاب کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا اور مال چند سپہ سالار و بقیہ فوج لے کر اس کے مقابلے پر گیا ہوا تھا۔ چنانچہ مہاراج کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک کہ مال چند سردار سے صلح کر کے واپس نہ آ گیا۔ مال چند ایک سپہ سالار کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ملک مالوہ ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ جب وہ مہاراج کے پاس واپس پہنچا تو اسے دکن جانے کا حکم ملا اور اس نے بڑے استقلال اور شان و شوکت کے ساتھ ملک دکن کا فوراً رخ کیا۔ جب دشمنوں نے اس کی آمد کی خبر سنی تو ہراساں ہو کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔

مال چند نے فساد پھیلانے والے گروہ کو بری طرح تباہ کیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس نے جا بجا تھانے اور چوکیاں قائم کیں اور فوج کا حیران ہو کر واپس آیا۔ راستے میں اس نے گوالیار اور بیانے کے قلعے تعمیر کروائے اور راگ کا علم جو موسیقی کے نام سے مشہور ہے دکن اور تلنگا سے لاکر ہندوستان میں مروج کیا۔

مہاراج نے سات سو سال عمر پائی، ان کے چودہ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑا شیشوراج اپنے باپ کا جانشین تھا۔ یوں ادوار بدلتے رہے۔ حکومتیں آتی رہیں ختم ہوتی رہیں اور ہندوستان میں بت پرستی کا رواج شروع ہو گیا۔

مہاراج ہی کے زمانے میں ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے، لیکن اس کے بعد جب بت پرستی کا راج مروج ہوا تو یہی طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ بت پرستی کو اس درجہ مقبولیت اس سبب سے ہوئی کہ ایک برہمن نے راجہ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی سوتا چاندی یا پتھر کی تشبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ اس سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگا اور انہیں پوجنے لگا۔

اس زمانے کے راجہ خود راجہ سورج نے بھی دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کی اور اس کی رعیت نے اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور ہر کوئی اپنے اپنے طور پر بت پرستی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بت پرستوں کے نوے گروہ پیدا ہو گئے۔

راجہ سورج نے چونکہ قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا۔ اس لئے اس شہر کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ شہر کا پھیلاؤ پچیس کوس تک بڑھ گیا۔ راجہ سورج کی مدت حکومت دوسو پچاس برس ہے۔ اس مدت کے بعد اس نے انتقال کیا۔

راجہ سورج ایرانی شاہ کی قباد کا ہم عصر تھا اور ہر سال اسے خراج ادا کرتا تھا۔ راجہ سورج کے ہاں پینتیس بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑا لہراج تھا اور جو راجہ سورج کے مرنے کے بعد اس کا جانشین ہوا۔

وہ دور جو لہراج کو ملتا بت پرستی کا دور تھا۔ لہراج نے اقتدار سنبھالے ہی اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام لہراج رکھا گیا۔ ہندوستان کے اس بادشاہ کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے اس شغف میں گزارا۔ راجہ سورج نے اپنی زندگی میں میں شہر بنارس کی بنیاد رکھی تھی لیکن وہ اپنی زندگی میں اس شہر کو بسا نہیں سکا تھا۔ لہراج نے اس شہر کو بسانے کی پوری پوری کوشش کی۔ بہر حال لہراج اپنے بیٹا ناراض چھوڑ کر اپنی حکومت چھوڑ کر

کیدار برہمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ لہراج نے چھبیس سال حکومت کی۔ کیدار نے انیس سال حکومت کی اور اس کے بعد شنکل نے کیدار کو شکست دے کر خود کو ہندوستان کا فرمانروا بنا لیا۔ گورنامی شہر شنکل کا آباد کردہ ہے۔ شنکل نے ہندوستان پر چونسٹھ برس حکومت کی۔

شنکل کے بعد اس کا بیٹا برہٹ تخت نشین ہوا۔ برہٹ نے اکیاسی سال حکومت کی اور مر گیا۔ اس راجہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ تب کچھواہ قوم کے ایک شخص مہاراج نے قنوج پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان کا راجہ بن گیا۔

مہاراجہ کچھواہ نے چالیس سال تک حکومت کی اور وفات پا گیا اور حکومت کی باگ ڈور مہاراج کی وصیت کے مطابق اس کے بھانجے کیداراج کے ہاتھ آئی۔ کیداراج کی موت کے بعد یہ حکومت بے چارے کے ہاتھ آئی جو کیداراج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے کیداراج کے مرتے ہی قوت و اقتدار حاصل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور راجہ بن بیٹھا۔ یہ وہی یک تھا جس میں دیو دھن اپنے فلک فیصلے کا شکار ہوا تھا اور رانی کندھاری نے چپا کلی پرستم ڈھایا تھا۔

بے چارے کے دور حکومت میں بہت بڑا خطہ پڑا اور چونکہ وہ شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے عوام الناس کی کوئی پروا نہ کی اور خود داد و پیش دیتا رہا۔ رعایا کی جانیں ضائع ہوئیں اور اکثر گاؤں اور قصبے تباہ ہوئے۔ اس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے تک ہندوستان شدید مشکلات کا شکار رہا۔ امراء اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کو خاطر میں لانا چھوڑ دیا اور ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ابھرنے لگیں۔ یوں بے چارے چند ہزار مشکلات میں پڑ گیا۔ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن لوگ اس کے سخت خلاف تھے۔ اس کی رانی شردھا جو ایک چھوٹے سے راجہ یدراج کی بیٹی تھی۔ بڑی زیرک اور سمجھدار تھی۔

شردھا بے چارے کی پانچویں بیوی تھی۔ اس سے پہلے بے چارے چند چار شادیاں کر چکا تھا۔ ہندو دھرم کے خلاف اس نے بہت سی عورتوں کو یوں بھی رکھ چھوڑا تھا۔

رانی شردھا زندگی میں صرف تین بار بے چارے کی خلوت حاصل کر سکی تھی۔

بے چارے کی اتنی رانیاں تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب رانی شردھا اس کی بیوی بنی تو اس کے کچھ عرصے بعد اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ یوں رانی شردھا بے چارے کی منظور نظر بن گئی۔

بے چارے نے بیٹے کی پیدائش پر پورے ملک میں خوشیاں منائی تھیں، لیکن اس کی خوشیوں کا ساتھ دینے والے بہت کم لوگ تھے۔ صرف راجدھانی میں کچھ گھرانے ایسے تھے جو بے چارے کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ صرف بے چارے کی فوجوں کی وجہ سے اس جشن میں شریک تھے۔

بے چارے کا بیٹا گیارہ سال کا ہوا تو بے چارے کو ایک بہت بڑے خطرے کا سامنا درپیش ہو گیا۔

یہ خطرہ راجہ کیدو کا تھا۔ جس نے بے چارے کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔

بے چارے چونکہ اپنی پوری زندگی میں سکون نہیں پاسکا تھا۔ اس لئے وہ صحت کی طرف سے بھی فکر مند تھا۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے وزراء اور امراء اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ بہمن و داراب کے علاوہ راجہ کیدو کو بھی خراج ادا کرے، لیکن ایک ہندو راجہ کو خراج ادا کرنا بے چارے کے لئے بہت تنگ آمیز تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے امراء اور وزراء کی بات نہ مانی اور جنگ کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہو گیا۔

رانی شردھا کو یہ امید تھی کہ بے چارے نے اپنی زندگی میں اس کے ساتھ جو سلوک بھی کیا ہو یہ الگ بات ہے، لیکن کم از کم اس کی موت کے بعد حکومت اس کے بیٹے تک دیو کو ضرور مل جائے گی اور جب تک دیو کی حکومت ہوگی تو رانی شردھا

یقیناً ایک مطلق العنان رانی بن جائے گی۔

چنانچہ تنگ دیو کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی اور تنگ دیو کو فنون سپاہ گری میں طاق کرنے کیلئے اس نے بہت سے لوگ رکھے ہوئے تھے۔

رانی شردھا کو پنڈت گردھاری لال سے بہت عقیدت تھی جو دریا پار کے ایک مندر میں جیون بتاتے تھے۔ ان کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی لیکن لوگ ان کے گیان ان کے علم کے بڑے قائل تھے اور مہینے کے پہلے منگل کو دریا پار کر کے لوگ پنڈت گردھاری لال کے مندر ضرور جاتے تھے اور وہاں جا کر پوجا کرتے تھے۔

بے چارے چند خود بھی گردھاری لال کا بہت بڑا عقیدت مند تھا اور جب بھی اسے فرصت ملتی وہ ان سے مشورہ لینے کیلئے چلا جاتا تھا۔

ایک بار رانی شردھا بھی گردھاری لال کے مندر میں راجہ بے چارے کے ساتھ چلی گئی اور اسے پنڈت گردھاری لال سے بے حد عقیدت ہو گئی۔

گردیو نے اسے آشیر وادی تھی اور کہا تھا کہ جلد ہی تیرے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام تو تنگ دیو رکھنا اور رانی شردھا نے گردن ہلا دی۔

چنانچہ جب تنگ دیو پیدا ہوا اور رانی چھلے سے باہر آئی تو سب سے پہلے اس نے گردیو کے مندر کا رخ کیا تھا اور کشتی میں بیٹھ کر ان کے پاس پہنچی تھی۔

پنڈت گردھاری لال نے تنگ دیو کو دیکھا اور دیر تک کسی خیال میں گم رہے۔ انہوں نے اسے آشیر واد تک نہ دی تھی۔ جب رانی شردھا نے انہیں چونکا یا تو وہ ہڑبڑا کے چوٹے۔

”مہاراج کس سوچ میں ڈوب گئے؟“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں دیوی بس بچے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

”کیوں! کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”آں.....!“ مہاراج جیسے پھر چونک پڑے۔

”نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے، بس ایسے ہی نجانے اسے دیکھ کر میرے من میں ایک عجیب سا خیال ابھر آیا ہے۔“

”کیسا خیال آیا ہے؟“

”میں اس خیال کو کوئی لفظ نہیں دے سکتا دیوی! لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس گرہ کو توڑ سکوں۔“

رانی شردھا پنڈت گردھاری لال کی بڑی عقیدت مند تھی اس لئے وہ خود بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی اور جب مہینے کے پہلے منگل کو وہ دوبارہ ان کے پاس گئی تو اس نے پھر وہی سوال کر دیا۔

”میں جانتا چاہتی ہوں گردیو کی کہ آخر وہ کون سی گرہ تھی جو تنگ دیو کو دیکھ کر آپ کے من میں پیدا ہو گئی۔“

”تو دشاں کر شردھا کہ ہم خود بھی اس کے سلسلے میں پریشان ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اسے دیکھ کر ہمارے من میں کچھ مٹے مٹے سے خیالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن تو چننا مت کر اب کہ منگل کو جب تو آئے گی تو ہم اس کے بارے میں تجھے بہت کچھ بتائیں گے۔ ہم اس سلسلے میں جا پ کر رہے ہیں جو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی یادداشت واپس دلا دے گا۔“ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

رانی شردھا بھی بے چارے کی عدم توجہی کا شکار تھی۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد بے چارے کے رویے میں کچھ تبدیلیاں

ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں تھیں کہ رانی شردھا کی خوش فہمی کا شکار ہو جاتی یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ تاہم اسے یہ امید ضرور بندھ گئی تھی کہ تلک دیوے بے چند کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اگر دوسری رانیوں سے کوئی بیٹا پیدا ہو بھی گیا تو وہ کم از کم حکومت کا دعویدار نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے دل میں بہت سے خیالات تھے اور جس بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا وہ پنڈت گردھاری لال کی بات تھی۔ چنانچہ ایک ماہ تک اس نے کانٹوں کے بستر پر لیٹ کر وقت گزارا اور بالآخر پنڈت گردھاری لال کے پاس پہنچ گئی۔

پنڈت گردھاری لال کی عبادت گاہ پر بے پناہ ہجوم تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ یا ترا کرنے آئے ہوئے تھے اور پوجا پاٹ کا میدان بھرا ہوا تھا۔

رانی شردھا نے بھی عام لوگوں کی مانند پوجا پاٹ شروع کر دی۔ پنڈت گردھاری لال کی ہدایت تھی کہ مندر میں آنے کے بعد خود کو نہ کوئی راجہ سمجھے گا نہ رانی۔ یہاں آنے والے سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں اس لئے خود کو کوئی بھی جھگوان کے دوار آکر بڑائی نہ دے۔ چنانچہ یہ یہاں کا اصول تھا کہ اگر بے چند بھی یہاں آتا تو عام لوگوں کی طرح آتا اور پوجا پاٹ کر کے چلا جاتا تھا۔

ہاں جب تمام لوگ چلے جاتے تو پنڈت گردھاری لال اگر کوئی خاص بات ہوتی تو بے چند یا رانی شردھا کو کوئی خاص وقت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ پوجا پاٹ میں خاصی رات بیت گئی۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ یا تری آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے اور رانی شردھا ایک کونے میں بیٹھی ان سب کے چلے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ پرشاد تقسیم ہو چکی تھی۔ تھوڑی سی پرشاد انہیں بھی ملی جس میں ایک ننھا سا حصہ تلک دیو کا بھی تھا جو ابھی رانی کی گود میں ہی تھا۔ جب تمام یا تری چلے گئے تو پنڈت گردھاری لال نے شردھا کو بلا لیا۔

شردھا نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے اور پنڈت گردھاری لال نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر انہوں نے اسے بیٹھنے کیلئے کہا اور بولا۔

”میں جانتا ہوں شردھا تیرے من میں بھی وہی کشت ہوگا جو میرے من میں ہے۔ پرنتو تیرے من میں یہ کشت زیادہ ہوگا۔ کیونکہ تو ماں ہے۔ راجکار تلک دیو کی ماں۔ میں نے پچھلے سات دن جاپ کیا اور اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا رہا جو میرے ذہن میں موجود تھی۔ تو دشواش کر اس بات کا کہ اس کا تعلق تلک دیو سے نہیں ہے۔ البتہ تلک دیو کی حد تک ملوث ضرور ہو جاتا ہے پر میری زندگی کیلئے ایک بڑا عجیب ایک بڑا الوکھا انکشاف ہوا ہے۔“

”میں پوچھ سکتی ہوں مہاراج کہ وہ انکشاف کیا ہے؟“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں رانی شردھا میں نے جاپ کیا اور مجھے کچھ ایسی باتیں یاد آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے ایک گہپا یاد آئی جو پہاڑوں میں تھی۔ یہ گہپا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ میں نے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ جیون بتایا ہے۔ پرنتو کبھی کسی نے اس گہپا کا ذکر نہیں کیا، پھر وہ گہپا جو جاپ کے درمیان میرے من کی آنکھوں نے دیکھی عالم وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ رانی میں نے اس کی تلاش میں ایک لمبا سفر کیا اور بالآخر میں ان پہاڑوں تک پہنچ گیا جو مجھے جگتے میں نظر آئے تھے۔“

جاپ کے دوران میں نے ان پہاڑوں کو دیکھا۔ پہاڑ کے دامن میں دریا کے اس کنارے ایک عجیب سی جگہ ہے۔ مجھے اس جگہ سے تھوڑی سی دور ایک بستی کے آثار بھی ملے ہیں، بس ایسے آثار جنہیں کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں کوئی بستی آباد تھی۔

لیکن میری آنکھوں نے چونکہ جاپ کے دوران یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اس لئے میں نے ڈھونڈ کر وہ نشانات تلاش

کر ہی لئے پھر ان نشانوں سے کچھ دور مجھے وہ پہاڑی بھی نظر آگئی جو میں نے جاپ کے دوران اپنے من میں دیکھی تھی۔ اس پہاڑی کی گہپا کے سامنے ایک پتھر موجود ہے۔ یہ پتھر اگر کوئی گزرنے والا دیکھے تو اسے ایسی چٹان سمجھے جو عام چٹانوں کی طرح ہو، لیکن مجھے چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اس پتھر کے نیچے ایک گہپا موجود ہے۔ چنانچہ میں نے اس پر زور لگایا اور رانی شردھا تو دشواش کر وہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ پتھر کے ہٹ جانے کے بعد مجھے ایک لمبی سربنگ نظر آئی، جس میں سے گزر کر میں ایک ایسے سوراخ میں پہنچ گیا جس کے دوسری طرف سے روشنی اُدر آ رہی تھی۔ یہ روشنی سورج کی تھی جو ایک سوراخ سے غار میں پڑ رہی تھی۔

میں غار میں داخل ہوا تو مجھے وہاں صرف چند چیزیں ملیں۔ ایک مرگ چھالہ جو اتنی خستہ اور خراب ہو چکی تھی کہ جسے چھو تو ٹوٹ کر بکھر جائے۔ پانی کا ایک کلسا جو جوں کا توں موجود ہے۔ البتہ اس پر زمانے کی گرد جم چکی ہے۔ ہاں گہپا میں پانی کا ایک کنڈل بھی موجود تھا اور دو کھڑاویں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ کھڑاویں اپنے پاؤں میں پہن کر دیکھیں تو وہ مجھے بالکل ٹھیک تھیں۔ گوان کی لکڑی اب اتنی بوسیدہ ہو چکی تھی کہ جو نبی میرے پاؤں کا وزن ان پر پڑا وہ ٹوٹ گئیں، لیکن وہ میرے پاؤں میں بالکل ٹھیک تھیں۔ کنڈل بھی میرے اٹھانے سے بالکل ٹوٹ گیا۔ صرف پانی کا کلسا رہ گیا جسے میں اٹھا کر اپنے ساتھ لے آیا ہوں، گو یہ چیزیں میری نہیں تھیں۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرا ہو۔ ان چار چیزوں کے علاوہ گہپا میں کچھ نہیں تھا۔ آرائی شردھا میں تھے اس کلسا کا درشن کراؤں۔“

رانی شردھا اٹھ گئی۔ حالانکہ ان تمام باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن پنڈت گردھاری لال کی عقیدت کی وجہ سے اس نے اس کلسے کے درشن کر لئے۔

کلسے کو دیکھ کر مجھے ان کیوں رانی شردھا کے ذہن میں ایک لہری دوڑ گئی۔ ایک عجیب سا احساس اس نے پہلے بھی کبھی اس کلسے کو دیکھا ہو، لیکن پھر یہ احساس ایک لمحے میں مفقود ہو گیا۔ پنڈت گردھاری لال البتہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے جیون سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ بہر صورت میں ان گہپاؤں سے واپس آ گیا اور اس کے بعد میں اپنے گیان کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر اس گہپا کا کیا راز ہے۔“

تب رانی شردھا میرے ذہن میں تلک دیو ابھرا اور تلک دیو کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ اسے دیکھ کر میرے من میں جو گرہ پڑ گئی تھی اس کی گھٹیاں الجھتی جھکتی رہیں۔ بالآخر پھر تلک دیو تک پہنچ گئیں۔ اب میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تلک دیو کا آخر ان ساری باتوں سے کیا تعلق ہے۔“

”مہاراج کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”نہیں رانی ایسی کوئی بات نہیں ہے، میرا گیان کہتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کسی بھی طرح تلک دیو سے ہو، لیکن اس میں تلک دیو کے جیون کیلئے کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے خطرناک کہا جاسکے۔“

”بس میں من کی یہی شنائی چاہتی تھی۔“ رانی شردھا نے کہا۔

”تو اپنے من کو شانت رکھ شردھا تیرے لئے چٹا کی کوئی بات نہیں ہے، میں موجود ہوں اور پھر میں اس مسئلے کو یوں ہی نہ چھوڑ دوں گا۔ ابھی میں ایک بڑا جاپ کروں گا۔ یہ جاپ اتالیس دن کا ہوگا، لیکن یہ میں اس سے شروع کروں گا جب اس کا صحیح وقت ہوگا۔ چنانچہ اس جاپ کے بعد یہ ممکن ہے کہ مجھے بہت کچھ معلوم ہو جائے۔“

رانی شردھا نے گردن ہلا دی اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مہاراج رات بہت بیت گئی ہے۔ ہمیں ابھی دریا پار کرنا ہے۔ یوں بھی یہ موسم ایسا ہے کہ دریا کے پانی کا بہاؤ کافی تیز ہے۔ چنانچہ اب میں آگیا چاہتی ہوں۔“

”بھگوان تجھے سکھی رکھیں شردھا۔“ پنڈت گردھاری لال نے کہا اور رانی شردھا مندر سے نکل آئی۔ شاہی کشتی کے کشتی بان دریا کے کنارے بیٹھے رانی شردھا کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

شردھا اپنے بچے کو کاندھے سے لگائے باندیوں کے ساتھ کشتی کے نزدیک پہنچ گئی۔ باندیاں اپنی کشتیوں میں بیٹھ گئیں۔

دریا میں کافی شور مچ رہا تھا۔ پانی کی روانی کچھ اور بڑھ گئی اور ملاحوں کے چہرے متشکر تھے۔

”کیا بات ہے تم لوگ کچھ پریشان سے ہو۔“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے رانی جی! اس عری کا بہاؤ کچھ تیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہو اور بارش کا پانی اکٹھا ہو کر ندی میں اضافے کا باعث بن گیا ہو۔“ کشتی بانوں نے جواب دیا۔

”کیا اس بارش میں کشتی کا کھینا خطرناک تو نہیں ہو سکتا۔“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”نہیں رانی جی! ابھی باڑا اتنی تیز نہیں ہوئی ہے۔ ہم اطمینان سے پہنچ جائیں گے۔“ کشتی بانوں نے جواب دیا۔ وہ تجربہ کار ملاح تھے اور کشتی کی باڑا ان کیلئے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے کشتی دھکیل کر پانی میں ڈال دی۔ رانی شردھا کشتی میں سوار ہو گئی تھی۔

لیکن ابھی کشتی تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ پیچھے سے پانی کا ایک خوفناک ریلہ آیا اور کشتی اس پر ڈول گئی۔ رانی نے پوری قوت سے بچے کو سینے سے بٹھک لیا تھا۔ پھر وہ متوشل لہجے میں ملاحوں سے بولی۔

”یہ کیا بات ہے! کیا کشتی خطرے میں ہے؟“

ملاحوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے کسی قدر متشکر لہجے میں کہا۔

”نہیں رانی جی! ابھی کوئی بڑا خطرہ تو نہیں ہے! لیکن آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پانی کی ایک بڑی باڑہ اس پانی میں اور شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے کشتی کافی پریشانی میں پھنس چکی ہے۔“ ملاح نے جواب دیا۔

”میں تم لوگوں سے پہلے ہی پوچھ رہی تھی کہ اگر خطرہ ہو تو اس سے کشتی کو پانی میں نہ ڈالو مگر تم لوگوں نے اپنی حد سے زیادہ تجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے کشت میں ڈال دیا ہے۔“

”ہم شہا چاہتے ہیں رانی جی! لیکن آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے! پانی اچانک ہی آیا ہے۔“ ملاح نے جواب دیا۔

رانی شردھا خاموش ہو گئی، لیکن اس کی نگاہیں خوفزدہ اعزاز میں پانی کو دیکھ رہی تھیں جس میں بڑے بڑے بلبلے اٹھ رہے تھے اور پانی پوری قوت سے بہتا ہوا آ رہا تھا۔ کشتی کی رفتار ملاحوں کے بس سے باہر ہوتی جا رہی تھی اور وہ تیز رفتار سے بہنے لگی تھی۔ ملاحوں کے چہروں پر کچھ اور خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

”رانی جی! ایک اور پریشانی آگئی ہے۔ اگر آپ ہمیں جان کی معافی دیں تو بتائیں۔“

”بتاؤ۔۔۔۔۔ بتاؤ۔“ رانی شردھا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

”باڑا اب اتنی تیز ہو گئی ہے کہ کشتی کو اب کنارے کی طرف کاٹنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا۔ کیا کشتی کنارے تک نہیں پہنچ سکے گی؟“ رانی شردھا نے کہا۔

”نہیں دیوی جی کشتی کنارے تک پہنچ جائے گی لیکن ہم اسے کاٹیں گے نہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”بادبانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چوہا اس تیز بہاؤ میں ہمارے بازوؤں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ہمیں ایک ہی ترکیب کرنی ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“ رانی شردھا نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا۔

”ہم کشتی کو بائیں سمت آہستہ آہستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اپنی رفتار سے جس تیزی سے آگے بڑھے گی ہم اس وقت اسے پوری قوت سے کناروں کی طرف کاٹیں گے۔ یوں آہستہ آہستہ اس کا رخ بدلتا جائے گا اور کشتی کے ٹوٹنے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔“ ملاح نے جواب دیا۔

”ہائے رام! تو کیا کشتی ٹوٹنے کا بھی خطرہ ہے؟“ رانی شردھا نے پوچھا۔

”دیوی جی بھگوان پر بھروسہ کریں۔ بھگوان جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔“ ملاحوں نے جواب دیا۔ انکے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ وہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے چند کو تو اپنی موت کا خیال بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ رہے تھے کہ اگر رانی شردھا کسی حادثے کا شکار ہو گئی تو ان کے خاندانوں تک کی خیر نہیں ہے۔ وہ اپنے جسم کی پوری قوت سے کشتی کو کنارے کی جانب کاٹ رہے تھے لیکن بد قسمتی ان کی کہ ان کی کوئی کوشش کارگر ہی نہ ہونے دے رہی تھی۔

کشتی کی رفتار طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پانی پر کسی تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔ بادبانوں سے خاص طور سے خطرہ تھا۔ اگر بادبان میں ہوا بھر گئی اور کشتی ایک طرف ہو گئی تو پانی کی تیز دھار اسے الٹ دے گی۔ چنانچہ ملاحوں نے پہلی کوشش یہی کی کہ بادبان اتار دیئے جائیں۔ اس تیز رفتار سفر میں بادبانوں کا اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے لمبے لمبے چاقوؤں سے بادبانوں کے رے کاٹ دیئے اور بادبان ہوا میں اڑتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کشتی کی برق رفتاری اسے آن کی آن میں میلوں دور تک لے گئی اور کشتی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اصل جگہ سے کتنی دور نکل آئی ہے۔ ملاحوں کی ہر تدبیر ناکام ہو رہی تھی اور جب امید کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تو ملاح ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

”رانی جی!۔۔۔۔۔ رانی جی! بھگوان کی سوگند اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے۔ ہمیں شہا کر دیں۔ ہم نے اپنے نمک کا حق ادا کرنے میں کئی کسر نہیں چھوڑی۔“

رانی شردھا ان کے چہروں کی سراسیمگی سے ان کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے خوبصورت بچے کی جانب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

”ہائے رام! کیا تنک دیو اتنی ہی عمر کیلئے اس سنار میں آیا تھا۔“ پھر اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”ہائے بھگوان! اگر حیرت دیا ہو جائے تو میں اپنا جیون اپنے بچے کو دینے کیلئے تیار ہوں۔ تو میرا جیون چھین لے اور میرے تنک دیو کو میرا جیون دے دے۔“ رانی شردھا نے درد بھری آواز میں کہا اور باندیوں کی چیمیں نکل گئی تھیں۔ وہ سب اپنی زندگی سے ہی خوفزدہ تھیں۔ لیکن رانی شردھا کی درد بھری بات سن کر وہ اپنا دکھ بھول گئیں۔ ان سب کے آنسو رواں ہو گئے۔

ملاح جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ کشتی اب کوئی دم کی مہمان تھی اور کبھی کبھی وہ پوری کی پوری محسوس ہوتی تھی۔ جس وقت وہ گھومتی تو باندیاں ایک دوسرے پر گر پڑتیں۔ لیکن اب باندیوں نے رانی شردھا کے گرد اپنا حلقہ بنا لیا تھا تا کہ رانی شردھا ادھر سے ادھر نہ گرنے پائیں۔

پانی کی ایک تیز لہر نے کشتی کو بہت اونچا اٹھالیا۔ ملاحوں کو یقین ہو گیا کہ اس کے بعد کشتی نیچے آئے گی تو فوری طور پر باتوچ میں سے ٹوٹ جائے گی یا پھر ڈوب جائے گی۔ وہ اپنی موت کا انتظار کرنے لگے، لیکن نجانے کیا ہوا، نجانے کیا ہوا کشتی کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز پر چڑھ گئی ہو۔ لہروں کے جو ہلکورے کشتی کے نیچے محسوس ہوتے رہے تھے ایک لحظہ قہم گئے تھے اور وہ لوگ جواب کسی بھی لمحہ موت کے منتظر تھے اس اچانک سکوت اور خاموشی پر اس انداز میں ساکت رہ گئے تھے جیسے متوقع ہوں کہ اب زندگی کا وہ آخری لمحہ آن پہنچا ہے جو انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گا اور وہ زندہ نہ بچ سکیں گے۔ یہ خاموشی، یہ خاموشی اور سکوت موت کی آمد کے استقبال کا سکوت ہے۔

لیکن موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کب آئے گی، کوئی اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، جب وہ زندگی کی طرف دوڑ رہے تھے تو موت ان کا خوفناک تعاقب کر رہی تھی اور جب وہ موت سے ٹکست کھا کر اس کے پہلو میں جانے کیلئے تیار ہو گئے تو اچانک زندگی نے موت کے سامنے فولادی دیوار بنادی۔

ملاحوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کشتی خشکی پر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ کیسی خشکی تھی اور کون سا ساحل تھا۔ اس کے بارے میں اس تاریک اور طوفانی رات میں ملاح کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔

لیکن یہ یقین کرنے میں انہیں کافی دقت پیش آئی کہ کشتی خشکی پر ہے، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ساحل کو دیکھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے یہ کون سی جگہ ہے۔

بہر صورت جگہ کوئی سی بھی ہو لیکن چند ساعت کے بعد وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس وقت جب انہیں یہ یقین ہو گیا یہ درحقیقت کوئی واہمہ نہیں ہے بلکہ وہ ساحل سے آگے ہیں اور تیز رفتار دریا اس ساحل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

رانی شردھا بھی آنکھیں بند کئے اپنے بچے کو سینے سے بچنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ وہ اپنے نونہال کی بہاریں نہ دیکھ سکی اور اس حادثے کا شکار ہو گئی۔

لیکن اسے بھی جب کچھ سکوت محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور ملاح کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟ یہ اچانک کشتی کا بہنا کیسے بند ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔

”بدھائی ہو مہارانی بدھائی ہو۔ بھگوان نے ہمارا جیون بچا لیا ہے۔“ ملاح نے خوشی سے کہا اور رانی شردھا بھی بچوں کی مانند خوش ہو گئی۔

”سچ۔“ اس نے قہر بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں رانی جی۔ بھگوان نے ہماری لاج رکھ لی۔ ورنہ ہم تو موت کے بعد بھی اس بات پر شرمندہ رہتے کہ رانی جی کو ہمارے ہاتھوں تکلیف پہنچی۔“

”اب فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ جلدی سے کشتی سے اترو میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔“ شردھا نے کہا اور اس کے نزدیک بیٹھی باندیاں چونک پڑیں۔

سب کے سب موت کے خوف کا شکار تھے اور چند ساعت کیلئے وہ سب حفظ مراتب بھول گئے تھے۔ باندیاں یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ رانی کے ساتھ سفر کر رہی ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ موت بڑی خوفناک چیز ہے اور زندگی بھر آدمی اقتدار کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے لیکن جب موت نزدیک آجائے تو سارے اقدار سارے حفظ مراتب، سمندر میں بہہ جاتے ہیں۔ باندیوں کا بھی اس وقت تک یہی حال تھا۔ لیکن اب جبکہ انہیں زندگی کی امید ہو گئی تو انہیں یہ بھی خیال آیا کہ رانی شردھا کی خدمت ہی ان کا جیون ہے اور اگر انہوں نے رانی شردھا کیلئے کچھ نہ کیا تو پھر جیون میں بھی ان کیلئے

کانٹے ہی کانٹے ہوں گے۔

چند باندیوں نے جلدی جلدی خشکی پر کود کر رانی کو سنبھالا۔ رانی نے اپنے بچے کو سینے سے جدا نہ کیا تھا۔ ایک باندی نے اسے لینے کی کوشش کی تو رانی نے اسے منع کر دیا۔

”نہیں۔ میں اسے کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔ بھگوان نے اسے دوبارہ میرے پاس بھیجا ہے۔ تم مجھے ایسے ہی سہارا دے کر اتارو۔“ اور باندیوں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتار دیا۔ ملاحوں نے کشتی کو کچھ اور اوپر بچھ لیا تھا۔

یہ تو بعد میں دیکھنے کی بات تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ کون سا ساحل ہے۔ فی الوقت تو انہیں زندگی بچ جانے کی بے حد خوشی تھی۔

کشتی کو محفوظ جگہ لانے کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ رانی باندیوں کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔ وہ اب تک اپنے بچے کو سینے سے بچھنے ہوئے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ باندیوں نے اس کے گرد حلقہ قائم کر لیا تھا۔

ملاح ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کون سی جگہ ہے۔ کشتی تو دریا کے بیچوں بیچ بہہ رہی تھی، پھر یہ ساحل اچانک کہاں سے آگیا اور ساحل بھی ایسا کہ اتنا ڈھلان تھا کہ کشتی اس پر باسانی چڑھ گئی۔ ورنہ دریا کے ساحل تو ناہوار تھے۔

وہ رات کی تاریکی میں آگے بڑھے تو ان کے قدموں کے نیچے حسین سبزہ ڈار آ گئے۔ گھاس کا یہ میدان دور تک چلا گیا تھا۔ گو تھوڑی سی چڑھائی تھی لیکن اتنی نہیں کہ وہ کسی تکلیف کا شکار ہو جاتے۔

پھر انہوں نے درختوں کی قطاریں دیکھیں، درخت سرسبز و شاداب تھے۔ یہ حسین جگہ ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے بھی اس حسین جگہ کو نہیں دیکھا تھا۔

گودرختوں کے سوکھے ہوئے پتے اور اس جگہ کی حالت سے یوں لگتا تھا کہ یہاں انسانی وجود نہیں ہے جو اس جگہ کو صاف ستھرا کرتا، لیکن بہر صورت یہ انوکھی جگہ ان کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔

کافی دور تک جانے کے بعد بھی جب انہیں کوئی اندازہ نہ ہوا تو وہ واپس پلٹ کر رانی کے پاس چل پڑے اور رانی شردھا کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا۔

”رانی جی کیا آپ اس جگہ کو پہچانتی ہیں؟“

”نہیں، کیوں کیا بات ہے؟“

”ہماری تو سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔“ ملاحوں نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ رانی شردھا کے ہونٹ سٹک گئے، پھر وہ بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ اگر رات یہاں بیت جائے تو ہم یہاں بتا لیں گے۔ صبح کو پتہ چل جائے گا کہ یہ کون سی جگہ ہے، تم لوگ چننا مت کرو۔“ رانی شردھا نے کہا۔

”جو آگیا مہارانی جی امیر اب ہمارے لئے کیا حکم ہے۔“

”تم خود سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے؟ یوں کرو۔ اگر یہاں خشک فہنیاں ملیں تو انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ جلا دو۔ ممکن ہے یہاں خطرناک جانور بھی ہوں، ساری رات ہمیں جاگنا ہوگا، ہم اس سے تک سو نہیں سکتے جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا مہاراجی جی۔“ ملاحوں نے کہا اور پھر وہ رانی کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے۔

ساری رات رانی نے وہیں بیٹھ کر گزاری تھی۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کر دیئے گئے اور ملاح ساری رات الاؤ میں خشک



لکڑیاں ڈالتے رہے تھے اور مختلف چیزیں ہاتھوں میں لے کر پہرہ دیتے رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی جنگلی جانور نکل آیا تو اس سے حفاظت کی جاسکے۔

لیکن یہاں کسی جانور کا وجود نہیں تھا۔ ساری رات گزر گئی اور صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ پچھلی رات کا وہ خوفناک سفر اور پھر وہ حادثہ جس سے نجانے کس طرح زندگی بچ گئی تھی۔ رانی کے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی، لیکن اس کے سینے سے گوشت کا جولوٹھرا چٹا ہوا تھا وہ اس میں زندگی کی حرارت دوڑا رہا تھا اور اولاد جب ماں کی آغوش میں ہو تو ماں کی آغوش بھی تھکن محسوس نہیں کرتی۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ بچہ خطرے میں ہو۔

صبح کی روشنی ہوئی تو ملوح دوڑ کر دریا سے پانی لے آئے اور اس پانی سے رانی نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال وال سنوار کر جب وہ تیار ہوئی تو باندیاں اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”اب تو راجکمار کو ہمیں دے دیجئے مہارانی! آپ تھک گئی ہوں گی اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

اور رانی شردھانے تلک دیو کو اپنی خاص خادمہ کی آغوش میں دے دیا، پھر یولی۔

”اس کا خیال رکھنا۔“

”آپ چنتا نہ کریں رانی جی! باندی نے جواب دیا اور رانی ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”پتا نہیں کون سی جگہ ہے اس سے پہلے تو ہم نے کبھی یہ جگہ نہیں دیکھی یوں لگتا ہے جیسے ہم کافی دور نکل آئے۔“ رانی

شردھانے کہا۔

”ہاں رانی جی۔“ ایک باندی نے جواب دیا۔

”لیکن یہ فاصلہ اتنا ہے کہ کبھی ہم نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔“ دوسری باندی نے کہا۔

”ہاں ہم کافی دور آچکے ہیں اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ دور ہونے کی وجہ سے ہم اس راستے پر کبھی نہیں آئے۔“

رانی شردھانے جواب دیا، پھر یولی۔

”لیکن اب کیا ہوگا۔“

”کچھ نہیں ہوگا رانی جی! اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ رات کی بات دوسری تھی! آپ فکر نہ کریں ہم کسی نہ کسی

طرح راستہ تلاش کر لیں گے اور اس کے بعد اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“ ملاحوں نے رانی کو یقین دلایا اور رانی سر ہلانے لگی۔



ستارے بے نور ہو گئے۔ دور پہاڑوں کی اوٹ سے اجالا چمکنے لگا، پھر کہیں سے ٹن ٹن کی آواز ابھری اور مجھے یوں لگا جیسے اچانک زمین آسمان الٹ گئے ہوں۔ تاحہ نظر پھیلے ہوئے پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا۔ جی گھٹنے کی آواز بند ہو گئی اور دور سے کوئی ہمیں اپنی طرف آتا نظر آیا۔

”بھگوان ناش کرے اس ستیاناسی کا: کوروتی مدھم آواز میں بڑبڑائی۔ میں اس کی آواز سن کر چونکا، میں نے کہا۔

”کیا ہوا کوروتی۔“

”پانی کبڑا! وہ منخوس ادھر ہی آرہا ہے۔ کوروتی نے دانت کھوس کر کہا۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا، گوتم بھنسا لی ہی

تھا۔ وہ اپنی لکڑی چال کے ساتھ اسی طرف آرہا تھا۔ ”پھر صبح بھی ہو گئی۔ ہمیں جانا پڑے گا۔“

”کہاں؟ میں نے پوچھا۔“

”شیش نواس تمہیں شردھانے کی کہانی سننی ہے تو کل رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کوروتی نے سرد لہجے میں کہا اور اپنی

جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گوتم اب ہمارے پاس آ گیا تھا۔ اچانک ہی مجھے اپنے پیروں کے پاس سرسراہٹ سنائی دی اور

میں نے چونک کر نیچے دیکھا۔ ایک انتہائی خوفناک کوڑیالا سانپ میرے پیروں کے قریب تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس

سے بچوں بھیا نک ناگ نے میری پنڈلی پر منہ مار دیا۔ ایک ہلکی سی جھین ہوئی اور میں۔ لیکن میرے منہ سے زوردار چیخ

نکل گئی تھی جس پر چونک کر کوروتی نے نیچے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹ بھنج گئے۔

”منخوس کیڑے۔ مہا بھارت کے دور کے راج لیکھک کی تاریخ میں کسی سانپ نے ان کے پاؤں میں نہیں کاٹا تھا۔

یہ تو گزری ہوئی تاریخ کا ایک سایہ ہیں۔ ان کا اصل شریر تو لاکھوں صدیوں کے بعد سنسار میں آنے والا ہے۔ یہ سانپ

ان کا کیا لگاؤ سکے گا۔ آؤ عالی جی یہ رقابت کا مارا، پیچھا کہاں چھوڑے گا آؤ۔

”کوئی بات نہیں ہے کشکا۔ حیرانہ راج لیکھک حیرے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ میں مہاراج سے کہہ کر تاریخ کے اس چور

کو پکڑوا دوں گا۔ تو دیکھنا۔“ گوتم بھنسا لی نے کہا اور واہس مڑ گیا۔ میرے پاؤں میں سانپ نے جس جگہ کاٹا تھا وہاں اب

نہ کوئی نشان تھا نہ تکلیف۔ لیکن میں اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔ کیا دلچسپ بات تھی! کیا یہ دلچسپ۔ صدیوں پرانی ایک

جیتی جاگتی عورت۔ مافوق الفطرت قوتوں کی مالک جدید دور کے ایک تاریخ نگار کو مل گئی تھی۔ صدیوں کی تاریخ ایک اسی

کتاب میں درج کر دی گئی تھی جس کے اوراق میں صدیاں تحریر تھیں۔ میں تاریخ کے کسی بھی دور میں اس دور کے کسی

کردار کا روپ دھار کر اس دور کی تاریخ کو جان سکتا تھا۔ پتھر کی یہ کتاب اپنے اندر صدیاں زندہ رکھے ہوئے تھی۔

اس دور کی کشکا اور اس سے پہلے دور کی کوروتی میرا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

”کچھ پریشان ہو کوروتی!“ میں نے کہا۔

”ہاں!“

”کیوں مجھے بتاؤ۔“

”وہ کبڑا میرے لئے دردِ سر بن گیا ہے۔ ہتھیارے کو موت بھی قبول نہیں کرتی ورنہ میں اسے کبھی کا موت کی نیند سلا دیتی۔“

”کیا وہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔“

”تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیسے.....“

”وہ مہاراج سے کہہ کر تمہیں گرفتار کر سکتا ہے۔ مہاراج تمہیں قیدی بنا کر قید خانے میں ڈال سکتے ہیں۔ تمہیں تاریخ کا چور کہہ کر صدیوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔“

یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ گویا پھر میں اپنی دنیا میں واپس نہیں جاسکتا۔

”کبھی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”ارے باپ رے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کتنا بھیانک تصور تھا۔ اپنی دنیا کو چھوڑ کر میں اس قدیم دور کا قیدی بن جاؤں گا۔ وہ بھی کسی اور شخصیت کی حیثیت سے۔ کچھ وقت کیلئے یہ ماحول بہت اچھا لگا تھا۔ ابھی تک صحیح معنوں میں غور نہیں کیا تھا کہ خود میں کس حیثیت سے ہوں۔ لیکن اب..... اب احساس ہو رہا تھا کہ اپنی دنیا کس قدر خوبصورت ہے اور میں وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں قید خانے میں پڑا رہوں اور وہ بھی نبھانے کب تک۔ کوروتی نے میرا چہرہ دیکھا اور مسکرا دی۔

”وہ گوتم بھنساہی ہے۔ مندروں میں گھنڈہ بھانے والا ایک غلام جس کا دعویٰ ہے کہ وہ میرے عشق میں گرفتار ہے۔ لیکن کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی محبت کو قبول کیا جاسکے۔ مجھے دیکھو اور اس کی منحوس صورت کو دیکھو میں اس سے زیادہ..... چالاک ہوں۔ بیشک اس نے امرت جل پی لیا ہے اور امر ہو گیا ہے لیکن میرا گیان اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے جتنے علم سکھے ہیں وہ لا جواب ہیں جبکہ اس کے پاس کوئی ایسا گیان نہیں ہے کہ وہ میری فتنی کو نچا دکھا دے۔ ممکن ہی نہیں ہے اس کیلئے۔ تم بالکل چننا مت کرو ویشان عالی میں تمہیں تمہارے سنسار میں پہنچا دوں گی۔ بس میرا یہ خیال تھا کہ تم مہابھارت کے کچھ اور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ یہ جانو کہ شردھا پر کیا ہوتی تھی مگر اب ذرا صورتحال مختلف ہو گئی ہے۔ شردھا کے بعد کی کہانی کبھی بعد میں تمہیں سنا دوں گی۔ اس سے یہاں سے نکل جانا ضروری ہے کیونکہ گوتم بھنساہی رقابت کا شکار ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے پر تل گیا ہے بلکہ.....“ کوروتی کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں سوالیہ لگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

”بلکہ اس سے آگے تم کچھ اور کہنا چاہتی نہیں کوروتی۔“

”نہیں اس دور میں میں کھٹا کھٹی مجھے کھٹا ہی کہہ کر پکارا کوروتی کہو گے تو صورتحال بڑی سمبیر ہو جائے گی۔“

”میں کہہ رہا تھا تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں کھٹا۔“

”ہاں! میں یہ کہہ رہی تھی مجھے شکر دینا۔ یہ کہانی ہمیں یہیں ادھوری چھوڑنی پڑے گی۔ تمہارا واپس جانا بڑا ضروری ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کوروتی خاموش ہو گئی۔

ہم دونوں پیدل چل رہے تھے۔ کوروتی نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا۔ گوتم بھنساہی اب آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ہم اس راستے پر نہیں جا رہے جس راستے سے یہاں تک پہنچے تھے۔ کم از کم اس

کا اندازہ مجھے تھا۔ چنانچہ یہ سفر جاری رہا اور سورج پوری طرح آسمان پر کھل اٹھا تھا اور دھوپ نے زمین کو سورج ہی کی طرح روشن کر دیا تھا۔

تب ہمیں دور سے ایک ہندوؤں کی بنی ہوئی عمارت نظر آئی جو کوئی پرانا کھنڈر تھی۔ اس کی دیواریں کالی سے سیاہ ہو گئی تھیں اور جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آرہے تھے۔

”یہ قلعہ درماتنی ہے۔ اپنے دور کا مشہور قلعہ جہاں راجہ دھرم داس نے ڈیڑھ سو سال حکومت کی تھی۔ اتنی لمبی حکومت اس سے پہلے ہندوستان کے کسی راجہ نے نہیں کی تھی مگر اب یہ ویران پڑا ہوا ہے اور بہت عرصے سے میرا مسکن ہے۔“

”تمہارا.....؟“ میں نے حیرت سے کہا تو کھٹا مسکرا دی پھر بولی۔

”گوتم کیا سمجھتے ہو کیا تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو۔ نہیں پترکار کچھ بھی نہیں معلوم تمہیں تمہارا جیون تو بہت چھوٹا سا ہے۔ بالکل اتنا سا۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا۔

”اس چھوٹے سے جیون میں تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔“

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم اس پرانے قلعے تک پہنچ گئے۔ میں نے بالکل ایک نئی طرز تعمیر کا جائزہ لیا۔ قدیم دور میں عمارتیں ایسے بھی بنائی جاتی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ ہم ایک ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ چمنوں کے نیچے تک سبزہ اگ آیا تھا۔ ہواؤں کی نمی نے پتھر کی زمین کو بھی نرم کر دیا تھا۔ کھٹا مجھے ساتھ لئے ہوئے چلتی رہی۔ کافی لمبی راہداریوں کو عبور کرنے کے بعد آخر کار ہم ایک ایسے دروازے پر پہنچے جو کبھی لکڑی کا ہوگا لیکن اب دیمک نے اسے مٹی کا بنا دیا تھا۔ کھٹا نے اس دروازے پر ہاتھ رکھا اور دروازہ راگہ کی طرح ڈھکے گیا۔ ہم اس راگہ پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں ایک اور چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔

”چلو اندر چلو.....“ کھٹا بولی اور میں نے اس دروازے سے اندر قدم رکھ دیا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ وہ میری محسن بھی تھی محافظ بھی اس نے مجھے جس ماحول اور جس دور سے روشناس کرایا تھا۔ وہ بے شک ایک فلسفی عمل تھا۔ جدید دور کا کوئی بھی انسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دنیا کی اس قدر قدیم تاریخ میں داخل ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے دعویٰ میں کبھی کوئی ایسا نیک کام کیا ہو جس کے بدلے مجھے ایک ایسا کردار مل گیا۔ وہ میری کاوشوں میں معاون ہو سکتا تھا۔ مجھے چونکہ خود بھی ہندو مایہ تھا لہذا میں نے اس پر حتی المقدور کتابیں لکھی تھیں لیکن جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس دور کا ایک کردار بن کر اس کا ایک لفظ بھی میں نے اپنی کسی کتاب میں نہیں لکھا تھا۔ وہ دنیا تو بالکل انوکھی تھی لیکن اب اگر میں ایسی کوئی کتاب لکھنا چاہتا تو دنیا تو میری بات پر کبھی یقین نہ کرتی کہ میں نے گزری صدیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ وہ کردار اپنی لگا ہوں سے دیکھے ہیں جو صرف تاریخ میں نظر آ جاتے ہیں اور وہ بھی ہندو تاریخ میں۔ میں نے مہابھارت دیکھی ہے وہ جنگ دیکھی جو کروڑوں اور پانچوڑوں کے درمیان ہوئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس دور کا کوئی لکھاری ایسی کوئی کتاب لکھ سکتا ہے جس میں وہ آنکھوں دیکھی جنگوں کا حال لکھ سکتا ہے۔

میں نے تین سیڑھیاں عبور کر کے پیچھے دیکھا۔ کوروتی پہلی سیڑھی پر تھی اس نے کہا۔

”چڑھتے رہو چڑھتے رہو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا لیکن یہ سیڑھیاں تھیں کہ قیامت الامان الحفیظ چڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ میں چڑھتا رہا دو تین بار میں نے کوروتی کو دیکھا۔ وہ میرے پیچھے آرہی تھی۔ میں راستہ عبور کرتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے



یہ سیزمیاں آسمان تک جا رہی ہیں۔ خدا کی پناہ کوئی آدمی گھٹنے تک میں مسلسل سیزمیاں عبور کرتا رہا اور میرے پاؤں جواب دینے لگے۔ رانوں کی مچھلیاں سخت ہو گئیں اور اب ایک ایک سیزمی چڑھنا مشکل لگنے لگا۔ میں نے ہنسی ہنسی آواز میں پوچھا۔

”مجھے کتنا اوپر جانا پڑے گا کوروتی؟“

لیکن کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں تو بری طرح تھک گیا ہوں‘ کیا میں کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے پلٹ کر دیکھا‘ لیکن جہاں تک میری نگاہ گئی وہاں کوروتی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ کیا وہ نیچے ہی رہ گئی‘ کیا وہ واپس چلی گئی اپنی تاریخ میں؟ تو اب میں کیا کروں‘ اوپر کی سیزمیاں عبور کروں یا نیچے جا کر کوروتی کو تلاش کروں۔ عجیب سی کشش کا شکار ہوا اور ایک سیزمی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے کچھ خیال آیا تو میں نے چیخ چیخ کر کوروتی کو آواز دینا شروع کر دی۔

”مجھے بتاؤ احم میری قابل اعتماد دوست ہو کوروتی‘ مجھے اس طرح تنہا مت چھوڑو۔ خدا کیلئے مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں۔ پیچھے آتا ہوں تو یہ ہزاروں سیزمیاں طے کرنا بھی میرے لئے ممکن نہیں ہوگا‘ اوپر جاتا ہوں تو یہ پتا نہیں کہ کتنی طوالت اختیار کرنی پڑے گی۔ مجھے خیال آیا کہ کوروتی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر مہاراجہ کو میرے بارے میں علم ہو گیا کہ میں تاریخ کا چور ہوں اور جدید دور کیلئے تاریخ چرانے آیا ہوں تو وہ مجھے قید میں ڈال دے گا اور پھر وہی قید میری زندگی کا آخر ہوگی..... ہوگی بھی یا نہیں کون جانے.....“

کوئی ایک گھنٹہ اپنے حساب سے وہیں بیٹھا رہا۔ کوروتی کا اب کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ مجھے چھوڑ گئی تھی‘ ایسا ہی تھا۔ مجھے اوپر جانا چاہئے دیکھوں اوپر کیا ہوتا ہے اور ان سیزمیوں کا اختتام کہاں ہوتا ہے۔ میں چڑھتا رہا اور آخر کار میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے ایک جھٹ سی نظر آ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی‘ لیکن یہ چند سیزمیاں اور عبور کرنی تھیں‘ چنانچہ میں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا اور پھر میں نے وہ حیران کن منظر دیکھا جو میرے لئے ناقابل یقین تھا۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں پتھر کی وہ کتاب رکھی ہوئی تھی۔ عظیم الشان کتاب اور میں اس کتاب کی آخری سطح پر تھا۔ اس پر لفظ ابھرے ہوئے تھے۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں ایک خانہ سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھبرا کر پھرتی سے اس سوراخ سے باہر نکل آیا اور اس احساس کے ساتھ کہ کہیں دوبارہ میں اس سوراخ سے نیچے نہ گر پڑوں‘ ایک چھوٹی سی چھلانگ لگا کر دوسری جگہ آکھڑا ہوا۔ وہ خانہ خود بخود بند ہو گیا تھا اور میں نے ان الفاظ کو دیکھا تھا جو اس پر لکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ شاید الفاظ سنسکرت میں لکھے ہوئے تھے‘ لیکن میں جب مہابھارت میں راج لیکھ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا تو میں نے وہاں سنسکرت میں لکھی کتاب بھی پڑھی تھی‘ جس کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ میں نے ہی لکھی ہے اور اس وقت سنسکرت کے وہ الفاظ میری نگاہوں کے سامنے تھے جنہیں میں پڑھ سکتا تھا۔ ان پر لکھا تھا ”مہابھارت۔“

میں خاموشی سے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ شاید کوروتی بھی اس سوراخ سے باہر آجائے۔ ہو سکتا ہے اسے آنے میں دیر ہوئی ہو‘ لیکن دیر ہوگئی۔ وہ خانہ دوبارہ نہ کھلا۔ خود میرا اس پر پاؤں رکھتے ہوئے خوف سے برا حال تھا کہ کہیں دوبارہ نیچے نہ جا پڑوں۔ جب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ کوروتی اس طرح سے باہر نہیں آئے گی تو میں نے بیخ کنی کر قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ میں نے ان دوسرے الفاظ پر غور بھی نہیں کیا تھا جو پتھر کے تراش سے بنے ہوئے تھے اور ابھرے ہوئے تھے۔ بالکل مہابھارت کی طرح۔ میں ان سب سے چپتا بچا تا سیزمیاں اتر کر کتاب سے نیچے آگیا‘ پھر احمقوں کی طرح میں نے تین چار بار زور سے آواز لگائی۔

”کوروتی..... کوروتی..... اگر تم اس عمارت میں موجود ہو تو میرے پاس آؤ‘ میں سخت پریشان ہوں‘ میں بے چین

ہوں کوروتی میرے پاس آؤ۔“

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں باپوسی سے آگے بڑھ آیا اور اس کے بعد اس عمارت کے صدر گیٹ سے بھی باہر آگیا۔ عمارت میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ سنسان پڑی ہوئی تھی اور بھائیں بھائیں کر رہی تھی‘ کیسی عجیب جگہ ہے یہ۔

پھر اس کے بعد میں واپس اپنے گھر آگیا۔ میرا گھر‘ میرا دیس‘ میرا سب کچھ۔ لیکن جہاں پہنچ گیا تھا وہ جگہ بہت عجیب تھی۔ کئی گھنٹے تک اپنی مسہری پر دراز آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ نیند آجائے۔ دماغ تھوڑا سا پرسکون ہو جائے‘ لیکن ان خیالات میں بھلا نیند کہاں سے آتی۔ سوچتا رہا..... بہت کچھ سوچتا رہا۔ بہت سے کردار یاد آئے‘ سچی وہ محفل جس میں مجھے راج لیکھ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ آہ کتنا عجیب ہے اس دور کیلئے‘ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخی کہانیاں لکھنے والا ایک ادیب اس طرح سے تاریخ میں گر پڑا تھا تو لوگ قہقہے لگانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہیں گے‘ یہی کہیں گے کہ زیادہ سوچتے ہوئے بے چارہ دماغی مریض بن گیا‘ اب ایسی ہی فضول باتیں نہیں کرے گا تو اور کیا کر سکتا ہے۔

اس وقت شاید مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے فرنگ میں جا کر کھانے پینے کی چیزیں تلاش کیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ فرنگ میں جو چیزیں میں نے رکھی تھیں وہ جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں۔ گویا کوئی وقت نہیں گزرا تھا۔ ہر چیز تروتازہ تھی۔ ایسا کچھ مل گیا جسے فوری طور پر پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے استعمال کیا جاسکے تو میں نے اسے زہر مار کیا۔ ہاں مگن میں جا کر میں نے اپنے لئے بہت عمدہ قسم کی کافی ضرور بنائی اور اس کی کئی پیالیاں چڑھا گیا۔ سوچنے کیلئے دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس سو جانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی بے خوابی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور اس کیلئے میرے پاس خواب آور گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں سے دو گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ کھائیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آگئی تھی۔

رات پرسکون گزری تو صبح کو طبیعت بہتر تھی‘ مگر انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ ٹوٹی ٹوٹی سی کیفیت تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سچی یاد آگئی تھی جس نے راج لیکھ کی حیثیت سے مجھے غسل دے کر تیار کیا تھا۔ پھر وہ تمام شوخ لڑکیاں جن کی آنکھوں میں جوانی ناچتی تھی۔ وہ سب میرے ارد گرد تھیں‘ جس کی طرف اشارہ کرتا وہ میری قربت میں آجاتی‘ لیکن خیر یہ بالکل الگ بات تھی۔ میں کوئی بے کردار آدمی نہیں تھا۔ حسن و جمال کی دلکشی مجھے بھی عام انسانوں کی طرح متاثر کرتی تھی‘ لیکن یہ نہیں کہ اس کیلئے در بدر ہو جاؤں۔ کوروتی کو کشاکش کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ انسان بے خود ہو جائے۔ وہ میرے پاس جس حیثیت سے آئی تھی اس کی کہانی بھی طویل ہے۔ جسے میں آہستہ آہستہ آپ کو بتاؤں گا۔ اب بھی وہ ایک پروقار لیکن کس قدر عمر رسیدہ عورت کی حیثیت سے میرے سامنے تھی‘ لیکن اس قدر دلکش کہ اسے ایک مکمل عورت کہا جائے۔ نسوانیت کی دلکشی سے بھرپور۔ ہاں فوجوانی کی عمر ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ وہ عمر جس میں میں نے اسے کشاکش کے روپ میں دیکھا تھا‘ مگر وہ کہاں رہ گئی۔ کیا گوتم بھنساالی نے اسے کسی عذاب میں گرفتار کر دیا۔ اس نے مجھے تو واپس میری دنیا میں بھیج دیا لیکن خود شاید تاریخ کی قیدی بن گئی۔ تھوڑا سا دکھ ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ زندگی میرے سامنے رواں دواں تھی۔ اپنی دنیا اپنے ماحول میں میرے لئے بہت کچھ تھا۔ دلکشی‘ خوشیاں‘ دوستیاں‘ بہت سے دوست تھے میرے‘ مداح بھی تھے۔ جن کی طرف سے مجھے موبائل فون پر پیغامات ملتے رہتے تھے۔ کسی محفل میں جاتا ایک ادیب کی حیثیت سے پہچان لیا جاتا تو میرے مداح میرے گرد جمع ہو جاتے۔ میرے آؤ گراف لئے جاتے‘ مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں نے تاریخ کا مطالعہ کس طرح سے کیا ہے۔ آج مجھے ہنسی آتی تھی۔ بس تاریخ کے کچھ واقعات میں اپنی کہانیاں سو کر میں اپنے کرداروں کو بھی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیتا تھا۔

لیکن اب جب میں نے مہابھارت میں (درویدی) کو دیکھا جس نے مشترکہ شادی کر رکھی تھی اور بہتر بہتر دن ایک ایک شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے رانی کندھاری کو دیکھا تھا۔ میں نے دروہن کو دیکھا تھا اور پھر مہابھارت کا وہ دور دیکھا تھا جس میں کائنات کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی اور لڑائی کتابوں میں محفوظ تھی۔ تب میرے دل میں ایک خیال آیا کیوں تاں ایک کتاب لکھوں ویسے تو میں نے ہندو مائیتھا لوجی میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ دیویوں دیوتاؤں اور جادو ٹونوں پر کالی دیوی پر درگا دیوی پر کھنیش جی پر اور نجانے کس کس پر میں نے رام لکھا لکھی تھی۔ لکشمی بیٹا اور رام پر ان کے بن باس پر۔ یہ سب کچھ لکھا تھا۔ میں نے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کو لکھنے کیلئے ان کتابوں سے مدد لی تھی جو ہندو دھرم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اب اگر میں مہابھارت لکھوں تو وہ اتنی اصلی ہوگی کہ شاید بہت سارے ہندو ادیبوں سے بھی نہ لکھی جائے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات صرف ہندو مائیتھا لوجی میں قید نہیں ہے۔ ان کے لاکھوں دیوی دیوتاؤں سے تو یہ دنیا آباد نہیں ہوئی ہے۔ دنیا بھر کی تاریخ پڑی ہے جس میں بڑے بڑے کردار ہیں۔ خود کوروتی نے مجھے بہت سے کرداروں سے روشناس کرایا تھا بلکہ میری زندگی کا سب سے اچھا وقت تو وہ تھا جب اس نے مجھے اپنی اس رہائش گاہ میں اس بڑے کمرے میں ان کرداروں سے روشناسی کرائی تھی۔ یہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ کیا ہی عجیب و غریب منظر تھا وہ میرے ذہن سے کبھی نہیں مٹ سکتا تھا۔ ایلا بار برسوں، دلویا، سینو، سائیک، ہیلن آف ٹرائے، کلویٹرا، ہلکس، ایوا براؤن اور نجانے کون کون چوکنہ تاریخ سے مجھے کافی شناسائی تھی ان کرداروں کے بھی میں نے نام سنے تھے۔ تھوڑی بہت معلومات بھی تھیں ان کے بارے میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس قدر مکمل نہیں ہاں اگر اب میں کسی ہندو دیوی کے بارے میں لکھوں تو وہ زیادہ مؤثر تحریر ہو سکتی ہے میری۔

یہی تمام باتیں سوچتے سوچتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں تاں میں ایک ایسی کتاب لکھوں جو تاریخ کے ذمہ جاوید کرداروں پر مشتمل ہو۔ وہ کردار زندہ جاوید ہیں جنہوں نے تاریخ میں کوئی بھی ایسا کام کیا ہو جس سے ان کی ایک شخصیت بن گئی ہو اور اسی وقت سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اس کتاب کا نام بھی آیا۔ میں اس کا نام رکھوں گا ”زندہ صدیاں“ ہاں صدیاں اگر کاغذ پر زندہ ہو جائیں اور اس قدر مکمل ہوں تو کوئی تاریخ دان ان سے انحراف نہ کر سکے تو یہ تو بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ جتنی جلدی ممکن ہو اس کتاب کا آغاز کر دیا جائے اور اس کیلئے میں تانے بانے بنے لگا۔ میں نے سوچا کہ جس ماحول سے گزرا ہوں اس میں وہاں تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن وہ ماحول اور اس سے منسلک واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں راجہ چتر برج سے لے کر اور بھی سب کچھ لکھ سکتا ہوں۔

میں تیاری میں مصروف ہو گیا۔ کئی دن تک دل پر گزرا ماضی نقش رہا۔ انسان کے اندر یہی خوبی ہوتی ہے کہ واقعات کتنے ہی عجیب ہوں آخر کار وہ ان کے جال سے نکل آتا ہے۔ پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کوروتی اپنی رہائش گاہ میں واپس آئی کہ نہیں۔ ممکن ہے وہ آگئی ہو۔ حالانکہ وہ جن پر اسرار صلاحیتوں کی مالک تھی ان کے تحت اسے میرے پاس آ جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی دل نے کہا کہ ایک لٹاؤ تو دیکھ لیا جائے۔ راستہ مجھے یاد تھا۔ وہ رہائش گاہ شہر کے ایک علاقے میں ذرا الگ تھلک واقع تھی اور مجھے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ ہوش و حواس کے عالم میں وہاں گیا تھا اور ہوش و حواس کے عالم میں ہی واپس آیا تھا۔

چنانچہ ایک دن تیاریاں کر کے چل پڑا اور وہاں پہنچ گیا۔ علاقہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد میں حواس باختہ ہو گیا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی گئیں۔ آس پاس کی ساری چیزیں جوں کی توں موجود تھیں لیکن وہ جگہ جہاں کوروتی مجھے لے گئی تھی۔ ایک دیران اور پرانے طرز کی اینٹوں کے ایک کھنڈر کی شکل میں نظر آ رہی تھی۔ میں دیر تک ادھر ادھر لگا ہوں دوڑاتا رہا۔ راستہ تلاش کرتا رہا اس خیال کے تحت کہ ممکن ہے میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ وہ کوئی اور گھر ہو لیکن

آس پاس کے جو مناظر تھے وہ بتا رہے تھے کہ یہ وہی جگہ ہے۔

پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ صدیوں پرانا ماضی جس طرح میری آنکھوں کے سامنے آیا اور مجھے وہاں جس طرح کے واقعات پیش آئے ان کے تحت یہ مشکل نہیں تھا کہ یہ پراسرار عمل ہو جائے اب کیا کروں..... بہر حال میں بھی کہانی نویس تھا۔ ہر طرح کی کہانیاں لکھ لیتا تھا۔ بہت سے ایسے مناظر میرے اپنے تخلیق کردہ تھے جو انسانی دل کو دہلا دیں اور ظاہر ہے میری سوچیں آسمان سے نہیں اترتی تھیں۔ ان مناظر کا تصور کیا جاسکتا تھا جو غیر حقیقی ہوں بلکہ غیر یقینی۔

عمارت کا دروازہ موجود تھا۔ میں اس کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ ہر طرف دیرانی اور سانے کا راج تھا۔ ہر طرف جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جیسے صدیوں سے ان پر کسی نے توجہ نہ دی ہو۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک کمرہ دوسرا کمرہ تیسرا کمرہ۔ لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی عمارت تھی۔ وہ کمرہ بھی دیکھا جہاں میں نے ماضی کی داستانوں کو پردوں کی شکل میں اور انسانوں کی شکل میں دیکھا تھا۔ چپے چپے کی تلاش لے ڈالی لیکن وہ جگہ نہ ملی جہاں کتاب تھی۔ تقریباً ایک سے لے کر ڈیڑھ گھنٹے تک میں وہاں کسی آوارہ روح کی مانند چکراتا رہا لیکن کوئی نشان نہیں ملا۔ پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی مایوسی کا احساس ہوا تھا۔ واپس چل پڑا اور اپنے گھر آ گیا۔ طبیعت پر ایک اداسی طاری تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوروتی میری اپنی کوئی تخلیق ہو میرا اپنا کردار جسے میں نے عجیب و غریب شکل میں لکھا ہو۔ آپ یہ بات نہیں سمجھ پائیں گے کسی سچے ادیب سے پوچھئے کہ کبھی کبھی اسے اپنے کسی کردار سے کس طرح عشق ہو جاتا ہے کہ وہ دیوانگی کی حدود میں داخل ہونے لگتا ہے۔ وہ کردار اس طرح اس کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے کہ اس کے ہر لمحے میں وہی کردار اس سے منسلک ہو جاتا ہے۔

دل کو بھلانے کیلئے آج رات میں نے اپنی پسند کے کلب میں جانے کا فیصلہ کیا جو خوبصورت جگہ تھی۔ حالانکہ میرا سلیبس نہیں تھا کہ اس جیسے کلب کو انورڈ کر سکوں لیکن ایک آدھ بار کہیں بھی جایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ میں چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد پر رونق کلب میں جا بیٹھا۔ بہت سے لوگ شاساتھے۔ سلام دعا ہوئی لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی دنیا میں کچھ ایسے منہ زب ہوتے ہیں جن کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یعنی جب تک کوئی آپ سے خود قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ آپ اس پر مسلط نہیں ہو سکتے۔ میں بھی اپنی میز پر تنہا بیٹھ گیا اور میں نے اپنے لئے ایک مشروب طلب کر لیا۔ میری نگاہیں بھٹک رہی تھیں لیکن پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے ایک لمحے کیلئے مبہوت کر لیا۔ کوروتی ایک خوبصورت ساڑھی میں ملبوس ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ لیکن میں اس کے نفوس ایک لمحے میں پہچان سکتا تھا۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا غلط فہمی نہیں ہے یہ وہ کوروتی ہی ہے پھر بھی میں نے اس کا انتظار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے رخ بدلا تو میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا کسی وہم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے میں خود اس کے پاس جاؤں یا انتظار کروں کہ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آئے اور میرا تھوڑا سا مہر کرنا بہتر ہی ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک دم اس کے چہرے پر ایک شناسا مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے اپنی میز کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اس میں انا کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا بیٹھا وہ محبت پاش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”کیسے ہو عالی؟“

”ٹھیک ہوں..... کھانا کھوں یا کوروتی؟“ میں نے سوال کیا۔

”کوروتی۔“ اس نے کہا اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ میں اس کی دلکش ہنسی میں کھو گیا۔

”کہو..... کیسے ہو؟“

”بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔ یہ بات کہنا مجھے قطعی غیر حقیقی لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔ اس دن کے بعد سے میں آج تک ٹھیک نہیں ہوں۔“

”مجھے اعزاز ہے، ظاہر ہے وہ سب کچھ تمہارے لئے اجنبی تھا۔“

”مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے آپ سے بھی اجنبی ہو گیا ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔

”کیسا لگا وہ سب کچھ؟“

”انوکھا، عجیب اور اس سب سے زیادہ عجیب تم۔ وہ لمبے جب تم صدیوں پہلے رقص کر رہی تھیں اور دنیا کی نظریں تم پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ تمہارا چہرہ نقاب میں تھا۔ لیکن آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور میں نے تمہارا پیچھا کیا۔“

”اور ہم نے صدیوں پرانا ماحول دیکھا۔“

”ہاں ابہت عجیب۔“

”وہ تو میں نے خیال رکھا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم مہابھارت میں کسی بھی فوج کے کوئی لڑاکے ہوتے اور مہابھارت لڑتے۔“

”ارے باپ رے۔ پھر تو میں تمہارا احسان مند ہوں، کیونکہ مجھے جنگ و جدل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ بھی ہنسنے لگی پھر میں نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ گی کوروتی؟“

”ہاں ہاں پوچھو۔“

”تم کہاں رہ گئی تھیں اس وقت جب تم نے مجھے بلند یوں پر پہنچا دیا تھا۔“

”بات اصل میں یہ ہے کہ تم لاکھوں سال بعد کے انسان ہو، لیکن میرا وجود کھٹک کی حیثیت سے وہاں تھا اور کھٹکا اگر اپنی جگہ پر نہ پہنچتی تو بڑا اذیت ہو جاتا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ گوتم بھنسا لی ہم دونوں کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے بتا دیا مہاراج کو کہ راج لیکھک قتل ہے۔ وہ بعد کی دنیا سے آیا ہے اور تاریخ میں گھس گیا ہے۔ مہاراج نے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے اور سپاہی راج لیکھک کو پکڑ کر لے گئے۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔

”ہاں! راج لیکھک کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ اصلی راج لیکھک تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنے آپ کو تاریخ سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ جب اسے مہاراج کے سامنے پیش کیا گیا اور مہاراج نے اس کا امتحان لیا تو اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اصلی راج لیکھک ہے۔ غلط خبر دینے والے گوتم بھنسا لی کو سزا کے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سارا کام مجھے کرنا تھا۔ کیونکہ میں اس تاریخ کا ایک کردار تھی اور وہ کردار مہاراج کے سامنے آنا چاہئے تھا ورنہ بڑی خرابی پیدا ہو جاتی اور پتا نہیں تاریخ میں کیا تبدیلیاں رونما ہو جاتیں۔ بس گوتم بھنسا لی قید ہو گیا اور اس کے بعد میں نے کچھ سے انتظار کیا، پھر واپس آ گئی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”لیکن ایک بات اور بتاؤ مجھے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے تمہاری اس رہا نگاہ کا رخ کیا جہاں تم مجھے لے گئی تھیں، مگر وہاں ویران کھنڈر کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔“

”تو ٹھیک ہے، مکان مینیوں سے جڑا ہے۔ جب اس گھر میں کوئی رہنے والا ہی نہ تھا تو اسے کھنڈر کے سوا اور

کیا ہونا چاہئے تھا۔“

”تو وہ تمہارا گھر نہیں تھا۔“

”میرا ہی گھر تھا اور ہے۔“

”اس کھنڈر کی شکل میں؟“

”ہاں وہ کھنڈر ہی تھا۔ جب میں وہاں تھی تو وہ آباد ہو گیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو کھنڈر بن گیا۔“

”اور اب.....؟“ میں نے سوال کیا، تو وہ ہنس پڑی پھر بولی۔

”اب میں وہیں ہوں۔“

”اور وہ کتاب.....“

”میں نے کہا تا سب کچھ وہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ قہوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”کوروتی وہ سب کچھ میری زندگی کا سب سے عجیب حصہ تھا۔ تم نے مجھے جو کچھ دکھایا میں نے اسے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں جو صدیوں پر مشتمل ہو اور میں نے اس کا نام ”زندہ صدیاں“ رکھا ہے کیونکہ تمہاری آنکھوں سے میں نے وہ صدیاں زندہ دیکھی ہیں۔“

اس نے مسکراتی ہوئی لگا ہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔

”مجھے تمہاری کتاب کا نام بہت پسند آیا ہے۔ تم یہ کتاب لکھو اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، تاریخ صرف ہندوستان یا مہابھارت تک ہی محدود نہیں تھی۔ تاریخ کا تعلق تو پوری کائنات، پوری دنیا سے ہے اور جہاں کے بارے میں بھی تم لکھنا چاہو وہاں کی تاریخ تمہاری لگا ہوں کے سامنے آ سکتی ہے۔“

میں چونک پڑا پھر میں نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”اب بھی یہ سوال کر رہے ہو؟ میری مرتب کی ہوئی کتاب پر تم نے غور ہی نہیں کیا۔ میں نے نجانے کیسے کیسے یہ کتاب ترتیب دی۔ اس میں صدیاں سمٹی ہوئی ہیں۔“

”گویا اگر ہم کہیں اور جانا چاہیں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“

”تو پھر میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں کوروتی، میں تمہاری آنکھوں سے دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کیا اعتراض ہوگا۔“ کوروتی نے کہا، پھر بولی۔

”چلو اب میری طرف سے کچھ ہو۔ میری میز پر آئے ہو۔ بتاؤ کیا منگو آؤں تمہارے لئے۔“

”اپنی میز پر میں ایک مشروب لے رہا تھا۔ اب تم جو چاہو کھلا پلا دو۔“

”ٹھیک ہے میں منگواتی ہوں۔“ کوروتی نے کہا اور ایک ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر اس کے پاس پہنچا تو اس نے اسے کچھ چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں پھر اسی موضوع پر آ گیا۔

”بتاؤ میں کب آؤں تمہارے پاس؟“

”میرا گھر تو یاد ہے نا۔“

”بھلا بھول سکتا ہوں اسے۔“ میں نے کہا۔

”توکل ہی آجاؤ۔“

”کوروٹی ایک سوال کروں تم سے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... ہزاروں سوال کرو۔“

”تم صدیوں سے جیتی ہو کیا کھاتی پیتی ہو۔“ وہ بے اختیار ہنس پڑی پھر بولی۔

”بڑا معصومانہ سوال ہے میں نے کب کہا ہے کہ میں مر چکی ہوں۔ میں زندہ ہوں اور زندہ لوگ جو کچھ کھاتے ہیں

میں بھی وہی کھاتی ہوں۔“

اتنی دیر میں ویٹر نے ہمارے سامنے چیزیں لگانا شروع کر دیں، لیکن اس کے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی کوروٹی چونک پڑی پھر اس کے منہ سے نکلا۔

”تم.....؟“ اس کے تم کہنے پر میں نے بھی گردن اٹھا کر دیکھا تو ویٹر کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ کہہ نہ توڑنگا ہوں سے مجھے گھور رہا تھا اور یہ گوتم بھنسا لی تھا۔ اس نے ویٹر کی وردی پہنی ہوئی تھی اور وہی یہ ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔

”تو آزاد ہو گیا کبڑے۔ خیر یہ بات تو میں جانتی تھی کہ تو آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

گوتم بھنسا لی نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے تمام چیزیں رکھنے کے بعد واپس چلا گیا تو کوروٹی بولی۔

”ان چیزوں کو ایسے ہی رکھا رہنے دو انہیں استعمال نہیں کرنا۔ وہ کبڑا شیطان نجانے ان میں کیا کچھ ملا کر لے آیا ہوگا۔ مجھے تو اگر وہ زہر کے ڈھیر بھی کھلا دے تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا، لیکن وہ تمہیں اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ ابھی دس منٹ کے بعد ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے۔“

میں سنسنی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کافی دیر تک ہم وہاں بیٹھے رہے ہم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پھر اس کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ بل وغیرہ وہیں رکھ دیا گیا تھا۔ کوروٹی کے ساتھ میں باہر نکل آیا تھا۔ باہر ایک انتہائی خوبصورت کار رکھڑی ہوئی تھی۔ کوروٹی اس طرف بڑھی اور بولی۔

”آؤ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔“

”نہیں کوروٹی میرے پاس میری اپنی گاڑی موجود ہے۔“

”تو پھر کل کسی وقت آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے کہا اور کار کی جانب بڑھ گئی۔

میں اس کی کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی اور میں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس عورت کی عمر کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کتنے لاکھوں سال کی یہ ہے اس کے کیا معاملات ہیں۔ لیکن بہر طور اتنا مجھے اندازہ تھا کہ وہ طویل ترین عمر کی مالک ہے، لیکن جس انداز میں میرے سامنے تھی وہ شدید کر دینے والا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں اپنی کار سٹارٹ کر کے واپس اپنے گھر کی جانب چل پڑا لیکن یہ رات بھی میرے لئے خوابوں کی رات تھی۔ ساری رات میں کوروٹی کو خواب میں دیکھتا رہا۔ مجھے خواب میں ہی وہ تمام مناظر نظر آئے۔

رانی شردھا کے پاس سے کہانی ختم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اب اس کہانی میں خاصی طوالت تھی۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ مہا بھارت آخر کس طرح شروع ہوئی۔

دوسرے دن آخر کار میں نے اس علاقے کا رخ کیا جہاں وہ گھر تھا جو خود بھی کسی طلسم کدے سے کم نہیں تھا۔ یعنی پہلے میں نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں آباد دیکھا، پھر وہ مجھے ایک کنڈر کی شکل میں نظر آیا اور اب دیکھیں وہاں کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب میں اس علاقے میں پہنچا تو دور ہی سے میں نے اس گھر کو پھر پہلے جیسی شکل میں دیکھا اور آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی، درحقیقت تاریخ کا یہ طلسم میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔

کوروٹی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے میرے لئے بڑی عمدہ عمدہ قسم کی چیزیں تیار کی تھیں جسے اس نے بڑے جدید انداز میں ایک میز پر لگایا اور بولی۔

”آؤ..... بہت عرصے کے بعد نجانے کتنے عرصے کے بعد میں نے کسی کیلئے اتنے تن من دھن سے کھانا پکایا ہے۔

تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانے میں اعتراض تو نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ میں کتاب کے ذریعے اور کچھ معلوم کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن کوروٹی نے کہا۔

”آج ہم کافی وقت ساتھ گزار دیں گے تمہارے بارے میں میرا اندازہ ہے کہ تم ایک آزاد فطرت کے انسان ہو اور تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“

”ہاں کوروٹی میں تمہیں بتا چکا ہوں ایک تنہا زندگی گزار رہا ہوں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی طرح پابندی کی حامل ہو، لیکن ہماری کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔ کوروں اور پانڈوں کے اس دور کے بعد کہانی میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔

”ہاں میں جانتی ہوں میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں اگر تمہاری اجازت ہو تو۔“

”ہاں! زندہ صدیاں ایسے ہی تو نہیں مختل تک پہنچ جائے گی۔“

وہ سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ پانڈو کوروں کی چالاکی سے آخری بازی بھی ہار گئے تھے، لیکن پھر جلاوطنی کے یہ بارہ سال پورے کرنے کے بعد پانڈو دکن کے قریب ملک وائن میں آئے اور یہاں انتہائی گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ در یودھن نے ان کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کہیں ان کا سراغ نہ ملا، پھر جب جلاوطنی کی ساری شرائط پوری ہو گئیں تو پانڈوؤں نے سری کرشن کو اپنا اپیلی بنا کر در یودھن کے دربار میں بھیجا اور اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ در یودھن نے اس مطالبے کو رد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی جنگ سے فیصلہ کرنے کی ٹھانی گئی۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی فوجوں کو سامان جنگ سے پوری طرح آراستہ کیا اور تھائیسر کے قریب کورکھیت کے میدان میں صف آراء ہو گئے۔ یہ عظیم الشان معرکہ جنگ کل جنگ کے شروع کے دور میں برپا ہوا۔ دونوں لشکر بری طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اور اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی۔ اس طرح سے دونوں طرف کے لشکریوں کو فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سی فوجیں کس کی ہیں چونکہ مکاری اور غداری کا انجام ہمیشہ ذلت اور رسوائی ہوتا ہے اس لئے در یودھن اس جنگ میں مارا گیا اور اس کے لشکری بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق اس جنگ میں کوروؤں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر گیارہ کھنوں اور پانڈوؤں کا لشکر سات کھنوں پر مشتمل تھا۔ کھنوں کی تفصیل یوں ہے کہ ایک کھنوں اکیس ہزار چھ سو بہتر ہاتھی سواروں، اتنے ہی اونٹ سواروں، سینہ ہزار چودہ سو گھوڑے سواروں اور ایک لاکھ نو ہزار چار سو پچاس پیدل سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ سپاہیوں کی اس قدر ہماری تعداد سے صرف بارہ آدمی زندہ بچے تھے۔ چار کوروؤں کے لشکر میں سے جن کے نام یہ ہیں۔ ایک برہمن کرپا جو تھریکا ماہر تھا۔ درون نامی ایک عالم کا بیٹا اٹھتا جو خود بھی بہت قابل انسان تھا۔ نمبر تین کرت برما جو یادو خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ در یودھن کے باپ کا سنجی نامی تھہ بان۔ اس طرح باقی آٹھ آدمی پانڈو کے لشکر میں سے بچے تھے۔ پانچ پانڈو بھائی، سانک نامی یادو خاندان کا ایک شخص، در یودھن کا سوتیلہ بھائی اور آٹھویں سری کرشن جو اپنی شہرت کی وجہ سے بڑے عالم تصور کئے جاتے تھے۔“

”ایک منٹ ایک منٹ کوروٹی۔“ میں نے تھکا اٹھا کر کہا۔ وہ چونک کر میری صورت دیکھنے لگی، تو میں نے کہا۔

”سری کرشن کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔“

”ہاں! سری کرشن شہر متھرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں مختلف خیالات آج تک پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں دنیا بھر کے تمام فریبوں کا سردار مانتے ہیں۔ بعض ان کے دیوتا ہونے کے قائل ہیں۔ بیٹا لوگ انہیں خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ سری کرشن کی ولادت اور پرورش کا قصہ اس طرح ہے کہ متھرا کے راجہ کشن کو مجوی نے یہ بتایا کہ اس کی موت کرشن کے ہاتھوں واقع ہوگی۔ راجہ نے یہ سن کر حکم دے دیا کہ اس لڑکے کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ لیکن سری کرشن بچ گئے۔ پیدائش سے لے کر گیارہ سال کی عمر تک وہ مندانامی ایک شخص کے گھر میں پرورش پاتے رہے جو موکل کا رہنے والا تھا۔ آخر کار انہوں نے یادو کے ذریعے راجہ کشن کو قتل کیا اور اس کے باپ راجہ اوگر سین کو تخت پر بٹھایا، لیکن اوگر سین کی حکومت برائے نام تھی، حقیقی اقتدار سری کرشن کے ہاتھوں میں تھا۔ سری کرشن کے چادوکی عملیات اور طلسمی شعبدوں کی وجہ سے لوگ ان کے خدا ہونے پر ایمان لے آئے۔ بہت لوگ اس عقیدے کے مطابق ان کی پرستش کرنے لگے۔ سری کرشن نے اپنی زندگی کے ابتدائی تیس سال بہت عیش و عشرت میں گزارے جن کے قصے بڑے مشہور ہیں۔ یعنی جتنا کنارے گویاں، کھن وغیرہ۔ جب عیش و عشرت کے تیس سال گزر گئے تو دوسرے راجاؤں نے سری کرشن کو تہاہ کرنے کی تجویز سوچی۔ بہار اور پٹنا کے راجہ جراح سنگھ نے ایک طرف سے متھرا پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے راجہ کالیون نے حملہ کر دیا۔ یہ راجہ کالیون عرب کا رہنے والا تھا۔ بہر حال سری کرشن ان دونوں راجاؤں کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور متھرا سے فرار ہو کر دوار کا چلے گئے۔ جو احمد آباد گجرات سے کافی فاصلے پر دریائے شور کے کنارے آباد ہے۔ دوار کا قلعے میں پناہ گزین ہوئے۔ سری کرشن نے اٹھتر سال دوار کا کے آس پاس کے علاقوں میں گزارے۔ اس تمام عرصے میں وہ دشمنوں سے بچنے کی کوششیں کرتے رہے، لیکن وہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ آخر ایک سو پچیس سال کی عمر میں در یو دھن کی ماں رانی کندھاری کی بددعا سے بہت بری طرح اس دنیا سے چل بے۔ ہندوستان کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سری کرشن کو موت نہیں آئی بلکہ انہوں نے بحالت زندگی روپوشی اختیار کی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔“

”رانی کندھاری کا ذکر آپ کر چکی ہیں کوروتی۔ اس بددعا کا کیا قصہ ہے۔“

”بہت ہی عجیب و غریب۔ کہا جاتا ہے کہ جب رانی کندھاری کی زچگی کا زمانہ قریب آیا تو ایک دن اس نے یہ سوچا کہ جب یہ لڑکا در یو دھن پیدا ہوگا تو اس کا باپ اندھا ہونے کی وجہ سے اس کو دیکھ نہیں سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنے شوہر کی رفاقت کا پورا پورا خیال رکھوں اور آشتی کی طرح لڑکے کو دیکھنے سے باز رہوں۔ اس خیال کی بنا پر جب در یو دھن پیدا ہوا تو رانی کندھاری نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے بیٹے کے جسم پر نگاہیں نہ ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو کر تخت سلطنت پر بیٹھا اور لڑائی کا بیٹا سامان لے کر دشمنوں کے مقابلے پر میدان جنگ میں آیا، لیکن رانی روز اول کی طرح بیٹے کے دیدار سے محروم رہی۔ جب لڑائی کا دن مقرر ہوا اور خطرے کی گھنٹی قریب آئی تو اس سے ایک روز پہلے کندھاری نے اپنے بیٹے در یو دھن کو بلا کر کہا۔“

”میری زندگی کے کٹڑے، میری جان! انسان اپنی اولاد کو ہر طرح کی آفات سے اور بلاؤں سے محفوظ اور بے خوف رکھتا ہے۔ کل جبکہ جنگ شروع ہوئی تو مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں تیرے نازک جسم کو جو خاص محفوظ نہیں ہے کوئی جدم نہ پہنچے اس لئے تو بالکل بے لباس ہو کر میرے سامنے آتا کہ میں تیرے سارے جسم پر نگاہ ڈالوں۔“

در یو دھن نے اپنی ماں سے اس طرح عریاں ہو کر آنے کا طریقہ پوچھا تو ماں نے جواب دیا۔

”اے میرے بیٹے اس زمانے میں عقل، سچائی اور بزرگی میں پانڈوؤں کے برابر کوئی نہیں ہے۔ تجھ کو چاہئے کہ تو

پانڈوؤں کے دربار میں حاضر ہو کر اس کا طریقہ دریافت کرے۔“

در یو دھن نے ماں کا کہنا مانا اور پانڈوؤں کے پاس پہنچا اور انہیں اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ پانڈوؤں نے یہ جاننے کے باوجود کہ در یو دھن ان کا جانی دشمن ہے، سچائی اور طبیعت کے استقلال کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”فطرت کا یہ قانون ہے کہ اولاد ماں کے پیٹ سے بالکل برہنہ پیدا ہوتی ہے اور والدین کی نظر اسی طرح برہنہ حالت میں بچے پر پڑتی ہے۔ چونکہ تیری ماں نے اب تک تجھے نہیں دیکھا اس لئے تجھے اس کے سامنے برہنہ جانا چاہئے، کیونکہ اس کیلئے تیرا وجود اب بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت کہ تیری ولادت کے روز تھی۔ لہذا یہ تیرا فرض ہے کہ تو اپنی ماں کا کہنا مانے اور اس کے سامنے بالکل برہنہ جائے تاکہ وہ تیرے جسم پر پاک نگاہیں ڈال کر مجھے تمام آفات سے محفوظ کر دے۔“

در یو دھن یہ نیک مشورہ حاصل کر کے اٹھا اور اپنے لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں سری کرشن سے ملاقات ہوئی، انہوں نے کہا۔

”اس طرح تمہا دشمن کے لشکر میں آنا خلاف مصلحت ہے۔ آخر تم کس لئے آئے تھے؟“

در یو دھن نے اس کے جواب میں تمام واقعہ بیان کر دیا، یہ سب سن کر سری کرشن نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ اگر در یو دھن پانڈوؤں کے مشوروں کے مطابق اپنی ماں کے سامنے بالکل برہنہ جائے گا تو ماں کی نگاہوں کی تاثیر سے اس کا جسم ہر طرح کی آفات سے محفوظ ہو جائے گا اور اس کے جسم پر کسی قسم کا کوئی وار کارگر نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ میں فتح اسی کو نصیب ہوگی اور یہ ہم لوگوں کو بالکل تہاہ و برباد کر دے گا۔ یہ سوچ کر سری کرشن نے فریب سے ایک قہقہہ بلند کیا اور کہا۔

”اے نادان شخص جو انسان دشمنوں سے نیک مشورے کی توقع رکھتا ہے وہ یقیناً اپنے لئے گڑھا کھودتا ہے۔ پانڈوؤں نے تیرے ساتھ مذاق کیا ہے ذرا تو خود ہی اپنے دل میں غور کر کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور اب تو جوان ہو چکا ہے۔ بھلا تیری غیرت تجھے کسی طرح اجازت دے گی کہ تو بالکل ننگا ہو کر اپنی ماں کے سامنے جائے۔“

در یو دھن سری کرشن کے فریب میں آ گیا اور انہی سے مشورہ حاصل کرنے لگا۔ اس پر سری کرشن نے کہا۔

”پانڈوؤں نے تجھے جو مشورہ دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حقیقت ہے، لیکن تو بس صرف اتنی احتیاط کر لینا کہ اپنے گلے میں پھولوں کا ایک لمبا سا ہار پہن لینا تاکہ تیری ستر پوشی ہو سکے۔ اس عالم بزرگی میں پھر تو اپنی ماں کے سامنے چلے جانا۔“

در یو دھن کو سری کرشن کا مشورہ پسند آیا اور اس نے اسی پر عمل کیا اور اپنی ماں کے سامنے جا کر کہنے لگا۔

”میں حاضر ہو گیا ہوں میری ماں! اپنی آنکھیں کھولو ماما جی اور مجھے دیکھو۔“

ماں نے یہ سوچ کر کہ در یو دھن پانڈوؤں سے نیک مشورہ لے کر آیا ہوگا آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جو نہی اس کی نگاہ در یو دھن کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہار پر پڑی تو وہ چیخ کر بے ہوش ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ زار و قطار رونے لگی اور پوچھنے لگی کہ کیا یہ ہار پہن کر آنے کا مشورہ تجھے پانڈوؤں نے دیا تھا۔ در یو دھن نے جواب دیا۔

”نہیں انہوں نے نہیں بلکہ سری کرشن راستے میں ملے تھے۔ میں نے ان کی رائے پر عمل کیا ہے۔“

یہ بات سن کر کندھاری نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے گلے ہوئے دل سے سری کرشن کو بددعا دی اور لعنت بھیجی اور اپنے بیٹے سے کہا۔



”اے بیٹے تیرے جسم کی یہی جگہ جو میری نگاہوں سے اوچھل رہی گئی ہے دشمن کے وار سے زخمی ہوگی اور شاید یہی تیری ہلاکت کا سبب بن جائے گی۔“

چنانچہ بات بالکل درست نکلی۔ در یوہن کی موت اسی طرح واقعہ ہوئی اور سری کرشن بھی اسی بددعا کے اثر سے جیسا کہ پہلے بتایا بہت بری طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ کہانی سری کرشن کی تھی جن کے متعلق ہندوستان والوں نے طرح طرح کے قصے بیان کئے ہیں۔ لیکن ایک اور شخص جس نے مہابھارت کے بعد کوروؤں پانڈوؤں کی کہانی ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنی حکومت قائم کی۔ اس کا نام کشن تھا۔ یہ شخص کافی ذہین تھا۔ اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس قدر کہ گھوڑا اس کی سواری کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے جنگی ہاتھیوں کو پکڑوا کر حسن تدبیر سے انہیں رام کیا اور ان پر سواری کی۔ اس کے علاوہ ایک شخص اور تھا جس کا نام جے کشن تھا۔ وہ اس کے دور میں اس کا وزیر بنا۔ اس نے چار سو سال تک زندگی پائی۔ اس کے بعد مہاراج کی حکومت آئی جو کشن کا بیٹا تھا اور اس نے اپنے باپ سے زیادہ حکومت چلانے پر محنت کی۔ چنانچہ بہت سے ایسے شہر جو ہندوستان سے بہت دور مقامات پر واقع تھے آباد ہو گئے۔ اس نے شہر بہار آباد کیا اور دور دور سے اہل علم کو بلا کر اس میں بسایا۔ یہاں عبادت گاہیں بنوائیں اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ مہاراج نے سات سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور اس کے بعد ہندوستان کی حالت بدل گئی۔ غرض یہ کہ اس طرح سے بات کیونچو راج کی حکومت تک آئی۔ مہاراج کے چودہ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑا کیونچو راج تھا جو اپنے باپ کا جانشین ہوا۔

خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ہندوستان میں بت پرستی کا رواج اس وقت سے شروع ہوا جب ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے۔ لیکن اس کے بعد بت پرستی کا رواج شروع ہو گیا۔ بت پرستی کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس برہمن نے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے راجہ کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی سونے چاندی یا پتھر کی شبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگا۔ خود راجہ سورج نے بھی دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کر دی۔ اس کی رعایا نے اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور یوں بت پرستی عام ہو گئی۔ لیکن ہندوستان میں بت پرستوں کے نوے مختلف گروہ پیدا ہو گئے۔ قنوج کی آبادی میں بہت اضافہ ہوا۔ راجہ سورج کی مدت حکومت دوسو پچاس برس ہے۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس راجہ کے بیٹے بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑا لہراج تھا جو اس کا جانشین ہوا۔ اس شخص نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر لہراج آباد کیا۔“

میرا دماغ بری طرح پکرا گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہندوستان کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں کے سامنے بیدار ہوتا جا رہا ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور اس سے کہا۔

”تم حقیقت یہ ہے کہ نجانے کیا ہو کوروٹی‘ میں تم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔“ کوروٹی نے آنکھیں بند کر لیں‘ جیسے وہ کسی خیال میں ڈوب گئی ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”زندگی بڑی بیکار چیز ہے۔ ذیشان عالی انسان کبھی کبھی جو کچھ کر بیٹھتا ہے اس کا کوئی بدل اسے نہیں ملتا۔ یوں سمجھ لو کہ میں نے اپنی عمر کے لاکھوں کیا کروڑوں سال دیکھے ہیں۔ میں ہر دور میں اپنی دلچسپیوں کو قائم رکھے رہی ہوں‘ چونکہ مجھے بھی تاریخ سے بہت زیادہ پیار رہا ہے اور بات صرف ہندوستان کی تاریخ ہی کی نہیں ہے۔ بابل‘ نیو‘ مصر‘ ایران‘ یونان

میں نے ہر جگہ کی تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ہر دور میں اپنے آپ کو ایک کردار بنا کر تاریخ میں ضم رکھا ہے۔ اگر تم تاریخ کے باریک پہلوؤں کے بارے میں جانتا چاہو تو تمہیں کہیں سے اس کی تصدیق نہیں ملے گی سوائے میرے۔“ میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ کیا عظیم شخصیت میرے سامنے تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”اور اس کے بعد کوروٹی تم نے ان تاریخوں کو بھی دیکھا ہوگا جن میں مشہور جنگیں ہوئی ہیں۔ باہر کے مسلمان فرمانروا ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے انوکھے کردار کیا تم ان سب سے واقف رہی ہو۔“

”کافی حد تک‘ چونکہ میں بتا چکی ہوں کہ مجھے خود بھی تاریخ کا بے حد شوق رہا ہے‘ اس لئے میں نے ہر دور میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔“

نجانے کتنی دیر تک میں اس کے ساتھ رہا‘ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اپنے ذہن میں تاریخ ایک قیمتی خزانے کے طور پر محفوظ ہو۔ خاصی رات ہو گئی تھی‘ میں نے اس سے اجازت مانگی تو وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ‘ لیکن خیال رکھنا کہ ہمارا ایک مشترکہ دشمن تمہاری تاک میں لگا رہے گا۔ تمہیں اس سے محفوظ رہنا ہے۔“

ایک لمحے کیلئے میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ بزدل تو میں بالکل نہیں تھا۔ لیکن مد مقابل کوئی عام آدمی ہوتا تو مجھے پروا نہیں تھی۔ تاہم میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے محتاط رہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”ایک بات بتاؤ کوروٹی اگر وہ کبھی میرے مد مقابل آنے کی کوشش کرے تو کیا اس وقت کے ہتھیار اس کے خلاف استعمال ہو سکیں گے۔“

”یہی تو دکھ بھری بات ہے۔ نہیں ہو سکیں گے‘ لیکن وہ تمہیں ہتھیاروں سے مارنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس بات کا مجھے علم ہے۔“

”وجہ؟“

”وجہ نا پوچھو تو زیادہ اچھا ہے۔“

میں نے اصرار نہیں کیا۔ یہ رات بھی میرے لئے عجیب و غریب حیرتوں کی رات تھی۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میں نجانے کب تک اس کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ کوروٹی سے زیادہ میرے لئے اب اچھا کردار اور کوئی نہیں رہا تھا۔ جو مجھے ہندوستان کی تاریخ بتا رہی تھی۔ اس نے مجھے لہراج تک کہ بارے میں بتایا تھا۔ لہراج کے باپ راجہ سورج نے اپنے عہد حکومت میں بنارس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ شہر اس کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا۔ اس نے اس شہر کو بسانے میں پوری پوری محنت کی تھی اور اپنے بھائیوں کو ہمیشہ عزیز رکھا تھا۔ پتا یہ چلا کہ اسی راجہ نے اپنے باپ کی اولاد کو راجپوت کے نام سے اور دوسرے لوگوں کو مختلف فرقوں اور ناموں سے موسوم کیا۔ آخر کار وقت بگڑا اور ہر شخص حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالنے کا خواب دیکھنے لگا۔ ایسے ہی لوگوں میں کیدار نامی ایک برہمن بھی تھا۔ اس نے سواک کے کوہستان سے سرکشی کی اور لہراج پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ اس طرح ہندوستان کی حکومت کیدار کے ہاتھ آ گئی۔ پھر اسی عہد میں شنکل نامی ایک باغی نے کوچ بھار کی طرف سے نکل کر سلطنت پر حملہ کیا اور بنگال اور بہار کو فتح کر کے ایک بھاری فوج تیار کی۔ اس طرح شنکل ہندوستان کا راجہ بن گیا۔

وہ مجھے ہندوستان کی پوری تاریخ سے روشناس کرانے لگی اور بات وہاں سے نکل کر اور آگے آ گئی۔ راجہ وکرماجیت‘ راجہ بھوج دیو‘ داس دیو‘ راجہ رام دیو‘ راجپوت کی حکومت تک بات پہنچی۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہو رہا تھا۔ پھر ہندوستان میں

مسلمانوں کی آمد کے بارے میں تفصیلات کا پتا چلا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے جس مسلمان نے قدم رکھا اور اہل ہندوستان سے معرکہ آرائیاں کیں وہ مہلب بن ابی صفراء تھا۔ ہجرت نبویؐ کے اٹھائیسویں سال امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں بصرے کے حاکم عبداللہ بن عامر نے فارس پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو جنہوں نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد بدعہدی کی تھی شکست دی اور وہاں بصرے آگیا۔ ہجرت کے تیسویں سال حضرت امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ نے ولید بن عتبہ کو جو کوفہ کا حاکم تھا اس وجہ سے معزول کر دیا کہ اسے شراب خوری کی عادت تھی اور اس کی جگہ سعید بن العاص کو مقرر کر دیا۔ سعید اسی سال خاورستان کی طرف متوجہ ہوا۔ حضرت امام حسن و امام حسینؑ بھی اس کے ساتھ اس معرکہ میں شریک ہوئے۔ اسطرآباد کے دارالسلطنت جرجان کو حضرت حسینؑ کے قدموں کی برکت سے فتح کر لیا گیا اور وہاں کے باشندوں نے دولاکھ دینار سالانہ دینا منظور کئے۔ اہل جرجان اسلام لے آئے اور خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

یہ تمام معلومات زندہ صدیاں کیلئے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھیں۔ میں انہیں رقم کرتا رہا، پھر اس کے بعد ایک دن میں کوروتی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی پریشانی کا شکار نظر آ رہی تھی اس نے کہا۔

”مجھے تم سے کچھ دن کیلئے رخصت ہونا پڑے گا۔“

”خیریت کوروتی..... کیوں؟“

”افسوس میں اس کیوں کا جواب نہیں دے سکتی۔“

”تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ خوبصورت گھر ایک بار پھر کنڈر کی شکل اختیار کر جائے گا۔“ وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”نہیں، بلکہ میں تمہیں دعوت دیتی ہوں کہ تم اگر چاہو تو اس کتاب کے ذریعے ماضی میں کہیں جاسکتے ہو۔ ہو سکتا ہے

تم جہاں جاؤ میں وہاں کے ماضی میں تمہیں نہ ملوں، لیکن پھر بھی تمہاری اپنی معلومات میں اضافہ ہوگا۔“

”لیکن میرے لئے واپسی کا سفر کیسے ممکن ہوگا۔“ میں نے کہا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

”اس بارے میں میں تمہیں ایک دو دن میں بتاؤں گی۔“

”گو یا تمہارا مطلب ہے کہ ایک دو دن تک ابھی تم یہاں موجود ہو۔“

”ہاں!“

”کوروتی میں تمہارا بری طرح عادی ہو گیا ہوں۔ نجانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر اب وقت نہیں گزار سکتا۔“

اس نے دکھ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔

”ہم ابھی جدا نہیں ہو رہے، ڈیڑھ دن ابھی کافی دن تک ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھے گا۔ تم کل آنا“

میں تمہیں اور بھی کچھ تفصیلات بتاؤں گی۔“ اس نے کہا۔

میرے لئے اب دن اور رات واقعی عجیب و غریب ہو گئے تھے۔ زیادہ تر کوروتی کا ساتھ رہتا تھا اور میں اس سے دنیا کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ ہم دونوں کے پروگرام بھی ساتھ ہی بنا کرتے تھے۔ بظاہر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ساتھ آج کل جس معزز خاتون کو دیکھا جاتا رہا ہے وہ دنیا کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب کردار ہے۔ اتنا حیران کن کہ اگر دنیا کو اس کے بارے میں بتایا جائے تو لوگ ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کہیں گے۔ یہی کہیں گے کہ واہ! مصنف پر اسرار کہانیاں لکھتے لکھتے پراسرار جموٹ بولنے پر بھی اتر آئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ کوروتی

صدیوں قدیم پرانا کردار تھی اور دنیا اس کے ذہن میں گم تھی۔

دوسرے دن میں پھر مقررہ وقت پر اس خوبصورت عمارت میں داخل ہو گیا جو کوروتی کی غیر موجودگی میں ایک کنڈر کی طرح سے رہ جاتی تھی۔ میں جس وقت وہاں جاتا تھا کوروتی میرا استقبال کرتی تھی۔ خوبصورت لباس میں ملبوس چہرے پر ایک حسین مسکراہٹ سجائے، لیکن آج وہ سامنے موجود نہیں تھی۔ حالانکہ وقت وہی تھا جب میں اس کے پاس جاتا تھا۔ نجانے کیوں ایک لمحے کیلئے میری چھٹی حس نے ایک عجیب و غریب احساس دلایا، وہ یہ کہ کوروتی اس وقت اس عمارت میں موجود نہیں ہے۔ لیکن عمارت کنڈر کی شکل میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر اوپر پہنچا اور پھر اندر داخل ہو کر میں نے کوروتی کو آواز دی۔ کچن سے کھانوں کی خوشبو بھی نہیں آ رہی تھی جو کوروتی بڑی دلچسپی سے میرے لئے تیار کرتی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ یہ ناقابل فہم کھانے تھے۔ صدیوں قدیم روایات کے مطابق۔ لیکن مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے بتانے لگی کہ کوروتی نے کل جو کھا تھا کہ وہ کچھ وقت کیلئے مجھ سے جدا ہو جائے گی تو وہ مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ میں گھر کے چپے چپے میں اسے تلاش کرنے لگا اور آخر کار وہاں پہنچ گیا جہاں وہ کتاب موجود تھی۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے سیزھیاں ملے کیں اور ابھرے ہوئے الفاظ سے بچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوروتی کہیں کسی تاریخ کے دور میں تو نہیں چلی گئی ہے۔ لیکن جب کوئی عمل نہیں ہوتا تھا تو کتاب صاف شفاف نظر آتی تھی۔ آج بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کوئی اور ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے میں کوروتی کو آواز دیتا۔ ایک لمحے کیلئے میں سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹا، لیکن پلٹتے ہوئے میں نے ذرا بے دھیانی سے کام لیا تھا۔ ایک دم سے میرا پاؤں لڑکھڑایا اور دوسرے لمحے میں کتاب کے ابھرے ہوئے ایک لفظ پر جا گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہوش و حواس رخصت ہو رہے ہوں۔ کتاب کا وہ لفظ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اور ایک گہرا غار نمودار ہو گیا تھا۔ جس میں میں برق رفتاری سے گرنا چلا جا رہا تھا۔

کچھ لمحوں کیلئے تو میرا ذہن بالکل پکرا کر رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اندھے کنویں میں گرنا جا رہا ہوں۔ مجھے وہ لمحے بھی یاد آئے جب پہلی بار میں کتاب کی گہرائیوں میں اترا تھا اور نیچے گرا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں بہت نیچے کسی اندھے کنویں میں گر رہا ہوں، مگر میرے جسم کو ایک ذرا بھی چوٹ نہیں آئی تھی اور اس وقت بھی یہی ہوا، زیادہ سے زیادہ چند فٹ نیچے گرا ہوں گا اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے نیچے بہت موٹی قسم کی مکمل بھیج ہو۔ یہ مکمل گہرے سبز رنگ کی گھاس تھی۔ اس وقت یہاں مدھم مدھم لیکن خوشگوار روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی کہ میں چاروں طرف اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر کا ماحول دیکھا اور خود بخود ایک فرحت سی ذہن پر محسوس ہوئی۔ بڑا حسین علاقہ تھا۔ ہر طرف سبز و شاداب جنگل نظر آ رہا تھا۔ دور دور تک گہری سبز گھاس بکھری ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اونچی اونچی جھاڑیاں جن پر خود رو پھول کھلے ہوئے تھے۔ وسیع و عریض میدان کے انتہائی سرے پر پہاڑی ٹیلے نظر آ رہے تھے اور ان کے عقب میں اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں، کیا ہی حسین منظر تھا۔ میں اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک ہی مجھے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ میرا سر گھوم گیا۔ جب میں نے کسی چیز کو متحرک دیکھا اور چونکہ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ اس لئے ایک لمحہ میں پہچان لیا۔ وہ ایک خونخوار ببر شیر تھا جو اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا اور اس نے کسی شے پر غراتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے ایک انسانی چہرہ سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی شیر کی غرائیں۔ ایک بار پھر میں نے اس شیر کو اسی طرح اچھلتے ہوئے دیکھا اور ایک لمحے کیلئے میرے اوسان خطا ہو گئے۔

تمہی مجھے ایک دم اپنے جسم پر کسی تہذیبی کا احساس ہوا اور میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میرے بدن پر جو لباس تھا

وہ میرا اپنا نہیں تھا بلکہ چڑے کا ایک انتہائی مضبوط زرہ میرے جسم پر تھا جو گھٹنوں تک تھا اور گھٹنوں سے نیچے پاؤں کسی لباس سے عاری تھے۔ البتہ جو جوتے میں نے پہنے ہوئے تھے وہ مخصوص قسم کے تھے۔ جن کے چوڑے تھے گھٹنوں تک آگے کس گئے تھے۔ کمر سے ایک کپھاڑا لٹک رہا تھا جس کا پھل بلاشبہ تین کلو سے زیادہ وزنی تھا۔ نجانے میرے ذہن میں کیا آئی کہ میں نے کپھاڑا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک بار پھر میرے حلق سے ایک تیز آواز نکلی اور وہ شیر جو کسی نامعلوم انسان پر حملہ آور تھا میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے رک کر میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کپھاڑا میرے ہاتھ سے نکلا اور پوری قوت سے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر پڑا۔ ہڈی ترخنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی شیر نے منہ کے بل قلابازی کھائی اور مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر آگرا۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ کپھاڑے کا وار اتنا کاری تھا کہ شیر کا سر دو ٹکڑوں میں توڑ دیا گیا تھا۔

میں نے متوشنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا، جیسی اس بڑی جھاڑی کے پیچھے سرسراہٹ ہوئی اور ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے بھی بالکل میرے جیسا ہی لباس پہنا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بازوؤں سے چہرے سے اور ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شیر نے اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور پھر گھاس پر گر پڑا۔ میں نے ایک نگاہ شیر پر ڈالی اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دوسرے لمحے میں اس شخص کی طرف بھاگا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ہوش و حواس میں تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

”میں زخمی ہوں میرے دوست“ میں بہت زخمی ہوں۔ ذرا تم ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر میرا گھوڑا تلاش کرو۔ وہ بے چارہ بھی زخمی ہو گیا ہے۔ شیر نے اچانک مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

حیرت کی بات یہ تھی کہ جو زبان وہ بول رہا تھا وہ بالکل اجنبی زبان تھی، لیکن میری سمجھ میں اچھی طرح آرہی تھی۔ میں نے اس کے کہنے کے مطابق ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو بہت دور مجھے ایک سفید دھبہ سا نظر آیا۔ یہ دھبہ متحرک تھا۔ غور سے دیکھا تو اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی گھوڑا ہے جس کا اس نے مجھ سے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس کا فاصلہ کافی تھا۔ میں نے اسے گھوڑے کے بارے میں بتایا تو اس نے گردن ہلائی اور بولا۔

”میں اسے بلاتا ہوں۔ کاش میری آواز اس تک پہنچ جائے۔ مجھے سہارا دو۔“

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تو اس نے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپنا بنایا اور ایک تیز آواز حلق سے نکالی۔ دوسری یا تیسری آواز اس کے حلق سے نکلی تھی کہ میں نے اس سفید متحرک دھبے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ گھوڑا پوری قوت سے دوڑا چلا آ رہا تھا۔

میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ بڑا ہی خوبصورت اور قد آور گھوڑا تھا۔ جو ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے کبھی جانوروں کا بہت زیادہ تجزیہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس گھوڑے کی آنکھوں میں بہت ہی پیار ہے۔ وہ اپنا منہ اس شخص کے شانے پر گر کرنے لگا۔ اس نے ہاتھ سے گھوڑے کی گردن چھتھائی اور مجھ سے بولا۔

”تمہیں خود بھی میرے ساتھ اس گھوڑے پر سوار ہونا ہوگا۔ میں شاید تمہارا اس پر بیٹھ کر سفر نہ کر سکوں۔“

میں نے اس کی اس بات پر غور کیا اور دل ہی دل میں ذرا سا خوفزدہ ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ لیکن فوراً ہی مجھے ایک اور خیال بھی آیا وہ یہ کہ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کپھاڑے سے ایک خوفناک شیر کا سر بھی نہیں توڑا تھا اور اس سے پہلے میرے جسم پر ایسا لباس بھی نہیں تھا۔ ہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ میں آپ سے خاص طور سے کروں گا وہ یہ کہ کورونی کی کہانی کے ساتھ ساتھ میں نے اس سے پہلے مہابھارت کے دور کی دنیا دیکھی تھی اور انہی لوگوں کے درمیان خود کو محسوس کیا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت بھی اچھی طرح یہ بات یاد رہی تھی کہ میں راج

لیکھک نہیں ہوں، میرا نام کنس نہیں ہے بلکہ میں ڈیٹان عالی ہوں ایک تحریر نگار ایک فکشن رائٹر اور اس وقت بھی مجھے اپنی تمام سوچوں کے ساتھ یہ ماحول اپنا اپنا ہی سا لگ رہا تھا۔ یعنی میں دوہری شخصیت کا شکار تھا اور یہ ایک انتہائی انوکھا عمل تھا جسے فی الحال میں تو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

گھوڑے کی پشت پر اس شخص کو سوار کرانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے ہاتھوں کا پیالہ سا بنایا اور اس شخص سے کہا کہ میرے ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو جائے ساتھ ہی میں نے اسے سہارا بھی دے رکھا تھا۔ وہ شخص حالانکہ خاصا تن و مند تھا۔ لیکن مجھے اس کا وزن ذرا بھی محسوس نہیں ہوا اور اسی وقت ہی میری نگاہیں اپنے بازوؤں پر پڑی تھیں۔ خدا کی پناہ اس وقت میرے بازو کی بھی طرح بروک لسز سے کم نہیں تھے۔ چوڑے چوڑے فولادی بازو جو صحیح معنوں میں مجھے اپنے نہیں لگ رہے تھے۔ میں تو ایک نرم و نازک شخصیت کا مالک ایک معصوم سا ادیب تھا۔ یہ میں کیا بن گیا ہوں اور لہجوں میں مجھے احساس ہوا کہ لازمی طور پر کتاب کے ان الفاظ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جن پر لڑکھڑا کر میں گرا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں ان الفاظ کے ذریعے تاریخ کے کسی دور میں پہنچ چکا تھا اور یہ ایک انتہائی دلچسپ لیکن بہت ہی سنسنی خیز تجربہ تھا۔ میری زندگی کا۔

گھوڑے پر سوار ہونے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ گھوڑے نے باسانی ہم دونوں کا وزن سنبھال لیا تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگا میں پکڑیں تو میرے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے گھوڑے سے کچھ کہا اور گھوڑا مناسب رفتار سے چل پڑا۔ گویا وہ ہمیں کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں اس شخص کیلئے پناہ موجود تھی۔

میرے آگے بیٹھے ہوئے لوجوان آدمی کے جسم کے زخمی حصے لازمی طور پر درد کر رہے ہوں گے لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔

”میرے مددگار میرے ہمدرد میرے دوست تمہارا نام کیا ہے۔“

”پولیسیس!“ میرے منہ سے آواز نکلی اور میں دنگ رہ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی اس نام کے معنی نہیں معلوم تھے اور نا ہی یہ پتا تھا مجھے کہ میں پولیس ہوں بھی یا نہیں، لیکن جتنے اطمینان سے میرے منہ سے یہ لفظ نکلا تھا اس نے مجھے خود حیران کر دیا، زخمی لوجوان نے کہا۔

”اور میرا نام ٹیولس ہے۔ تم بہت بہادر اور دلیر معلوم ہوتے ہو۔ بس میرے لئے بھی یہ شیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن درندے نے دھوکے سے حملہ کیا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو ابھی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ نجانے کون سی دنیا ہے نجانے کون سے لوگ ہیں یہ۔ نجانے یہ تاریخ کا کون سا حصہ ہے۔ میں اس کتاب کے کسی دور میں آگرا ہوں، لیکن یہ دور کون سا ہے۔

بہر حال یہ سارے سوالات میرے ذہن میں تھے۔ گھوڑا مناسب رفتار سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ پھر ہم ایک ایسی بلندی پر پہنچے جہاں کی گہرائیوں میں ایک بہت ہی حسین شہر آباد تھا۔ بلند یوں سے ڈھلانوں کا سفر خطرناک نہیں تھا۔ بڑے معتدل ڈھلان تھے، لیکن اختتام پر جو خوبصورت عمارتیں نظر آرہی تھیں وہ قابل دید تھیں، ہر طرف سبزہ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔

گھوڑا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آخر کار ایک وسیع و عریض مکان کے سامنے پہنچا اور اس کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر ایک خاص طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن تعمیر کا یہ انداز بھی انتہائی حسین تھا۔ وہاں ایک بوڑھی لیکن خوبصورت عورت جن کے نقوش بڑے کھڑے کھڑے سے تھے اور ایک مرد نے ہمارا استقبال کیا۔



گھوڑے پر دو افراد اور نیلس کو زخمی دیکھ کر دونوں فکر مند ہو گئے اور تیزی سے آگے بڑھ کر گھوڑے کے نزدیک پہنچ گئے۔  
معمر عورت نے کہا۔

”ارے یہ تمہارے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ اودہ میرے خدا میرا بچہ دیکھو تو سہی یہ زخمی ہے۔“ اس نے مرد سے کہا اور مرد آگے بڑھ کر نیلس کے پاس پہنچ گیا۔ نیلس نے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے، بس ایک شیر نے دھوکے سے حملہ کر دیا اور میں زخمی ہو گیا۔ لیکن میرے مہربان پولیسیس نے ایسے وقت میں میری مدد کی کہ میں اگر آپ کو زعمہ نظر آ رہا ہوں تو یہ بات اس کی مرہون منت ہے۔“

”آہ..... آہ..... میں تمہیں سہارا دوں، نیچے اترو۔“

”اب کیسے ہو۔“ معمر سیدہ شخص نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

”بہت بہتر ہوں۔ آپ پہلے میرے دوست سے ملیں اور اس کیلئے کسی مناسب قیام گاہ کا بندوبست کریں۔ اب میں اسے ابھی اپنے پاس سے جانے نہیں دوں گا۔“

”یقیناً، یقیناً..... اس نے ہم پر احسان کیا ہے اور میرے عزیز میں تم سے احسان مندی کے مخصوص الفاظ نہیں کہوں گا، کیونکہ وہ کسی شخص کی محبت اور خلوص کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ تم بھی میرے نیلس کی طرح سے ہو۔ آؤ یہ پورا گھر تمہارا ہے جو جگہ تمہیں سکون کی نظر آئے اسے اپنے لئے منتخب کر لو۔“ بوڑھے شخص کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت اور خلوص تھا۔ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب ہم اندر داخل ہو گئے اسی وقت نوجوان نے آہستہ سے پوچھا۔

”تو نیسا کہاں ہے؟“

”وہ اندر ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”کیا حال ہے اس کا؟“

”حسب معمول۔ میں تو اس لڑکی سے خوفزدہ رہنے لگا ہوں۔“

”کیوں؟“

”بس حسب معمول وہی احمقانہ باتیں ہمیشہ شہنشاہ کی مخالفت کرتی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے وہ کسی دن مشکل میں نہ پھنس جائے اور ہم سب کو کسی مشکل میں نہ پھنسا دے۔“

”ہاں یہ مناسب نہیں ہے بابا صاحب اودہ جانتی ہے کہ اس کا بھائی ملازم ہے اور بادشاہ کا مستند خاص، مجھے آزمائش میں نہ ڈالا جائے تو بہتر ہے۔“

”بس کیا کہا جائے.....“

اسی وقت عقب سے ایک آواز ابھری اور میری نگاہیں اس طرف گھوم گئیں، تب میں نے گھوم کر دیکھا ایک شعلہ سراپا میرے سامنے کھڑی تھی۔ حسین قد و قامت پر حکمت چہرہ۔ چہرے کے نقوش نیلس سے ملتے جلتے تھے، لیکن لڑکی ہونے کے ناتے وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ البتہ اس کے چہرے کے تاثرات زیادہ خوشگوار نہیں تھے۔

”اودہ..... تو نیسا دیکھو میں زخمی ہو گیا ہوں۔“ نیلس نے کہا۔

”دیوتاؤں کا خدا تمہیں صحت دے، لیکن میں سن چکی ہوں تم میری مخالفت میں بول رہے تھے اور ابھی تم نے اپنا ارادہ بھی بدل دیا ہے۔“ لڑکی کے لہجے میں طنز تھا۔

”ہمارے مہمان پولیسیس سے ملو۔“ نیلس نے پھر بات برابر کرنے کی کوشش کی اور لڑکی نے میری طرف دیکھ کر

مخصوص انداز میں گردن جھکا دی۔

”آؤ تو نیسا! مہمان کی خدمت کریں، انہوں نے میری جان بچائی ہے۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے بھائی کی مدد کی، لیکن نیلس تمہارے الفاظ نے مجھے بہت دلبرداشتہ کیا ہے۔“

”تو نیسا کیا مہمان کے سامنے ایسی گفتگو مناسب ہوتی ہے۔“ نیلس کے لہجے میں آخر کار تلخی آ گئی۔

”میرا تذکرہ بھی شاید مہمان کے سامنے ہی ہوا تھا۔“

”گویا آج بھی تم اپنے ارادے پر اٹل ہو۔“ نیلس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”فیصلے لکھوں میں نہیں کئے جاتے نیلس، جو لوگ جذباتی فیصلے کرتے ہیں وہ غلط نہیں ہوتے۔“

”تو پھر جاؤ پہاڑوں میں بھگتی پھرو۔ ان سر پھروں کو تلاش کرو جو نیوکی کے باغی ہیں اور ان میں شامل ہو جاؤ۔“

”ہرگز نہیں، میں پہاڑوں میں چھپ کر نہیں موقع ملنے پر سامنے سے وار کروں گی۔ ہاں اگر ان باغیوں نے کبھی میری مدد کی تو میں اپنی زندگی ان کیلئے وقف کر دوں گی۔“ لڑکی پر اعتماد لہجے میں بولی اور میں کان جھاڑنے لگا۔ ایک لفظ جو سمجھ میں آ رہا ہو۔

”تم لوگوں میں تو اذلی میرے تو۔ نیسا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا بھائی زخمی ہے، بجائے اس کے کہ تم اس سے زخموں کی تفصیل پوچھو، لڑائی کرنے لگیں۔ کیا یہ مناسب بات ہے۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے میں اپنے بھائی کو اپنی زندگی دے سکتی ہوں، لیکن اپنے نظریات نہیں۔“

”تو اندر جاؤ..... چلو۔“ بوڑھے نے کہا۔

”میں اس بداخلاقی کیلئے معافی کی خواستگار ہوں۔“ لڑکی نے میری طرف رخ کر کے کہا اور ایک بار پھر ہم سب اندر کی جانب چل پڑے۔

نیلس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر جا کر اس نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

”ہمارے درمیان کون سا نظریاتی اختلاف ہے تو نیسا!“

”میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ تم نیوکی کے باغیوں میں شامل ہوتے اور اس کی سرکوبی کیلئے کام کرتے۔ اس کے برعکس تم اس کے وفاداروں میں سے ہو۔“

”آخر اس سے تمہیں کیا اختلاف ہے۔“

”وہی جو ہر محب وطن کو ہو سکتا ہے۔ وہ جانور ہے جنگلوں میں سیدہ کو بی کرنے والا ایک گوریلا اور تم اس جانور کے غلام ہو۔ کیا یہ انسانی ہستی اس کی ذات کی توہین نہیں ہے کہ وہ ایک جانور کا تابع ہو گیا۔“ لڑکی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”لیکن وہ بہت بڑے خاندان کا شخص ہے۔ وہ اس تخت کا جائز حقدار ہے اور یونان کے قانون کے مطابق ہار ہا خود کو اس کا اہل ثابت کر چکا ہے۔“

”نہیں یہ ایک سازش ہے۔“

”کیوں آخر کیوں؟“

”اسے ایک شخص نے اپنے جھینے ہوئے وقار کی بحالی کیلئے کارگس دی ہے۔ وہ جنگ کر سکتا ہے، سوچ نہیں سکتا، بول نہیں سکتا۔ اس کی آواز میں کوئی اور بولتا ہے۔“

”تم جانتی ہو تمہاری یہ معلومات ہمارے خاندان کی تباہی ہے۔“

”بس یہی بنیادی اختلاف ہے مجھے تم سے۔ میں چاہتی ہوں کہ انسان اگر برا بھی ہو تو اپنی برائیوں سے قلعہ ہو۔ اچھا ہو تو ہر برائی کے خلاف آواز اٹھائے اس میں کوئی ایک صفت ہونی چاہئے۔ تمہاری طرح خاندان کی زندگی کے خوف سے حق گوئی سے انحراف نہیں۔“ تو نیسا نے کہا اور نیلس غصے سے تلملانے لگا۔

”ٹھیک ہے وقت بتائے گا کہ تمہاری وجہ سے ہم لوگوں کو کون مشکلات کا سامنا کرنا پڑا.....“

”تم لوگوں نے بلاوجہ خود کو میرا محافظ سمجھ رکھا ہے۔ میں کسی کی پناہوں میں نہیں ہوں خود مختار ہوں اور وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”اگر یہ خیالات نیوکی کو معلوم ہو جائیں؟“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں منافقت کی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ لڑکی نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ کمرے میں خاموشی ہو گئی سب کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ بوڑھی عورت اور مرد کبھی کبھی خوفزدہ لگا ہوں سے میری شکل دیکھ لیتے تب میں نے کہا۔

”آپ لوگ میری موجودگی کو محسوس نہ کریں۔ میں بس کیا ہوں اس کا آپ کو اعزازہ نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں نوجوان تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔ میری بیٹی تو نیسا کے دل میں نیوکی کیلئے نفرت بیٹھ گئی ہے۔“

”اور یہ نفرت آخر کار ایک دن ہمارے خاندان کو تباہ کر دے گی۔“ نیلس نے کہا۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے باہر کے لوگوں میں نہ بیٹھنے دوں اور اس کے خیالات دوسروں تک نہ پہنچنے دوں۔ میں اس کے ذہن کو نہیں بدل سکتا۔“

”ٹھیک ہے پھر تباہی کا انتظار کریں۔“ نیلس نے کہا پھر بولا۔

”کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تم کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کر لو۔“

بہترین کھانا مجھے کھلایا گیا اور ایک جگہ میرے آرام کیلئے مخصوص کردی گئی۔ ایک بار پھر میرے ذہن پر عجیب و غریب خیالات سوار ہونے لگے۔ اگر میں ان لوگوں کو بتاتا کہ بھائیو! میں پتا نہیں ان سے کتنے بعد کی دنیا کا انسان ہوں اور میرا تمہاری اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ تک نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو اور تمہارا یہ کیا چکر چلا ہوا ہے۔ کورتی ویسے تو یہ سب کچھ میرے انتہائی دلچسپ ہے ایک عجیب و غریب کہانی میری معلومات میں شامل ہو گئی ہے اور مجھے اچھی خاصی دلچسپی کا احساس ہو رہا ہے لیکن پتا نہیں کیوں میرا ذہن کچھ الجھا الجھا سا ہے۔

بہر حال بہت دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے نیند آگئی تھی۔ نجانے کب تک میں سوتا رہا۔ اس کے بعد جاگا منہ ہاتھ دھویا۔ گزرے ہوئے ماحول میں مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا جو مجھے مہابھارت کے دور میں راج لیکھک کے نام سے پکارا گیا تھا اور اب..... اب میں پولیسیس تھا۔ نام سے تو یہ اعزازہ ہو رہا تھا کہ میں یونان میں ہوں لیکن جب ان لوگوں نے یونان کا نام لیا تب مجھے احساس ہوا کہ یہ یونان ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں معلومات حاصل کروں کہ میں کون سی جگہ ہوں اور یونان کی تاریخ کے کس دور میں ہوں۔

بہر طور اچانک ہی لڑکی نے مجھ سے سوال کر لیا۔

”سنو میری بات سنو! تمہارا نام پولیسیس ہے نا! تم نے کبھی نیوکی کو دیکھا ہے۔“

”نہیں..... کبھی نہیں۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”کبھی نہیں..... تعجب کی بات ہے۔ کیا تم نے نقدیروں کا کوئی ایسا مالک دیکھا ہے جس کے بدن پر لمبے لمبے بال

ہوں اور وہ بول بھی نہ سکے۔“

”نہیں میں نے نہیں دیکھا۔“

”تو پھر کارگرس میں تم ایک ایسے شخص کو ضرور دیکھو گے اور تم یہ دیکھ کر بہت خوش ہو گے کہ وہ تمہارا شہنشاہ ہے۔“

”اور پولیسیس تمہارا واسطہ کبھی پاگل عورت سے پڑا ہے۔“ پولیسیس نے تلملانے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے لگا تو وہ خود ہی بولا۔

”خوش نصیب ہو میرے دوست! اگر تم عورتوں کے درمیان رہتے تو ان کی حماقتیں تم سے آدمی صلاحیتیں چھین لیتیں۔ یہ وہ مخلوق ہے جو سوچتی کم اور بولتی زیادہ ہے۔ اب میری بہن کو ہی لے لو جسے خوبصورت شکل تو مل گئی ہے لیکن عقل اسے چھو کر بھی نہیں گئی اور وہ صرف طنز یہ لہجے میں گفتگو کرنا جانتی ہے۔“

”اور کارگرس کے مرد صرف غلامی کے قائل ہیں۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”میں تمہیں آخری بار اطلاع دے رہا ہوں تو نیسا کہ خود کو سنبھال لو ورنہ میں ایک سرکاری فرض شناس کی حیثیت سے تمہیں گرفتار کر کے شہنشاہ کے سامنے پیش کروں گا اور اس کے بعد ذمہ دار نہ ہوں گا۔“

”دل کی گہرائیوں سے میں اس بات کی خواہش مند ہوں۔ اس طرح ممکن ہے یہاں کے بزدل بھائیوں کی غیرت جاگ اٹھے۔“

”کیا مطلب ہوا اس بات کا۔“ نیلس نے پوچھا۔

”شہنشاہ نیوکی کا مستند خاص یہ بات نہیں جانتا کہ شہنشاہ کو عورتوں سے بڑی رغبت ہے اور میری صورت کافی دلکش ہے۔ شاہ مجھے سزا تو نہیں دے گا میرے سفید بدن کی سرخ لکیریں تیرے لئے کافی دلکش ہوں گی۔“

”بات حد سے بڑھ رہی ہے تو نیسا۔ تو اتنی بے باک ہو گئی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے اب تجھے ہمیشہ کیلئے اس سلسلے میں زبان بند کر لینی چاہئے۔ آئندہ میں اس بارے میں کچھ نہ سنوں۔“ اس بار بوڑھے شخص نے غل دیا۔

”صرف ایک بات کہہ دو بابا میں خاموش ہو جاؤں گی۔“

”کیا؟.....“ بوڑھا بولا۔

”میں جموٹ بول رہی ہوں۔“

”جموٹ ہو یا سچ، تجھے کون اس کے پاس لے جا رہا ہے۔“

”لیکن میں جانا چاہتی ہوں۔“

”آخر کیوں؟“

”اس لئے کہ میری سرزمین کی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک ہوا ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ ان کا کوئی محافظ باپ یا بھائی نہیں ہے۔“

”ہوتا بھی تو کیا کر لیتا۔“ بوڑھے کے لہجے میں بے بسی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس لڑکی کے سوالوں نے ذہنی اذیت پہنچائی ہے۔

”اگر یہ بات ہے بابا تو اس سرزمین کی ہر لڑکی اپنا تحفظ کھو بیٹھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کارگرس میں رشتوں کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ نا کوئی کسی کا باپ نا کوئی کسی کا بھائی۔ یہ رشتے تحفظ کی غیرت کے رشتے ہوتے ہیں اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر سب کو آزادی مل جانی چاہئے۔ چنانچہ میں جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں مجھے کرنے دیا جائے اور کہا جائے کہ شہنشاہ نے

مجھے دیکھ لیا ہے اور آپ لوگ بے بس ہیں۔“

”تو نیسا۔“ بوڑھا شخص چیخ پڑا۔

”مجھے غلط ثابت کر دیں بابا صاحب! آپ نہیں جانتے کہ اپلا سا کے پورے بدن پر خراشیں تھیں اور ان خراشوں میں خون جما ہوا تھا۔ اس کے بدن سے جگہ جگہ بھورے بال چپکے ہوئے تھے۔“

”تو اسے بھول نہیں سکتی۔“

”بھول جاتی، لیکن یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی کہ میرا بھائی اس کا شریک کار ہے۔“

”ان معاملوں میں تو میں اس کا شریک نہیں ہوں۔“ نیلس چیخ اٹھا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اس کی زندگی کے مختلف شعبے ہیں ان میں سے ایک شعبہ تمہارے پاس ہے۔“

”میں کیا کروں..... میں کیا کروں۔“ نیلس غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”بتاؤ میں کیا کروں؟“ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے جا بیٹھی اس نے اپنی گردن اونچی کر دی اور آنکھیں بند کر کے بولی۔

”تمہارے پاس جو خفیہ ہے اس کی دھار بہت تیز ہے اسے نکال کر میری گردن پر پھیر دو جن لڑکیوں کے باپ اور

بھائی زندہ ہیں انہیں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہئے۔ اسی میں ان کی نجات ہے ورنہ پھر بیٹیاں کیا

کریں۔ مجھے جواب دو میرے دلیر بھائی۔ ان بہنوں اور بیٹیوں کو کیا کرنا چاہئے۔“

”تیرا بھائی کیا کر سکتا ہے بول تیرا بھائی کیا کر سکتا ہے مجھے جواب دے۔“ نیلس جذباتی ہو گیا۔

”ہم لوگوں میں اتنے بزدل لوگ بھی ہیں جو اس سے اتنا ڈرتے ہیں۔“

”جتنا چاہو ذلیل کر لو لیکن مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”کیوں کر رہے ہو یہ سوال؟“

”میں تم سے تعاون کرنا چاہتا ہوں میں زخمی ہو گیا ہوں۔ میں کہہ دوں گا کہ اب میں اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر

ہوں۔“

”اوہ..... اوہ..... تو کیا تم..... تو کیا تم.....“ اچانک ہی تو نیسا کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرا گئی۔ وہ خوشی سے

مسکرا پڑی۔



”ہاں اتونے مجھے ذلیل کیا ہے۔“ نیلس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور تو نیسا اپنی جگہ سے اٹھ کر نیلس کے سینے سے جا لگی، پھر اس نے کہا۔

”اب ساری بیٹیوں کو محفوظ مل جائے گا۔ اب شاید اس سرزمین کی تقدیر بدل جائے گی۔“ وہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔

”تو جو کہے گی میں وہی کروں گا۔ لیکن میں تمہا اس کھیل کو ختم نہیں کر سکتا میں کمزور ہوں۔“

”میرے بیٹا بھائی اس کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان کا سہارا حاصل کرو۔ اب ان کے ساتھ شامل ہونے کیلئے انہیں تلاش کرو جن کے خلاف تم کام کرتے رہے ہو۔“

اچانک ہی نیلس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”اور تم..... تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

ایک بار پھر میرے سر میں مچلی ہونے لگی۔ میں نے دل میں کہا کہ پیارے بھائی مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے یہ بدن بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ مجھے اچانک ہی ذیشان عالی سے پولیسیس بننا پڑا ہے جبکہ میں یا میرے خاندان میں بھی آج تک پولیسیس نہیں پیدا ہوا۔

بوڑھا غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد نیلس نے کہا۔

”اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو ہمارا محسن ہے ہماری الجھنوں کا شکار ہو گیا ہے۔ بہر حال اب جو کچھ بھی ہے وہ ایک الگ بات ہے میرا خیال ہے کم از کم اسے ذہنی طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میرے دوست رات ہو گئی ہے۔ تم آرام کرو۔ ہم لوگ تو فصول لوگ ہیں اپنی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔“

میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی اس آرام گاہ میں واپس آ جاؤں اور اپنے بارے میں سوچوں۔ ویسے بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ایک عجیب الجھا ہوا معاملہ ہے۔ جس کا سر پاؤں میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لاکھ میں تاریخ کے کسی اجنبی دور میں آ گیا ہوں لیکن بھلا مجھے ان ساری باتوں کے بارے میں کیا معلوم۔

اس وقت رات غالباً اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ جب مجھے اپنی آرام گاہ کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا میں جاگ رہا تھا۔ آنے والا بوڑھا شخص تھا۔ یعنی نیلس کا باپ جس کا نام ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو۔ میرا ذہن شدید الجھنوں کا شکار ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اندر آ جاؤں۔“

”ہاں..... ہاں محترم بزرگ اندر آئیے۔ بھلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔“

بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میری شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”جو الفاظ میں ادا کروں گا اگر ان میں تمہیں کچھ ناگوار گزریں تو ایک عمر رسیدہ شخص سمجھ کر معاف کر دینا۔ اصل میں

مجھے اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ یہ ساری باتیں سن کر تمہاری آنکھوں میں اجنبیت ابھرتی ہے۔ چہرے کے نقوش کبھی نہیں بولتے۔ اگر انسان ان پر قدرت رکھتا ہو لیکن آنکھیں ہر لمحہ ہر اکھن کا اظہار کر دیتی ہیں اگر ان میں دیکھنے کی صلاحیت تمہارے اندر ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ہر بات سے اجنبیت محسوس کی ہے۔ کیا تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے کہ ایسا کیوں ہے؟“

”میں آپ کے اس شہر میں اجنبی ہوں جیسا کہ آپ کے بیٹے نے بتایا کہ میں صرف جنگل میں اسے ملا تھا اور اس کی مدد کر کے اس سے شناسائی حاصل کی۔“

”خیر..... تم جو کوئی بھی ہو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم جس دور میں ہیں یہ دور یونانی تہذیب کا زریں عہد ہے جس میں اقتصادی عمرانی اور سیاسی ادارے ارتقا کے کمال پر پہنچ گئے ہیں اور ہماری ثقافت نے بھی بعض پہلوؤں پر ترقی کر لی ہے۔ میں تمہاری سی تمہیں معلومات فراہم کروں۔“

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر ایجیہ کی تہذیب کی بیرونی چوکیوں سے کچھ ایسے معاملات علم میں آئے ہیں جو کچھ مشکلات کا باعث بن گئے ہیں..... مینون اور بہترین یونانی بہادر لٹیکیز کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے اور لٹیکیز روٹھ کر دور چلا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے لڑائی میں یونانیوں کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہمارا جھگڑا لڑائے سے ہے۔ لڑائے کے دو جوان ہیکٹر اور پیٹر وکوس قتل کر دیے گئے ہیں۔ پیٹر وکوس جو لٹیکیز کا انتہائی عزیز دوست تھا۔ غمزہ لٹیکیز نے انتقام میں ہیکٹر کو قتل کیا ہے اور وہ عجیب و غریب واقعات بڑی عجیب و غریب حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو ایک اور یونانی جنگ جو اوڈیسوس کو پیش آئی وہ لڑائے کی شکست کے بعد ایک انوکھی حیثیت کی حامل ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب لٹیکیز نے ہیکٹر کو قتل کرنے کیلئے قدم اٹھایا تو اسے ہتھیار پہنچائے گئے اور ہتھیار پہنچانے والا اسلحہ سازی کا دیوتا تھا۔ جب لٹیکیز نے ہیکٹر کی لاش کو لڑائے کی فصیل کے ارد گرد کھینچتے پھرتا تھا تو دیوتاؤں نے مداخلت کی اور کہہ سن کر اسے راضی کیا کہ ہیکٹر کی لاش مناسب تدفین کیلئے اہل لڑائے کے حوالے کر دی جائے۔ دیوتاؤں کے ساتھ غیر معمولی گہرے روابط پر یونانی کہانیاں بڑی عجیب و غریب حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تو شاید تمہیں علم ہو ایک یونانی ہونے کی حیثیت سے کہ یونان میں سورج کی حرکات کو اپولو سے منسوب کیا جاتا ہے اور سمندر میں جو طوفان آتے ہیں ان کا انتساب پوسیڈن سے ہوتا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی عقل حکمت کی دیوی استھنا بخشی ہے۔ لڑائی میں فتح فتح کے دیوتا ایریز کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور محبت میں کارمائی کا ذریعہ ایفروداٹ ہے۔ یہ تمام دیوتا کوہ اوپس پر رہتے ہیں اور ایک باقاعدہ خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں تمہیں ہیرا کے بارے میں بتاؤں کہ جب حیران کن کردار تھا۔ ہیرا کا کہنا ہے کہ جناب زیوس کیا آپ ایریز کے کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے میرے خیال میں تو اسے سزا ملنی چاہئے۔ بادلوں کو سیٹھے والے زیوس نے جواب دیا۔

”جو کچھ چاہتی ہے کہ گزر استھنا کو بھیج دے وہ خوب جانتی ہے کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔“ چنانچہ استھنا اتر کر یونانی فوج میں آئی اور دیومیدیز سے کہا۔

”دیومیدیز تو واقعی یونانیوں کا سب سے بڑا جواں مرد ہے تو ایریز یا کسی دوسرے غیر فانی سے کیوں ڈرتا ہے۔ اٹھ اس پر حملہ کر! اس پر کاری ضرب لگا وہ ایک پاگل اور تند خلوک ہے۔ اس کے سامنے ہرگز نہ جھک۔ وہ شرارت کا مجسمہ ہے وہ ہرجائی ہے۔ کل میرے اور ہیرا کے سامنے کہہ رہا تھا اور قسم کھا رہا تھا کہ میں اہل لڑائے سے جنگ کروں گا اور یونانیوں کو مدد دوں گا۔ اب وہ اہل لڑائے کا ساتھی ہے اور اپنا وعدہ بھلا بیٹھا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ استھنا بڑے اضطراب کے عالم

میں دیومیدیز کے پاس گئی اور اس کے جنگی رتھ پر سوار ہو گئی اور رتھ کے دھڑے سے چنچ کی سی آوازیں نکلنے لگیں کیونکہ اس پر ایک تند خو آدمی کے علاوہ ایک ہولناک دیوی بھی سوار ہو گئی تھی۔ تب استھنا نے چابک اور باگیں پکڑیں اور گھوڑے سیدھے ایریز کی طرف بڑھے۔ استھنا نے ہیڈیز کی ٹوپی سے اپنے آپ کو چھپا لیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایریز اسے دیکھے۔

بوڑھا ایک وجد کے سے عالم میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور یہ تمام باتیں میرے ذہن کے مختلف خانوں میں کھٹ کھٹ کر کے فٹ ہو رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یونان کے قدیم ماحول پر میں کوئی داستان لکھوں تو کیا یہ تمام باتیں مجھے یاد آجائیں گی۔ میں انہی سوچوں میں تھا کہ بوڑھے کی آواز ابھری۔

ایکا مینون لڑائے کی جنگ میں یونانیوں کا قائد تھا۔ وہ انسانی قربانی کو بنیادی حیثیت دیتا تھا۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ ڈوگی آرمیس اس پر مہربان ہو جائے جس نے غلط سمت میں ہواگیں چلا کر لڑائے کے خلاف مہم میں رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی چنانچہ اس نے اپنی بیٹی اپنی جینا کو قربان کر دیا اور یہاں سے ایک مینون کے خاندان کی خوبی داستان کا آغاز ہوا اس کی دیوی کلانٹم نے اپنی بیٹی اپنی جینا کے انتقام کا ارادہ کیا اور اپنے شوہر مینون کو قتل کر ڈالا۔ مقتول کی اولاد میں سے دو بچے زندہ بچے تھے۔ انہوں نے اپنی ماں کے خلاف انتقام کا ساز باز کر لیا، اصل میں مسیجی مراسم کے موقع پر انسانوں کی جگہ گھوڑوں سواروں اور موٹیہیوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں ہر شہر اور ہر آبادی کے خاص مقامی تہوار تھے۔ سب سے بڑا تہوار ہر چار سال کے بعد اولپیا میں منایا جاتا تھا۔ جہاں زیوس کا معبد تھا اور یہیں پر اولپیا کی کھیل شروع ہوتے تھے اور ان کے خاتمے پر خاص مذہبی مراسم ادا کئے جاتے تھے۔ جو لوگ مقابلے میں کامیاب ہو جاتے ہیں انہیں مقدس لارن کے بتوں کا پاٹ پہنایا جاتا ہے یہ کھیل صرف پانچ دن ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی چیزیں ہیں ان کا سلسلہ بارہ سو سال سے جاری ہے۔“

میں ایک کردار کی حیثیت سے یونان سے روشناس ہو رہا تھا اور اب میں نے بوڑھے شخص کو باقاعدہ اپنے سوالات کا نشانہ بنالیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”یونانی فن تعمیر کے بارے میں آپ کی اپنی کیا رائے ہے معزز بزرگ؟“

”اس میں ستون زیادہ بنائے جاتے ہیں اور سنگ مرمر کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے خاص طور سے میں تمہیں بالائے حصار کی عمارت پار تھیمان کی طرف متوجہ کرتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ وہ عمارت کون سے سن میں بنائی گئی تھی۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ عمارت چار سو سینتالیس قبل مسیح میں بنائی گئی اور پار تھیمان ایک انتہائی خوبصورت مندر کی عمارت تھی آج کل اس کے کھنڈرات تمہیں مل جائیں گے مگر بڑی وضع قطع کی عمارت تھی اس کے ستون سیدھے جاتے تھے اور چمٹ پر پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے لیکن اب پار تھیمان کھنڈر بن چکی ہے اور یونانی تعمیر کے دوسرے شاہکار بھی پریتلیس کے دور سے اب تک بہت خراب ہو چکے ہیں یہی کیفیت یونان کی مجسمہ سازی کی ہے۔“

بوڑھا مجھے پورے یونان سے روشناس کرا رہا تھا۔ اس کے خیال میں میں یورسیس تھا۔ لیکن اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ میں کس دور کا کون سا انسان ہوں بوڑھا کہہ رہا تھا۔

”بقراط کے دبستان نے یونان کے پرانے تصورات کو ٹھکرا دیا کہ بیماریاں صرف دعاؤں سے دور ہوتی ہیں انہوں نے علاج کے نئے طریقے دریافت کئے تھے۔ یہ بات کافی آگے بڑھی اور بڑے بڑے فلسفیوں نے اس میں مداخلت کی۔ سقراط افلاطون اور ارسطو نے غور و فکر کی کائنات انسان کو بنالیا۔ سقراط تقریباً چار سو اہتر قبل مسیح کا سکتر اش تھا۔ وہ

پتھر کی عمارتیں بناتا تھا۔ اس نے پوری زندگی اتھنز کے گھروں میں باتیں کرنے اور سننے میں گزار دی۔ لیکن ان لوگوں کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو نئے نئے خیالات کے حامی تھے اور خوش فہمی اور خوش عقیدگی کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ سقراط کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ ارسطو۔ فوج نے اس پر شدید حملہ کیا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ دیوتاؤں کی بے حرمتی کرتا ہے اور اتھنز کے نوجوانوں کا اخلاق بگاڑ رہا ہے چنانچہ اس پر مقدمہ چلا اس نے کہا کہ میں مذہبی مراسم کا ٹھیک ٹھیک پابند ہوں اور اپنی قوم کو باعزت بنادینے کا خواہش مند ہوں اگر تم مجھے موت کی سزا دو گے تو میرا بدل تمہیں آسانی سے نہیں ملے گا۔ میری حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرو تم لوگوں نے مجھے دولت سے وابستہ کر دیا ہے اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ میں انسانوں کو بہکا رہا ہوں، لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھ جیسا انسان تمہیں دوبارہ کبھی نہیں ملے گا، لیکن اکثریت کے حکم سے سقراط کو موت کی سزا دے دی گئی اور زہر کا پیالہ پی لینے کے بعد وہ مبر سے موت کا انتظار کرنے لگا اس نے کہا کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو یہ تو عورتوں والی باتیں ہیں مبر سے کام لو۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور پھر پکڑا ہٹا کر بولا۔

”کریٹیک اسکلیس کا ایک مرغ مجھے دینا ہے کیا تم یاد سے میرا یہ قرض ادا کر دو گے۔“ کروٹو نے پوچھا اور بھی کوئی کام ہے اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا اور ایک دو لمبے کے بعد حرکت سی ہوئی چہرے سے پکڑا ہٹایا گیا سقراط کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ کروٹو نے آنکھیں بھی بند کر دیں اور منہ بھی بند کر دیا یہ سقراط کا انجام تھا اور پھر سقراط کے بعد الفلاطون نے چار سو ستائیس سال قبل مسیح میں سقراط کی زندگی کے واقعات اور اس کی تعلیمات مرتب کیں۔ الفلاطون ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اتھنز میں ایک درس گاہ قائم کی جسے اکاڈمی کہتے تھے اور اس نے اپنی زندگی تالیف و تصنیف میں گزار دی۔“

بوڑھا خاموش ہو کر کچھ آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے بھی وہ آوازیں سن لیں، تجھی بوڑھے کی آواز ابھری۔

”کوئی آرہا ہے اور کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ میں اپنے بچوں سے خوفزدہ رہتا ہوں ان کا خیال ہے کہ میں بہت زیادہ باتوں میں ہوں اور یونان پرست ہوں ہر وقت یونان کی تاریخ میں کھویا رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بوڑھا جلدی سے باہر نکل گیا، باہر کچھ باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور میں نے ان آوازوں کو محسوس کر لیا، ان میں ایک نسوانی آواز بھی جسے میں نے پہچان لیا، وہ تو نیسا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں دروازے سے باہر آیا تو مجھے تو نیسا نظر آئی جو مجھے دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرا دی اور بولی۔

”میں جانتی ہوں بابا صاحب تمہیں زبردستی یونان کی پرانی باتیں سننا ہے ہوں گے لیکن اب ان کی جگہ میں لینا چاہتی ہوں۔ بس ایک آس پر یہاں آئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ تم سے بات کروں گی جیسا کہ میرے بھائی نیولس نے بتایا کہ تمہارے بازوؤں میں فولاد بھرا ہوا ہے اور تم ایک وحشی درندے کو باسانی ہلاک کر سکتے ہو تو مجھے تو ایسے ہی کسی شخص کی ضرورت ہے جسے میں اپنا ہمنوا بنا سکوں کیا میرے ساتھ کچھ وقت صرف کر پاؤ گے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے تو نیسا کے حسین جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں مجھے فہمی آ رہی تھی کہ میڈم تو نیسا! اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں آج سے ہزاروں کیا لاکھوں سال بعد کے دور کا انسان ہوں اور میرا نام پولیسیس نہیں بلکہ ایک نرم و نازک نام دیشان عالی ہے اور میں صرف ایک گلشن رائٹر ہوں تو آپ کا سر چکرا کر رہ جائے گا اور پھر آپ مجھ سے کوئی بات نہیں کر پائیں گی تاہم ظاہر ہے مجھے کوروتی نے جس ماحول میں پہنچا دیا تھا یا میں اس کی کتاب کے جن الفاظ سے نیچے گر پڑا تھا۔ مجھے اسی دور کی باتیں کرنی تھیں جب تک کہ واپسی کا کوئی راستہ نظر آ جائے یا

پھر کوروتی مجھے کسی اور شکل میں یہاں نظر نہ آجائے یہ سب کچھ مجھے کرنا ہی تھا۔  
تو نیسا مجھے ایک جگہ لے کر بیٹھ گئی، پھر اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”تمہیں دیکھ کر کچھ عجیب عجیب احساس ہوتا ہے یوں لگتا ہے جیسے تم یونان سے تعلق نہ رکھتے ہو بلکہ کوئی اجنبی انسان ہو۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں بہت دور سے آیا ہوں ایک سیاح ہوں جو دنیا کے سفر پر نکلا ہے اور مختلف چیزوں کو دیکھتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے بہت ہی اچھی بات ہے۔ اگر تم اس سرزمین کو ایک عجیب و غریب شخصیت سے نجات دلا دو تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ تمہارا عظیم کارنامہ ہوگا، تمہیں معلوم نہیں کہ وہ وحشی درندہ انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ انسان اسے صرف اس لئے قبول کئے ہوئے ہیں کہ اس نے ایک ایسی عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے جو شہنشاہ کی بیٹی تھی آؤ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ میرا بازو پکڑے پکڑے اپنی خواب گاہ میں آ گئی اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میں تمہیں اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔“

”تم نے مجھے عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ایک جانور نما شے انسان کے جسم سے پیدا ہوئی ہے۔“  
”یہی تو نصیبی ہے ہماری اور اس دور کی۔ اس کا نام نیوسکی ہے نیوسکی۔ ہوا یہ تھا کہ نیوسکی کی ماں ایک بار اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں ٹکلی تھی کہ وہاں بن مانسوں کے ایک گروہ نے ان کا محاصرہ کر لیا، بندر نما انسانوں نے بڑی تباہی مچائی اور ایک لوس کے گروہ کے بیٹا انسان ختم کر دیئے۔“

ایک لوس جان بچا کر بھاگا تو اس کی بیٹی وہیں پر رہ گئی اور بن مانسوں نے اسے پکڑ لیا، کوئی ایک سال کے بعد جو مہم ایک لوس کی بیٹی کو تلاش کرنے کیلئے نکلی تھی اسے اکار شہ جو ایک لوس کی بیٹی کا نام ہے دستیاب ہو گئی اور وہ لوگ اسے محل لے آئے۔ ایک لوس اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوا، لیکن بد نصیبی یہ تھی کہ اس کی بیٹی حاملہ تھی اور پھر اس نے بن مانس کی اولاد کو جنم دیا، جس کا نام نیوسکی رکھا گیا، نیوسکی بندر کا بیٹا تھا۔ مکمل بندر۔ لیکن عقل و دانش والا انسان اور پھر اس کے نام کے ساتھ جو تباہی پھیلی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی میں تمہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی پولیسیس! ایک لوس کا نواسہ کن کیفیتوں کا حامل تھا۔ وہ بہت ہی گندی فطرت کا مالک ہے اور کارگرس کے بیٹا گھرانوں میں اس کی غلامیتیں پھیل چکی ہیں اور اب اب وہ یہاں حکومت کر رہا ہے اور اس کی حکومت میں ایک شخص بھی محفوظ نہیں ہے میرے لئے اس سے زیادہ غم کی بات اور کوئی نہیں تھی کہ نیولس میرا بھائی اس کا ملازم خاص ہے۔“

میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ کاش اس بار بھی میں اپنی دنیا میں بخیر و خوبی واپس جا سکوں اور میری کتاب زندہ صدیاں یونان کے اس پس منظر میں ایک انوکھی کہانی سے دنیا کو روشناس کرے۔ کاش! آہ کاش۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میں نے دل میں سوچا کہ مجھے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر کام کرنا چاہئے اور اس کیلئے میرے پاس نیولس ایک بہترین مہرہ تھا۔ چنانچہ دوسرے دن جب نیولس مجھے ملا تو میں نے اسی موضوع پر بات کی میں نے اس سے کہا کہ میری ملاقات اس کی بہن سے ہوئی اور اس نے مجھے سارے معاملات میں تفصیلات بتائیں۔

”ہاں..... میں تمہیں اپنے دل کی بات بتانا چاہتا ہوں پولیسیس! اب جبکہ میری بہن نے میرے دل میں سوئے ہوئے انسان کو جگا دیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ واقعی نیوسکی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے اب میرے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت جنم لے رہی ہے۔ رشتے کتنے مضبوط ہوتے ہیں اور انسان کس قدر کمزور۔“

”میں سمجھتا ہوں نیولس کہ انسان کو رشتوں سے متاثر ہونا چاہئے اور نہ اپنی کمزوری اور طاقت سے بات حق گوئی کی ہو تو وہ صرف یہ فیصلہ کرے کہ وہ کون سے راستے کو بہتر سمجھتا ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں تمہیں حیرانی سے یہ بات بتاؤں کہ وہ صرف بدن ہے ایک جانور کا بدن اس کی اصل حیثیت اور اصل زبان اس کی ماں ارکاشہ ہے۔“

”اودہ کمال کی بات ہے کمال کی بات ہے ارکاشہ یعنی ایگائوس کی بیٹی۔“

”ہاں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”لیکن کیوں وہ ایسی کیوں ہے جبکہ وہ تو انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔“

”یہ بھی ایک نفسیاتی عمل ہے میرے دوست ارکاشہ جو انہی بے پناہ خوبصورت تھی ظاہر ہے اس کے دل میں بھی بہت سے خیالات اور خواہشیں ہوں گی لیکن اس کے حکم میں پرورش پانے والا وجود ایک بن مانس کا وجود تھا۔ ظاہر ہے اس کا دل اس کے احساسات ٹوٹے ہوں گے اور اسے اپنے باپ سے شکایت ہوگی کہ ایگائوس نے اسے کس طرح جانوروں کے حوالے کر دیا بس یوں سمجھ لو کہ وہ اپنے کچلے ہوئے احساسات کا بدلہ لے رہی ہے۔“

”کیا ایگائوس زندہ ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں۔“

”اور تم؟ تم اس کی ملازمت کر رہے تھے۔“

”ہاں میرے دوست لیکن آج تو نیولس کی باتوں نے مجھے جگا دیا ہے۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے وہ کہ ایک جانور انسانی نسل کو کس بے دردی سے خراب کر رہا ہے۔ میں آج سے بالکل بدل گیا ہوں۔“

”تم نے غور نہیں کیا شاید کیا تم اتنی جلدی اپنے احساسات کو بدل سکتے ہو نیولس؟“

”ہاں میں بدل سکتا ہوں میرے گھر کے لوگ بہت کم ہیں اگر ان میں سے ایک کی زندگی ختم ہو جائے تو دوسرے بے موت مر جائیں گے چنانچہ اگر میری بہن اس طرح کام آگئی تو میرے ماں باپ اور خود میں بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔“

”تب پھر تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے تم ابھی اس سلسلے میں کوئی ایسا عمل نہ کرنا جس سے بقول تمہارے ارکاشہ کو تم پر کوئی شبہ ہو جائے۔ اچھا مجھے ایک بات بتاؤ کیا یونان کے اس خوبصورت شہر کے دوسرے لوگ جو یونان کا دارالحکومت ہے جس کا نام کارگس ہے اس کے خلاف بغاوت نہیں کرتے میرا مطلب ہے وہ لوگ جن کی بیٹیاں یا جن کے گھر کی عورتیں نیولس کا شکار ہو چکی ہیں۔“

”باغیوں کا ایک گروہ باقاعدہ مل رہا ہے اور اس نے شہر سے باہر اپنی رہائش گاہیں بنالی ہیں اور مستقل طور پر تیاریاں کر رہا ہے اودھ ارکاشہ کے حکم سے ہمارے میرا مطلب ہے ارکاشہ کے سپاہی باغیوں کے اس گروہ کو تلاش کر کے چن چن کر قتل بھی کر دیتے ہیں دیے تمہیں حیرت ہوگی کہ نیولس ایک جانور ہونے کے باوجود انسانوں کی طرح بولتا ہے باتیں کرتا ہے سوچتا ہے بے شک اس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے لیکن ارکاشہ اسے بہت سی باتوں سے آگاہ کرتی ہے ٹھیک ہے ایگائوس کی موت کے بعد ارکاشہ کا بیٹا ہی وہاں حکمران ہے۔“

”ٹھیک ہے اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ؟“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور نیولس میری شکل دیکھنے لگا پھر بولا۔

”ہاں کہو۔“

”کیا تم مجھے بھی ارکاشہ کے یا نیولس کے عمل میں کوئی جگہ دلا سکتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”میں وہاں نیولس کی کاخام خاص بننے کا خواہش مند ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور نیولس حیران انداز میں مجھے دیکھنے پھر بولا۔

”میں تمہیں ایک بات کہوں تم درحقیقت میری سمجھ میں نہیں آئے آج تک میں تمہیں سمجھنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”میری ان باتوں کو چھوڑ دو تم مجھے سمجھ کر کیا کرو گے اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی الجھن نہیں ہوگی۔“

”مجھے یقین ہے میرے دوست میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کروں گا۔“

”تو پھر تم میرے لئے عمل میں جگہ نکالو کیا یہ ایک مشکل عمل ہوگا؟“

”نہیں میں اسے ہی اختیارات رکھتا ہوں میں تمہیں نیولس کے مخصوص مافظوں میں جگہ دلا سکتا ہوں اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ تقریروں کا حکم میرے ہی سپرد ہے۔“

”تب ٹھیک ہے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی لیکن اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میرے لئے بہت ہی دلچسپ سوالات ذہن میں آکھڑے ہوئے تھے۔ میں یونان قدیم میں ہوں اور یوڑھے بزرگ نے مجھے یونان کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ میں قدیم یونان سے واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ دور کا تعین بھی ہوتا جا رہا تھا۔ یوڑھے شخص کی عمر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ لیکن یہ ضرور اندازہ تھا کہ وہ بہت ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور قدیم یونان سے لے کر اب تک کے یونان میں اس نے خاصا وقت گزارا ہے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کی ہے مزے کی بات یہ تھی کہ میں بے شک اتفاقیہ طور پر اسرار کتاب کے ان الفاظ پر گر پڑا تھا جن پر یقیناً یونان لکھا ہوگا۔

کسی بھی زبان میں مجھے اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کتاب پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ کون سی زبان کے ہیں البتہ مزے کی بات یہ تھی کہ میں جس دور میں بھی ہوتا اور جس علاقے میں بھی ہوتا وہاں کی زبان بخوبی بول اور سمجھ سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری شخصیت ہی بگڑ چکی تھی پولیسیس کون تھا۔ یونان کی تاریخ میں پولیسیس کا کیا مقام تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا مجھے۔ لیکن نیولس کے بارے میں جو کہانی میرے علم میں آئی تھی وہ ناقابل یقین سی تھی البتہ اس کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ارکاشہ بن مانسوں کی صحبت میں رہی تھی پتہ نہیں اس بن مانس کیلئے اسکے دل میں کیا جذبات تھے جس کی اولاد کو اس نے نیولس کی حیثیت سے جنم دیا تھا۔ جدید دنیا میں اس داستان کا تصور کر کے مجھے خود پر ہنسی آنے لگی وقت نے اگر مجھے موقع دیا اور میں نے زندہ صدیاں کتابی شکل میں لکھیں تو کیا لوگ اس پر یقین کر سکیں گے لیکن لوگوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا آپ کچھ بھی لکھ دیں ان میں کچھ لوگ اس سے متفق ہوں گے کچھ اسے صرف تفریحی کہانی سمجھ کر پڑھیں گے اور کچھ برا بھلا کہیں گے کہ رائٹر نے کیا اوگی بولگی چھوڑی ہیں۔

لیکن جناب ڈیٹان عالی کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ ڈیٹان عالی ہی جانتا تھا۔ البتہ میں نے اپنے جسم اور اپنی جسمانی طاقت پر بھی غور کیا تھا اور مجھے ہنسی آئی تھی بلکہ میں نے دل میں سوچا تھا کہ پولیسیس کی حیثیت سے اس وقت جو جسم میرے پاس ہے وہ امریکی ریسلر بروک لسز یا روسی ریسلر روسو سے کم نہیں ہے بلکہ اگر اس حیثیت میں میرا سامنا بہک وقت ان دونوں سے بھی ہو جائے تو میں ان کی ایسی ٹیمی کر کے رکھ سکتا ہوں۔

میرے ہانڈوں میں فولاد ٹرپ رہا تھا۔ خیر میں بروک لسز یا روسو کو ہرا کر کیا حاصل کر سکیں گا البتہ اگر یہ صحت مجھے



حاصل ہو جائے اور میں اپنی دنیا میں اسی انداز میں پہنچ جاؤں تو بس پھر حسنان وطن میرا خیال ہے میرے لئے خون خرابے پر آمادہ ہو جائیں، نجانے کب تک یہ خیالات دل میں آتے رہے اور اس کے بعد گہری نیند سوتا رہا۔ جاگا تو صبح ہو چکی تھی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ناشتے کیلئے بلایا گیا، ناشتے کے بعد نیولیس نے مجھے تیار ہونے کیلئے کہا اور میں وہاں سے چل پڑا۔ یونان کا شاہی محل لازمی طور پر ان تمام انگریزی فلموں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ جن میں اسی طرح کی چیزوں کی نقل کی جاتی ہے۔ اس پر کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے، کارگرس کا یہ یونانی محل اس سے بھی زیادہ حسین تھا اور میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے بہت متاثر تھا۔

شاہی محل کا تقریباً سارا ہی نظام نیولیس کے ہاتھ میں تھا اور جس جگہ نیولیس مجھے لے کر داخل ہوا وہاں سب کے سب اس کا احترام کر رہے تھے۔ شاہی محل کا یہ عظیم الشان کمرہ بہت ہی خوبصورت تھا اور اس میں ایک حسین تخت رکھا ہوا تھا جہاں نیولیس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے ایک الگ جگہ بیٹھنے کیلئے کہا، لیکن آہستہ لہجے میں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے جو حیثیت دے رہا ہے وہ میرے شایان شان نہیں ہے، لیکن اس کا پس منظر کچھ اور ہے۔ غرضیکہ نیولیس نے چند افراد سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں اس کے محافظوں میں سے ایک ہوں۔

مجھے محافظوں کا لباس دیا گیا جسے پہن کر میں نے ہتھیار وغیرہ ہاتھ میں سجائے اور دل ہی دل میں خود پر ہنسنے لگا، میں نے سوچا کہ کاش مجھے کسی جنگ میں شامل ہونے کا موقع مل جائے تاکہ زندہ صدیاں میں اس جنگ کا حال بھی لکھوں اور اپنی بہادری کے کارنامے بھی بیان کروں، یہ الگ بات ہے کہ لوگ اسے کوئی مزاحیہ باب ہی سمجھ لیں، خیر اس کے بعد میں نے تیاریاں کیں اور نیولیس کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کے کہنے کے مطابق نیوکی سے ملاقات ہو سکتی تھی اور پھر میں اندر داخل ہو گیا۔ لیکن ایک محافظ کی حیثیت سے میرے لئے یہ سب سے زیادہ حیرت ناک بات تھی کہ ایک گور یلا انسانی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور یہ الگ بات ہے کہ وہ آواز غنی غنی غنی اور خوں خوں خوں کی تھی اور اس کے کوئی معنی نہیں محسوس ہو رہے تھے، لیکن پولیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک، ہم کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں اس میں کامیابی بھی ہوگی۔“

جواب میں پھر خوں خوں کی آواز سنائی دی اور مجھے تعجب ہونے لگا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگی گوریلے کی زبان یہاں بہت اچھی طرح بھی جاسکتی ہے۔ آواز پھر سنائی دی اور نیولیس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، عالم پناہ میں جا رہا ہوں، آپ آرام کریں۔“

غرضیکہ نیولیس مجھ پر توجہ دینے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گیا، وہ اس اعلیٰ حیثیت کا مالک ہے یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی، کافی دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد اچانک ہی میں نے ایک اور منظر دیکھا، یہ یونان کی روایتی حسینا میں تھیں، بے حد خوبصورت لڑکیاں جو باریک لباسوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان کا رخ نیوکی کی خواب گاہ کی جانب ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئیں، نیولیس نے مجھے وہیں کھڑے رہنے کیلئے کہا، کچھ ہی دیر کے بعد اندر سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ساتھ ہی ساتھ لیوکی کی خوشخوار غرائیں بھی وہ شاید کسی پر بگڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ اس کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ان کا مفہوم سمجھ سکتے تھے، لیکن مجھے یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد وہ آوازیں جو پہلے قہقہوں کی شکل میں تھیں بدل گئیں اور اب اس میں ان لڑکیوں کی چیخیں اور کراہیں شامل تھیں جبکہ نیوکی کی غرائیں ابھر رہی تھیں۔

بڑا بے ہنگم شور تھا اور لڑکیوں کی چیخیں ایک عجیب سا ہنگامہ پیدا کر رہی تھیں، پھر وہ بدحواس ہو کر باہر نکل آئیں، ان کے لباس نچے ہوئے تھے اور جسوں پر جگہ جگہ خون نظر آ رہا تھا۔ نیوکی نے انہیں بری طرح زد و کوب کیا تھا۔ میں حیران تھا

کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، ان لڑکیوں کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد نیوکی باہر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کسی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں تیزی سے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میرے ساتھ تین محافظ اور آگے بڑھ آئے، نیوکی آگے کی جانب چل پڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اب وہ محل کی ایک خوبصورت راہداری سے گزر رہا تھا اور ہم چاروں خادم اس کے ساتھ تھے۔ ایک بار پھر اس نے پلٹ کر ہم لوگوں کو دیکھا اور مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوشخبر کے نجانے ان خادموں سے کیا کہا، غالباً اس نے انہیں روک دیا تھا اور صرف مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر وہ ایک کمرے کے قریب پہنچ کر رک گیا جہاں دو پہرے وار کھڑے ہوئے تھے۔ ان پہرے داروں نے نیوکی کو دیکھا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بھالے نیچے گرا دیئے، ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا، کیا حسین جگہ تھی، تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا اس کا۔ کوروتی نے مجھے نجانے کیسے کیسے ماحول سے روشناس کرا دیا تھا۔ کمرے میں بہت ہی اعلیٰ قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا جو قدیم طرز کا تھا۔ چاروں طرف رنگین پردے لہرا رہے تھے ایک بہت ہی خوبصورت مسہری کچھی ہوئی تھی اور اس خوبصورت مسہری پر جو کوئی موجود تھا اسے دیکھ کر میری آنکھیں شدت حیرت سے کھلی کہ کھلی رہ گئیں۔ ناقابل یقین اور نا سمجھ میں آنے والی بات۔ یہ کوروتی تھی، یونانی لباس میں ملبوس، حسن و جمال میں یکتا، چہرے پر عجیب سی حتمکت اور وقار، لیکن اس کے نقوش میں کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ مہابھارت کے دور میں وہ مجھے ایک اور حسینہ کی شکل میں ملی تھی اور اب یہاں نجانے کس نام سے موجود تھی۔

کمال کی بات ہے، واقعی کمال کی بات ہے، ناقابل یقین، وہ سامنے دیکھ رہی تھی اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ کون ہے، بہر حال میں آگے بڑھا تو وہ ایک عجیب سی کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گئی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک وحشت سی پیدا ہو گئی ہو۔ کچھی نیوکی نے سینے پر دو ہتھ مارے اور اپنے مخصوص انداز میں خوں خوں کرنے لگا۔ کوروتی کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس نے اس انداز میں ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ خود کو وحشت زدہ قیدی محسوس کر رہی ہو، پھر اس کے حلق سے ایک نفرت بھری آواز نکلی۔

”تو پھر آ گیا۔“ عالم کتے درندے۔“ اس کی آواز میں بڑی وحشت تھی اور میرے سر میں کھلبلی ہو رہی تھی، یہ کیا چکر ہے۔ ادھر نیوکی اپنے سینے پر ہاتھ مار رہا تھا۔

”لعنت بھیجتی ہوں میں تجھ پر کتے۔“ مجھے اس وقت کا افسوس ہے جب تو نے گندے کیڑے میرے بدن سے جنم لیا تھا۔“

نیوکی نے کچھ نہ کہا بلکہ اس نے انسانوں کی طرح ایک زرنگار کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا، میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا ہوا تھا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”تو بھی دیکھ رہا ہے وحشی غلام، درندے تجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تو اسے نکال کر باہر کر دے۔“

مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو، اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں، میں نے گردن جھکا دی تو وہ بولی۔

”ہاں میں جانتی ہوں تو کہتا ہے کہ تو صرف ایک غلام ہے، تیری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن اگر تو مجھے اس سے نجات دلادے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تجھے وہ حیثیت دوں گی جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا، اپنا یہ چوڑا بھالا اس کے سینے میں اتار دے، میں کہتی ہوں اسے قتل کر دے، میں کہتی ہوں قتل کر دے اسے۔“

کوروٹی کی وحشیانہ آواز ابھر رہی تھی اور صبح معنوں میں میری کھوپڑی پر جیسے بھونک مار رہے تھے۔ یہ عورت یہ نوجوان لڑکی اس کی تو کچھ عمر ہی نہ تھی اس کا حسن و جمال تو آفاقی حیثیت رکھتا تھا۔ کیا یہ اس گوریلے کی ماں ہے کیا یہ ارکاشہ ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے اعزاز میں شدید وحشت تھی اور وہ ایک ہی جملہ کہے جا رہی تھی۔

”مار دے اسے میں بھتی ہوں مار دے۔“

نیوسکی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں خوفناک چمک تھی میں نے لرزے کی اداکاری کی اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے ایک دم محسوس ہوا جیسے نیوسکی مطمئن ہو گیا ہو ادھر کوروٹی خوفزدہ لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور کبھی اسے پھر وہ بولی۔

”دیکھ بد نصیب جانور میں تیری ماں ہوں رشتے بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں تو نے میرے پیٹ سے جنم لیا ہے ماں کہلاتی ہوں میں تیری سمجھا ماں کہلاتی ہوں۔“

جواب میں نیوسکی نے قریب رکھا ہوا عظیم الشان گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا گو یا وہ ارکاشہ کی اس بات سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔ پھر اس نے میری جانب دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے دروازہ بند کرنے کیلئے کہا میں نے دروازہ بند کر دیا لیکن میں خود وہیں کھڑا رہا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوروٹی یا یونان کے اس دور میں ارکاشہ اتنی خوفزدہ کیوں ہے۔ وہ کس عذاب میں گرفتار ہے ایک بار پھر نیوسکی نے میری جانب دیکھا اور پھر اس طرح گردن گھمائی جیسے اسے میری موجودگی کی پروا نہ ہو تب اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور میں نے اس کی طرف دیکھا وہاں شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ کوروٹی خوفزدہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی پھر اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں میں تجھے شراب نہیں پلاؤں گی میں تیری ماں ہوں تو میرے رشتے کو بھول گیا ہے لیکن میں نہیں۔“

”اچانک ہی نیوسکی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا وہ خوفناک انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اس کے وحشی پنچے نے کوروٹی کے لباس کو پکڑ لیا اور کوروٹی اٹھ کھڑی ہوئی اس کا تقریباً سارا لباس اتر گیا تھا۔

”ڈلیل کتے کہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ نیوسکی کے سینے پر مارتے ہوئے کہا لیکن نیوسکی نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ دور جا گری تب وہ اپنی جگہ سے اٹھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن آخر کار شراب کا برتن اسے لے کر آتا ہی پڑا۔ نیوسکی پھر اس کرسی پر بیٹھ گیا تب کوروٹی نے شراب پیالے میں اٹلی اور اس کے سامنے بڑھادی۔ نیوسکی شراب حلق میں اٹھاتا رہا مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی جبکہ کوروٹی زار و قطار رو رہی تھی اس نے روتے ہوئے کہا۔

”آہ گزرے وقت تو نے میرے ساتھ شدید دھوکہ کیا ہے میں اس شخص کی بددعا میں اپنے ساتھ رکھتی ہوں جس کے ساتھ میں نے بے وفائی کی تھی اور بلاشبہ میں اس قابل نہ تھی وہ مندروں میں گھٹنے بجاتا تھا۔ لیکن اس قدر بد نما تھا وہ کہ میں اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن اب مجھے اس کا صلہ مل رہا ہے مجھے غم ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے اور اس کے نتیجے میں مجھے یہ سزا ملی۔ کاش میں اس جنگلی جانور کو جہنم نہ بھیج لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ درندہ درندہ ہی رہے گا۔ کاش میرے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا آہ میرے باپ میرے خنوس باپ تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کر دیا۔ بول تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کر دیا ایگائوس کاش تو اسے مار دیتا۔“

لیکن نیوسکی بدستور شراب نوشی کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ سے پیالہ پھینک دیا اور صراحتی اٹھا کر منہ لے لگائی پھر وہ غٹا غٹ کر کے ساری شراب پی گیا ایک بار پھر اس نے کوروٹی کی طرف دیکھا اور پھر سینے پر دونوں ہاتھ مارنے لگا تو کوروٹی بولی۔

”آہ میں کمزور ہوں لوگو! میں کمزور ہوں میں تیری ماں ہوں تو نے میرے بطن سے جنم لیا ہے لیکن تو ان باتوں کو

کیا سمجھے گا تو انسان کہاں ہے۔“

”جب گوریلہ آگے بڑھا اور اس نے کوروٹی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں ہرگز نہیں تو میرے ساتھ یہ وحشت ناک سلوک نہیں کر سکتا۔“

ایک بار پھر نیوسکی غرانے لگا پھر اس نے کوروٹی کو پکڑ لیا بس نبھانے کیوں میرے ذہن میں ایک آگ سی بھر گئی کوروٹی چیخ رہی تھی اور نیوسکی کی ہولناک چیخیں ابھر رہی تھیں لیکن دروازے پر دستک نہ ہوئی میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے لیکن پھر میرے اندر کا کہانی کار جاگ اٹھا مجھے کوروٹی کی باتیں یاد آنے لگیں اس نے کہا کہ تاریخ میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ تاریخ کے ساتھ منسلک رہتا ہے ہم بے شک تاریخ کے ایک کردار کی حیثیت سے ماضی میں جاسکتے ہیں لیکن ہم اس تاریخ میں تبدیلی نہیں کر سکتے اور تم بھی کبھی ایسا نہ کرنا کیونکہ اس طرح تاریخ نہیں بدلی جاسکتی اور ان الفاظ کو یاد کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا لیکن دوسرے محافظ خاموشی سے وہیں کھڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

کچھ دیر کے بعد کوروٹی یا ارکاشہ کی چیخیں مدہم ہوتی چلی گئیں پھر میں نے نیوسکی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور وہ سیدھا چلا گیا۔ دوسرے محافظ میرے ساتھ ہی کھڑے ہوئے تھے۔ غالباً وہ اندر کے معاملات سے لطف لے رہے تھے۔ کیونکہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”کہاں گیا تھا وہ؟“ ایک محافظ نے پوچھا۔

”یہ بتانا کیا ضروری ہے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں ہمیں معلوم نہیں ہے؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

”تم کہاں تھے؟“

”اندر ہی تھا۔“

”بڑا ہی وحشی جانور ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”تم شہنشاہ کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہو؟“

”شہنشاہ؟“ سپاہی نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں ہے تو وہ شہنشاہ ہی۔“

”کیوں تمہیں اس سے اختلاف ہے؟“

”یار اگر تم پہرے داری میں نئے ہو تو محل کے معاملات میں بھی کورے ہی ہو کیا؟“

”ہاں میں باہر کی فوجوں میں تھا۔ محل کے معاملات سے ناواقف ہوں۔“ میں نے مصہومیت سے کہا۔

”اودہ تو یہ بات ہے مگر اب تو تماشہ دیکھ لیا۔“

”ہاں اور حیرت انگیز تماشہ۔“

”یہاں تو تم تماشے ہی دیکھتے رہو گے۔ ایگائوس نے جو جال پھیلایا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم کیا سمجھتے ہو کیا گوریلہ کوئی ڈی ہوش جانور ہے؟“

”پھر؟“

”وہ صرف گوریلہ ہے خصوصی صلاحیتوں کا مالک ایک جانور اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

”لیکن حکومت کون کرتا ہے؟“

”وہی جسے کرنا چاہئے“ یعنی ایگانوس..... دراصل یہ گہری کہانی ہے۔“ سپاہی بہت باتوں پر معلوم ہوتا تھا۔  
”میرے دوست کیا تم مجھے یہ کہانی نہیں سناؤ گے“ مجھے تفصیل جاننے کا بے حد شوق ہے اور تمہاری بات پر حیرت بھی ہے۔“

”حیرت کیوں ہے؟“

”تم کہتے ہو کہ وہ خصوصی صلاحیتوں کا مالک ایک گوریلا ہے لیکن میں آج تک یہی سن رہا ہوں کہ وہ ایک باہوش شہنشاہ ہے جو بڑی عمدگی سے حکومت کر رہا ہے“ گو تخت الٹری کی تاریخ میں یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن پھر اسے حیرت انگیز یوں نہیں کہہ سکتے کہ بہر حال اس گوریلے نے ایک عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی حرکات دیکھی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی سمجھدار ہے۔“  
”اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ حکومت کر سکے۔“  
”لیکن یہ سب کیا ہے؟“

”ایگانوس کی سازش“ دراصل حکومت کے شوق نے ایگانوس کو انسانیت سے کافی نیچے گرا دیا ہے اس نے اپنی بیٹی کی شادی اس شخص سے کر دی جس نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا لیکن پھر اس کے ذہن میں سازش نے جنم لیا اور اس نے ایک سازش کی اس کی بیٹی نے ایک گوریلے کو جنم دیا اور خیال ہے یہ گوریلا شوشی کے نطفے سے نہ تھا۔ لیکن ایگانوس اور اس کی بیٹی چاہتے تھے کہ ان کی اولاد حکومت کرے چنانچہ ایگانوس نے گوریلے کی پرورش کی اور اسے کچھ خصوصی تربیتیں دیں اس طرح گوریلے نے شوشی کو شکست دی اور یہی ایگانوس کا منصوبہ تھا۔ اب گوریلا بظاہر شہنشاہ ہے لیکن حکومت ایگانوس کر رہا ہے گوریلا ایک طاقتور جانور ہے چنانچہ اسے شکست دینے والے کا کوئی وجود نہیں ہے اور ایگانوس کی حکومت محفوظ ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”اوہ بڑی انوکھی بات ہے۔“

”ہاں لیکن صرف باہر کے لوگوں کیلئے۔“

”میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ لیکن میرے دوست ابھی میں نے ایک انوکھا واقعہ دیکھا ہے۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”کیا؟“

”ارکاش تو اس کی ماں ہے نا؟“

”ہاں لیکن ایک وحشی جانور کیلئے رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں اگر وہ کوئی انسان ہوتا تو اس سے یہ حرکت سرزد نہ ہوتی۔“

”تو تم جانتے ہو۔“

”ہاں عام لوگ نہیں جانتے یہاں تک کہ ہمارا آقا نیلس بھی شاید اس بات سے ناواقف ہے لیکن کون اپنی زعمگی کا خطرہ مول لے۔“

”ایگانوس کو بھی یہ بات نہیں معلوم ہوگی۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایگانوس کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دے یا کسی کا حال جاننے کی کوشش کرے وہ حکومت کر رہا ہے اور یہی اس کیلئے کافی ہے۔“

اور میرے ذہن میں پھل جھڑیاں سی چھوٹے لگیں بڑی عمدہ بات تھی بڑا خوبصورت منصوبہ تھا۔ بلکہ میں تو یہ سوچنے لگا تھا کہ نیوسکی کو شکست دینے کیلئے میں نے جو طویل کارروائیاں کی ہیں وہ تو حماقت ہی تھی اسے تو اس محل میں آکر ہی شکست دی جاسکتی تھی۔

بہر حال اگر حالات یوں ہیں تو یوں یہ سبھی لیکن ابھی فوری کارروائی مناسب نہیں ہے پہلے کچھ اور حالات جان لئے جائیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کی ہاں جب میری ڈیوٹی کے اوقات ختم ہوئے اور میری جگہ ایک دوسرے پیریدار نے لے لی تو میں نیلس کے پاس پہنچ گیا۔ نیلس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا تھا اور پھر وہ بولا۔ ”تم تھک گئے ہو گئے پوسیس۔“

”تھکن کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔“

”خوب دیئے تم بھی عمدہ صلاحیتوں کے مالک انسان ہو میں نے تمہارے اندر خصوصی صلاحیتوں کو محسوس کیا ہے۔“

”شکر یہ میرے دوست۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم نے ہمارے شہنشاہ نیوسکی کو دیکھا۔“

”ہاں اچھی طرح اور اس گوریلے کو اس تخت الٹری کا عجوبہ کہا جاسکتا ہے وہ تو بڑی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہے۔“

”ہاں وہ جانتا ہے کہ وہ ناقابلِ تخریر ہے اور اسے ایگانوس سے کوئی اختلاف نہیں ہے بہر حال چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا ہیں میری فطرت میں ایک نمایاں کمزوری ہے۔“  
”کیسی کمزوری۔“

”اس سے قبل میں نیوسکی کا وفادار تھا اور اس کی بہتری کے بارے میں سوچتا تھا۔ ذہن کی بات جو کچھ بھی تھی لیکن اس میں تردد نہیں تھا۔ اب صورتحال دوسری ہے اب میں اس کا مخالف ہوں چنانچہ دل چاہتا ہے کہ جو کچھ کر رہا ہوں جلدی سے کر ڈالوں۔“

”یہ جذبہ برا تو نہیں ہوتا نیلس۔“

”ہاں لیکن میں ابھی تاریکیوں میں ہوں۔“

”کیوں؟“

”میرے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے۔“

”ان لوگوں کے خلاف کچھ کرنے کیلئے۔“

”ہاں۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”جلد از جلد باغیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ان سے مل کر کیا کرو گے؟“

”ان کی جدوجہد میں حصے دار بنوں گا۔“

”کیا تم انہیں کوئی بڑا فائدہ پہنچا سکتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”ان کی تعداد بیشمار ہے اس لئے کسی ایک آدمی کے ان میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا ہاں اگر کوئی عمدہ منصوبہ ان تک پہنچایا جائے تو ان کی مدد ہو سکتی ہے۔“

”عمدہ منصوبہ کیا ہو؟“

”وہ میں بتا سکتا ہوں۔“

”تو بتاؤ میرے دوست۔“

”نیوکی کے خلاف بغاوت کا اعلان معمولی ہوگا۔“

”ہرگز نہیں کیونکہ نیوکی کے بیٹا ہنوا ہیں اور پھر فوجیں تو وہی کریں گی جس کا حکم انہیں نیوکی دے گا۔“

”تو ان فوجوں سے جنگ کیلئے باغیوں کو کس چیز کی ضرورت ہوگی؟“

”کیا مطلب؟“ نیولس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں اس کیلئے انہیں اسلحہ درکار ہوگا۔“

”اوہ یقیناً۔“

”اور مجھے یقین ہے کہ اسلحہ باغیوں کی سب سے اہم ضرورت ہے۔“

”بے شک۔“

”چنانچہ اگر تم ان کی مدد کر سکتے ہو تو مجھے ایک سوال کا جواب دو کیا تمہاری پہنچ شای افواج کے اسلحہ خانے تک ہو سکتی ہے؟“

”ہاں..... گو اس کی سربراہی کسی اور کے سپرد ہے، لیکن میں اسلحہ خانے تک پہنچ سکتا ہوں۔“

”اور اسلحے کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

”یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا، لیکن کوشش کی جاسکتی ہے، اوہ میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں، لیکن پھر ایک سوال آجاتا ہے۔“

”کیا؟“

”ہم اسلحہ باغیوں تک کیسے پہنچائیں گے جبکہ ہمیں ان کے ٹھکانے کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”میں اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔“

”لیکن کس طرح.....“

”میرے اوپر بھروسہ رکھو دوست جبکہ تم اس بات کو تسلیم کر چکے ہو کہ میں بہت ہی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔“

”میں نے کہا اور نیولس کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن تم بھی مجھے بے حد پراسرار معلوم ہوتے ہو یو لیسس۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”اور اب تو میرے ذہن میں ایک اور شہر جاگ اٹھا ہے۔“

”وہ بھی بتا دو۔“

”کہیں باغیوں سے تمہارا کوئی تعلق تو نہیں ہے۔“

”ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ تو کیا تم ان کے ٹھکانے سے واقف ہو۔“

”اب تم بچوں کی طرح سوالات کرنے لگے، نیولس! فی الوقت ان باتوں کو جانے دو، میرے بارے میں یہ تو سوچو کہ

کیا تم سے ملاقات سے قبل میں ان معاملات میں ڈھیل تھا۔“

”میرا خیال ہے نہیں۔“

”پھر تم خود فیصلہ کر سکتے ہو اب میری رائے ہے کہ اس بارے میں نہ سوچو پہلے اس کا فیصلہ کرو کہ اسلحہ خانے کے

عظیم ذخائر کس طرح حاصل کئے جاسکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ نیولس نے کہا اور دیر تک یہی سوچتا رہا، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں کوئی تجویز

سوچنا ہوگی۔“ اور میں خاموش ہو گیا، میرا ذہن بہت سے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پھر میں نے اچانک سوال کیا۔

”اسلحہ خانے کے محافظ کا کیا نام ہے؟“

”آرگس۔“ اس نے جواب دیا۔

”کس قماش کا انسان ہے؟“

”عیاش طبع، عورت خور جیسا کہ یہاں کے دوسرے لوگ ہیں بہت سے لوگ تو نیوکی سے صرف اس لئے خوش ہیں

کہ اس کے دور حکومت میں عورت کی عزت و عصمت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے اور کوئی بھی شخص کسی بھی عورت پر ہاتھ ڈال

سکتا ہے اس کی کسی فریاد کی شنوائی نہیں ہوتی۔“

”وہ محافظ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“

”ایسے کتنے لوگ تمہارے ساتھ ہیں نیولس جو خفیہ طور پر تمہارے لئے کام کریں اور یہ نہ سوچیں کہ تم کیا کر رہے

ہو؟“

”ایسے لوگ۔“ نیولس نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔ ”کم از کم بیس آدمی ایسے ضرور مل جائیں گے۔“

”کافی ہیں اچھا ایک بات اور بتا دو۔“

”ضرور۔“

”کیا تم اس بغاوت کی کامیابی کیلئے اپنی بہن کو داؤ پر لگا سکتے ہو، میرا مطلب ہے اس کیلئے کوئی خطرہ مول لے سکتے

ہو؟“

”کیسا خطرہ؟“

”یہ کہ وہ آرگس کو اپنے جال میں پھانس لے اور ہمارے آدمی اسلحہ خانہ خالی کر دیں۔“ میں نے کہا اور نیولس کسی

سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”گو یہ خطرناک کام ہے، لیکن اگر تو نیسا سے اس کیلئے کہا جائے تو وہ فوراً تیار ہو جائے گی، وہ اس سلسلے میں اتنی ہی

پر جوش ہے۔“

”ہر تحریک کی تکمیل کیلئے خطرات سے کھیلنا ہی پڑتا ہے نیولس! اب اس کی چالاکی یہ ہوگی کہ وہ خود کو آرگس کی ہوس

سے بچائے اور اتنی شراب پلائے کہ آرگس حواس میں نہ رہے اور اس کیلئے ایک اور ترکیب بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم خود تو نیسا کو آرگس سے روشناس کراؤ تاکہ آرگس فوراً بدحواس نہ ہو۔“

نیولس نے میری باتوں پر خوب غور کیا، پھر بولا۔

”ٹھیک ہے، فرض کرو ہم اس طرح اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اسے یہاں سے کس طرح لے

جائیں گے۔“

”تمہیں روانگی کے احکامات کہاں سے ملتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ایکائوس سے۔“

”براہ راست۔“

”ہاں۔“

”اور ایکائوس تمہارے اوپر بھروسہ کرتا ہے۔“

”ہاں وہ مجھے اپنے مستندوں میں سمجھتا ہے۔“

”بس تو اگر تم اس سے اسلحہ حاصل کر لو تو اسے ایک تجویز پیش کرو اس سے کہو کہ تم ایک قافلہ لے کر جانا چاہتے ہو باقی قافلے لوٹنے ہیں وہ تمہارے قافلے کو بھی لوٹیں گے اور اس طرح تم ان کے ٹھکانے کا کھوج لگا لو گے۔“

”نیولس عجیب سی لگا ہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بہت ہی عمدہ ترکیب ہے واقعی تمہارا ذہن لا جواب سوچتا ہے میں تو اب دل سے تمہارا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر جب ہم نے تو نیسا سے اس تجویز کا تذکرہ کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ ”میں ایکائوس کے خلاف ہونے والی ہر کارروائی میں بھرپور حصہ لوں گی اور غلوں دل سے تمہاری تجاویز پر عمل کروں گی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

صورتحال گو بہت اچھی نہیں تھی تاہم میں اور نیولس اس سلسلے میں عمل کرنے کیلئے تیار تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود تو نیسا نے ہمیں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اپنا کام باسانی کرے گی اور اپنے آپ کو محفوظ بھی رکھے گی چنانچہ تو نیسا محل پہنچ گئی۔ منصوبے کے مطابق میں سپاہی کی حیثیت سے نیولس کے ساتھ تھا اور نیولس تو نیسا کے ساتھ آرمس کے پاس پہنچ گیا، آرمس ہی وہ خاص شخص تھا جو اسلحہ خانے کا محافظ تھا۔ صورت ہی سے بواہوس اور عیاش آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا اور نیولس سے کہنے لگا۔

”آؤ میرے دوست نیولس آج تمہارا گزر یہاں کیسے ہوا؟“

”بس کوئی خاص بات نہیں آرمس تو نیسا نے کہا کہ اسلحہ خانے کی طرف سے ہوتے ہوئے چلو سو میں یہاں آ گیا ہاں تم خیریت سے تو ہونا؟“

”بالکل خیریت سے ہوں دوست ہاں میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ بڑی آرزو تھی تم سے ملنے کی تمہیں دیکھنے کی، لیکن بس میری مصروفیت تم دیکھو مجھے یہاں ہرقت رہنا ہوتا ہے اور میں دوسرے لوگوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا اور تم نے دیکھا ہوگا کہ میرے محافظ مجھ سے اتنی دور ہیں کہ اسلحہ خانے تک ان کا سایہ بھی نہیں پہنچ سکتا میں خود ہی ہر چیز کی نگرانی کا قائل ہوں اور یہ فرض شناسی میرے نزدیک اچھی چیز ہے۔“

”بے شک بے شک آرمس تمہاری اس فرض شناسی کے چرچے تو عام ہیں۔“

”اوہو تمہارا شکریہ! تمہاری مہربانی ہاں یہ خاتون جس کا نام تو نے تو نیسا بتایا ہے کون ہے؟“ آرمس کی نگاہیں بدستور تو نیسا پر لگی ہوئی تھیں۔

”میری بہن تو نیسا ہے یہ محل دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ بڑی ہی بچکانہ فطرت کی مالک ہے یہ لڑکی کہنے لگی کہ اسلحہ خانہ دکھاؤ اور اسلحہ خانہ دکھانے کیلئے مجھے تم سے بہتر اور کون مل سکتا تھا۔ سو میں یہاں تک آ گیا۔“

”یہ آرمس ہیں۔“ تو نیسا نے خواب ناک لہجے میں سوال کیا۔ ”کیسی حسین شخصیت ہے ان کی آہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آرمس کی شخصیت اتنی حسین ہوگی۔ سچ بھائی مجھے تو محل کے عہدیداروں کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے پہلے میں سوچتی تھی کہ نجانے یہ لوگ کیسے ہوتے ہوں گے لیکن آہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ان میں ایسی ایسی شخصیتیں

پوشیدہ ہیں میں آپ سے بہت متاثر ہوں آرمس کیا میں اکثر آپ سے مل سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں خاتون کیوں نہیں میرے لائق جو بھی خدمت ہوگی میں اسے انجام دے کر بڑی خوشی محسوس کروں گا۔“

”شکریہ آرمس بہت بہت شکریہ۔“ اور آرمس کا حلیہ بگڑ گیا پھر اس نے نیولس سے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں محترم نیولس میں خاتون تو نیسا کو اسلحہ خانے کی بھرپور سیر کراؤں گا۔“

”ٹھیک ہے تو میں اسے آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں اور تو نیسا میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جب چاہو آرمس کے پاس جا سکتی ہو یہ میرا اچھا بلکہ بہت ہی پیارا دوست ہے۔“ نیولس نے کہا اور تو نیسا نے مسکرا کر

آرمس کی طرف دیکھا آرمس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ وہ بڑا ہی کمینہ صفت انسان معلوم ہوتا تھا۔

چنانچہ ہم تو نیسا کو اس کے پاس چھوڑ کر چلے آئے واپسی پر نیولس کسی قدر سنجیدہ تھا۔ ”گو مجھے اپنی بہن پر بے حد اعتماد ہے لیکن اس کے باوجود.....“

”وہ ایک قابل اعتماد لڑکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ عہدگی سے اپنا کام انجام دے گی لیکن اب تم اپنے لوگوں کو تیار کر لو۔“

”کون سے لوگوں کو؟“

”وہ جو اسلحہ خانے سے اسلحہ غائب کریں گے۔“

”وہ ہر وقت تیار ہیں اور اسی محل میں موجود ہیں۔“

”اب ہم یہاں سے جائیں گے تو انہیں ساتھ لے جائیں گے تاکہ راز افشا نہ ہو احتیاط ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے گوان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس پر اعتماد نہ کیا جاسکے لیکن اس کے باوجود یہ احتیاط غیر مناسب نہیں ہے۔“ نیولس نے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا میرے پاس تجاویز کے جو خازن تھے اور جس راستے سے میں کام

کرنا چاہتا تھا انہیں زینہ بہ زینہ خرچ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ارکاشہ وغیرہ کی بات چھپائے رکھی۔ کچھ وقت گزار کر تو نیسا نے مسکراتے ہوئے ہمیں اپنا کامیاب ہونے کی خوشخبری سنائی۔ نیولس اس کیلئے پریشان تھا۔

”وہ تو عورت کے معاملے میں پرلے درجے کا بیوقوف ہے میرا دعویٰ ہے کہ اگر میں طویل عرصے تک بھی اس کے پاس رہی تو وہ میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میں اسے شراب میں ڈبو دیتی ہوں اور اسکے محافظوں کی مجال نہیں کہ وہ اس

طرف آسکیں گویا پھر میرا راج ہوتا ہے۔“

”تم ہمیں ان جگہوں کی تفصیل بتاؤ۔“ نیولس نے خوش ہو کر کہا۔

”تو نیسا نے اسلحہ خانے کا نقشہ اس تفصیل سے بتایا کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم خود اس کی سیر کر چکے ہوں۔ چنانچہ اس تفصیل کے تحت نیولس کے لوگوں نے اپنا کام شروع کر دیا اس کام کو نہایت سست رفتاری سے کیا جا رہا تھا تاکہ

کسی کو شبہ نہ ہو سکے چرایا جانے والا اسلحہ نیولس کے مکان میں جمع کیا جا رہا تھا اور اب صورتحال یہ تھی کہ نیولس کے گھر میں رہنے کی جگہ نہیں تھی اور اس کے ماں باپ اس اسلحہ کو دیکھ کر خوب ہنستے تھے۔

میں نے ایک عظیم کام کر لیا تھا۔ یعنی اتنا اسلحہ جمع کر لیا تھا کہ باغیوں کی پوری تعداد کیلئے کافی تھا اور اب مزید اسلحے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسری طرف نیولس کی فوجیں عین وقت پر اسلحے سے محروم ہو جائیں گی اس طرح دوہرا فائدہ ہوا تھا۔

بالآخر اسلحے کا کام ختم ہو گیا اور نیولس نے پوچھا۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہے یو لیسس؟“

”ٹھیک..... بہر صورت ایگا نوس نے تمہیں اجازت دے دی ہے، تم نے اس سے کیا کہا کہ تم کس انداز میں کہاں جانا چاہتے ہو؟“

”میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ میں ایک قافلہ لے کر سفر کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس بیٹا رگھوڑے ہوں گے اور ان پر کافی ساز و سامان۔“

”تو کیا اس نے اس قافلے کی وجہ دریافت کی؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں..... میں نے اسے جواب دیا تھا کہ میں باغیوں کی سرکوبی کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ قافلے لوٹنے ہیں۔“

”تو کیا اس کے بعد ایگا نوس نے تم سے یہ سوال نہیں کیا کہ اگر تم کسی ایسے گروہ کے ہتھے چڑھ گئے تو کیا کرو گے؟“

”ہاں اس نے پوچھا تھا۔“

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے اسے بتایا تھا کہ میں چند افراد کو لے کر جاؤں گا اور جب وہ لوٹ مار کر رہے ہوں گے تو میں غائب ہو جاؤں گا اور چھپ کر ان کا تعاقب کروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ وہ ان اشیاء کو کہاں لے کر جاتے ہیں۔ گویا میں اس وقت اس قافلے کو چھوڑ دوں گا جب وہ لوٹ مار کر رہے ہوں گے۔ میں نے یہ بات ایگا نوس سے کی اور ایگا نوس نے بہر حال ایک حد تک اسے منظور بھی کر لیا۔“

”اوہ..... تو ایگا نوس نے اس بات پر کوئی تجویز پیش نہیں کی؟“

”ہاں کی تھی۔“

”وہ کیا؟“

”اس نے کہا تھا کہ قافلے والوں کی تعداد زیادہ ہونا چاہئے۔“

”اس کی وجہ اس نے کیا بتائی؟“

”صرف یہ کہ اگر کوئی گروہ قافلے والوں پر آپڑے تو ان میں سے بچ کر وہ اس گروہ کا جائزہ لے سکیں۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ باغی گروہ پر حملہ آور ہی نہ ہوں، وہ ہمیں تعداد میں زیادہ دیکھ کر ہماری چال کو سمجھ جائیں اور حملہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”پھر؟“

”اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور اجازت دے دی کہ میں جس طرح چاہوں کروں۔“

”تو پھر میرے دوست تم نے کیا سوچا ہے اور اب تم کب روانہ ہو گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”بس کچھ وقت لگے گا“ اس دوران میں رگھوڑوں کا انتظام کر لوں گا اور اس قسم کے معاملات مکمل کر لوں گا کہ مجھے یہاں سے نکلنے میں دقت نہ ہو۔“

”اسلئے کیا ہوگا؟“

”ظاہر ہے پولیسس اسلئے ہی تو خاص چیز ہے، ہمیں اس کی خاص حفاظت کرنا ہوگی۔ بلکہ اسے چھپا کر لے جانا ہوگا“ میں اسے پہلے ہی ایسی جگہ بھیج دوں گا تاکہ شہر سے نکل کر ہم رگھوڑوں سے سامان اتروالیں، شہر کے اندر تک ہم رگھوڑوں پر صرف وہی چیزیں بار کریں گے جو ہمارے ذہن میں ہیں اور جو ایگا نوس کے سپاہیوں کو مشکوک نہ کر سکیں، ظاہر ہے میں

ایگا نوس کو بھی وہ اشیاء دکھاؤں گا تاکہ وہ سب مطمئن ہو جائیں۔“

”مناسب خیال ہے اس کام میں تمہیں جتنا بھی وقت درکار ہو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں۔“

”نہیں بس ٹھیک ہے، باقی سارے معاملات میں خود ہی حل کر لوں گا۔“ نیولس نے جواب دیا۔ ”ہاں ایک بات اور ہے کہ اب تو عیسا کو وہاں نہ جانے دیا جائے۔“

”ہاں اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آگس سے کہہ دیں گے کہ تو عیسا بیمار ہے۔“

”ٹھیک ہے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے اور اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے اس کی پہنچ اتنی دور تک بھی نہیں ہے۔“

چنانچہ یہ بات طے ہو گئی اور اسی روز سے تو عیسا کا محل جانا بند ہو گیا اور نیولس اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب نیولس اپنی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ اسلئے آبادی سے کافی دور جمع کر دیا گیا تھا۔ یہ جگہ ویران تھی۔ یہاں نیولس نے بیٹا رگھوڑوں پر بہت سا سامان لدوا لیا تھا۔ لیکن اپنے ساتھ صرف بیس افراد کو لیا تھا اور یہ بیس افراد وہی تھے جو نیولس کے اپنے ہمراز اور ساتھی تھے۔ دوسرے معنوں میں یہ سب باغی تھی۔ اس بیٹا رگھوڑوں والے قافلے میں ان بیس افراد کے علاوہ میں اور نیولس بھی شامل تھے۔ نیولس نے کسی ایسے آدمی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ جو اس کیلئے برا ثابت ہو سکتا۔ جس وقت ایگا نوس نے ہمیں رخصت کیا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایگا نوس نے رگھوڑوں پر لدے ہوئے سامان کو بھی دیکھا تھا۔ پھر اس نے ہمیں کامیابی کی دعائیں دی تھیں۔ ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو نیولس کے امور کا نگران ہو سو ہم چل پڑے۔ نیولس بہت خوش تھے۔ نجانے اس کے ذہن میں میرے لئے کیا تھا۔ لیکن وہ میری بے پناہ عزت کرتا تھا۔ پھر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں رگھوڑوں پر لدوا ہوا سامان اتار کر اسلئے بار کرنا تھا۔ ہم نے اسلئے بار کیا اور کھانے پینے کی اشیاء ساتھ لے لیں باقی سامان رگھوڑوں میں دفن کر دیا گیا اور اس کے بعد ہم نے وہاں سے کوچ کر دیا۔ نیولس نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اور میں اس خیال کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمیں کون سا رخ اختیار کرنا چاہئے پولیسس؟“

”تمہارے خیال میں کیا میں تمہیں چند لمحات ہی میں صحیح جگہ لے جاؤں گا۔“

”میرے خیال کی بات نہ کرو پولیسس، میرے ذہن میں جو کچھ بھی ہے میں تم سے اس کا اظہار نہیں کروں گا۔ ہاں یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھ سے غلط ہو اور میرے ہمدرد بھی ہاں اگر تم خود کو کسی مسئلے میں پھنسا جانا چاہتے ہو تو پھر بھی میرا فرض ہے کہ میں تم سے مکمل تعاون کروں۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک گیا۔

”نن..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے پولیسس، بس بعض باتیں روانی میں ہو جاتی ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔“

”اوہ.....“ میں نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑے۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ نیولس میرے بارے میں کچھ جان گیا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ نیولس مجھ سے مشکوک ہو چکا ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہر صورت اس شک کی کوئی غلط صورت نہیں تھی، اس نے مکمل کر مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے خود سے غلط سمجھتا ہے۔ چنانچہ اب جبکہ نوبت یہاں تک آ گئی تھی اور کچھ دیر کے بعد جب مجھے نیولس کے علم میں یہ بات لانا تھی کہ خود میرا تعلق بھی باغیوں کے گروہ سے ہے تو میں کیوں شدت سے اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ سو میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ البتہ نیولس کے



ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں کچھ جاننے کی سی چمک.....

اب نیولس کچھ بے چینی رہنے لگا تھا اور ہم آبادیوں سے دور ایک ایسے علاقے کی جانب جا رہے تھے جو ہمیں باغیوں کے علاقے تک لے جاتا۔ یعنی اس جگہ جہاں میں نے سرنگیں پھیلایا ہوتی تھیں اور یہ سرنگیں ہماری ہی کادشوں کا نتیجہ تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب تر تھی جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ میں اگر چاہتا تو ایک طویل فاصلے سے نیولس کو اس ٹھکانے تک لے جاتا لیکن اسلئے سے لدے ہوئے گھوڑے میرے لئے بہت قیمتی تھے۔ یہ ہماری بہت معمولی محنت سے حاصل ہوئے تھے۔ یعنی پہلے لوہے کا حصول اور اس کے بعد ہتھیار سازی، گویا ایک طویل کام ایک مختصر سے وقت میں طے ہو گیا تھا اور ایک ایسا کام جس کیلئے ہمیں اچھی خاصی دشواریوں سے گزرنا ہوتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ سرنگوں کے آس پاس پوشیدہ رہنے کی جنگیں اور کمین گاہیں کہاں کہاں ہیں۔ چنانچہ تھوڑے سے سفر کے بعد ہم ایک کمین گاہ تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں نے دوسرے اور بھی کام کئے تھے۔ یعنی میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ کارگس تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ کون سا ہو سکتا ہے اور اگر ہم ایک سرنگ ایسی بنالیں جو کسی قریبی سرنگ سے جا کر مل جائے تو اس کا ایک راستہ شہر میں کھلے تو اس کیلئے ہمیں کتنے فاصلے تک سرنگ کھودنا ہوگی اور اس کیلئے کیا نقشہ ترتیب دینا ہوگا۔ یہ ایک بڑا کام تھا جو ہمیں انجام دینا تھا اور سب سے بڑا کام ہو چکا تھا۔ یعنی ہتھیاروں کی بازیابی اور نیوکی کیلئے خاصا سخت ہوتا تھا۔ جس میں اس کی شکست ایک یقینی امر تھا۔ چنانچہ میں نے کمین گاہوں سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نیولس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”نیولس ہم باغیوں کی سرزمین تک پہنچ گئے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ نیولس حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں۔“

”کیا کہہ رہے ہو پولیسس؟“

”جو کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن باغی کہاں ہیں؟“

”باغی بہت ہی قریب موجود ہیں ان پہاڑیوں میں۔“

”ان پہاڑیوں میں۔“ نیولس نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”لل..... لیکن.....“ نیولس ایک دم ہکلا گیا۔

”تمہیں اتنا تعجب ہے؟“

”میں نہیں مان سکتا، دیوتاؤں کی قسم میں نہیں مان سکتا، یہ پہاڑیاں تو کارگس سے بہت نزدیک ہیں اور نیوکی کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے کہ باغی اس کی شہرگ سے اس قدر نزدیک ہیں۔ ہمیں تو زیادہ سفر بھی نہیں کرنا پڑا اور میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں نے جن باغیوں کی تلاش کیلئے اتنے دور دراز علاقے کا سفر کیا ہے وہ تو ہم سے اس قدر قریب ہوں گے اور بلاشبہ اگر باغی یہاں موجود ہیں تو پھر انہوں نے انتہائی مہارت کا ثبوت دے کر ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہے جس کے بارے میں کارگس کے رہنے والے سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”کیا میں ان باغیوں سے رابطہ قائم کر لوں؟“ میں نے نیولس سے پوچھا۔

”ضرور کرلو۔“ نیولس نے مسکرا کر کہا اور پھر بولا۔ ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری تقدیر بہت بلندی پر ہے لیکن

حیثیت بدلنے کے بعد اگر تم کارگس کے باغیوں کی حیثیت سے اس وقت مجھے ملتے جب میں باغیوں کی تلاش میں تھا اور کارگس کا وفادار تھا تو اس وقت بلاشبہ باغیوں کی بد نصیبی ہوتی، لیکن یوں لگتا ہے کہ بغاوت کامیاب ہو کر رہے گی اور تم میرے دوست جس قدر پر اسرار انسان تھے اس کا اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا اور میرے دوست پولیسس میں اپنی باتوں سے تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا، تم جلدی سے ان سے رابطہ قائم کرو۔“ اور میں نے گردن ہلا دی۔

اس کے بعد میں نے اپنے مخصوص اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ میرے ہاتھ ایک مخصوص انداز میں چل رہے تھے۔ گویا ایک طویل داستان تھی جو میں باغیوں کو سنا رہا تھا اور پھر میں نے اپنا اشارہ نشر کرنے کے بعد نیولس کی جانب دیکھا جو بغور میرے اشاروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نیولس، تم اپنے آدمیوں کو قیام و طعام کا بندوبست کرنے کا حکم دو۔“

”کیا تم یہاں قیام کرو گے؟“

”نیولس تم مجھے ایک بات کا جواب دو؟“ میں نے نیولس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور پولیسس، ضرور.....“

”کیا یہ سارے آدمی تمہارے قابل بھروسہ ہیں، کیا یہ ہمارے خلاف تو نہیں جاسکتے؟“

”تم رازوں کی بات کرتے ہو پولیسس۔“

”بالکل..... میرا مقصد یہی ہے۔“

”اور تمہارا مقصد یہ ہے کہ باغی ان کے سامنے اپنے خفیہ ٹھکانوں سے باہر نہ آئیں۔“

”ہاں یہ بھی صحیح ہے۔“

”تو اس کیلئے میں تمہیں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”ان تمام لوگوں کو باغیوں کے حوالے کر دیا جائے اور ان میں سے صرف چند افراد ساتھ رہنے دیئے جائیں جنہیں ہم واپس لے جاسکیں، جن پر مکمل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے واپس جا کر باقی لوگوں کے بارے میں ہمیں کوئی نہ کوئی کہانی سنانا پڑے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جب ہم واپس ایگائوس کے پاس پہنچیں گے تو کیا اسے یہ نہیں بتائیں گے کہ ہمارا سارا سامان کیسے لوٹا گیا اور قافلے کے آدمی کس طرح ہلاک کر دیئے گئے، اس وقت تمہارے خیال کے مطابق ہمیں کیا جواب دینا ہوگا۔“ نیولس نے مجھ سے سوال کیا۔

”ظاہر ہے ایسا جواب جس سے ایگائوس مکمل طور پر مطمئن ہو سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بالکل درست پولیسس، دراصل اس سلسلے میں مجھے تم سے ہی مشورہ لینا تھا۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی جواب تو دیں گے ہی.....“

”ایگائوس کو اس بات کا علم ہے کہ باغیوں کے گروہ بہت زیادہ مضبوط ہیں ان کی کارروائیاں ہماری کارروائیوں سے زیادہ موثر ہوا کرتی ہیں، چنانچہ اگر ہم اس کو کوئی کہانی سنائیں گے تو وہ اس کہانی پر شہ نہیں کرے گا۔“

”خوب تو واپس لے جانے والے آدمی کتنے ہوں گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”صرف پانچ..... چھٹا میں اور ساتویں تم.....“

”مناسب۔“ میں نے جواب دیا اور نیلس دوسرے کام انجام دینے لگا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو قیام کا حکم دے دیا۔ گھوڑوں کے اوپر سے سامان اتارا جانے لگا اور یہ قافلہ قیام پذیر ہو گیا۔ لیکن زیادہ دیر نہ لگ سکی کہ پہاڑی چٹانوں نے گھوڑے اگلا شروع کر دیئے گھوڑے سوار اس برق رفتاری سے قافلے کے چاروں طرف جمع ہو رہے تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔

میں نے اپنے لوگوں کی کارروائی دیکھی اور متاثر ہوا یہ لوگ بہت ہی زیادہ ذہانت کا ثبوت دے رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کارروائی میں ایمبر وں بھی شریک تھا۔ یقیناً اسے اطلاع دی گئی ہوگی کہ کوئی قافلہ یہاں آ کر رہا ہے اور اس سے اشارے نشر کئے جا رہے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ایمبر وں نے سرنگوں کے درمیان اتنا طویل سفر اتنی جلدی طے کر لیا تھا۔ کیونکہ جس جگہ ہمارا خصوصی ٹھکانہ تھا وہاں سے اس سرنگ تک کا فاصلہ کافی طویل تھا اور اگر سرنگوں میں گھوڑے بھی دوڑائے جاتے تو یہ فاصلہ اتنی جلدی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال ہر بات سے قطع نظر یہ اعلیٰ کارکردگی کی ایک عمدہ مثال تھی یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ ایمبر وں یہیں کہیں قریب ہی موجود ہو۔

پھر میں نے ایمبر وں کو دیکھا اور ایمبر وں نے مجھے باغی ہمارے چاروں طرف پھیل گئے اور پھر ایمبر وں دو آدمیوں کے ساتھ میرے سامنے پہنچ گیا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور میرے نزدیک آ کر جھک گیا۔

”عظیم سربراہ.....“ اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ”کیا حکم ہے؟“ اور میں نے نیلس کی جانب دیکھا اس کی نگاہوں میں کچھ جاننے کی چمک تھی، بہر حال میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے ایمبر وں سے کہا۔

”ایمبر وں! یہ سارا اسلحہ حاصل کرو! میرا خیال ہے یہ تمہاری تمام تر فوجوں کیلئے کافی ہے۔“

”یقیناً! کیا یہ سارا سامان اسلحہ ہے؟“

”ہاں..... تم اسے باسانی لے جا سکتے ہو۔“

”اور یہ لوگ؟“ ایمبر وں نے سوال کیا۔

”سب ہمارے وفادار ہیں اور سب ہمارے ساتھی۔“

”واہ..... گویا تم نے وہاں بھی ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔“ ایمبر وں نے سوال کیا۔

”جو چاہے سمجھ لو! میں تجھے کچھ سوچنے سے نہ روک سکوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اور ایمبر وں اسلحہ سرنگوں کے ذریعے اپنے خفیہ ٹھکانوں تک پہنچانے لگا۔ نیلس کے ساتھی متحیرانہ انداز میں باغیوں کو دیکھ رہے تھے۔ خود نیلس کی حالت بھی حیرت انگیز تھی وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ وہ ایمبر وں کے الفاظ پر حیران تھا جو اس نے میری شان میں کہے تھے۔ پھر جب میں نیلس اور اسکے ساتھیوں کو لے کر سرنگ کے اندر داخل ہوا تو نیلس نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا یہ درست ہے میرے دوست پولیسس؟“

”ہاں نیلس! تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، کیا تم نے کبھی اس بات پر سوچا کہ باغیوں کا سربراہ کون ہے؟“

”میں نے سنا تھا کہ اس کا نام پولس ہے..... اوہو..... اچانک نیلس کو اپنی بات کا احساس ہوا اور اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”کیا میں پولیسس کو پولس بھی کہہ سکتا ہوں؟“

”ہاں میں پولس ہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور نیلس کے روٹنے کھڑے ہو گئے اس کا چہرہ شدت حیرت سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ کافی دیر تک کچھ نہ بول سکا۔ اب وہ پتھر کے بت کی طرح میرے ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی نادانیت پر شدید حیرت ہو۔ سرنگوں کا یہ جال جتنا طویل تھا نیلس اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر کار اسلحہ

سرنگوں میں منتقل ہو گیا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ نیلس کو ان سرنگوں کی سیر کراؤں گا، میں نے اس کے پندرہ ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیا اور نیلس نیا نہیں یہ بات بتا دی تھی کہ انہیں یہاں کس طرح رہنا ہے۔ باقی پانچ آدمی جو اسے واپس لے جاتا تھے ان کو بھی اس نے منتخب کر لیا تھا۔ یوں ان کیلئے ایک الگ جگہ منتخب کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نیلس کو لے کر چل پڑا اور پھر میں نے نیلس کو وہ عظیم الشان غار دکھایا جو قیدیوں کی رہائشگاہ تھی اور غار میں موجود سرنگوں کے ذریعے وہ دور دور کے علاقوں میں جا سکتے تھے۔

یہاں ہمارا جتنا بھی وقت صرف ہوا صرف نیلس کو ان علاقوں کو دکھانے میں صرف ہوا تھا اور اس کے بعد میں نے یہ مکمل ختم کر دیا، اب ہم واپسی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ نیلس نے جو کچھ دیکھا اور اسے میری شخصیت کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہوا وہ اس کیلئے باعث حیرت تھا اور اب وہ اکثر حیران ہی رہا کرتا تھا۔ اکثر وہ تنہائی میں میری شکل دیکھا کرتا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

”میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا پولیسس کہ تم کون اور کیا ہو گے۔ افسوس میں تمہارے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش نہیں آیا جتنا مجھے آنا چاہئے تھا۔“

”اس بات کو ذہن سے نکال دو نیلس..... سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم میرے ہمنوا بن گئے ہو۔“

”ہاں اور شاید یہ میری خوش نصیبی ہے۔ ورنہ تم تو میرے سرنگ پہنچ گئے تھے۔ اگر میں تمہارا دشمن ہی ہوتا تو کیا تمہارے ہاتھ باسانی میری گردن تک نہ پہنچ جاتے اور اس کے بعد تم مجھے نہایت اطمینان سے قتل کر سکتے تھے۔“

”اور اس کیلئے میں وقت کا ٹھکر گزار ہوں نیلس کہ اس نے یہ موقع نہ آنے دیا، یہ حقیقت ہے نیلس کہ اگر تم تبدیل نہ ہوتے اپنے ارادوں میں تو میں تمہیں زیادہ دیر زعمہ نہ رہنے دیتا، لیکن بہر حال تمہارے روپ میں نہ صرف مجھے اپنا ایک ہمنوا بلکہ اتنا عظیم دوست بھی ملا جس کی دوستی پر میں بھلا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے نیلس اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔“

”بالکل! میں خود بھی اس کام میں اب جلدی کرنا چاہتا ہوں۔“ نیلس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر ہم سرنگوں کے سفر سے واپس چل دیئے۔ ایمبر وں اسلحے کے یہ ذخیرے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کے پاس رہنے کیلئے مجھے بہت کم وقت ملا تھا۔ لیکن اسے نقشے اور ہدایات تو دینا ہی تھیں، میں نے اسے پوری تفصیل سمجھا دی اور نیلس گردن ہلانے لگا۔

”تو تم نے جو کچھ کیا پولس میں اس پر سخت حیران ہوں، لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ارمغانوں کی وادیوں نے ایک ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا ہے اور وہ کارنامہ ہے تیری پیدائش اور تیری پرورش۔“

”حیرت چھوڑ ایمبر وں! کیا تو اس اسلحے سے مطمئن ہے۔“

”اسلحہ پہلے بھی ہمارے پاس کافی موجود ہے، لیکن اس عظیم الشان ذخیرے کے بعد تو ہماری ساری ضروریات پوری ہو گئیں۔“

”سرنگ کا نقشہ سمجھ لیا۔“

”ہاں۔“

”اور اب ہماری اور تمہاری ملاقات سرنگ کے اختتام پر کارگس میں ہی ہونی چاہئے، اس کام میں تم جتنی جلدی کرلو بہتر ہے۔“

”تم مطمئن رہو پولس سارے کام تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہوں گے۔“

”خوراک کی کیا کیفیت ہے؟“

”محفوظ ذخائر ابھی تک موجود ہیں بلکہ ان میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ساتھی بہترین غلہ اور سبزیاں پیدا کر رہے ہیں ان کا جذبہ قابل داد ہے۔“

”یقیناً اس کے بعد ان کی زندگی میں جو خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی وہ ان کی محنتوں کا ثمر ہوں گی اس کے علاوہ پولس ہمارے ہاتھ ایسے لوگ بھی لگے ہیں جو انہی قیدیوں میں شامل تھے جو ہمارے ساتھ فرار ہوئے تھے۔“

”اوہ..... کتنی تعداد ہے ان کی؟“

”بیس آدمی تھے۔“

”کہاں مل گئے۔“

”ویرانوں میں بھٹک رہے تھے۔ موت کے نزدیک تھے۔ اگر ہم ان کی زندگی نہ بچاتے تو وہ موت کا شکار ہو گئے ہوتے۔“

”اچھا کیا تم نے؟“

”لیکن ان سے ان کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اس نے ہم سب کے حوصلے اور بڑھا دیے ہیں۔“

”خوب..... وہ کیا معلومات تھیں؟“

”ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ تھا۔ ایسی اذیتیں برداشت کرنا پڑی تھیں کہ سن کر خوف آ رہا ہے اس لحاظ سے ہمارے ساتھیوں نے تو بہترین وقت گزارا ہے۔“

”کہاں ہیں وہ لوگ؟“

”ہم نے انہیں خود میں شامل کر لیا ہے اور وہ لوگ بھی اب ہمارے مشن سے بہت غلصہ ہیں۔“

”ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں ہے لیکن ہر شخص کو معروف رکھو کسی کو کالی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔“

”وہ سب کاشت کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ایمرس کوئی اور سوال؟“

”نہیں۔“

”میری ہدایات پر تم نے غور کر لیا ہے۔“

”ہاں بخوبی اور تم یہاں کے معاملات سے بے فکر رہو مجھے یقین ہے کہ تم کوئی ناقابل یقین کارنامہ انجام دینے میں مصروف ہو گے بہر حال میں بذریعہ سرنگ کارگس پہنچ رہا ہوں۔“

ایمرس کی یقین دہانی کے بعد میں وہاں سے چل پڑا پانچ ساتھی ہمارے ساتھ تھے اور ہم نے ان کی حالت خست بنا دی تھی اور اب ہم کارگس واپسی کا سفر کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا جس کا تذکرہ میں نے نیولس سے کیا۔

”نیولس کیا اسلحے کی گمشدگی کا راز کھل گیا ہوگا؟“

”اوہ ممکن ہے.....“

”کیا ان کا شبہ ہمارے اوپر بھی جاسکتا ہے؟“

”ناممکن۔“

”پھر وہ کیا سوچیں گے؟“

”دوسری بات ہے کہ وہ اسے باغیوں کی حرکت سمجھیں اور تحقیقات کریں گے کہ کارگس میں باغی کہاں سے گھسے۔“

”اس صورت میں تو ہم محفوظ ہیں۔“

”سو فیصدی ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

نیولس نے مطمئن لہجے میں کہا اور پھر میں نے اسے مزید تفصیل بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”اس کے علاوہ میں ایک اور انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ..... اب اور کوئی انکشاف باقی رہ گیا ہے کیا مجھے تو آج تک حیرت ہے کہ باغیوں کا عظیم سربراہ میرے ساتھ ہے۔“ نیولس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... وہ بات میری ذات سے متعلق نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”محل ہی کی ایک بات ہے لیکن میرے خیال میں تم خود بھی اس سے لاعلم ہو ورنہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔“

”ایسی کون سی بات ہے۔“

”تم نے کبھی مجھے ارکاشہ کے بارے میں نہیں بتایا؟“

”ارکاشہ..... نیوکس کی ماں.....“

”ہاں۔“

”اس کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات ہی نہیں تھی۔“

”کیا وہ زندہ ہے؟“

”ہاں اور محل کے ایک گوشے میں رہتی ہے۔“

”کیا وہ گوشہ نشین ہے؟“

”ہاں اس نے خود ہی یہ زندگی اختیار کی ہے۔ لیکن اس کا بیٹا نیوکس اس کا پورا خیال رکھتا ہے اور اس نے اسے محل ہی کے ایک حصے میں رکھا ہوا ہے۔“

”کیا نیوکس اس سے ملنے بھی جاتا ہے؟“

”یہی سنا ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا ہے۔“

”تمہارے کسی سپاہی نے تمہیں اس حاضری کی تفصیل نہیں بتائی۔“

”نہیں..... کوئی خاص بات ہے۔“ نیولس کی آنکھوں سے تجسس جھانک رہا تھا۔ لیکن میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک اور سوال داغ دیا۔

”کیا ایگنوس اپنی بیٹی سے ملنے بھی نہیں جاتا؟“

”ایگنوس.....“ نیولس چونک پڑا پھر جلدی سے بولا۔ ”نہیں میرا خیال ہے وہ اس سے نہیں ملتا۔“

”کیوں؟“

”وہ بیٹی سے زیادہ خوش نہیں ہے شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ارکاشہ کی وجہ سے اس کی حکومت چھین گئی تھی۔“

”کیا اسے اس سے محبت بھی نہ ہوگی؟“

”ایسی بات بھی نہیں ہے لیکن وہ اپنے ہی جوتوڑ میں معروف رہتا ہے۔ اسے باغیوں کا بھی خوف ہے اس لئے وہ ہر وقت جاگتا رہنا چاہتا ہے۔“

”ہوں تو پھر وہ ضرور لاعلم ہوگا۔“

”کون سی بات سے؟“

”وحشی درنہ سو فیصدی جانور ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ انسان کی اولاد کس طرح ہو سکتا ہے۔“

”یعنی۔“

”گور یلا اپنی ماں کو صرف عورت سمجھتا ہے اور ارکاشہ کا بدن اس کے ناخنوں کی خراشوں سے بھرا ہوا ہے وہ مجبور ہے اور بیٹے سے نفرت کرتی ہے۔“

”کیا؟“ نیولس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”ہاں نیولس، ظاہر ہے کہ وہ ایک جانور ہے۔ اس سے زیادہ کیا توقع رکھتے ہو اور یہ تمہاری اس دنیا کا سب سے الٹا پہلو ہے، تم تابع ہو اس کے جس کی چہرہ دستیوں نے تحت اثری کا مستقبل تاریک کر رکھا ہے وہ صرف ایک جانور ہے، انسانوں کی صفات رکھنے والا جانور۔“

”ہاں بڑی بھیا تک بات کہی تم نے پولیسیس ایسی خوفناک بات کہ اگر کارمس کے لوگوں کو معلوم ہو جائے تو ایک طوفان کھڑا ہو جائے۔“

”اس طوفان کا نتیجہ کیا ہوگا؟“ میں نے نیولس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”قتل و غارت گری اور بے پناہ خونریزی کیونکہ بہر حال نیوکی کے ہمنوا اس کیلئے سب کچھ کریں گے اور وہ طاقتور ہیں۔“

”خود ایگانوس کا کیا رویہ ہوگا؟“ میں نے دوسرا سوال کیا اور نیولس سوچ میں ڈوب گیا، پھر گردن ہلا کر بولا۔

”اس کے بارے میں نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے ایگانوس کا نظریہ بدل جائے اور وہ نیوکی کا دشمن بن جائے۔“

”اس کے امکانات موجود ہیں۔“

”کافی حد تک“ کیونکہ اگر خود ایگانوس اس پہلو کو نظر انداز کرنا چاہے تو اسکے بس کی بات نہیں ہے، اس کے خلاف اس قدر نفرت پھیل جائے گی کہ وہ اس نفرت کا سامنا نہیں کر سکے گا۔“

”گو یا دونوں پہلو ہمارے حق میں ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”میں ایگانوس کو اس لیے سے روشناس کرانا چاہتا ہوں نیولس اور اب واپس جانے کے بعد تمہارا کام یہ ہوگا کہ میری مستقل ڈیوٹی نیوکی پر ہی لگا دو۔“

”آہ..... تم اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”ان دونوں میں اختلاف“ لیکن اس کا اظہار میں اس وقت کروں گا جب میرا کام مکمل ہو جائے گا۔“

”اوہ تم کس قدر خطرناک ہو پولیسیس، بلاشبہ تمہیں اس کا حق پہنچتا ہے کہ تم باغیوں کی سربراہی کرو اور اس کے بعد ملک کا نظم و نسق سنبھالو۔“ نیولس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، احمق نوجوان غلط فہمیوں کا شکار تھا اسے کیا معلوم کہ میں کیا تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہوتا تو حیرت کا مجسمہ ہو جاتا۔“

◆\*◆

ہم کارمس میں داخل ہو گئے اور نیولس نے پہلے شاہی محل کا رخ کیا تھا۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی لیکن جس وقت نیولس ایگانوس کے سامنے پہنچا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

نیولس نے بڑے پریشان لہجے میں اپنی ناکامی کی داستان سنائی تھی۔ اس نے بتایا کہ قافلہ لوٹ لیا گیا۔ باغیوں کی نگاہوں سے وہ روپوش نہ ہو سکا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا گیا۔ ایگانوس کا غصہ شباب پر تھا۔

”یوں لگتا ہے نیولس کہ تم اپنے عہدے کے قابل نہیں ہو۔ باغیوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور تم ہمیشہ اپنی ناکام صورت لے کر میرے سامنے آتے ہو۔“

”میں شرمسار ہوں۔“ نیولس نے کہا۔

”لیکن تمہاری شرمساری نیوکی کے باغیوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ میں نیوکی سے مشورہ کر کے کسی اور شخص کو تمہاری جگہ تعینات کروں گا“ اس وقت تک تم اپنے عہدے کو چھوڑ کر محل کے محافظوں کے گھروں کی خدمت انجام دو۔“

نیولس نے سر جھکا دیا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”کیا خیال ہے پولیسیس ہمارے دوست ایگانوس نے تو ہمارے اوپر رعایت کی ہے۔“

”بے شک ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

”اور میرا خیال ہے اب تم اپنا کام انجام دو۔“

”کون سا کام؟“

”تم ایگانوس کو اس کی بیٹی ارکاشہ کے بارے میں بتا دو۔ یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔“

”لیکن اب تو تمہاری خدمت بدل چکی ہے نیولس۔ کیوں نہ یہ کام اب تم کرو۔ ظاہر ہے تم محل کے محافظوں کے نگران بن گئے ہو۔“

”اوہ جیسا تم کہو۔“ نیولس نے کہا اور ہم اس سلسلے میں لائحہ عمل مرتب کرنے لگے۔

اسلحہ خانے سے اسلحے کی چوری کی بات ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ بہر حال نیولس نے محل کے نگران کی حیثیت سے معاملات سنبھال لئے۔ میں حسب معمول گوریلے شہنشاہ نیوکی کا خادم بن گیا تھا اور مستقل طور پر اس کی خواب گاہ میں تعینات تھا تا کہ اس پر نگاہ رکھوں اور بلاشبہ اس گوریلے کے کارنامے بے حد گھٹانے اور قابل نفرت تھے۔ مجھے اس کی ذات سے بے پناہ گھن آنے لگی تھی اور میں نے یہ بات بخوبی محسوس کی تھی کہ دوسرے پہریدار محل کے دوسرے بیٹا لوگ اس سے بے پناہ نفرت کرتے تھے۔ وہ اس کی رعیت میں تھے لیکن خوش نہیں تھے۔

نوجوان اور نوجوڑ لڑکیاں گوریلے کی خواب گاہ میں پہنچائی جاتی تھیں اور اسکے بعد یا تو ان کی لاشیں برآمد ہوتیں یا پھر وہ اس حالت میں ہوتیں کہ ان کے جسم لہو لہان ہوتے۔ بڑی دردناک کیفیت ہوتی تھی ان کی اور اس کے بعد جب نیوکی

اپنی خواب گاہ سے برآمد ہوتا تو دل چاہتا کہ اس کے بدن کے گلڑے گلڑے کر دیئے جائیں لیکن ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ سارے کام آہستگی سے کرتا تھے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا۔ میں اگر چاہتا تو یہ سارے کام کر سکتا تھا۔ لیکن بات صرف اس گوریلے کی نہیں تھی بلکہ کارگس کی پوری حکومت کو تبدیل کرنا تھا اور اس سلسلے میں بہر صورت اس کم بخت جانور کے ہمدرد کافی تھے نجانے کیوں؟

سو میں نے محسوس کیا کہ گوریلہ حسین ترین لڑکیوں کے درمیان رہنے کے باوجود ارکاشہ سے خاص رغبت رکھتا تھا۔ اس کی وجہ میں نے محسوس کی تھی جو شاید یہ تھی کہ گوریلہ آج بھی مجھے کسی قسم کی پریشانی کا شکار نظر آتا تو ارکاشہ کے کمرے کی جانب چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ کوئی خوبصورت حسینہ اس کی خواب گاہ میں بیٹھی اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگئی۔ معلوم ہوا کہ ابھی اس کی بد نصیبی کے دن نہیں آئے اور میں نے اسے ارکاشہ کی خواب گاہ کی جانب جاتے دیکھا اور ہوتا اس وقت یہی تھا کہ خادموں میں سے ایک خادم ضرور اس کے ساتھ ارکاشہ کی خواب گاہ میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اس بات کا مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔

بڑا ہی گھناؤنا کردار تھا۔ ارکاشہ کے اس بیٹے کا جس کا لطفہ ایک غلام ایمر دس کا تھا اور میں نے بارہا محسوس کیا کہ ارکاشہ اب اپنی اس حرکت پر کس قدر پچھتاتی ہے۔ سو اس دن گوریلے کی ذہنی کیفیت زیادہ درست معلوم نہیں ہوتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے۔

اتنے دنوں میں مجھے اندازہ تھا کہ میں نے اس کی شخصیت کے کچھ پہلو سمجھ لئے ہیں اور اسی وقت مجھے..... اپنا کام انجام دینا تھا اور اس وقت میرے اندازے کے مطابق گوریلے کی بے چینی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ وہ ارکاشہ کی جانب ضرور جائے گا، کیونکہ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست نیولس کو اطلاع دی۔

نیولس نے معجزانہ انداز میں مجھے دیکھا تھا اور پھر وہ کہنے لگا۔  
”کیا تمہیں یقین ہے کہ آج وہ وہاں ضرور جائے گا۔“

”ہاں! میرے دوست میرا خیال ہے اگر اسے موقع پری دیکھ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کی بے چینی سے یہی محسوس کرتا ہوں کہ آج وہ ضرور ارکاشہ کی جانب جائے گا۔“

”تو پھر میں ایگانوس سے بات کروں۔“  
”یقیناً۔“

”تم میرے ساتھ چلو گے۔“  
”ضروری ہے کیونکہ اطلاع دینے والوں میں تو میں ہی ہوں۔“

”تب پھر آؤ، ہمیں دیر نہیں کرنا چاہئے اور بہتر یہی ہوگا کہ تم اس وقت خواب گاہ میں موجود ہو، جب ایگانوس کو میں وہاں لے جاؤں۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے جواب دیا اور ہم دونوں ایگانوس کی جانب چل دیئے۔  
ایگانوس تک رسائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ اس نے اطلاع ملنے پر ہمیں اپنی آرام گاہ میں بلا لیا۔

”نیولس کیا تم اپنے عہدے کی بحالی کی بات کرنے آئے ہو، لیکن میں اس سلسلے میں سائرس کا انتخاب کر چکا ہوں اور میں نے اسے ہدایت بھی دے دی ہے کہ وہ باغیوں کی سرکوبی کیلئے انتہائی اقدامات کرے اور تم اب اس کا نتیجہ دیکھو گے۔“

”ایگانوس زیرک اور دانشمند ہے اور اس کے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ..... کارگس کی بھائی کیلئے ہوتے ہیں۔“

چنانچہ نیولس کے وفادار کی حیثیت سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ ایگانوس کے فیصلوں کی اطاعت کرے، اس لئے مجھے جو منصب بخشا گیا ہے وہ میرے لئے کم نہیں ہے اور میں اپنے پرانے منصب کی بحالی کیلئے نہیں آیا۔“

”پھر..... پھر کیا بات ہے؟“ نیولس کے الفاظ سے ایگانوس کا رویہ نرم نظر آنے لگا۔  
”اس سے قبل میری توجہ باغیوں کی جانب مبذول تھی، لیکن محل میں آکر میں نے حسب استطاعت محل کے حالات کو پرکھا ہے اور اس وقت میں ایک دردناک اطلاع لے کر تیرے پاس آیا ہوں ایگانوس اور یہ میرا فرض تھا۔“

”دردناک اطلاع؟“ ایگانوس نے چونک کر پوچھا۔  
”ہاں ایگانوس کی غیرت اور وطن دوستی میری نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ نیولس اس کا نواسہ ہے لیکن میں جانتا ہوں شاہی وقار اور دبدبہ اسے ایگانوس نے ہی عطا کیا ہے اور ایگانوس اس کا گران ہے، لیکن میرے علم میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ ایگانوس نے بذات خود اپنے اجداد یا کارگس کے قانون یا عزت و حیثیت کے قانون کی دجیاں اڑائی ہوں۔“

”ہاں یہ حقیقت ہے۔ ہم نے نیولس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی لیکن خود کبھی کارگس کے قوانین کو عمدہ نہیں کہا۔“  
”اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس معاملے کی ایگانوس کو اطلاع نہیں ہے۔“  
”کس معاملے کی بات کر رہے ہو نیولس۔ بات کو الجھائے بغیر صاف صاف کہو۔“

”ہمارے اس خادم کا نام ایلاز ہے اور یہ میری جانب سے نیولس کی خواب گاہ پر تعینات تھا۔“ نیولس نے میری طرف اشارہ کیا۔

”تو پھر تمہارے اس خادم نے ایسی کیا بات دیکھی جس سے تم نے محسوس کیا کہ کارگس کا قانون زخمی ہوا ہے۔“  
”خادم کی یہ مجال نہیں ہے شاہ ایگانوس کہ وہ کسی قسم کی مداخلت یا اپنی طرف سے کوئی ایسی بات کرے جو اس کی حیثیت سے برتر ہو۔ لیکن شہزادی ارکاشہ نے اس سے خود مظلومانہ درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار تو ایگانوس کو اس کا پیغام دے اور اسے بتائے کہ جب سے اس نے ارکاشہ کی جانب سے نگاہیں پھیریں۔ ارکاشہ کی حیثیت اس محل میں کیا ہوگئی ہے اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔“

”ارکاشہ۔“ ایگانوس کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، پھر بولا۔  
”کیا ہوا ارکاشہ کو؟“

”شاہ ایگانوس! کیا تم نے اس دوران کبھی ارکاشہ کی خیریت جاننے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم اس سے ملے ہو۔“  
”نہیں..... طویل عرصے سے نہیں۔“

”اور اس کی وجہ کیا ہے یہ پوچھنے کا حق ایک خادم کو تو نہیں ہے لیکن.....“ نیولس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ارکاشہ کی کچھ باتوں سے شدید..... ناراض تھا۔ میں منتظر تھا اس بات کا کہ ارکاشہ خود مجھ سے رابطہ قائم کرتی۔“

اس کے انداز میں بے پناہ بے چینی تھی۔ وہ پھر بولا۔  
”لیکن اس نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اور میں اس سے برگشتہ رہا۔“

”افسوس۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ تم سے رابطہ قائم کرتی۔ شاہ ایگانوس۔“ نیولس نے کہا۔  
”کیوں ایسی کیا بات ہوئی؟“

”تمہیں شاید اس بات کی اطلاع نہیں ہے کہ شاہ نیولس، بعض معاملات میں انسانوں سے قطعی مختلف ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“

”پھر جب تمہیں اندازہ تھا شاہ ایگائوس تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ کارگس کی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو کہ کسی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ اپنی ماں کا رشتہ ذہن سے منادے اور اسے بھی ایک عورت سمجھے۔“

”کیا..... کہہ کر رہے ہو۔“ ایگائوس کی آواز میں خوف کے آثار تھے۔

”ہاں میرا یہ خادم اپنی نگاہوں سے وہ درندگی دیکھ چکا ہے جس کے نشانات ارکاشہ کے بدن پر کسی ثبوت کی مانند موجود ہیں۔ اس کا پورا جسم زخمی کیا جا چکا ہے اور وہ وقفے وقفے سے اسکے بدن کی سرخ خراشوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ وہ وحشت خیز سلوک ہے جو ایک درندہ اپنی ماں کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ خراشیں نیوکی کے ناخنوں سے بنتی ہیں۔ حتیٰ کہ بے چاری ارکاشہ اس قابل نہیں رہ جاتی کہ خود اٹھ سکے۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا..... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ ایگائوس کے لہجے میں وحشت تھی۔

”یہ بالکل درست ہے ایگائوس۔ میرا خادم اس کا چشم دید گواہ ہے اور خود ارکاشہ نے اس بات کیلئے کہا ہے کہ کم از کم ایگائوس کو اس کی حالت زار کی اطلاع دی جائے۔“

”اوہ..... اوہ..... وحشی درندے وحشی کتے“ تو نے ایگائوس کی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ تو نے ایگائوس کے سینے میں سوراخ کیا ہے۔ ایگائوس جس نے تجھے کس قابل بنایا جس نے تجھے عروج پر پہنچایا وہ تجھے فنا بھی کر سکتا ہے۔ ارکاشہ میری بیٹی میری بیٹی تیرے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ نوجوان اسلذا تم مجھے ساری باتیں سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے میری بیٹی کے ساتھ درندگی کا سلوک دیکھا ہے۔“

”ہاں شاہ ایگائوس۔ وہ جتنی ہے کراہتی ہے لیکن نیوکی اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ وہ ارکاشہ کو نوچتا کھسوتا ہے۔ اسے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹختا ہے اور اسے بالکل نڈھال کر دیتا ہے۔ ارکاشہ ایک قیدی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسے اپنے کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور وہ اپنی آواز دروازے پر کھڑے ہوئے پہریداروں کو نہیں سنا سکتی۔“

ایگائوس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ تب اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

”نیوکی..... نیوکی..... اب تیری زندگی میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تو وحشت اور درندگی کی یہ بدترین مثال قائم کرے گا۔ نیوکی تو نے میرے خوابوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آہ میں نے تیرے بارے میں کیا سوچا تھا۔ لیکن تو نے میرے سینے میں ہی خنجر گھونپ دیا ہے۔ نیوکی تو نے میرے اوپر احسان کیا ہے۔ بے شک تو میرا غلصہ اور ہمدرد ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا۔ میں ابھی ارکاشہ سے طوں گا۔ آہ میری بیٹی کس اذیت کا شکار ہے۔“

ایگائوس غصے اور رنج کی کیفیت سے نڈھال ہو گیا تھا۔

”شاہ ایگائوس..... میری ایک درخواست ہے۔“

”کیا؟“ اس نے غم و اندوہ کے لہجے میں کہا۔

”ابھی آپ انتظار کریں۔“

”کیا انتظار کروں؟“

”اگر آپ کچھ انتظار کریں تو بہتر ہے میں اس وقت آپ کو وہاں پہنچاؤں جب نیوکی درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہو۔“

دوسری صورت میں وہ ہم سب کو جھوٹا بھی ثابت کر سکتا ہے۔“

”لیکن میں کیسے انتظار کروں۔ میں اپنی بیٹی کیلئے بے چین ہوں۔“

”ہمیں مصلحت ایسا کرنا پڑے گا۔“

”کیسی مصلحت؟ میں آج بھی قادر ہوں۔ وہ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ اس نے تو اپنی ماں کا خیال کیا نہ میرا۔ میں نے اس کیلئے کیا نہیں کیا۔ لیکن آج بھی میری آواز اس سے برتر ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو..... یولو کیا سمجھتے ہو تم؟“

”کس کے بارے میں شاہ ایگائوس؟“

”کارگس پر کس کی حکومت ہے۔“

”نیوکی کی۔“

”دوسروں کی طرح تم بھی احمق ہو۔ ذرا بھی سمجھدار ہوتے تو سمجھ جاتے نیوکی ہوتا کون ہے۔ ایک وحشی صرف ایک جانور۔ جسے میں نے انسان بنایا ہے۔ جب وہ اپنی بیٹ سے نہیں بدل سکتا تو اور کیا کر سکتا ہے۔ نہیں نیوکی اس کا کارگس پر آج بھی میری حکومت ہے اور اس کے وفادار میری قوت سے نہیں لڑ سکتے۔“

”شاہ بہتر جانتا ہے۔“

”لیکن میں تمہاری بات مانوں گا خادم۔ جاؤ اپنا کام انجام دو اور نیوکی تم میرے ساتھ رہو۔ میں اسے عالم وحشت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میں نے سر جھکا دیا اور پھر میں واپس نیوکی کی خواب گاہ میں آ گیا۔ وحشی درندہ اندر غرار ہا تھا اور پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلا اس کے انداز میں وحشت تھی۔

تمام خادم مودب ہو گئے۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے جائے لیکن مجھے کسی بات کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور میں نے محسوس کر لیا کہ اس کا رخ ارکاشہ کی خواب گاہ کی طرف ہی تھا۔

تب میں نے اس کے ساتھ اندر جانا مناسب نہیں سمجھا اور میں ایگائوس کی طرف چل پڑا۔ نیوکی ایگائوس کے پاس موجود تھا۔ دونوں مجھے دیکھ کر اچھل پڑے تھے۔

”وہ..... وہ شہزادی کے کمرے کی جانب گیا ہے۔“ میں نے خادموں کے سے انداز میں کہا۔

”اوہ..... چلو..... چلو نیوکی..... آؤ۔“

ایگائوس نے بڑا خنجر اپنے لباس میں چھپا لیا اور پھر وہ باہر لپکا۔ میں اور نیوکی اس کے پیچھے تھے۔ نیوکی نے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری اور میں بھی مسکرائے لگا۔

تب ہم تینوں ارکاشہ کی خواب گاہ پر پہنچ گئے۔ خواب گاہ کا دروازہ بند نہیں تھا اور اندر سے ارکاشہ کی وحشت زدہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی یہ آوازیں کرہناک چیخوں میں بھی بدل جاتی تھیں۔

ایگائوس دیوانہ وار اندر داخل ہو گیا اور نیوکی بھی اس کے پیچھے ہی اندر چلا گیا۔

اندر کا منظر میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ شراب کے برتن زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ ارکاشہ بے لباس تھی۔ اس کے بدن پر نئی خراشیں نظر آرہی تھیں اور قوی جیکل گوریل درمیان میں کھڑا ہوا تھا۔

”نیوکی.....“ ایگائوس کی آواز سنائی دی اور گوریل کے اندر ایگائوس کی آواز سے ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ وہ پلٹ کر ایگائوس کو دیکھنے لگا اور پھر اس نے مجھے اور نیوکی کو دیکھا۔

ایگائوس آگے بڑھ گیا اور اب وہ گوریل کے مقابل نظر آ رہا تھا۔

”نیوکی یہ تو ہے۔“ ایگائوس نے کہا اور اسی وقت ارکاشہ..... آگے بڑھ آئی۔



”صرف اسے دیکھ رہا ہے ایگائوس مجھے بھی تو دیکھ یہ میں ہوں۔“ اس نے پھرے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کا بے لباس جسم دیکھ کر ایگائوس کی آنکھیں جھک گئیں۔

”مجھے نہیں معلوم تھا ارکاشہ..... میری بیٹی مجھے نہیں معلوم تھا۔“

”نیوکی..... نیوکی..... اسے نہیں معلوم تھا۔ سمجھا تو میرے بچے میرے بیٹے! اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اسکی بیٹی کس حال میں ہے آ..... میرے نزدیک آ..... اسے بتا کہ تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ دیکھ میرا بدن تیرے لئے ہے۔ ایگائوس کو اپنی قوت کے مظاہرے دکھانیوکی۔“

اس نے گوریلے کو جھجھوڑ ڈالا، لیکن ایگائوس نے ارکاشہ کو پکڑ کر گھسیٹ لیا، پھر بولا۔

”جنگلی کتے اتو نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ تیری ماں ہے تو نے اس کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ وحشی جانور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا لگایا ہوا پودا اس قدر زہریلا بن جائے گا اور اب مجھے بتا میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں۔“

”گوریلے بول نہیں سکتا تھا لیکن یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ انسانوں کی مانند سمجھدار ہے اور ہر بات پر غور کر سکتا ہے۔

اس کے چہرے پر بے پناہ خوفناک کیفیت طاری تھی۔ تب اس نے خونخوار آوازیں نکالیں اور ایگائوس کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے انداز میں بغاوت نظر آرہی تھی۔

”میں کہتا ہوں فوراً یہاں سے چلا جا اور کسی جنگل میں جا کر پناہ لے، اب تیری یہاں گنجائش نہیں ہے۔ چلا جا ورنہ میں..... میں تجھے قتل بھی کر سکتا ہوں۔“ ایگائوس نے اپنا خنجر نکال لیا۔ ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ تب گوریلے کے انداز میں وحشت ابھرائی۔ اس کے حلق سے ہلکی ہلکی غراٹھیں نکلنے لگیں، پھر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور آگے بڑھا۔

یقیناً۔ کوئی خاص واقعہ ہونے والا تھا اور یہ بات میں اور نیلس دونوں ہی جانتے تھے کہ ایگائوس اس گوریلے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گوریلے بے پناہ طاقتور تھا اور ایگائوس کسی حادثے کا شکار ہونے والا تھا۔

گوریلے قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ ایگائوس نے ارکاشہ کو اپنے پیچھے کر لیا، لیکن دوسرے لمحے ارکاشہ نے اپنے باپ کو دھکا دیا اور آگے آگئی۔

”نہیں ایگائوس تو اسے قتل نہیں کر سکتا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی وحشت کا مظاہرہ تجھے دیکھنا ہوگا۔ تجھے دیکھنا ہوگا کہ آج تک تیری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے اور تو کس طرح مجرمانہ غفلت برتتا رہا ہے۔“

”ارکاشہ میری وحشت کو آواز نہ دے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو کس کیفیت میں ہے۔ ہٹ جا سامنے سے ہٹ جا۔“

ایگائوس نے ارکاشہ کو ایک طرف کر دیا اور خود چند قدم آگے بڑھ گیا۔

تب اچانک گوریلے اپنی جگہ رک گیا۔ وہ اس انداز میں رکھا جیسے اب وہ ایگائوس پر حملہ آور ہونا چاہتا ہو۔ ایگائوس کے انداز میں وہی کیفیت تھی وہ بے حد خون خوار نظر آ رہا تھا۔ اس کا لمبا خنجر ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

”رک کیوں گیا بزدل آگے بڑھ اور مجھ سے مقابلہ کر۔ میں آزمانا چاہتا ہوں کہ میرے بازوؤں میں اب کتنی قوت ہے اور کیا اب میں اس مجرم کو شکست نہیں دے سکتا جس نے کارگس کے قوانین سے بغاوت کی ہے اور جو ہمارے اجداد کے بنائے ہوئے اصول توڑنے کا مرتکب ہوا ہے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کیلئے تجھے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ارکاشہ تیری ماں ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ اچانک گوریلے کے منہ سے آواز نکلی اور ایگائوس کا منہ بھی حیرت سے پھیل گیا۔

”میں اس کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں ایبیر وں کا بیٹا بھی نہیں ہوں۔ میں کون ہوں اس کے بارے میں اس وقت

بتاؤں گا جب تم زندگی کی آخری سانس لے رہے ہو گے۔“

اور یہ ایسی اچانک حیرت انگیز بات تھی کہ نہ صرف میں اور نیلس بلکہ ارکاشہ اور ایگائوس بھی ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے کبھی اس گوریلے کو بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جب گوریلے نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک ناقابل یقین واقعہ رونما ہوا۔

گوریلے نے اپنے پورے بدن سے پوری کھال اتار دی تھی۔ ایک گوریلے کی کھال اور اس کھال کے نیچے سے جو انسان برآمد ہوا تھا وہ میرے لئے ارکاشہ کیلئے اور ایگائوس کیلئے خیر خیز تھا۔ نیلس اسے نہیں جانتا تھا۔ لیکن ہم اسے جانتے تھے۔ ذیشان عالی اور کوروتی وہ گوتم مہنسا ہی تھا۔

”تو..... تو کون ہے؟“ ایگائوس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایک کہانی ایک داستان ہے۔ میری صورت تیرے لئے اور تیری بیٹی کیلئے اجنبی نہ ہوگی۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیزل۔ تو..... یہ تو ہے۔“

”ہاں۔ اور اب تجھے معلوم ہو گیا ہوگا ایگائوس کہ ارکاشہ میری ماں نہیں میری محبوبہ ہے۔“

”لیکن..... لیکن تو تو مر چکا تھا؟“

”ہاں میں مر چکا تھا۔ لیکن میرا علم میرا جادو زندہ تھا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میں ایک داستان ہوں، ایک انوکھی داستان اور اب وقت آگیا ہے کہ میں خود کو افشا کر دوں کہ اس سے مناسب وقت اور کوئی نہیں ہے۔“

یہ کارگس کی داستان کا سب سے عجیب اور پراسرار موڑ تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گوریلے لیزل کیسے بن گیا، اس نے تو ارکاشہ کے بطن سے جنم لیا تھا اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ جادوگر کبڑا میری اس وقت کی حیثیت سے بھی واقف تھا یا نہیں۔ کبڑا لیزل یاد ہے نا۔ وہی جادوگر کبڑا جس نے آرمون سے کہا تھا کہ ارکاشہ اسے دے دے اور حکومت خود لے لے اور پھر اس نے خود کو آرمون کے سامنے ہلاک کر لیا تھا.....

گوریلے کی کھال زمین پر پڑی تھی اور خنجر ایگائوس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ سب تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ ایگائوس گویا سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس وہ آنکھیں پھاڑے کبڑے کو دیکھ رہا تھا۔

”نامکن..... ناقابل یقین۔ مرنے والے اس طرح زندہ نہیں ہوتے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں وہ کسی مشن کی خاطر اپنی زندگی کو دھوڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی بقیہ زندگی کے استعمال کا حق نہیں ہے۔“

”لیکن..... لیکن لیزل..... تو..... تو.....؟“

”میں نے پوری زندگی میں صرف دو کام کئے ہیں ایگائوس! پوشیدہ علوم کا حصول یا ارکاشہ سے عشق۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے صرف ارکاشہ کے عشق میں اپنے سارے علم قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ارکاشہ میری نہ بن سکی اور اس نے آرمون کو اپنا لیا۔ تب میں نے آرمون سے کہا کہ وہ ساری زندگی خوش نہ رہ سکے گا۔ میں اسے سکون نہ لینے دوں گا اور..... ایگائوس اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کے تین حصے کئے ایک جگہ میرا علم ناکام رہا تو میں نے پوری توجہ اپنے علم پر دی۔ تین حصوں میں پہلا حصہ وہ تھا جب میں غلام ایبیر وں کی حیثیت سے ارکاشہ کے سامنے آیا۔ غلام ایبیر وں کو میں نے فنا کر دیا تھا اور پھر میں نے اپنی اس زندگی کو بھی قربان کیا اور خود کو ارکاشہ کے بطن میں محفوظ کر لیا اور پھر لیزل کو آرمون کے سامنے قتل کر کے میں نے اس زندگی کا خاتمہ کر دیا تاکہ تیسری زندگی میں داخل ہو جاؤں جو بظاہر ایک جانور کی زندگی ہو، لیکن اس کے اندر لیزل پرورش پا رہا ہو۔ میں نے جانور کا روپ اس لئے اختیار کیا تھا ایگائوس کہ

ساری سازشوں سے محفوظ رہوں اور دوسرے میرے لئے سازشیں کرتے رہیں اور اس بار میں یزل کبڑے کی طرح کمزور نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے رقیب کو شکست دی اور آرمون میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اب ارکاشہ میرے سوا کسی کی نہیں تھی اور میں یزل کی مانند کمزور نہیں تھا۔ پہلی بار میرے علم نے میری کوئی مدد نہیں کی، لیکن دوسری بار وہ میرا بھرپور ساتھی تھا۔“ یزل کبڑے کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

اور واقعی انوکھی کہانی تھی یہ۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے ایگائوس بھی اس کہانی کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہو۔ اس کے انداز میں ہوجان نظر آ رہا تھا۔

تب تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

”تیرے علوم اپنی جگہ، لیکن کارگرس کے کسی شیطان نے بھی اس عورت کی عزت کی ہے جس کے بطن سے اس نے جنم لیا تو کیا تو نے اس مٹی کو بھی فراموش کر دیا، جس نے تجھے تشکیل کیا۔“

”اگر ایسا ہوا ہو تو؟“ یزل نے پوچھا۔

”تب ایگائوس شش کے عتاب سے محفوظ نہیں رہے گا اور ایگائوس شش قوتیں سلب کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ ماؤں کا محافظ ہے اور اس کے عتاب سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ میں اس کی قوتوں کو آواز دوں گا۔“

کبڑے کی شیطانی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

”ہوتا یوں ہے کہ جب کارگرس کے قوانین سے بغاوت ہوتی ہے۔ علمی اور روحانی بغاوت تو وہ آپہنچتا ہے اس جگہ جہاں اسے پکارا جائے لیکن تو نے دیکھا تیری آواز بے اثر ہے اور ایگائوس شش کا یہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ آخر کیوں؟“ اس نے کہا۔

”صرف اس لئے کہ تیری کہانی جھوٹ ہے، تیرے علم کی داستان جھوٹی ہے۔“ ایگائوس نے کہا اور کبڑے نے اپنا ایک ہاتھ بند کیا۔ اس کے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے روشنی پھوٹنے لگی اور اس نے اپنا ہاتھ ایگائوس کی سمت کر دیا۔ ایگائوس کا جسم تھر تھرا کانپنے لگا تھا اور یوں لگا جیسے فضاؤں کی حرارت فنا ہو گئی ہو۔ سخت ٹھنڈا دینے والی خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ کبڑے نے ایک تہقہہ لگایا اور بولا۔

”میرا علم نہ کمزور ہے نہ جھوٹا..... تو نے دیکھ لیا محسوس کر لیا..... لیکن تو بے حد چالاک ہے اور کیوں نہ ہو۔ عرصہ دراز تک کارگرس کا حکمران رہا ہے۔ لیکن ایگائوس زیادہ بہتر تھا کہ تو حسب معمول حکمرانی کرتا رہتا اور میرے معاملات میں دخل نہ دیتا۔“

”میں نے تیرے دوسرے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا نہ کسی لیکن ارکاشہ میری بیٹی ہے اور تیری ماں ہے۔“

”میں کہہ چکا ہوں وہ صرف میری محبوبہ ہے۔ میں نے غلام ایبیر دس کی حیثیت سے اسے حاصل کیا اور اس کا بطن میری اولاد سے آباد ہو گیا۔“

”لیکن اپنے علم کی مدد سے تو نے اس کے بطن میں گھر کیا۔“

”ہاں لیکن اس نے جس بچے کو جنم دیا وہ میں نہ تھا۔ ہاں اس وقت میں بھی اس کے نزدیک تھا جب میری آنکھوں نے اس بچے کو دیکھا۔“

”اور اس کا بچہ؟“

”وہ میری تحویل میں تھا۔“

”تو نے اسے ہلاک کر دیا؟“

”میں غلام ایبیر دس کو ہلاک کر کے میں نے اس کا بدن حاصل کیا، لیکن وہ بچہ میری ہی اولاد تھا۔ اس لئے میں اسے ہلاک کیوں کرتا۔“

”پھر وہ کہاں ہے؟“

”دیکھنا چاہتے ہو اسے۔ لیکن تم کیا سمجھتے ہو میری اولاد صاحب علم نہ ہوگی.....“ اور پھر اس نے ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

”تم سارا! تو کہاں ہے ان کے سامنے اپنا وجود پیش کر.....“

دوسرے ہی لمحے کمرے میں ایک قوی ہیکل سیاہ فام نظر آیا، جس کے آنے کا کوئی رستہ نہیں تھا لیکن اس کی شکل دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ کیونکہ وہ ایبیر دس کی جوانی تھی۔ سو فیصدی اس کا ہم شکل۔ سب دنگ رہ گئے تھے یہاں تک کہ ارکاشہ بھی۔ سب تھمیرا نہ لگا ہوں سے اس غلام کو دیکھ رہے تھے۔ ارکاشہ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

”یہ..... یہ میرا بیٹا ہے۔ آہ ذلیل یزل کبڑے تو نے میرے بیٹے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے مجھ سے جدا کر دیا تھا..... میرا بیٹا.....“

یزل کے چہرے پر بدستور شیطانیت تھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے نوجوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ میرا بھی بیٹا ہے اور اس نے میری آغوش میں پرورش پائی ہے۔ یہ ماں کے وجود سے ناواقف ہے ارکاشہ اس لئے تمہاری آواز اس کیلئے بیکار ہے۔“

”آہ تو نے..... تو نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے یزل۔“

”اور تو آج بھی میرے ساتھ ناانصافی سے کام لے رہی ہے ارکاشہ..... میری محبت کو دیکھ۔ میری پائیداری کو دیکھ۔ میں کب سے تجھے چاہتا ہوں۔ اگر میں جسمانی طور پر کمزور نہ ہوتا تو اس وقت تیری محبت تیرا وجود حاصل کر لیتا، جب تیرے لئے مقابلے ہوئے تھے، لیکن میری محبت کی آگ سرد نہ پڑی اور پھر تیرے لئے میں نے اپنا وجود فنا کر دیا اور اس فنا کے بعد تو مجھے حاصل ہوئی۔ کس طرح کس مصیبت سے اور کس کسپہری کے عالم میں، میں نے تجھے پایا۔ ہاں ارکاشہ آج بھی میں تجھے سارے عالم کی حسیناؤں پر ترجیح دیتا ہوں، لیکن کتنا بد نصیب ہوں میں کہ آج بھی تیری محبت حاصل نہیں کر سکا۔“

”تو شیطان ہے اور میں ہر عالم میں تجھ سے نفرت کرتی رہوں گی۔“

”ٹھیک ہے میں نے تجھے محبت کیلئے مجبور نہیں کیا۔“ اس نے کہا اور تماشہ کو جانے کا اشارہ کیا۔ نوجوان غائب ہو گیا تھا۔

جب کبڑا ایگائوس کی طرف متوجہ ہو گیا، اس کا چہرہ اب خشک اور بدرونی معلوم ہو رہا تھا۔

”اور اب تیرا کیا خیال ہے ایگائوس! تیری پریشانی ختم ہوئی کہ نہیں، میں نے کارگرس کے قوانین کو نہیں ٹھکرایا۔“

”میں اس کا پٹا نہیں اس کا عاشق ہوں اب بھی تجھے کوئی اعتراض ہے۔“

”لیکن..... لیکن تو نے ایگائوس کو دھوکہ دیا ہے یزل!“

”ہرگز نہیں۔ دیکھ لے میں آج بھی حکومت پر محبت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے حکومت کی خواہش نہیں کی جو تو نے چاہا کیا۔ میں نے حکومت کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ بہتر یہی تھا کہ تو حکومت کرتا رہتا، تو نے میرے

معاملات میں مداخلت کیوں کی؟“

”لیکن لیزل! کیا تو مجھے ہمیشہ دھوکہ دیتا رہے گا۔“

”تو بھی تو لاکھوں انسانوں کو دھوکہ دیتا رہا ہے۔ جواب دے کیا تو نے میری آڑ میں اپنی حکومت برقرار نہیں رکھی۔ کیا آرمون کو حکومت سے ہٹانے کیلئے تو نے اس بن مانس کا سہارا نہیں لیا جو میری چال تھی۔“

”لیکن۔“ ایگائوس کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

”ارکاشہ میری ہے۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا تو چونکہ ایک ایسی بات کیلئے چراغ پا ہو رہا تھا جو یہاں کے قوانین کے خلاف ہے، اس لئے میں تجھے معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن آئندہ میرے معاملات میں مداخلت نہ کرنا اور تم دونوں۔ تم دونوں ایگائوس کی وفاداری کے زعم میں اپنی زندگیاں خطرے میں نہ ڈالنا۔ میں ہر شے کو فنا کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ تم غلام ہو غلام رہو گے میرے یا ایگائوس کے تمہارا کام صرف غلامی ہے۔ اس لئے تم اپنی زبان بند رکھنا۔“

اور میں نے سکون کی سانس لی۔ گویا اس کا غم محدود تھا، مگر بیشمار پراسرار باتوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ درندہ میری شخصیت اور باغیوں کے بارے میں ضرور معلوم کر لیتا۔ میں نے ایگائوس کی جانب دیکھا۔ ایگائوس اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

”جاؤ ایگائوس اور آئندہ میرے اور ارکاشہ کے درمیان مداخلت کی کوشش مت کرنا۔“ اس نے آگے بڑھ کر دوبارہ اپنی کھال اوڑھ لی اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک گوریل نہیں۔

ایگائوس گردن جھکائے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ تھے۔ باہر نکل کر ایگائوس نے کہا۔

”تم لوگ جاؤ، میں دوبارہ تمہیں طلب کروں گا۔“

اور ہم دونوں واپس چل پڑے ہماری ترکیب بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ یعنی ہم نے جو سوچا تھا۔ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تھا۔ پھر جب ہم اپنی رہائشگاہ پر آگئے تو نیلس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو پوئیسس! کیا بات ہے؟“

”انہی حالات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”ہم ناکام ہو گئے۔“

”ہاں واقعی، واقعی طور پر یہی لگتا ہے لیکن اس انکشاف کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تعب خیز، انتہائی تعب خیز!“

”میں لیزل کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور یہ کہانی میرے لئے اجنبی ہے، لیکن وہ بڑا با علم ہے اور ایگائوس جیسے انسان کو یہ قیوف بناتا رہا ہے۔ گویا آج تک قریب سے جاننے والے بھی سمجھتے رہے کہ بن مانس صرف ایک کھلونا ہے جس کے عقب میں ایگائوس کا چہرہ ہے۔ لیکن ایگائوس تو نرا احمق نکلا اور وہ چالاک۔ کیا تمہیں لیزل کی کہانی معلوم ہے پوئیسس؟“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”اوہ مجھے اس سے بے حد دلچسپی ہے۔ کیا مختصر اتم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے۔“

”لیزل نے جو الفاظ استعمال کئے تمہیں یاد ہیں؟“

”ہاں۔“

”تب کہانی مختصر رہ جاتی ہے، وہ ایک صاحب علم لیکن کمزور آدمی تھا۔ لیکن اس کا علم اسے جسمانی برتری نہیں دے

سکا، لیکن وہ ایگائوس کی بیٹی ارکاشہ کو چاہتا تھا اور ارکاشہ اس سے نفرت کرتی تھی، پھر ایگائوس نے کارگس کے قانون کے تحت لوگوں کو ارکاشہ اور حکومت کے حصول کیلئے مقابلہ کی دعوت دی اور اس مقابلے میں ایک چرواہے کا بیٹا آرمون بھی شامل تھا جو ارکاشہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ لیزل کبڑا خود تو مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے آرمون کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو لیزل اس کی مدد کر سکتا ہے اور کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ آرمون صرف حکومت کرے گا اور ارکاشہ اس کی ہوگی۔ آرمون نے یہ شرط تسلیم نہ کی اور کبڑے کے علم کو بھی شکست دے دی۔ تب کبڑے نے وہ چالیں چلیں جن کا اس نے تذکرہ کیا اور اس نے اپنے علم کو مضبوط بنایا۔ اس نے بظاہر آرمون کے سامنے خود کو ختم کر لیا، لیکن دوسری شکل میں زندہ ہو گیا۔ یہ اس کا علم تھا۔ ایگائوس جو حکومت چھوڑ کر اس احساس کا شکار ہو گیا تھا کہ اب اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی اس سازش کا شریک رہا۔ لیکن وہ بھی حالات سے لاعلم تھا اور آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ارکاشہ کا عجیب اخلت پٹا اس کے ہاتھوں میں کٹ پتلی ہے۔“

”آہ کیسی عجیب کہانی ہے کتنی پراسرار اور حیرت انگیز! کون کون اس کہانی میں عیاں ہوا ہے۔ لیکن اب کیا ہوگا۔“

”ہماری جدوجہد میں کچھ اور تیزی آجائے گی۔“

”تم پریشان نہیں ہو۔“

”کیوں پریشانی کی وجہ؟“

”اوہ! تم بھی تو معمولی انسان نہیں ہو، لیکن تمہارا اب کیا خیال ہے؟ کیا ایگائوس اس انکشاف کے بعد خاموش ہو جائے گا؟“

”اگر خاموش ہوتا چاہے گا تو ہم اسے خاموش نہیں رہنے دیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم اس کے بعد احساس کو ہوا دو گے کہ اس کبڑے نے شکست دی ہے۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”ہم اس کے اس احساس کو ہوا دو گے کہ اسے کبڑے نے شکست دی ہے۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”ہم اسے ایک ترکیب بتائیں گے۔“

”کیسی ترکیب؟“

”اور میں نیلس کو اپنی تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔ نیلس پر خیال انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

”ایگائوس کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔“

”یہ تمہاری ذہانت کی بات ہے، ویسے وہ ذہنی طور پر سخت پریشان ہے اور ایسے حالات میں انسان دوسروں کے سہارے تلاش کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن اس کے بعد؟“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”یہی میں پوچھ رہا ہوں۔ یعنی بغاوت؟“

”ان دونوں میں سے ایک کو زندہ رہنا چاہئے نیلس۔ دونوں کی زندگی زیادہ خطرناک ہے۔“

”تمہارے خیال میں کون زیادہ خطرناک ہے؟“

”ہر حال میں لیزل خاص طور پر نئی شکل میں آنے کے بعد؟“  
 ”وہ زبردست جادوگر ہے۔“  
 ”میں نہیں مانتا۔“  
 ”کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ ہم سے لاطم ہے حالانکہ اگر اس کا علم زیادہ طاقتور ہوتا تو وہ یہ جان جاتا کہ اس کی حکومت کے اصل باغی اس کے نزدیک موجود ہیں۔“  
 ”اوہ۔ ہاں یہ تو درست ہے۔“

”کچھ بھی ہو نیولس ہمیں اپنے مشن کو پورا کرنا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کی حکومت نہیں ہونا چاہئے اور تم میرے ہمنوا ہو۔ ویسے ایگائوس کو زبردست شکست ہوئی ہے۔ اب اس کی سوچ کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ یہ دیکھنا ہے۔“  
 اور پھر ایگائوس کے دو سپاہی ہمیں بلانے آگئے۔ اس خادم کو بھی طلب کیا گیا جو نیولس کی خواب گاہ پر تعینات تھا۔ سپاہی نے خاص طور سے کہا اور پھر ہم دونوں تیار ہو گئے۔

”یہ بھی بہتر ہی ہوا ہے نیولس کہ تم میرے ساتھ ہو۔ اس طرح میں بھی مطمئن رہوں گا، لیکن ایگائوس سے جو کچھ بات چیت کرنا ہے اس سے تم مطمئن ہو؟“

”پوری طرح۔ بات یہ ہے نیولس کہ ہمیں وہ جو اکیلے ہیں۔ ہم نے چاروں طرف پاؤں پھیلا رکھے ہیں اور ہم کسی طور پر محدود نہیں ہیں۔ اگر ہم ایک پہلو سے شکست کھاتے ہیں تو ہمارے پاس دوسرا ذریعہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ سرنگ عمل ہو جائے تو ہماری طاقت بھی کارگس میں بڑھ سکتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے کارگس کے دوسرے علاقوں میں نیولس کے اتنے حامی اور ہمدرد نہ ہوں گے جتنے کہ اس علاقے میں موجود ہیں۔ گویا اگر ہمیں کسی جگہ سے خدشہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسی علاقے سے۔ اگر ہم نے یہاں نیولس پر قابو پالیا تو باقی معاملات سے باسانی نمٹا جاسکتا ہے۔“

”یقیناً۔“ نیولس نے جواب دیا، پھر وہ پر خیال انداز میں بولا۔

”لیکن نیولس یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔“

”سپاہی ہم سے فاصلے پر تھا۔ اس لئے ہمیں یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ ہماری گفتگو سن لے گا۔“

”کیا سوال پیدا ہوتا ہے نیولس؟“ میں نے پوچھا۔

”ان دونوں کا مسئلہ تھا۔ تمہارے خیال میں ان میں سے کس کی زندگی زیادہ اہم ہے۔ نیولس کی یا ایگائوس کی۔“  
 نیولس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا اور میں اسے دیکھنے لگا، پھر میں نے کہا۔

”آہ..... میرے دوست نیولس تم اس بات سے قطعی ناواقف ہو کہ نیولس کی حقیقت کیا ہے۔ تم نے اس کی ایک شکل دیکھی اور دوسری شکل بھی دیکھ لی، جس میں وہ لیزل کی حیثیت سے سامنے آیا۔ لیزل ایک شیطان ہے۔ اسے شیطان صفت کہنا میرے خیال کے مطابق مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم اسے مکمل شیطان کہیں تو یہ زیادہ مناسب ہے۔“

میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ ایگائوس اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے دیکھا اس نے ایگائوس کی زندگی بھر کی کاوشوں کو شکست دی ہے اور کس طرح اس نے اپنے آپ کو ایگائوس کی نگاہوں سے محفوظ رکھا۔ بہت ہی چالاک انسان ہے۔ یہ گونشیاں کی زندگی میں ڈوبا رہا، لیکن حکومت مکمل طور پر اس کی رہی۔ یعنی باہر کے لوگ یہی بات جانتے ہیں کہ نیولس شہنشاہ ہے اور ایگائوس نے بھی یہی بات مشہور کی، نیولس کی بادشاہت میں اس کی شخصیت کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہے۔ ادھر ایگائوس اپنے طور پر یہی سمجھتا رہا کہ حکومت وہ خود کر رہا

ہے اور ذریعہ نیولس ہے۔ لیکن نیولس کی سوچ زیادہ خطرناک تھی اس نے یہی سوچا کہ ایگائوس حیثیت کیا رکھتا ہے اسے جب چاہے وہ مٹا سکتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے نیولس ذہنی طور پر بہت زیادہ طاقتور ہے اور بلاشبہ اس کے علوم حیرت انگیز ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں نئے تجربات کر سکتا ہے جو میں نے کارگس کے کسی دوسرے شخص میں نہیں پائے۔ اسی لئے میں نے یہ بات کہی کہ لیزل مکمل شیطان ہے۔“

”بالکل درست“ تو اس لئے تمہارا خیال یہ ہے نیولس کہ اگر نیولس ہمارے راستے سے ہٹ جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”زیادہ بہتر کیا بلکہ نیولس کو ہمارے راستے سے ہٹنا ہی چاہئے اور اب خاص طور سے ان حالات میں جبکہ اس کی شخصیت مکمل گمنی ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

”بہت خوب گویا تم یہ چاہتے ہو کہ نیولس راستے سے ہٹ جائے۔“  
 ”ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔ لیکن تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا نیولس کا راستے سے ہٹنا اتنا آسان ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں جو کچھ تم نے بتایا ہے اس کے تحت تو یہ اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔“  
 ”دیکھنا یہ ہے نیولس کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس وقت جب تک میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ نیولس صرف ایک طاقتور گوریلا ہے اور ایگائوس اصل ذہن ہے جو اس کی پشت پر کام کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں کوئی تردید نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نیولس کو شکست دوں گا۔“

لیکن جب سے مجھے اس کی اصلیت معلوم ہوئی ہے میرے ذہن میں بہت سے خیالات ہیں۔“

”تم مایوس ہو پوچھتے ہو؟“ نیولس نے پوچھا۔

”نہیں نیولس۔ لیکن اب معاملہ بدل گیا ہے۔“

”وہ بہت طاقتور ہے۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے خاص طور سے اس کے علوم۔ ہمیں دشمن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

”پھر اب تم نے کیا سوچا ہے نیولس۔“

”میں بھلا کیا سوچوں؟ میں تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ نیولس نے پریشان لہجے میں کہا۔  
 ”تو پھر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ الجھو نہیں ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ اگر حل نہ ہو تو مشکل بھی نہیں ہوتی۔“

”یہ تو درست ہے۔“ نیولس نے کہا۔

”گفتگو کرتے ہوئے ہم دونوں محل کے دروازے میں داخل ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایگائوس کے سامنے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں عام لوگوں کا گزر نہیں تھا۔ یعنی ایگائوس کی وہ پوشیدہ رہائش گاہ جس کے گرد سخت پہرہ رہتا تھا اور ایگائوس اپنے شیطانی کارنامے وہیں بیٹھ کر انجام دیتا تھا۔ باہر کی دنیا میں وہ صرف ارکا شہ کا باپ یعنی معزول شہنشاہ اور نیولس کا نانا تھا۔ لیکن یہاں اس کیلئے اس کے اختیارات لامحدود تھے۔“

ایگائوس کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار صاف طور سے ہوتا تھا۔ وہ ایک آرام کرسی میں دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ ہم دونوں کو اس نے اپنائیت کی نگاہ سے دیکھا۔

”آؤ بیٹھو۔ تم دونوں اس سے قبل جس حیثیت سے آئے تھے اب اسے بھول جاؤ“ کیونکہ تم میرے ایک ایسے راز کے شریک ہو گئے ہو جس سے کوئی اور واقف نہیں ہے۔ لیکن کیا تم قابل اعتماد ہو؟“ ایگائوس نے گہری نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔

”اس کا فیصلہ ایگائوس کرے۔“ نیلس نے جواب دیا۔

”ایگائوس فیصلے کرنے کا اہل ہے کیونکہ اس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے اور اس کا ذہن آج بھی اس کا ساتھی ہے۔“

”درست کہا شہنشاہ نے۔“ نیلس بولا۔

”اور ہر دور میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کا پابند رہا ہے۔ میں صرف تم لوگوں کی وفاداری نہیں مانگوں گا بلکہ اس کا صلہ بھی دوں گا۔“

”حقیقت پسند شہنشاہ کی بات دانشمندانہ ہے۔“ نیلس نے کہا۔

”سو یہ سوچ لو کہ مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی کچھ نہیں دے گا اور جو تم مانگو گے میں اسے دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ شہنشاہ کی یہ بات کافی ہے۔“

”گویا میرے وفادار بن کر تم کسی اور کے وفادار بننے کی کوشش نہیں کرو گے۔ کیا تم اس بات کا وعدہ کرتے ہو؟“

”شاہ ایگائوس ہماری نیت پر شک نہ کرے اور اس بات کا یقین کرے کہ ہم نے جو کچھ کیا اپنی وفاداری کے تحت ہی کیا اور آئندہ بھی جو کچھ کریں گے اس میں یہ احساس مزید شامل ہوگا کہ شاہ کی نگاہوں میں وقعت پانے کے بعد ہماری حیثیت مختلف ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری وفاداری مشکوک نہیں ہوگی..... ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیشہ شاہ ایگائوس کے وفاداروں میں رہیں گے اس کی اچھائی کے خواہاں رہیں گے۔“

”تمہاری زبان سے سچائی کی جو بو آتی ہے خادم! اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟“ ایگائوس نے سوال کیا۔

”میں پشت ہاپشت سے ایگائوس کے وفاداروں میں سے ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تب ٹھیک ہے۔ اگر ایسے وفادار مجھے حاصل ہیں تو بہر صورت میں مایوس نہیں ہوں۔ لیزل کبڑا کیسے ہی علوم کا ماہر کیوں نہ ہو لیکن میری ذہنی قوتیں اور میرے وفاداروں کا تعاون اسے شکست دے گا اور مجھے اس بات کا بھرپور یقین ہے۔ میں اپنے مستندوں کے ساتھ تمہا نہیں ہوں اور کبڑے کو حیرت ہوگی جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ خود گل میں میرے لئے بیشار و دوست ہیں۔ شاہ ایگائوس نے کہا۔

”یقیناً یقیناً شاہ کی قوت محدود نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سو میرے دوستو! مجھے تمہارا مشورہ بھی درکار ہے اور میں یہ مشورہ تم سے لے رہا ہوں۔ تمہاری اس حیثیت سے نہیں جو اس سے قبل تھی بلکہ میں اپنے مخصوص ساتھیوں کی حیثیت سے تمہارا مشورہ چاہتا ہوں۔“

”ہم خلوص دل سے تیار ہیں شاہ ایگائوس۔“ نیلس نے جواب دیا۔

”تو کیا کہتے ہو تم اس سلسلے میں جب کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ نیوکی کے سلسلے میں میں نے دھوکہ کھایا ہے گویا نیوکی وہ نہیں تھا جو میں نے اسے سمجھا بلکہ وہ کچھ اور نکلا اور اس نے اپنی قوتوں کو محفوظ رکھا۔ لیکن محل کے لوگ جن کے تحت حکومت کے کاروبار چلتے ہیں۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ زبان نیوکی کی اور ذہن ایگائوس کا ہے اور زبان بظاہر کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ اس سے قبل وہ لیزل کو اس کی اصل حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ یہ بات تو ان کے علم میں بھی ہوگی کہ سوچنا ایگائوس ہے اور اگر لیزل بذات خود کوئی حیثیت رکھتا ہے تو اس کا استحصال نہیں کر سکتا۔ گویا ہم لوگوں کی

واقعیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو نیوکی کے روپ میں چھپے ہوئے لیزل کو ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو تمہارے خیال میں اس سلسلہ میں کوئی موزوں ترکیب ہے؟“ ایگائوس نے سوال کیا اور میں اس کی ذہنی الجھنوں پر غور کرنے لگا۔ وہ ہمارے بارے میں جانے بوجھے بغیر ہم سے مشورہ لے رہا تھا۔ چنانچہ نیلس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”شاہ ایگائوس! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بھرے دربار میں ہم لیزل کو بے نقاب کر دیں۔“

”اوہ.....! وہ میں جانتا ہوں کہ تم ایک ایسے عہدے پر فائز رہ چکے ہو جس کی ذمہ داریاں اہم ہوتی ہیں لیکن اس سے قبل میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم ذہنی برتری کے حامل ہو اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے عہدے سے معزول کر دیا تھا اور ایک دوسرے شخص کو تمہاری جگہ دے دی تھی۔ نیلس گزری باتوں کو ذہن سے نکال دو اور مجھے بتاؤ کہ تم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کیا بہتر تجویز پیش کر سکتے ہو۔ یعنی اگر میں کبڑے کو بے نقاب کرنا چاہوں تو کس طرح؟“ ایگائوس نے سوال کیا۔

”شاہ ایگائوس! لیزل کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ ایک با علم انسان ہے لیکن کارگس کے قانون کے مطابق نہ تو اس نے آرمون سے جنگ کی ہے جس کی حکومت حاصل کی گئی اور نہ اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا جس سے اس کی اپنی حیثیت مسلم ہو جائے۔ اب اگر ہم دربار عام میں اس کی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہوئے کہیں کہ لیزل نے اپنے علم کے ذریعے اس ہستی کو ختم کر دیا جو حکمران تھی اور گوریلے کے نقاب میں مظلوف ہو کر لیزل نے خود کو حکومت کا وارث ثابت کرنے کی کوشش کی اور حکومت پر قبضہ کر بیٹھا تو کیا اہل دربار اس کی حکومت کو تسلیم کر لیں گے؟“

”ہرگز نہیں کریں گے اور یہی کارگس کا قانون ہے۔“ شاہ ایگائوس نے جواب دیا۔

”ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اہل دربار کو اس کی حیثیت بتا دیں تو کیا وہ یزل کی مخالفت نہیں کریں گے؟“

”یقیناً کریں گے۔“

”تو پھر اس سے بہتر ترکیب اور کون سی ہو سکتی ہے کہ بھرے دربار میں کبڑے کو بے نقاب کر دیا جائے اور اس کی معزولی کا مطالبہ کیا جائے۔ شاہ ایگائوس تم اپنی حیثیت میں فوری طور پر حکومت سنبھال سکتے ہو اور یہ اعلان کر سکتے ہو کہ جب تک کسی بہتر حکمران کا انتخاب نہ ہو جائے تم اس حکومت کے گران ہو اور اپنی اس گران میں نئے حکمران کا انتخاب کراؤ گے.....“ نیلس نے کہا اور ایگائوس نے غریہ لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”خوب خوب کہا۔“ تم یقین کرو گے نیلس کہ میں نے بھی اپنے ذہن میں یہی فیصلہ کیا تھا۔“

”یقیناً شاہ ایگائوس کی زبان پر شک کیسے ہو سکتا ہے۔“ نیلس نے جواب دیا۔

”تو بھر میرے دوستو! میں تمہاری تجویز سے پوری طرح متفق ہوں اور مجھے انتہائی خوشی ہے کہ میں نے جو کچھ سوچا تھا اور لوگ بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہیں اور وہ چیز جس کے بارے میں میں کچھ سوچتا یا سمجھتا ہوں اس چیز کو میرے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں تمہاری اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے یہی فیصلہ کرتا ہوں کہ پھر سے دربار میں میں کبڑے کی نقلی شخصیت کا اعلان کر دوں گا۔ ہاں اس سلسلے میں اگر کوئی اور تجویز ہو تو وہ بھی بتاؤ۔“

”میں یہ چاہوں گا شاہ ایگائوس! کہ تم اس سلسلہ میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرو بلکہ پہلے اپنے کچھ اہل دربار کو اپنا ہنواؤ اور انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرو کہ لیزل کیا ہے اس طرح جب دربار میں تم اس بات کا اعلان کرو گے تو شاہ

ایگا نوس! اس صورت میں تمہارے ہمدردوں کیلئے وہ اعلان اجنبی نہ ہوگا اور وہ تمہارا ساتھ دینے کیلئے پوری طرح تیار ہوں گے۔“ نیولس نے کہا۔

تب میں نے اسی گفتگو میں مداخلت کی۔

”میری رائے کچھ اور ہے نیولس۔“

”کیا؟“ نیولس نے پوری توجہ سے مجھے دیکھا۔

”یہ اتفاق نہیں ہے کہ تم نے اور شہنشاہ ایگانوس نے ایک ہی بات سوچی اور اس کا اظہار کر دیا..... کیا تم اسے اتفاق سمجھتے ہو؟“

”تمہارے خیال میں یہ کیا ہے؟“

”ایک مؤثر تدبیر یعنی لیزل کو بے نقاب کرنے کیلئے یہی طریقہ کار سوچا جاسکتا ہے۔“

”تو پھر اس سے مقصد؟“

”گو یا اگر کوئی ایسے مرحلے میں داخل ہو جائے تو پھر وہ کیا کر سکتا ہے۔ وہی جو شاہ ایگانوس نے سوچا اور جو تم نے ورنہ تمہاری تجویز کچھ اور ہوتی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کیا لیزل احمق ہے۔ جب دوزخ میں ایک ہی انداز میں سوچ سکتے ہیں تو تیسرا ذہن کیوں نہیں سوچ سکتا۔“

”خادم کی بات قابل غور ہے نیولس۔“ ایگانوس نے کہا۔

”لیزل خود بھی تو مطمئن نہیں ہوگا اور وہ بھی یہی سوچ سکتا ہے، لیکن خادم اس بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو کیا یہ تجویز مناسب نہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے اس سے عمدہ اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی۔“

”پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ اہل دربار میں سے پہلے سے کچھ لوگوں کو اس بارے میں بتانا مناسب نہیں ہے بلکہ یہ انکشاف اچانک کیا جائے۔“

”ہاں غور کیا جاسکتا ہے۔“

”شاہ ایگانوس! کیا اہل دربار صرف اس کے ہمنوا ہوں گے جبکہ میرے خیال میں وہاں تمہارے بارے میں جاننے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“

”پھر تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ تم جب بھی اور جو بھی قدم اٹھاؤ اس میں زیادہ لوگوں کو شامل نہ کرو اور جس وقت چاہو قدم اٹھاؤ۔“

”تو پھر دوسرے دربار میں یہ کام کر لیا جائے۔ ویسے خادم کی بات میرے ذہن کو لگتی ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔“

”مناسب۔“ نیولس نے کہا۔

”دوسرے دربار میں تم موجود ہو گے اس کے علاوہ مجھے کچھ اور لوگوں کی بھی ضرورت رہے گی جو میرے لئے جنگ کریں۔“

”بہتر ان کا بندوبست میں کر لوں گا۔“ نیولس نے کہا۔

”تو پھر میں اس بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کروں گا۔ بس اس معاملے کو طے سمجھو اور خود کو اس کیلئے تیار کر کے دوسرے دربار میں شرکت کرو۔“

”جو حکم۔“ نیولس نے کہا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ نیولس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے دلچسپ لگا ہوں سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگا۔

”کیوں نیولس کیوں ہنسی آرہی ہے۔“

”تمہارے بارے میں سوچ کر۔“

”خیریت؟“

”ایگانوس تمہیں خادم کہہ کر پکارتا ہے اور اسے اس بات پر حیرت ہے کہ اس کے ہاں کے معمولی لوگ اس کی ذہانت کو چھوٹے ہیں۔ ابھی تو وہ صرف لیزل اور نیوکی کی طرف متوجہ ہے، لیکن اسے دوسری خصوصیت کا علم ہوگا تو وہ کتنی حیرت کرے گا۔“

”اس نے بھی لوگوں کو دھوکہ دیا ہے اسے اس دھوکے کی سزا ملنا بہت ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے بالکل ٹھیک۔ بہر حال دوسرے دربار کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”سب ٹھیک ہے۔ کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں۔“

”ہمارا اپنا کردار وہاں کیا ہوگا؟“

”ایک تماشائی کا۔“ میں نے جواب دیا اور نیولس چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ہم حالات کے تماشائی ہیں نیولس! جن لوگوں کو تم ایگانوس کی طرف داری کیلئے لے جاؤ گے وہ تمہارے اپنے آدمی ہونے چاہئیں۔“

”ظاہر ہے وہی ہوں گے۔“

”لیکن تم انہیں جو ہدایات دو گے وہ یوں ہوں گی کہ اگر دربار میں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ حالات کا جائزہ لیں اگر ایگانوس کا پلہ بھاری رہے تو وہ ایگانوس کیلئے جنگ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں اور اگر دیکھیں کہ نیوکی بھاری پڑ رہا ہے تو خاموشی اختیار کر لیں اور حالات کا جائزہ لیں۔“

”اوہ۔“ نیولس نے پر خیال انداز میں کہا۔

”یہی بہتر بھی ہے نیولس۔“

”ہاں میں سمجھتا ہوں۔“ نیولس نے کہا اور پھر گردن ہلا کر بولا۔

”ٹھیک ہے پلیسیس۔ میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا۔“

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب دربار عام لگا۔ گوریلا نیوکی تخت شاہی پر فروکش تھا اور اس کا مشیر اور پیٹرو ایگانوس اس کی جانب سے مقدمات کی پیروی کر رہا تھا اور اس کی ایما پر فیصلے دے رہا تھا۔

آخری مقدمہ نمٹانے کے بعد ایگانوس نے دربار پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

”اہل دربار اور معزز لوگو! ایک مقدمہ میں خود بھی پیش کرنا چاہتا ہوں اور اپنی جگہ میں اپنے بزرگ ہیلالاز کو مقرر کرتا ہوں تاکہ وہ میرے اس مقدمے کی پیروی کرے۔“



میری نگاہیں نیوکی پر جمی ہوئی تھیں جس نے چونک کر ایگائوس کی جانب دیکھا تھا۔ ہیلالاز کھڑا ہو گیا۔  
 ”تیرا مقدمہ کس کے خلاف ہے ایگائوس؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”نیوکی کے خلاف۔“ ایگائوس نے کہا اور دربار میں بھینٹناٹ گونج اٹھی۔ نیوکی گردن ہلانے لگا تھا۔  
 ”کیا کہنا چاہتا ہے تو نیوکی کے خلاف؟“ ہیلالاز نے پوچھا۔

”یہی کہ وہ نیوکی نہیں بلکہ لیزل ہے ایک قدم جادوگر جس نے اپنے علم کے سہارے یہ انداز اختیار کیا اور حکومت کے اصل حقدار کو اغوا کر کے اس کی جگہ خود قابض ہو گیا۔ اس کھال کے نیچے لیزل پوشیدہ ہے اور ہیلالاز لیزل کو بھولنا نہ ہوگا۔“

نیوکی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دربار میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔

”کیا یہ حقیقت ہے۔ کیا ایگائوس سچ کہہ رہا ہے جواب دیا جائے۔ نیوکی کیا کہتا ہے۔“

”تب نیوکی نے غصیلے انداز میں گردن ہلائی اور فضا میں ہاتھ ہلانے لگا۔ گویا اپنے غصے کا اظہار کر رہا ہو اور پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور ایک قوی پیکل آدمی تخت کے پاس پہنچ گیا۔

”میرا نام الاشا ہے اور میں نیوکی کا نمائندہ ہوں۔ چونکہ نیوکی کے پاس قوت گویائی نہیں ہے اور اس کا ترجمان صرف ایگائوس ہے لیکن یہ ایگائوس کی بھول ہے۔ نیوکی صرف قوت گویائی اور انسانی جسم سے محروم ہے۔ اس کے پاس عقل و دانش کی کمی نہیں ہے۔ اس لئے اس نے مجھے اپنی اشاراتی زبان سے آگاہ کیا تھا۔ اب میں اس کا ہم زبان ہوں۔“

”آؤ تم بھی آ جاؤ لیکن آج میں نیوکی کے وجود میں چھپے ہوئے اس شیطان لیزل کو بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں۔“ ایگائوس نے کہا۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو ایگائوس؟“ الاشا نے پوچھا۔

”یہی کہ جانور کی اس کھال کے نیچے جو لیزل پوشیدہ ہے۔ اس نے ارکاش کے بیٹے جسے وہ اب تمہارا کہتا ہے کو اس وقت اغوا کیا جب وہ پیدا ہوا تھا اور خود ایک انوکھی سازش کے تحت اس بچے کی شکل اختیار کر لی اور اس کے بعد سے وہ خود ارکاش کیلئے بھی ایک عذاب بنا ہوا ہے اور کارگرس کے لوگوں کیلئے بھی۔ میں صرف اس لئے اس کا شیر کار بن رہا کہ وہ قوت گویائی سے محروم ہے اور میں کارگرس کا محافظ۔ میرے علم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ دراصل لیزل ہے اور جب مجھے معلوم ہو گیا تو پھر میں بھلا اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل کیوں رہتا۔ چنانچہ آج میں اہل دربار کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ نیوکی لیزل کا دوسرا روپ ہے اور وہ کسی بھی طور حکومت کے قابل نہیں ہے۔“ ایگائوس نے کہا اور سارے درباری چونک پڑے۔

”لیکن ایگائوس تمہیں اس بات کو ثابت بھی تو کرنا ہوگا کہ وہ نیوکی نہیں لیزل ہے۔“

”ہاں اس کی کھال کے نیچے لیزل پوشیدہ ہے۔ اس کے بدن سے کھال کو اتار دیا جائے۔“ ایگائوس نے کہا اور دربار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تب الاشا اٹھا۔ الاشا نیوکی کے پاس جا کر رک گیا اور نیوکی سے کچھ سوالات کرنے لگا۔ تب الاشا نے ایگائوس کی جانب دیکھا اور عجیب سے انداز میں بولا۔

”ایگائوس! نیوکی کہتا ہے کہ وہ کارگرس کا حکمران ہے جو کچھ بھی ہے وہ کارگرس کے قوانین کے تحت اس سرزمین کا حکمران بنا ہے۔ اس نے یہ حکومت آرمون کو شکست دے کر حاصل کی ہے اور ایگائوس چونکہ ایک معزول شدہ حکمران ہے اس لئے وہ شیر تو ہو سکتا ہے قادر و حاکم نہیں پھر وہ کس حیثیت سے یہ مقدمہ طے کرتے ہوئے اپنے اس اعتراض کو

منظر عام پر لایا ہے۔“ الاشا نے نیوکی کے ترجمان کی حیثیت سے کہا۔

سابق حکمران ہونے کی حیثیت سے اور چونکہ اس وقت اس حکومت کا حکمران کوئی نہیں ہے اس لئے سابق حکمران ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اس حکومت کا گھرانہ بن جاؤں اور حکومت کسی ایسے شخص کے سپرد کر دوں جو اس کا اہل ہو اور خدار نہ ہو۔“ ایگائوس نے جواب دیا۔

”لوگو! تمہارا کیا خیال ہے؟“ ہیلالاز نے ایگائوس کے ترجمان کی حیثیت سے اہل دربار سے پوچھا۔

”ایگائوس کو سب سے پہلے یہ بات ثابت کرنا ہوگی کہ نیوکی کے روپ میں لیزل ہے۔“ بہت سی آوازیں ابھریں۔

”اور اس کے بعد اگر یہ بات سچ ثابت ہوگئی تب پھر کیا ہوگا؟“ ہیلالاز نے سوال کیا۔

”تب لیزل کو اسی وقت گرفتار کیا جائے گا اور حکومت کارگرس کے سابق حکمران ایگائوس کے حوالے کر دی جائے گی لیکن صرف ایک گھرانہ حکومت اور پھر ایگائوس نے حکمران کیلئے انتخابات کرائے گا۔“

”کیا نیوکی کو اس پر اعتراض ہے؟“ ہیلالاز نے نیوکی سے سوال کیا اور نیوکی کا ترجمان الاشا آگے بڑھ آیا۔

”نہیں نیوکی اس بات کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک اور شرط بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ ایگائوس نے پوچھا۔

”اگر ایگائوس یہ بات ثابت نہیں کر سکا تو پھر اسے مداخلت بیجا کے جرم میں گرفتار کیا جائے گا یا پھر اسے یہ مہلت دی جائے گی کہ چونکہ وہ اچانک ہی حکومت کا عیدار بن کر ظاہر ہوا ہے اس لئے اسے قانون کے مطابق نیوکی کے سامنے آنا پڑے گا اور اس کا فیصلہ کرنا نیوکی کا کام ہوگا کہ اسے زندگی دے یا موت۔“

”میں یہ بات نہیں مانتا کیونکہ نیوکی سرے سے حکومت کا حقدار ہی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ تو چند ساعت کے بعد ہو جائے گا۔ اگر نیوکی نیوکی نہیں ثابت ہوتا تو پھر ایگائوس کو یہ حق حاصل ہے۔ ورنہ دوسری مشکل میں یہ بات بھی بالکل مناسب ہے کہ نیوکی اس شخص کو اپنی مرضی کے مطابق سزا دے جس نے اس پر شک کیا اور اپنی آواز شہنشاہ کے سامنے اس سے بلند اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کی۔“ الاشا نے کہا۔

اس بات پر سب ہی نے اتفاق کیا۔ میں نے خوفزدہ انداز میں نیولس کی جانب دیکھا اور نیولس نے گردن ہلا دی۔

”ہم نے اس سلسلہ میں نہیں سوچا تھا پولیسیس۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا نیوکی یا لیزل اپنی حکمت عملی یا اپنے علم کی قوت سے کام لے کر خود کو وہی نہیں ثابت کر دے گا جو وہ عوام کے سامنے ہے۔“

”ہاں ممکن ہے۔“

”ایسی صورت میں جو کچھ ہوگا اس کا اندازہ تم کر لو۔“

”سب ٹھیک ہے نیولس۔“

”کیا طلب؟“

”کیا تم ایگائوس کیلئے دل میں ہمدردی محسوس کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے ہم لوگ صرف تماشا ہی ہیں۔ دو پہلوان

آمنے سامنے ہیں۔ کون بھاری پڑے اس کا اندازہ بعد میں ہو جائے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ باقی رہ جانے والے کو تو ہم شکست دے دیں گے۔“

”لیکن ایگائوس کے پاس ایک داؤ محفوظ ہے۔“  
”کیا؟“

”اس وقت وہ ارکاش کو پیش کرے وہ اس کی مدد کر سکتی ہے۔“

”افسوس! اس بارے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔“

”افسوس کی کوئی بات نہیں ہے نیولس! بس کھیل دیکھتے رہو۔“ میں نے جواب دیا اور نیولس خاموش ہو گیا۔

ایگائوس کافی پر جوش تھا۔ اسے خود پر بے حد اعتماد بھی تھا۔ چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرتا ہے اور ہم نے سوچ لیا کہ ایگائوس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی ہے۔

نیولس نے خود کو پیش کر دیا، وہ اس امتحان کیلئے تیار تھا۔ دربار میں بھی میں نے دیکھا کہ ایگائوس کے ہمنوا بہت کم ہیں۔ شرط ایسی آن پڑی تھی کہ ان کی آواز بھی دب گئی تھی اور اب صرف اس بات کے نتیجے کے منتظر تھے۔

چنانچہ ہیلاناز کے طلب کرنے پر اہل دربار میں سے دو اشخاص آگئے اور پھر اس کے اشارے پر نیولس کی کھال اتارنے کی کوشش کی جانے لگی۔ نیولس گوریلوں کے سے انداز میں سینہ پیٹ رہا تھا۔ وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس نے تعرض نہیں کیا اور ان لوگوں کو اپنی ہی کوشش کرنے دی۔

وہ لوگ بھی شاید ایگائوس کے وفاداروں میں سے تھے جو نیولس کو عریاں کر دینا چاہتے تھے، لیکن وہ کیا کرتے۔ خود لیزل کی بات دوسری تھی، لیکن دوسرے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور بالآخر لوگوں نے اعتراف کیا کہ نیولس ایک گوریلو کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ایگائوس کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

”میں نے..... میں نے خود دیکھا ہے کہ اس نے اپنی کھال اتار دی تھی اور خود کو لیزل کہا تھا بلکہ میرے دو گواہ بھی تھے..... آہ..... میری بیٹی ارکاش کو بلاؤ۔ وہ اس بات کی گواہی دے گی۔ آخر وہ اس کی ماں ہے۔“

”تمہارے گواہ کون ہیں ایگائوس؟“ الاشانے پوچھا اور ایگائوس نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم لوگ آگے آؤ۔“ الاشانے کہا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

”اب..... اب کیا کریں۔“ نیولس نے آگے بڑھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”انکار کر دینا! ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔“ میں نے جواب دیا اور نیولس کے انداز میں تشویش پیدا ہو گیا۔

”کیا ایگائوس درست کہتا ہے کہ تم دونوں اس کے گواہ ہو؟“ الاشانے پوچھا۔

”کس بات کے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”کیا تمہارے سامنے نیولس کی لیزل کی شکل میں نظر آیا تھا؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے سکون سے جواب دیا۔

”کیا کہہ رہے ہو خادم؟“ ایگائوس پاگلوں کے سے انداز میں بولا اور پھر اس نے نیولس کی طرف دیکھا۔

”نیولس تم بھی!“

”شہنشاہ نیولس کے خلاف کسی سازش میں ہم حصہ نہیں لے سکتے ایگائوس۔“ نیولس نے جواب دیا اور ایگائوس کے جسم میں لرزش نمایاں ہو گئی۔

”تم گواہی نہیں دو گے کہ نیولس ارکاش کو اپنی ماں نہیں سمجھتا اور وہ تم سب بدل گئے۔“

تب نیولس کے خادم نے کہا۔

”ایگائوس تم شہنشاہ نیولس کے خلاف سازش کرنے میں ناکام رہے ہو! اس کا مظاہرہ پورے دربار میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب تمہارے بارے میں فیصلہ کرنا ضروری ہے۔“

گوریلا کھڑا ہو گیا۔ تب ایگائوس سخت وحشت کے عالم میں چیخا۔

”میرے وفادارو! میرے ساتھیو! نیولس کو قتل کر دو۔ ان تمام لوگوں کو قتل کر دو جو خدا رہیں۔ ہاں شہنشاہ میں ہوں“

سارے احکامات میرے ہوتے ہیں۔“

لیکن دربار پر سکوت طاری ہو گیا۔ ایگائوس کے ہمدرد بھی سمجھ گئے کہ ایگائوس کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ کوئی ٹھوس بات کہنے میں ناکام رہا ہے اور اس وقت اس کا ساتھ دینا موت کے مترادف ہے۔ چنانچہ سب خاموش رہے ایگائوس دیوانوں کی مانند گھوم گھوم کر سب کو دیکھ رہا تھا۔

”کوئی..... کوئی نہیں بولے گا۔ تم میں سے کوئی میرا ساتھی نہیں ہے۔“ وہ چیخ کر بولا۔

اب گوریلا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پورے دربار میں پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

”میں میں خود ہی سب ٹھیک کروں گا۔ تم ایگائوس کی قوت کو محدود سمجھتے ہو۔“ اب نیولس اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ ایگائوس نے اس پر خنجر کا بھرپور وار کیا تھا۔ لیکن اس جنگجو گوریلو کے بارے میں میں خود بھی جانتا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ایگائوس کی کلائی پکڑ لی، پھر اس نے ایگائوس کی کلائی کو جھٹکا دیا اور ایگائوس کی دہاڑ گونج اٹھی۔ اس کا پورا بازو ٹٹک گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ چیخا ہوا پلٹ کر بھاگا۔ لیکن گوریلو نے عقب سے اسے دبوچ لیا اور پھر اس نے ایگائوس کو زمین سے اٹھایا۔

دیکھنے والے ساکت و جامد کھڑے تھے اور یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ میں کچھ بول سکیں۔ خود ایگائوس کے ہمنوا بھی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور انہیں سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ گوریلو کو روکنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگ جو شاید ایگائوس کیلئے جان دینے کا عہد کر کے آئے ہوں گے اس وقت اپنی جان بچانے کی فکر میں کوشاں تھے۔

تب ایک بار گوریلو نے ایگائوس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے الٹا لٹکا دیا۔

پھر اس کے حلق سے دہاڑیں نکلنے لگیں ایسی خوفناک چیخیں جو دل دہلا دینے والی تھیں۔ اہل دربار پر سکتہ طاری تھا۔ ان کے بدن آہستہ آہستہ لرز رہے تھے اور ایگائوس کا بدن دو حصوں میں منقسم ہوتا جا رہا تھا۔ تب گوریلو نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ ساری زمین ایگائوس کے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ میں اور نیولس ساکت و جامد لگا ہوں سے گوریلو کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بہر صورت ہمارا ایک دشمن ختم ہو گیا تھا اور نیولس تو یہ بات جانتا بھی نہ تھا کہ ایگائوس کی موت میرے لئے کس قدر دلچسپ ہے..... یہ وہی شخص تھا جو میرے خلاف سازش میں شریک تھا۔

اہل دربار خاموش ہی رہے اور چند ساعت کے بعد گوریلو نے گویا دربار پر خاست کر دیا۔ اب اس کا ہمنوا اس کا ترجمان الاشان تھا۔ سارے درباری خاموشی سے واپس پلٹ پڑے۔ ان میں میں اور نیولس بھی تھے۔

نیولس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ اپنی شکل سے خاصا غمگین نظر آ رہا تھا۔ گھرتک کا فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ گھر پہنچ کر میں نے نیولس سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

”کیا بات ہے نیولس تم کچھ خاموش اور سنجیدہ سے ہو؟“

”یہ بات نہیں ہے یوسیس! بس میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان بعض اوقات کتنا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایگائوس

نجانے کتنے عرصے سے شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا انجام.....“

”ہاں نیلس ہر شخص قوت حاصل کر لینے کے بعد یہ سوچ لیتا ہے کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے اور اب اس کا مقابل اس کا ثانی کوئی بھی نہیں ہے، لیکن اس کے بعد اسے ایسے غیر یقینی حالات سے واسطہ پڑتا ہے کہ اس کی تمام سوچ مردہ ہو جاتی ہے۔ ایگانوس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تم نے اس کی کہانی نہ سنی ہوگی۔ اس نے اپنے داماد آرمون کے خلاف جو کچھ کیا وہ کوئی جائز اور مناسب بات نہیں تھی۔ حکومت آرمون نے حاصل کی، لیکن ایگانوس نے اسے ختم کرانے کیلئے اپنی بیٹی کے ساتھ تعاون کیا اور آج یہی تعاون اس کی موت بن گیا۔“

”ہاں یہ تو درست ہے کوئی بھی شخص احتساب سے مبرا نہیں ہے، لیکن مجھے صرف اس بات کیلئے افسوس ہو رہا ہے کہ وقت پر ہم نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔“

”تو کیا تم اس کا ساتھ دینا چاہتے ہو؟“

”نہیں یہ بات نہیں ہے، بس وعدہ کرنے کے بعد وعدے سے انحراف ذرا افسوسناک لگا تھا۔“

”صرف تم ہی نہیں تھے دوسرے لوگ بھی تھے۔ آخر وہ بھی تو کسی مقصد کے تحت ہی آئے ہوں گے۔ وہ سب بھی تو ہماری مانند خاموش ہو گئے۔ کیا تمہارے خیال میں ایگانوس تمہارے بار میں پہنچ گیا تھا۔ میرا خیال ہے ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے بیشمار آدمی ہوں گے، لیکن جب اس کی ساری کوششیں ناکام رہیں تو ان لوگوں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ بالکل ہماری مانند اور ہر سمجھدار آدمی کو ایسا ہی کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں ہمارا رویہ بالکل درست تھا۔ ہم جس انداز میں ایگانوس سے منحرف ہوئے تھے وہی ہمارے لئے بہتر تھا ورنہ نتیجہ کیا ہوتا۔ اسی جگہ ہم لوگ بھی ہوتے جہاں ایگانوس پہنچ گیا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں ہم تمہارا اہل دربار سے مقابلہ کر سکتے تھے۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“

”بس تو پھر کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے انتہائی بہتر رویہ اختیار کیا ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے جس انداز میں نیوسکی سے دور تھے اور اس نے ہمارے بارے میں کوئی خاص بات نہیں سوچتی تھی اب وہ اسی انداز میں سوچے گا۔“

”ہاں۔ بالکل درست کہا تم نے۔“ نیلس نے جواب دیا۔

”لیکن اب کچھ تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔“

”کیسی تبدیلیاں؟“ نیلس نے پوچھا۔

”مقصد یہ کہ اس سے قبل نیوسکی یا لیزل نے حکومت کے سارے معاملات ایگانوس پر چھوڑے ہوئے تھے، لیکن اب وہ خود ان ساری چیزوں کو دیکھے گا اور اس سلسلہ میں کافی رد و بدل کا امکان ہے۔“

”میرے ذہن میں اور کوئی بات نہیں ہے نیلس میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ لیزل کبڑا کچھ ایسے علوم کا ماہر ہے جن کے ذریعے وہ بہت سے کام کر سکتا ہے، اب تک وہ اپنی عیاش فطرت سے کام لے کر صرف عیاشی کے بارے میں سوچتا رہا ہے، لیکن اب جبکہ وہ منظر عام پر آچکا ہے ظاہر ہے اب وہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے کیلئے وہ سب کچھ کرے گا جس میں اس کے اپنے لوگوں کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔“

”بالکل سچ کہا تم نے پولیسیس۔“

”تو اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہونے کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔“

”لیکن کیا تمہیں اپنی بغاوت کی کامیابی کے امکانات نظر آتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میرے انداز میں جھنجھلاہٹ سی آگئی۔

”مم..... میرا مطلب ہے تم خوفزدہ تو نہیں ہو پولیسیس۔“

”نیلس۔“ میں نے ہماری لہجہ میں کہا۔

”میں حکومت کے خلاف جس پیمانے پر مہم چلا چکا ہوں کیا تم نے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ کیا ہماری تیاریاں اتنی کمزور ہیں کہ اب تم لیزل کے بارے میں غور کرنے لگو۔“

”نہیں نہیں میرا خیال ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔“ نیلس نے شرمندگی سے کہا۔

”میرے دوست! یہ بغاوت کبڑے لیزل کی قوت سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جس وقت لیزل میرے مقابل ہوگا تو اسے اپنے تمام علوم کے ساتھ موت کی وادیوں میں جانا پڑے گا۔“ میرے لہجہ میں ایسی غراہٹ تھی کہ نیلس کے روٹکنے کھڑے ہو گئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا۔

”مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ میں نے تمہارے جذبات کی توہین کی ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس بات پر یقین رکھو کہ شکست نیوسکی یا لیزل کا مقدر بن چکی ہے۔“

نیلس کے چہرے سے تردد دور ہو گیا۔ ساری باتوں کے باوجود کس قدر معصوم انسان تھا۔ بہر حال ناقابلِ اعتبار نہیں تھا۔

”ہم لوگ واپس نیلس کے مکان پر پہنچ گئے۔ ایگانوس کی موت کی اطلاع کارمس میں پھیل چکی تھی۔ تو عیسادوڑتی ہوئی ہمارے پاس آئی تھی۔“

”کیا یہ حقیقت ہے پولیسیس؟ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں!“ نیلس نے جواب دیا۔

”اور کیا میں یہ نہ سمجھوں کہ یہ پولیسیس اور نیلس کی مہم کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے؟“ ذہین لڑکی نے کہا اور نیلس تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے تو عیسادوڑتے ہوئے کہا۔

”میں دل کی بات نہیں مانتی، لیکن میرا ذہن یہ بات کہتا ہے کہ نیوسکی کی حکومت کا پہلا ستون ہلانے والے تم لوگ ہو۔“

”جہیں ایگانوس کی موت کی خوشی ہوئی ہے؟“

”ہاں۔ وہ نیوسکی کا تخلیق کار تھا اور بالآخر فنکار کو اس کے فن نے شکست دے دی اور یہ منصوبہ شاید کسی بڑے فنکار کی تخلیق ہے۔“

”تمہاری بہن تم سے زیادہ ذہین ہے نیلس۔ میرا خیال ہے تم ضروری معاملات میں اس سے مشورہ لے لیا کرو۔“

”میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں نیلس۔“ نیلس کے باپ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔

”کیا بابا؟“ نیلس نے پوچھا۔

”تم اس کو میری حماقت تو نہ سمجھو گے؟“

”نہیں بابا۔ آپ ذہین اور زیرک ہیں۔“ نیلس نے احترام سے کہا۔



تھا۔

ریشی گن اب ایک ماہر سنگ تراش بن گیا تھا۔ چنانچہ اسے دیئے گئے نقشے کے مطابق نیولس کے مکان کی عقبی سمت میں پہلا سوراخ ہوا اور ہم اس جگہ سے دور ہٹ گئے پھر سوراخ کشادہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس سے ریشی گن کا چہرہ جھانکنے نظر آیا۔ اس نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور پھر اطمینان سے باہر نکل آیا۔ ہم سب اس کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ریشی گن بڑے خلوص سے ایک ایک سے گلے ملا اور ہم نے اس کی کامیاب کوشش پر اسے مبارکبادیں دیں۔ ریشی گن نے ہمیں سرنگ دیکھنے کی دعوت دی۔ میں تو خیر اس کا کردگی کا معترف تھا۔ لیکن دوسرے لوگ اس سرنگ کو دیکھ کر ششدر رہ گئے جس میں اوپر تک سبز چٹانیں تھیں۔ اس کے بعد ہم ان لوگوں کو لے کر اندرونی کمروں میں آگئے۔ تو نیسا باغیوں کے سامنے بھیجی جا رہی تھی وہ بے حد مسرور تھی۔

کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ریشی گن نے مجھ سے سرنگ میں چلنے کی فرمائش کی اور میں نے دور تک اس سرنگ کو دیکھا ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ اتنی کشادہ اور صاف کہ دو گھوڑے باسانی گھڑسواروں سمیت گزر سکیں۔ اس کے علاوہ اس میں دیگر سہولتیں بھی تھیں لیکن تو نیسا یہ جان کر دم بخود رہ گئی کہ میں اس پوری بغاوت کا سرغنہ ہوں۔ وہ مجھ سے بے حد متاثر ہو گئی۔

پھر آرام کے اوقات میں ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ریشی گن کو ایک نیولس کی موت کی اطلاع دی تو ریشی گن بہت خوش ہوا لیکن نیولس کی شخصیت جان کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

”پھر اب ہمارے لئے کیا حکم ہے پولیسیس؟“

”اپنی تمام تر قوت کا رگس کے نزدیک لے آؤ۔ سرنگ سے آمدورفت جاری رکھو اور دوسرے راستے فی الحال بند کر دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ریشی گن بولا پھر میں نے نیولس سے کہا۔

”میں اب جلد از جلد کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔“

”بے شک اب انتظار کس بات کا۔“

”دراصل اس سلسلے میں بھی فی الحال میں چالاکی سے کام لوں گا۔“

”یعنی.....“

”کچھ اس طرح سے کہ دو جانباز ایک نیولس کی موت پر احتجاج کریں گے اور نیولس کی طرف حملہ کر دیں گے۔ ہمیں ان دونوں کے فرار کا بندوبست کرنا ہوگا۔“

”آہ..... تمہارا ذہن کہاں سے تم تک پہنچا ہے پولیسیس۔ بغاوت کے آغاز کیلئے اس سے عمدہ ترکیب اور کوئی نہیں ہو سکتی لیکن جبران ہوں کہ تم اس انداز میں کیسے سوچتے ہو۔“

میں نیولس کی حیرانی پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ رہا ہے۔ میں تو ہزاروں سال کی دنیا کے بعد کا انسان ہوں اور اس طرح ان دلچسپ معاملات میں ملوث ہو گیا ہوں کہ کوئی خوابوں میں بھی نہ سوچ سکے۔ نیولس میری تجویز پر بہت پر جوش تھا۔ اس نے کہا۔

”ہاں لیکن ہمیں ان کی حفاظت کا واقعی مکمل بندوبست کرنا ہوگا۔“

”یہ بتاؤ کس طرح کرو گے؟“

”دربار سے باہر حفاظتی دستہ تعینات ہوتا ہے۔“

نیولس کا باپ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”نجانے کیوں جب میں آرام کرنے لیٹتا ہوں تو میرے کانوں میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔“

”کیسی آوازیں؟“

”زیر زمین ہلکے ہلکے دھماکے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی یہ دھماکے شدید بھی ہو جاتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنا دھم سمجھ کر کسی کو نہیں بتایا لیکن اب تو ہر وقت یہ آوازیں گونجنی رہتی ہیں.....“

”اوہ.....“ نیولس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے اور پھر وہ اسی جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس نے زمین سے کان لگا دیئے تھے۔ تب وہ پر جوش لہجے میں بولا۔

”پولیسیس سنو..... یہ آوازیں سنو اب تو یہ بالکل قریب محسوس ہونے لگی ہیں۔“

”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے نیولس.....“

”لیکن اتنی جلدی..... واقعی اتنی جلد تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”میرے ساتھیوں کی کارکردگی بے مثال رہی ہے.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسرے تعجب سے ہمیں دیکھنے لگے۔

”کیا تم ان آوازوں سے واقف ہو نیولس؟“ نیولس کے باپ نے پوچھا۔

”ہاں! یہ آوازیں کارگس کی زندگی میں نیا باب کھولیں گی۔ یہ آوازیں نیولس کیلئے موت کی آوازیں ثابت ہوں گی۔“ نیولس نے پر جوش لہجے میں کہا لیکن کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ تب میں نے نیولس کے باپ اور اس کی پر جوش بہن تو نیسا کو اس کے بارے میں بتایا اور وہ دنگ رہ گئے۔ تو نیسا کے چہرے پر تو مسرت کی سرخی پھوٹ پڑی تھی وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

”آہ..... میں اپنی خوشی کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتی۔ میرے پرانے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ میں نے اکثر خواب دیکھے ہیں کہ میں نے نیولس کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور نیولس نے آخر میرے ہاتھوں شکست کھائی۔ یہ خواب اب پورے ہو رہے ہیں۔ کارگس میں میرا ایسا گھر ہوگا جہاں سے نیولس کے خلاف پہلی آواز اٹھے گی۔“ تو نیسا خوش ہوتی رہی۔

آوازیں اب جتنی قریب ہو رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کام اب بہت مختصر رہ گیا ہے اور بہت جلد میری اپنے دوستوں سے ملاقات ہونے والی ہے۔ چنانچہ ہم نے مخصوص لوگوں کیلئے کھانے پینے کا انتظام کر دیا اور ان کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے جس انداز میں قیدیوں کو منظم کر لیا وہ ناقابل یقین تھا۔ سرنگوں کی کھدائی میں پوری رسد گاہ جاتی تھی اور ایسے انتظامات ہوتے تھے کہ ضرورت کی تازہ چیزیں دروازے علاقے سے ان تک پہنچتی رہیں اور ہر جگہ ایسا ہی ہوتا

”ہاں!“

”اور دربار عام میں کسی کے داخلے پر پابندی نہیں ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“

”اسی طرح ہمارے دس بارہ جانباز دربار میں مسلح موجود ہوں گے۔ ہمارے دونوں آدمی احتجاج اور حملہ کر کے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ باہر حفاظتی دستے کے ساتھ ہمارے جوانوں کی خاصی تعداد ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بھی بظاہر حفاظتی دستے کے ساتھ ہوں گے جو دراصل دونوں کو فرار ہونے میں مدد دے گا۔ اگر دربار کے اندر ہی وہ پھنس جاتے ہیں تو اندر موجود لوگ حملہ آور ہو کر انہیں باہر نکلنے میں مدد دیں گے۔ انہیں ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا اور اس کے بعد شہر میں ہنگامے ہوں گے۔ ممکن ہے نیلس ہمیں اتنے بڑے پیمانے پر کوشش نہ کرنی پڑے جتنی ہم نے تیاریاں کی ہیں۔“

”ہاں! بشرطیکہ ہماری کوئی چال کامیاب ہو جائے تو.....“

”مجھے یہی نظر آ رہا ہے۔ خیر ان قیدیوں کو کسی طرح مطمئن کرنا بھی تھا۔ ہم نیوکی پر قابو بھی پالیتے ہیں تب بھی ہمیں کارگرس کے انتظامی امور کیلئے منتظمین کی ضرورت پڑے گی۔ یہ لوگ اس وقت کام کریں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

اس طرح سارے مسئلے حل ہو گئے اور دوسرے دن نیوکی کے دربار میں تینوں یعنی میں، پولیسس اور ریٹی گن موجود تھے۔ پر ہیبت گوریلانجٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا ترجمان اس کے نزدیک کھڑا مقدمات پیش کر رہا تھا۔ تب ہمارے مقرر کئے ہوئے دونوں جوان اندر داخل ہوئے۔ ان کے انداز میں جارحیت تھی اور درباری آداب کے خلاف آگے بڑھ کر نیوکی کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”سنگ دل شہنشاہ نیوکی! تو نے قدیم حکمران ایگانوس کو جس طرح قتل کیا ہے وہ تیری زندگی کی بدترین مثال ہے۔ اس کے علاوہ تیری چہرہ دستیوں نے کارگرس کے ماحول کو مایوسی کے غاروں میں یوں دھکیل دیا ہے کہ کوئی بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتا، ہمیں ایگانوس کی موت کا بدلہ چاہیے۔“

”کون ہو تم..... اور کیا چاہتے ہو؟“ نیوکی کے ترجمان نے پوچھا.....

”بدلہ چاہتے ہیں ہم بدلہ لیں گے نیوکی سے۔“ انہوں نے کہا اور پھرتی سے دو خنجر نیوکی پر پھینک دیئے کہ اہل دربار دنگ رہ گئے..... دوسرے ہی لمحے دربار میں ہنگامہ ہو گیا۔ لوگ چاروں طرف سے ان دونوں جوانوں پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے تلواریں نکال لیں، لیکن دربار میں پہلے سے پوشیدہ لوگوں نے حملہ آوروں کو سنبھال لیا اور گردنیں الگ ہونے لگیں۔ دونوں جوان نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن میں نے دیکھا کہ نیوکی اب اپنی جگہ کھڑا ہو گیا ہے۔ خنجر کی کارکردگی اس پر بے اثر رہی تھی اور وہ تنا ہوا کھڑا تھا اور دربار کا ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر باہر بھی ہنگامہ ہو گیا۔ باہر والوں نے اتنی تیزی سے حملہ کیا کہ پورے دستے کا صفایا ہو گیا اور وہ اندر کھس آئے۔ بیٹھارہ درباریوں کو قتل کر دیا گیا اور پھر سب فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے بھی دکھاوے کی جنگ کی تھی جو اپنے لوگوں کے ساتھ تھی صرف اس لئے کہ نیوکی کے ساتھ اب بھی شامل رہیں، لیکن نیوکی اب بھی پرسکون کھڑا تھا اور اس کے انداز میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کی گہری اور خوفناک آنکھیں یوں لاشوں کو دیکھ رہی تھیں جیسے ان کی کوئی حیثیت اس کی نگاہوں میں نہ ہو پھر اس نے زندہ لوگوں کی جانب دیکھا اور اس کے بعد اپنے ترجمان کی طرف ترجمان نیوکی کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

”بچ جانے والو! نیوکی کا خیال ہے کہ یہ واقعہ کسی وقتی جوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس بغاوت کا آغاز ہے جس کی خبریں بہت عرصے سے سنی جا رہی تھیں اور شہنشاہ نیوکی بہت جلد اب اس سلسلے میں اپنے عمل کا اظہار کریں گے۔“

اس اعلان کے بعد دربار برخاست ہو گیا۔ میں اور نیلس محل میں ہی تھے۔ البتہ ریٹی گن کو ہم نے واپس بھیج دیا تھا اور اسے کچھ ضروری ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ محل میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوئی، سوائے اس کے کہ نیوکی اپنی آرام گاہ میں بند ہے اور اس کے پاس صرف چند مخصوص افراد رہ رہے ہیں۔ تب وقت پر دوسرا دربار ہوا اور آج ترجمان نے ایک اور اعلان کیا۔ اس دن ہمارا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس لئے دربار میں کوئی ناگوار واقعہ نہیں ہوا۔ ترجمان نے کہا۔

”کارگرس کے نمائندہ! جو واقعہ ہوا تھا۔ اس کے بارے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہ بغاوت کا آغاز ہے جس کیلئے ایگانوس کی موت کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق ایگانوس کے ہمدردوں سے نہیں تھا۔ لیکن تمہارا حکمران تمہارا نیوکی معمولی قوت نہیں ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایگانوس اصل حکمران ہے اور نیوکی صرف ایک جانور۔ لیکن یہ بھولے ہوئے لوگ نیوکی کی قوتوں سے واقف نہیں تھے۔ ہمارا حکمران با علم ہے اور اس کے احکامات علم و دانش پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کا پوشیدہ علم بے حد عظیم ہے اور اس کے تحت اس نے قوت گویائی حاصل کر لی ہے تاکہ تم سے تمہاری زبان میں بات کرے۔ سواب تم اپنے شہنشاہ کی آواز سنو گے۔“ ترجمان خاموش ہو گیا۔

تب ایک غیر انسانی آواز انسانی الفاظ لئے نمودار ہوئی.....

”ہاں! میں حکمران ہوں میں نہیں جانتا کہ میرے اندر کون کون سی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میری والدہ ارکاشہ نے مجھے جانور کی شکل میں کیوں جنم دیا، لیکن میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں جو سوچتا ہوں وہ ممکن ہو جاتا ہے۔“

تو سنو! کارگرس والو! آج سے تم میرے احکامات میری زبانی سنو گے۔ میں نے اپنے علم سے گویائی حاصل کر لی ہے۔ باغیوں کا ایک گروہ کارگرس میں داخل ہو گیا ہے اور کارگرس والوں کو ان کی سرکوبی کرنی ہے۔ میں ان کیلئے بہتر انتظامات کروں گا۔“

لوگ دانتوں میں انگلیاں دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ خیر..... اس کے بعد یہ خبر پورے کارگرس میں پھیل گئی کہ نیوکی نے اپنے علم کی قوت سے انسانی آواز حاصل کر لی ہے، لیکن دوسری طرف ہم لوگوں کی کوشش بھی کامیاب رہی تھی۔ یعنی ہم نے ایگانوس کے حمایتیوں کی ہمدردی حاصل کر لی تھی اور بیٹھارہ لوگ باغیوں کی مدد کیلئے تیار ہو گئے تھے اور اس کے بعد ایک مخصوص وقت پر باغیوں کی ایک بڑی تعداد باہر نکل آئی اور محل پر حملہ آور ہوئی، لیکن محل سے سخت مدافعت کی گئی۔ نجانے کہاں سے انسان آگئے تھے اور پوری طرح ہتھیاروں سے لیس تھے۔ گو باغیوں کی تعداد بیٹھارہ تھی اور ان کے پاس بھی عمدہ ذرائع تھے۔ میں ان کی قیادت کر رہا تھا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ نیوکی کے ہمدرد فلاحی بدن رکھتے تھے۔ وہ قتل ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب کہ ان کا ہر وار باغیوں پر کامیاب ہوتا تھا اور اس صورتحال سے کافی سنگینی کا احساس ہوا، ہم نے اس کے خوفناک ہونے کا دل سے اعتراف کیا تھا۔

”اس طرح تو اس کے جادو کی قوت سے ہمیں نقصان عظیم ہو رہا ہے اور اگر ہم اپنے لوگوں کو اس طرح قربان کرتے رہے تو آخر باغیوں کی تعداد ختم ہو جائے گی۔“

”ہاں..... میں اس سلسلے میں فکرمند ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ہمیں اپنا طریقہ کار بدلنا ہوگا اور ایک ایسی ضرب ان پر لگانی ہوگی جو نیوکی کو نقصان پہنچائے۔ اس طرح تو ہمیں اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔“

”میں بہت جلد کوئی منصوبہ پیش کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہمارے ساتھی بھی بدل ہو گئے تھے۔ کیونکہ مدافعت کرنے والوں کی تعداد کسی طور کم نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ

وہ ان میں سے ایک بھی شخص کو قتل نہیں کر سکتے جو اس طرح ان میں دہشت پھیلتی جا رہی ہے گویا ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ بھی زائل ہو رہا ہے لوگ نیوکی کے آدمیوں سے خوفزدہ ہونے لگے ہیں۔“

”کیا اس کا اظہار کیا گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”کھل کر کہنے لگے ہیں اب تو.....“

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تب میں نے دوسرے انداز میں سوچا۔ میں جانتا تھا کہ نیوکی کون ہے۔ کوروتی مجھے اس کی اصلیت بتا چکی تھی۔ کبڑا گوم بھنسا لی جو ہمیشہ تاریخ میں اپنے پاؤں اڑا دیتا تھا اور اس طرح کی کہانیاں ترتیب دیتا تھا کہ انسانی ذہن کو کسی طور یقین نہ آئے۔ میں اس کتاب کے ذریعے مہابھارت کے دور میں پہنچا تھا اور اسی کتاب کے اندر میں اب قدیم یونان کی تاریخ سے گزر رہا تھا۔ ایک اہم اور کارآمد کردار کی حیثیت سے..... آہ..... واقعی دنیا میں کسی مورخ نے تاریخ لکھتے ہوئے ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا ہوگا کہ تاریخ خود اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جائے۔

زندہ صدیاں اگر تحلیل کو پہنچیں تو درحقیقت وہ ہسٹری کی کائنات میں سب سے زیادہ مستند کتاب ہوگی، لیکن دیکھنا یہ تھا کہ اس عجیب سے عمل کا انداز کیا ہوگا۔ گوم بھنسا لی کی قوتوں نے اسے نیوکی بنا دیا تھا اور لگتا یہ تھا کہ وہ کوروتی پر حاوی ہو گیا ہے اور ارکاشہ کی حیثیت سے کوروتی اس کی سم ظریفیوں کا شکار ہو رہی ہے اب کیا کرنا ہوگا یہ بات میرے دل میں تھی۔

تو نیسا نے میرے قریب آنے کی کوشش کی۔ یہ خوش و خرم لڑکی باغیوں کی شکست سے اداسی میں ڈوب گئی تھی۔ اس وقت میں تنہا باغ کے گوشے میں تھا کہ وہ میرے نزدیک آگئی۔

”پولیسیس!“ اس نے مجھے آواز دی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے تو نیسا؟“

”کیا باغیوں کو شکست ہوگئی پولیسیس؟“ اس نے درود بھرے لہجے میں پوچھا۔ تب میں نے کہا۔

”یہ فیصلہ تم نے کس طرح کیا۔“

”حالات یہی بتا رہے ہیں۔“

”نہیں حالات ابھی ہمارے اتنے خلاف نہیں ہیں۔“

”تم خود بھی مطمئن نظر نہیں آتے پولیسیس۔ باغیوں کو مکمل شکست ہو رہی ہے اور وہ کسی بھی جگہ کامیاب نہیں ہو رہے۔“

”ہاں یہ سوچ ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔“

”مگر مجھے مایوسی محسوس ہو رہی ہے۔ تم نے بڑا قدم اٹھایا ہے، افسوس ہمیں نیوکی جیسے ظالم حکمران کے ہاتھوں شکست ہوگئی۔“ تو نیسا کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے۔

”ایک بات بتاؤ تو نیسا..... کیا تمہیں نیوکی سے ذاتی طور پر نفرت ہے۔“

”شدید.....“

”اس کی وجہ؟“

”ہے.....“

”کیا؟“

”وہ میرے سنہرے وطن کی پیشانی پر داغ ہے۔ وہ قابل نفرت ہے۔ اسکے دور میں کوئی عورت محفوظ نہیں ہے اور کبھی وہ عورت میں بھی ہو سکتی ہوں۔“

”اس کے علاوہ؟“

”میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔“

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ باغیوں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ دوسری طرف نیوکی کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ باغیوں کو شکست دے کر حوصلہ مند ہو گیا تھا۔ اس نے لڑائی کا رگس میں محدود کر دی تھی۔

پھر مجھے اطلاع ملی کہ نیوکی کے سپاہی اب کارگس کے چپے چپے میں پھیل گئے تھے اور باغیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں چنگاریاں بھگنیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی شخصیت کو دربار تک محدود رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب مجھے کل کر میدان جنگ میں اتارنا ہوگا۔ پھر جب میں دربار جا رہا تھا تو میں نے بہت گھروں کو نذر آتش ہوتے دیکھا، جن میں آگ لگی ہوئی تھی، پھر وہ گھر نظر آئے جو اچانک نوس کے حامیوں کے تھے اور باغیوں کی مدد کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے گلی کوچوں میں باغیوں کی بیٹھرائیں دیکھیں اور میرا خون کھول اٹھا۔ یہ تو غلط ہوا ہے۔

خبر میں دربار پہنچ گیا، یہ جنگی دربار تھا اور اب نیوکی مکمل کر اس دربار میں اپنی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی غیر انسانی آواز ابھری۔

”میں اس بغاوت کے سرغنہ کی تلاش میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ باغیوں کے نمائندوں کو طلب کروں اور ان سے پوچھوں کہ ان کی قیادت کون کر رہا ہے۔“

”ان کا سرغنہ سامنے آگیا تو کیا ہوگا؟“ کسی نے سوال کیا۔

”میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں یہ طویل جنگ برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ میرے مشاغل متاثر ہو رہے ہیں۔“

”ہوں..... پھر اب کیا کرنا چاہئے.....“

”تم نے دیکھا کہ میرے آدمی باغیوں کو ہلاک کر رہے ہیں، وہ خود ہلاک نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جتنے لوگ جان دینا چاہیں میرا کیا بگڑ رہا ہے۔“

”یہ خبر باغیوں کو دی جائے۔“

”ضروری ہے۔“

پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”باغیوں کی قیادت میں کر رہا ہوں۔“

میرے ان الفاظ نے ان لوگوں کو دوکگ کر دیا اور سب حیران رہ گئے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کیا ہونا چاہئے تھا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا اور ایک درودست تہہ خانے میں قید کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ میں نے جذباتی طور پر کیا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بہر حال میرا یہ زمین دوز تہہ خانہ بہت پر اسرار تھا اور جس رات میں وہاں قید ہوا اسی رات کو میں نے ارکاشہ کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ارکاشہ ایک خوبصورت لباس میں میرے سامنے آگئی۔ اس وقت وہ بے مثال حسن کی مالک تھی، کس طرح قید خانے میں پہنچی یہ مجھے نہیں اندازہ تھا۔ کیونکہ قید خانے کے سپاہی باہر نظر آرہے تھے۔

”ارکاشہ.....“ میں نے اسے پکارا تو وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آگئی، پھر بولی۔



”نہیں..... کوروتی..... کیا تم مجھے نہیں پہچانتے۔“

”میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب نیو کی تمہارے اوپر دست درازی کر رہا تھا۔“

”ہاں! یہ کہانی جس دور کی ہے اس کے بارے میں تم نے اندازہ لگا لیا۔ کیا کہتے ہو۔ یونان کے اس دلچسپ اور دلکش دور کے بارے میں تمہیں یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ کون سے دور میں یونان کیسے کیسے حالات سے گزر رہا تھا۔ یہ جس سن کی بات ہے اس کی تفصیل تمہارے علم میں آچکی ہے۔

میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

”لیکن بہت سی باتیں قابل غور ہیں کوروتی۔“

”کیا؟“

”جیسا کہ ثابت ہوا ہے جیسا کہ میں نے دیکھا اور مجھے علم ہوا کہ وہ گوتم بھنسا لی ہے۔ وہی کبڑا جو مندروں میں گھٹنے بجاتا تھا اور جو تم سے اظہار عشق کرتا تھا۔“

”ذرا غور کرو..... سوچو ذرا اس بارے میں۔ یہ بات تمہارے علم میں ہے کہ صدیوں سے ہزاروں سال سے وہ اپنی محبت کے گیت گاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرا تعاقب کرتا ہوا تمہارے دور تک بھی پہنچ گیا اور پھر خود اس نے تمہیں اپنے بارے میں ساری تفصیلات بتائیں۔ وہ کب اور کہاں کس انداز میں میرے سر پر مسلط ہو رہا ہے تم نے دیکھ لیا۔“

”لیکن مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی۔“

”ہاں پوچھو!“

”نیو کی کی حیثیت سے وہ تمہارے جسم کو نوچتا رہا ہے کیا تم نے اس کی مدافعت نہیں کی اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ قتل ہوتا تھا اور پھر زندہ ہو جاتا تھا۔“

”تمہارے علم میں ساری تفصیل موجود ہے۔ اس نے امرت جل کا وہ حصہ پی لیا تھا جو اس برتن میں بچا رہ گیا تھا اور اس کے بعد اس نے ہزاروں پر اسرار علوم سیکھے۔ ہر دور میں اس نے اپنے علوم سے کام لیا، لیکن ہاں ایک بات تمہیں ماننا ہوگی کہ وہ بد بخت اگر اس قدر مکروہ نہ ہوتا اور اتنا برا نہ لگتا مجھے تو ایسا محبت کرنے والا شاید روئے زمین پر کسی خوش نصیب کو دوسرا نہ ملے۔ اس نے جو بھی سوچا اور جب بھی سوچا مجھے سامنے رکھ کر سوچا اور میرے ہی قریب آنے کی کوشش کرتا رہا، گویا اس کی زندگی کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا کہ وہ میری قربت حاصل کرے۔“

”اور اس نے تمہاری قربت حاصل کر لی۔“ میں نے کہا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی، پھر ہنس پڑی، پھر بولی۔

”بڑا اچھا محسوس ہو رہا ہے مجھے.....“

”وہ کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”تمہاری آنکھوں میں میرے لئے ایک خاص کیفیت موجود ہے۔ یعنی اگر میں یہ کہہ دیتی کہ ہاں اس نے میری قربت حاصل کر لی اور میرے بدن کا راز دار بن گیا تو شاید تمہیں اس بات کا بہت دکھ ہوتا۔“

میں نے چونک کر اپنے بارے میں سوچا اور دل ہی دل میں خود پر لاجول پڑی۔ واقعی پتا نہیں کیوں ایک لمحہ کیلئے مجھے ایک رقابت کا احساس ہوا تھا۔ جس طرح کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ فطری طور پر میں ایک حسن پرست انسان ہوں۔ اچھے چہرے مجھے متاثر کرتے ہیں، بہت سی قربتیں بھی بڑھاتی ہیں میں نے، لیکن یہ صدیوں پرانی روح یہ ہزاروں سال کی عورت میرے لئے ایسا کوئی مقام بھلا کیسے حاصل کر سکتی ہے۔

کوروتی شاید میرے تاثرات کا اندازہ لگا رہی تھی وہ مسکرا کر بولی۔

”ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن مجھے اس بات کا جواب دو کہ تاریخ میں جہاں بھی تم جاتے ہو میں تمہارے قریب ہوتی ہوں۔ یعنی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میرے بغیر اگر تم کہیں بھی جاؤ تو وہاں کے معاملات میں گھر جاؤ اور میں تمہیں نہ ملوں، لیکن میں تمہاری خوشبو سونگھتی ہوئی وہاں تک پہنچ جاتی ہوں، باقی جہاں تک میری قدامت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں میں تمہیں پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گی اور اب یہ بتاؤ کہ کیا کارگس کے جنگ و جدل میں حصہ لوگے یا یہاں سے واپسی کا ارادہ ہے۔“

”ایک بات میں جانا چاہتا ہوں کوروتی۔“

”ہاں بولو!“

”کارگس کا انجام کیا ہوگا..... نیو کی زندہ رہے گا یا ختم ہو جائے گا۔“

”نہیں وہ ختم تو نہیں ہو سکتا لیکن روپوش ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”اب بھی مطلب پوچھو گے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس نے ایک کردار اختیار کیا ہے اور وہ میرے تعاقب میں رہا ہے۔ وہ اب بھی میرا تعاقب کرے گا، اگر میں اس کے ساتھ رہتی اور اس کو قبول کر لیتی تو تم یقین کرو وہ کارگس کیلئے ایک بہترین انسان ثابت ہوتا اور جو کہانیاں اس کے نام سے وابستہ ہیں میرے کہنے پر وہ سب کو ختم کر دیتا، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ اس نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ صرف میری ہی جلن میں کیا ہے۔“

”کیوں نا میں یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ یہ بات تو تمہیں پتا ہی ہے کہ میں بالکل اتفاقیہ طور پر تمہاری اس کتاب سے گزر گیا تھا اور اس دور میں آ گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی ناکامی مجھ سے نہیں دیکھی جارہی۔ خاص طور سے وہ لڑکی تو عیسائے وہ کس قدر دھکی اور اداس ہے۔ باقی مر رہے ہیں۔“

”ہاں! بغاوت ختم ہو جائے گی تو عیسائے اور اس کا بھائی نیولس بھی مارا جائے گا۔ پولیسس ان کیلئے کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم دیکھ لو چاہو تو تمہوڑا سادقت باقی رہ گیا ہے اس کے بعد یہ تاریخ ختم ہو جائے گی اور تمہیں واپس چلنا پڑے گا۔“

”اور اگر میں واپس جانا چاہوں تو کیا تم میرے ساتھ ہوگی۔“

”کیا تم یہ چاہتے ہو۔“ اس نے لگاؤ سے پوچھا اور میں سر کھانے لگا تو وہ ہنس پڑی۔

”آؤ چھوڑو..... واپس چلتے ہیں۔“ اس نے کہا اور میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک اتنا بڑا سلسلہ چل رہا تھا۔ اچھے سارے لوگ تو عیسائے نیولس اور وہ سب جو اس بغاوت میں میرے احکامات کی پابندی کر رہے تھے ایک لمحے کیلئے دل کو ایک ہلکا سا احساس ہوا کہ اگر میں ان کے درمیان سے چلا گیا تو ان کی کیفیت کیا ہوگی۔ بے چارے مارے جانے والے ہیں۔ انہیں حقیقت کا علم نہیں ہے، لیکن میں حقیقت کو جانتا ہوں، کیونکہ یہ گزری ہوئی تاریخ کی کہانی ہے۔ لیکن بہر حال میں ان کو اس بے کسی کی موت مرتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا جبکہ میں نے ان کی قیادت کا فیصلہ کیا تھا۔ انسان ہر حالت میں اپنی برتری چاہتا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاؤں۔

کوروتی نے میرے چہرے سے یہ اندازہ لگا لیا اور اس کے بعد بولی۔

”آؤ.....“

میں خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ دل پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا۔ کوروتی مجھے ساتھ لئے ہوئے چلتی رہی اور ہم نے بہت طویل فاصلہ طے کیا، پھر ایک عجیب سی جگہ آپہنچے۔ تھوڑے فاصلے پر پہاڑوں کی بلندی سے ایک آبشار نیچے گر رہا تھا۔ قرب و جوار کا ماحول بہت ہی خوبصورت تھا۔ پھول کھلے ہوئے تھے اور حسین سبزہ زار آنکھوں کو

دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ درختوں کا ایک ایسا جھنڈ ہمارے سامنے آیا کہ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ درخت اوپر سے گئے اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جبکہ ان کے درمیان نیچے کافی خالی جگہ بنی ہوئی تھی۔ کوروتی نے ہنس کر مجھے دیکھا، پھر بولی.....

”کیسی جگہ ہے۔“

”یوں سمجھ لو کہ اگر انسان خوش ذوق ہو تو ساری زندگی یہیں رہنے کو جی چاہے۔“

”زندگی.....“ کوروتی دلکش انداز میں ہنس پڑی، پھر بولی۔

”آؤ بیٹھو چلتے ہیں..... یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ ہے۔“

میں خود بھی اتنا طویل سفر طے کر کے تھک سا گیا تھا اور پھر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ان لوگوں کو چھوڑتے ہوئے مجھے کافی دکھ تھا۔ کیونکہ میں ان کے انجام سے واقف تھا۔ میں نے کہا۔

”کوروتی سب سے بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم نے انہیں دلاسا دینے کے بعد تنہا چھوڑ دیا۔“

”ذیشان عالی! کیسے ادیب ہو۔ کہانیاں کو اپنی زندگی بنا لیتے ہو۔ کہانیاں تو کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ تم ایک تاریخ دان ہو اور میں تمہیں تاریخ کے نظارے کرا رہی ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم تاریخ میں تبدیلیاں پیدا کر سکو اپنے ذہن کو وسعت دو۔ جب تم اپنی کتاب مکمل کر لو گے تو اسے پڑھ کر خود ہنسو گے۔ اس کا ایک ایک سین تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا اور تم کہو گے کہ تم نے اپنی آنکھوں سے ایسا دیکھا۔ ہر چند کہ دنیا اس بات پر یقین نہیں کرے گی لیکن بڑے بڑے تاریخ دان بڑے بڑے محقق یہ تسلیم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس چیز کی شناخت انہوں نے اپنے طور پر نبھانے کی کسی مشکلات سے گزرنے کے بعد تلاش کی تھی۔ تم نے کتنی چابک دستی سے اسے لکھ مارا۔“

خیر میں تمہیں دلا سے دے رہی تھی۔ یہ سوچ کر خود کو کھٹکتے کرو۔ میں زندگی کے طویل دور سے گزری ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کبھی کبھی اس لمبی زندگی سے بڑی اکتاہٹ ہوتی ہے۔ لیکن انسان ہر حال میں جینا چاہتا ہے۔ تم بھی زندگی کے یہ چند لمحات خوشی سے گزارو۔“

اس کے انداز میں ایک عجیب سی والہیت پیدا ہو گئی اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ وہ کوروتی تھی جو میری تاریخ میں میرا ساتھ دے رہی تھی بلکہ یہ ارکاشہ کی حیثیت سے ایک دلکش ترین عورت تھی۔ حالانکہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ تاریخ کے اس دور میں وہ یونان کے ایک مخصوص حصے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ایک بڑا کردار بن کر رہ چکی تھی۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ اس کی دلکشی اب بھی بے مثال تھی۔ ویسے تو میری دنیا میں بھی وہ خاصی حسین تھی لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا، پھر بولی۔

”اپنی دنیا میں فوراً واپس چلنا ہے؟“

”جب میں نے سارے فیصلے تم پر چھوڑ دیے ہیں تو یہ فیصلہ بھی تم ہی کرو گی۔“ میں نے کہا۔

”کچھ وقت آرام کرتے ہیں جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ یہ جگہ ہمارے لئے بڑی سکون بخش ہے۔“

میں نے بھی سوچا کہ چلو کیا فرق پڑتا ہے، تھوڑا وقت یہاں گزار لیا جائے میرے لئے کون سے مسائل کھڑے ہوئے تھے جو میں فوراً اپنی دنیا میں جانا پسند کرتا۔ گھاس کا یہ ٹہلی بستر بہت ہی دلکش تھا۔ کوروتی نے کہا۔

”تم یہاں آرام کرو میں آتی ہوں۔“

پھر جب وہ واپس آئی تو اس کے پاس بہت سے اجنبی پھل تھے۔ بہت ہی خوبصورت اور بڑے دلاویز۔

”لو..... یہ میری طرف سے تمہاری میزبانی ہے۔“

میں نے ہنس کر اسے دیکھا اور کہا۔

”یہ پھل بھی بڑے عجیب ہیں۔“

”نہیں..... اب ان کی پیداوار دنیا میں ختم ہو گئی ہے، لیکن اس دور میں یہ بہترین پھل مانے جاتے تھے..... یہ لو۔“

اس نے ایک خربوز نما چیز نکال کر مجھے دے دی اور کہا۔

”اس کے کھانے کا طریقہ ایسا ہی ہے۔ تم آرام سے کھاؤ۔“

میں نے اسے جگہ کے دیکھا۔ بتائیں سکتا کہ کتنی نفیس چیز تھی۔ میں اسے کھاتا چلا گیا۔ ایک پھل اتنا بڑا تھا کہ

کھانے سے پیٹ بھر گیا، لیکن پھر آنکھوں میں کچھ کچھ غنودگی سی پیدا ہونے لگی تو میں نے کہا۔

”کوروتی مجھے تو نیند آرہی ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔ بڑا کھنک دار اور دلکش قہقہہ تھا۔ بس اس کے بعد کچھ عجیب سا

احساس دل پر مسلط ہو گیا۔ کوروتی میری آنکھوں میں ایک حسین شکل اختیار کر گئی۔ وہ بھی بہت زیادہ مجھ سے لگاؤ کا

اظہار کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے میرا سراپے بازو پر رکھا اور گھاس پر دراز ہو گئی، اس کے بعد نیم مدہوشی کے عالم

میں میں نبھانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رہا اور جب جاگا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ سب خواب نہیں تھے بلکہ حقیقت تھی۔ کوروتی

میری زندگی میں ایک نئے انداز میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا حسن تھا۔ ایک عجیب سی کشش تھی

ایک شرم کا سا احساس تھا۔ اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

”ٹھیک ہو؟“

”ہاں لیکن یہ سب.....“

”یہ سب زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اور پھر ہم تاریخ سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ میں تبدیلی تو نہیں کر سکتے.....“

”لیکن مجھ میں تو ایک تبدیلی آگئی ہے۔“

”کیا..... تم اس سے منحرف ہو؟“ اس نے سوال کیا اور شرقی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے چند لمے سوچا

پھر آہستہ سے کہا۔

”نہیں۔“ اور وہ مسکرا دی۔

”ہم یونان کے اس دور کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ کارگس اور اس کے مسائل اب ان لوگوں کے سپرد ہیں۔ کمینہ گوتم

بھنسا لی جینی طور پر ہماری تلاش میں ہوگا۔ میں تمہیں بتاؤں عالی اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ہر دور

میں میرے پیچھے لگا رہا ہے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ مجھ تک رسائی حاصل کرے۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کیا تم

اس بات پر یقین کر لو گے کہ وہ میری اس قدر قربت کبھی نہیں حاصل کر سکا۔ نیوکی کی حیثیت سے اس نے دیواگی کا ایک

کھیل شروع کیا تھا۔ لیکن تم خود سمجھتے ہو کہ ایک جانور میرے کتنے قریب آ سکتا ہے وہ اپنی دیواگی کا مظاہرہ کر لیا کرتا تھا۔

لیکن بس میں نے اس سے فاصلے ہی رکھے تھے اور یہ میرا طریقہ کار تھا۔ ذیشان عالی حیرت انگیز بات ہے کہ تم میرے

اتنے قریب آگئے ہو تم یقین کرو یہ معمولی بات نہیں ہے۔

”خیر ہم کچھ وقت یہاں گزاریں گے۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔“

میں نے ہنس کر گردن ہلا دی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں خود بھی اس کی قربت سے سرور سا ہو گیا تھا۔ جیسا

کہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میری فطرت میں حسن برقی کا بہت بڑا عنصر شامل تھا اور میں بھی جنس مخالف کی دلکشی

سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ بہت سی دوستیاں کی تھیں میں نے لیکن ایک ایسا حسین وجود جس کے بارے میں لفظ ہی ختم

ہو جائے میرے لئے انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ انسان بڑا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اس کی سوچیں پتا نہیں اسے کہاں

سے کہاں لے جاتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ یہ ایک صدیوں پرانی عورت ہے۔ ظاہر ہے اس کے تجربے اور اس کی زندگی کے مشاغل پتہ نہیں کیا کیا رہے ہوں گے۔ لیکن اس کی دلکشی بے پناہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے دور میں بھی میرے دور میں وہ ایک پروقار سی عمر رسیدہ خاتون معلوم ہوتی تھی؛ لیکن اتنی عمر رسیدہ بھی نہیں کہ اس کی دلکشی میں کوئی فرق آجائے۔

ہم نے تقریباً اندازے کے مطابق کئی چاند اور کئی سورج ان اطراف میں گزرائے کھانے پینے کا بندوبست وہ کر لیا کرتی تھی اور اس کے بعد باقی وقت ہمارا ہوتا تھا۔ چونکہ ہم ایک نئے دور اور ایک نئی جہد سے آشنا ہوئے تھے۔ اس لئے گزرنے والے یہ لمحات برے نہیں لگتے تھے لیکن پھر ایک دن اس نے خود ہی کہا۔

”اصل میں ہم کارگس سے اتنی دور نکل آئے ہیں اور ایسی جگہ آگئے ہیں جہاں کارگس میں ہونے والی کارروائی کا ہمیں علم نہیں ہے اور تاہی ہم جاننا چاہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں ڈیٹان عالی ایک انسان ہونے کی حیثیت سے تمہیں ان تمام کرداروں سے دلچسپی ہے جو تمہارے ارد گرد بکھر گئے تھے یعنی نیولس اور توئیسوا وغیرہ لیکن اب تم سب کو بھول جاؤ“ کیونکہ وہ تاریخ کا حصہ تھے اور تاریخ میں گم ہو گئے، کیا کہتے ہو وہاں چلیں۔“

”ہاں!“ میں نے کہا اور پھر ایک دوپہر جب سورج پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا تھا وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جگہ آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا۔

”دلوں ہاتھ اوپر کرو۔“

”میں نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اور وہ میرے رخ کو تبدیل کرتی رہی۔

یہاں تک کہ ایک رخ ایسا آگیا کہ میری آنکھوں میں دھندلاہٹ سی پھیل گئی۔ وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے خود بھی میری طرح ہاتھ بلند کر لئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد یوں لگا جیسے ہمارا جسم ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو اور جب یہ دھند چھٹی تو میں نے اپنے آپ کو جدید دور کی شہری آبادی میں پایا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا کیفیت ہوئی، کوروتی میرے پاس ہی کھڑی مسکراتی لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

”یہ سب کچھ فطری ہے۔ ایسا ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے تم جن حالات سے گزر رہے ہو وہ تمہارے لئے کتنے سنسنی خیز ہیں۔“

میری طبیعت میں بے حد اضطراب تھا اور میں ایک عجیب سی اداسی دل میں پارہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”کوروتی میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے لگا ہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”غصہ کیا ہے میں تمہیں نہیں روکوں گی۔“

میں اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اسکے لہجے میں خلگی تھی یا پھر اس نے نہایت سادگی سے مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بہر حال میں نے اس بات کی پروا نہیں کی اور اس کی کوٹھی سے باہر نکل آیا، پھر اس کے بعد میں گھر پہنچ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے کچھ دن میں نے زمانہ قدیم میں اس کے ساتھ جو گزارے تھے وہ میرے وجود پر مسلط ہو گئے تھے۔ وہ انتہائی دلکش تھی اس قدر کہ انسان ایک بار اسے پانے کے بعد زندگی بھر اسے دوبارہ پانے کی آرزو کرے۔ اس نے میرے ساتھ جو لمحات گزارے تھے وہ بڑی اپنائیت کے لمحات تھے۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر کو دیکھنے لگا۔ میری غیر موجودگی کے تمام اثرات اس پر نمایاں تھے جبکہ اس سے پہلے میں نے کبھی اس ہارے میں نہیں سوچا تھا اور اپنے گھر میں مطمئن تھا۔ میرے جو مشاغل تھے وہ میرے لئے اطمینان بخش تھے۔ وہی والا مسئلہ تھا کہ کسی شے کی پروا ہی نہیں تھی۔

مثال ہے تاکہ کئی عمر ہوٹلوں میں میرے ہسپتال جا کر تو ہوٹلوں میں عمر نہیں کٹ رہی تھی مرنے کا بھی فی الحال کوئی منصوبہ ذہن میں نہیں تھا۔ لیکن کارگس سے واپس آنے کے بعد بہت سی یادیں دامن گیر تھیں۔

گھر واپس آنے کے بعد پہلی رات میں نے گزرے ہوئے ماحول کے بارے میں سوچا اور عجیب سے خوابوں میں گم ہو گیا۔ میں اب اس قدر بیوقوف بھی نہیں تھا۔ پولیسیس کی حیثیت سے اس دور میں جینے کے باوجود میرے اندر ڈیٹان عالی جاگا ہوا تھا اور میں اس وقت بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ جس دور سے میں گزر رہا ہوں وہ میرا اپنا دور نہیں ہے بلکہ تاریخ کا ایک باب ہے ایک انوکھی تفصیل کے ساتھ؛ لیکن توئیسوا کی آنکھوں میں میں نے اپنے لئے جو کچھ دیکھا تھا وہ اب بھی مجھے یاد آتا تھا اور دل میں ایک ہلکی سی ہوک کا احساس ہوتا تھا۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی؛ لیکن نیولس کی وجہ سے وہ کھل کر مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی؛ کیونکہ اس وطن پرست لڑکی کا نظریہ حیات بالکل مختلف تھا۔ آہ..... پتا نہیں کیا ہوا ان سب کا پتا نہیں کیا ہو اور کیا ہوگا..... سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں ماضی سے واپس آگیا تھا اور مجھے صورتحال کا پتا نہیں چلا تھا۔ لیکن کوروتی بعد کے ہونے والے واقعات سے ضرور واقف ہوگی۔ کیونکہ یہ اس دور کی بات تو ہے جب وہ وہاں ارکا کا شہ کی حیثیت سے موجود تھی۔

یہ رات ایسے ہی اچھے ہوئے خیالات میں گزری۔ مستقبل کے بارے میں سوچنا ایک طرح سے حماقت ہی ہوتی ہے؛ کیونکہ مستقبل ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ فیصلے وقت کرتا ہے اور وہی فیصلے ہماری زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں۔

دوسرے دن ہی صبح جاگ کر سب سے پہلے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔ بے شک میری زندگی میں کچھ پراسرار واقعات داخل ہو چکے تھے۔ میری کتاب زندہ صدیاں دنیا کی بہترین کتاب ہو سکتی تھی؛ اگر میں انہی واقعات میں خود کو مصروف رکھتا۔ مجھے ایسے کردار مل گئے تھے جس کے بارے میں اگر میں کسی کو بتاتا تو وہ کبھی یقین نہ کرتا..... کوروتی ایک خوبصورت روپ میں میرے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ میں اگر یہ بتاتا کہ زمانہ قدیم کی ایک پراسرار شخصیت ہے تو لوگ ہنسنے کے سوا کچھ نہ کرتے۔ ظاہر ہے میں سب کے سامنے مداری کا تماشا نہیں کر سکتا تھا۔

غرض کہ اپنے گھر کے معاملات میں پوری طرح دلچسپی لیتا رہا۔ کوروتی بار بار یاد آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میں اس سے الگ ہو کر یہاں تک آگیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ایسا کردار تھی اور خاص طور سے اب کہ میں اس کی قربت سب سے زیادہ پسند کرتا۔ وہ ایک حسین صورت تھی اور میں اسے اس دور میں حاصل کر چکا تھا جب وہ ایک انتہائی دلکش وجود تھی۔ اس کی دلکشی سے اب بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس نے روپ بدل لیا تھا.....

طویل عرصے کے بعد اپنے گھر اپنی دنیا میں لوٹ کر مجھے ایک طرح سے خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ میرے اپنے مشاغل تھے۔ ہر انسان کو اپنے مشاغل پوری طرح عزیز ہوتے ہیں۔ اپنے کچن میں آکر میں نے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد پرسکون ہو کر میں نے اپنی کتاب اٹھالی اور اس میں کچھ صفحات کا اضافہ کرنے لگا۔ میں نے اس کتاب میں لکھا کہ میں صدیوں کے نگارے کر رہا ہوں۔ میں نے مہابھارت کے دور کا قدیم ہندوستان دیکھا اور اس میں ایک کردار کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ بے شک یہی لگتا تھا جیسے رات کو ایک دلکش خواب دیکھا ہو اور صبح کو اکٹھ کھل گئی ہو۔ لیکن ایسا خواب جو ایک چلنے پھرتے وجود کی مانند تھا اس خواب میں صدیوں کے نگارے تھے۔ میں صدیاں زندہ دیکھ رہا تھا۔ زندہ صدیوں میں میں نے اپنے تاثرات لکھے۔ یونان کے قدیم معاملات وہاں ہونے والے تمام واقعات نیولس کی ایک پراسرار کردار جس نے یونان کے ایک دور پر حکمرانی کی تھی اور اس وقت کے تمام کردار؛ لیکن یہی بات یہ ہے کہ میرا ذہن خود بھی شدید الجھنوں کا شکار تھا۔ توئیسوا اگر اس وقت پولیسیس نامی کسی آدمی سے متاثر ہوئی تھی تو اس کا انجام کیا ہوا؟ کیا کوروتی کو اس ہارے میں علم ہوگا۔ سوالات تو بیچار تھے۔ ہانسیوں کا کیا ہوا؟ گوتم بھسالی نیولس کی حیثیت سے کتنے

عرصے وہاں رہا۔ جب ہم نے وہ جگہ چھوڑ دی تو گوتم بھنسا لی کا کیا ہوا ایسے عجیب و غریب واقعات تھے۔ جن پر اگر غور کیا جاتا تو سچی بات یہ کہ پاگل ہو کر پاگل خانے میں داخل ہونے کو جی چاہتا۔ کیسے ممکن تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ صدیاں میرے سامنے زندہ ہو جائیں۔

دو پہر تک اپنی کتاب کے صفحات میں اضافہ کرتا رہا۔ اس میں اپنے تاثرات لکھے پھر اس وقت شاید دن کا ایک بجھا تھا جب دروازے کی تیل بجی اور میں چونک پڑا۔ کوئی نہیں آتا تھا میرے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ کسی سے تعلقات ہی نہیں تھے اس طرح کے جو کوئی میرے گھر آتا تھا ان دل نے جلدی سے کہا کہ ہو سکتا ہے خود کو روتی آئی ہو۔

میں پھرتی سے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا اور جو شخص میرے سامنے آیا وہ میرے لئے ایک شدید ذہنی جھٹکے کا باعث بن گیا۔ یہ کبڑا گوتم بھنسا لی تھا جو سردنگا ہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تم.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اندر آنا چاہتا ہوں۔“ گوتم بھنسا لی بولا۔

میں نے صرف ایک لمحے توقف کیا یہ انتہائی خطرناک آدمی تھا۔ میرا بدترین دشمن، کئی بار مجھ پر جان لیوا وار کر چکا تھا۔ صدیوں پرانی روح تھی، نہیں کہا جاسکتا کہ کس قدر جسمانی قوتوں کا مالک ہوگا، لیکن یہ بھی میرے لئے ایک شرمندگی کی بات تھی کہ میں اس سے خوفزدہ ہو کر دروازہ بند کر دیتا اور اسے اندر آنے کی اجازت نہ دیتا، ظاہر ہے میں بھی اس دور کا ایک جوان آدمی تھا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا اور میں نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ۔“

وہ اندر داخل ہوا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور پھر اسے ساتھ لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

”بیٹھو۔“ میں نے اس سے کہا اور وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا، اس کے چہرے کے تاثرات اچھے نہیں تھے۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ تمہاری خوراک کیا ہے۔ تم صدیوں پرانے انسان ہو کیسے جیتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کیا کھاتے پیتے ہو؟ مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔“

”میں تمہارے پاس مہمان بن کر نہیں آیا بلکہ کھلے الفاظ میں تم سے یہ کہنے پر حق بجانب ہوں کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔“

”کہنے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اس کے سامنے ایک صوفے کے ہتھے پر بیٹھ گیا۔

”تم نے میری صدیوں کی تپیا بھنگ کر دی ہے، تم نے اسے حاصل کر لیا ہے جبکہ میں صدیوں سے اس کے حصول کیلئے سرگرداں تھا۔“

دفعتاً ہی میرے دل میں ایک اشتیاق پیدا ہوا، میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے..... کیا تم یہ جانتے ہو؟“

”کیا نہیں جانتا؟..... میں سائے کی طرح اس کے پیچھے رہتا ہوں۔“

”جب پھر تمہیں ہر بات کا علم ہوگا یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں اس وقت تم سے دور نہیں تھا۔ جب تم نیوکی بنے ہوئے تھے اور یونان کے اس دور پر حکمرانی کر رہے تھے۔

”اور تم کیا سمجھتے ہو کیا مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں جانتا تھا لیکن تاریخ میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا تھا۔“

”آہ میری جان میرے دوست، یہ تو تم نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا، اگر تم یہ جانتے تھے کہ میں اس دور میں موجود ہوں تو تم نے میرا تعاقب کیوں نہیں کیا۔“

”نہیں..... صدیوں پہلے جو بیت بچی ہے وہ صدیوں کی بات ہے جو ہوا تھا وہ اسی طرح رہنا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی کیسے ممکن تھی۔ میں یو لیسس کی حیثیت سے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد تمہیں وہاں سے چلے جانا تھا۔“

”کہاں؟“

”یونان کے کسی اور حصے میں، لیکن وہ تم نہیں تھے۔ وہ یو لیسس تھا جو نیوکی کی موت کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔“

”نیوکی کی موت؟“

”ہاں.....!“

”وہ کیسے واقع ہوئی۔“

”باغیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا، انہوں نے محل پر حملہ کیا اور سب سے پہلے انہوں نے نیوکی کو قتل کر دیا۔“

”اور اس وقت وہ تم نہیں تھے۔“

”نہیں وہ نیوکی ہی تھا۔ میں نے تو صرف اس کا روپ دھارن کیا تھا۔“

”اور تم جو ارکا شہ کو پریشان کرتے تھے۔“

”وہ سب کچھ بالکل اسی طرح تھا۔ لیکن میں نے نیوکی کا روپ دھارا تھا۔“

”اور اس کے بعد جب ہم نے وہ صدیاں چھوڑ دیں تو تم ہمارے پیچھے چلے آئے۔“

”ہاں! میرا تعلق صرف کوروتی سے ہے۔ دیکھو دوست تم نے جو کچھ کر ڈالا ہے وہ میرے دل کی آگ بن چکا ہے، میں تم سے کھل کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ جب بھی مجھے موقع ملا میں تم سے زندگی جیمین لوں گا، ایسا دشمن تمہیں پہلے کبھی نہیں ملا ہوگا۔“

”تو اب تک تم اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔“

”یہ راز میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ اگر تمہیں یہ راز معلوم ہو گیا تو تم مستقبل میں بھی اپنی حفاظت کر لو گے جبکہ اس بات کو لکھ لو کہ تمہاری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔“

میں ہنس پڑا۔ میں نے اس سے کہا۔

”اور میں بھی تمہیں یہ بتا دوں کہ میں تم سے زہر برابر بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ اگر میں تم کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تو تم سے یہ کہتا کہ آؤ دیکھو ذرا اپنے آپ کو آزماؤ صدیوں پرانے انسان کہ نئے دور کا انسان کیا ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں تم سیسے کا ایک ٹکڑا میرے سینے میں اتار دو گے، لیکن بیکار رہے گا وہ تمہارے لئے، وہ میرے جسم سے پار نکل جائے گا اور میرا جسم پھر اپنی جگہ معتدل ہو جائے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”کبڑے تمہارا اس وقت یہاں میرے پاس آنا یقیناً کسی خاص مقصد کا حامل ہوگا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔“

”میں تم سے چاہتا ہوں کہ تم اس سے گریز کرو..... اسے میرے لئے چھوڑ دو..... سے بیت جائے گا تم مر جاؤ گے، لیکن ہمیں آگے جانا ہے..... ہمیں آگے جانا ہے۔ بہت آگے صدیوں ہزاروں صدیوں آگے، کیونکہ ہم امر ہیں، ہم جیون کو پانچکے ہیں۔ تمہوڑے عرصے کی بات ہے کوروتی تم سے دور ہو جائے گی، لیکن میں اس کا ساتھ دوں گا، میں اس کا پیچھا کرتا

رہوں گا۔ اس سے تک جب تک وہ مجھے حاصل نہ ہو جائے۔“  
میں دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک کردار تھا۔ میری زندہ صدیوں کا کردار جس کو میں لکھ رہا تھا۔ جس طرح میں کوروتی کو لکھ رہا تھا اسی طرح گوتم بھنساالی کو بھی۔ کیونکہ یہ دونوں کردار میری کتاب کے مرکزی کردار تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

”گوتم بھنساالی! کوروتی کا کہنا ہے کہ تم نے بھی صدیوں کی اس عمر میں بہت سے علم سیکھے ہیں، بہت گیمانی ہو تم، روپ دھار سکتے ہو تو مجھے ایک بات بتاؤ تم اپنی صورت کیوں نہیں تبدیل کر سکتے۔“  
اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ مجھے گھورتا رہا، پھر بولا۔

”ہاں“ میں جانتا ہوں..... میں اتنا ناواقف نہیں ہوں تم جس یک میں سانس لے رہے ہو وہ دو نام رکھتا ہے ایک تو ترتیہ یک اور دوسرا جس کا نام ایک بہت بڑے مہارشی مانی نے رکھا تھا سنھیا یک..... سنھیا یک جو ہے وہ چالاک کا یک ہوگا اس میں منش..... منش نہیں ہوگا بلکہ بہت ہی ودان اور بھوت ہوگا گزری ہوئی ساری صدیوں سے الگ اتنا تیز چالاک نظر آ رہا ہے تمہارے اس یک میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے لئے ناقابل یقین ہے۔ عجیب عجیب چیزیں جن کا ماضی قدیم میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے تم سانس کا نام دیتے ہو اور تمہاری سانس بڑی عجیب ہے۔ خیر تو میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ایک اور ظلم کا شکار ہو چکا ہوں۔“

”کس کے؟“

”کوروتی کے۔“

”ظلم.....“

”ہاں.....!“

”وہ کیا؟“

”وہ خوبصورت تھی، چالاک تھی، مجھ سے کہیں زیادہ چالاک۔ میں تو مندر میں گھنٹہ بجانے والا ایک سیدھا سادا انسان تھا جو بس یوں سمجھو پریم روگ کا شکار ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بالکل اتفاقی طور پر مجھے بھی امرت مل گیا اور میں نے اسے تھوڑا سا پی لیا، لیکن عقل میں، میں کوروتی سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس کے اندر جو کچھ تھا یا جو کچھ ہے تم خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ وہ ایسے ایسے مرحلوں سے گزر چکی ہے کہ کوئی اسے دیکھنے کے بعد یہ نہیں سوچ سکتا بڑے بڑے گیانیوں اور مہارشیوں سے اس نے گیان سیکھے۔ پتا نہیں بھگوان نے اس کے من میں میرے لئے اتنی کھوٹ کیوں ڈال دی، میں روپ بدل لیتا، مگر اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ مجھ پر ایک ایسا منتر کر دیا کہ میں سب کچھ بن سکتا ہوں، ایک خوبصورت نوجوان نہیں بن سکتا۔“

”ارے.....“ میں نے حیرانی سے کہا۔ میرے لئے یہ انکشاف کافی سنسنی خیز تھا اور یہ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری کتاب زندہ صدیاں میں ایک خوبصورت باب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ زندہ صدیاں درحقیقت تہذیب کی تاریخ سے چھوٹی ہوئی چل رہی تھی۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میں اس تاریخ کو زندہ کر رہا تھا جو صدیوں میں محفوظ ہو گئی تھی اور وہ انکشاف کر رہا تھا جو صدیوں کی گرد میں چھپ گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انکشافات اپنے طور پر بڑے سنسنی خیز تھے اور تاریخ پانے والوں کیلئے بڑی اہمیت کے حامل ہاں بس اتنی سی بات تھی کہ اس میں ایک خوبصورت چاشنی کیلئے تھوڑا سا پراسرار ماحول ضروری تھا۔ یعنی زندہ صدیوں کو تھوڑی سی پراسرار صدیاں بھی بننا چاہئے تھا۔ کوروتی کے بارے میں اس کے انکشاف سے میرے دل میں یہ تصور پیدا ہوا کہ کوروتی سے یہ معلوم کروں گا کہ کیا اس نے کبھی کسی ایسے دور

میں بھی اپنے آپ کو شامل کیا ہے جس میں ایک پراسرار زندگی کی داستان چھپی ہوئی ہو۔ یقینی طور پر اس سلسلے میں بھی مجھے کوروتی سے کافی مدد حاصل ہو سکتی تھی۔ گوتم بھنساالی کے اس انکشاف سے میں نے یہ بات اپنے ذہن میں بسالی اور اس کے بعد گوتم بھنساالی مجھے آگے کے بارے میں بتانے لگا۔

”بس میری مان لو تم میری مان لو جو میں کہہ رہا ہوں وہ مان لو اسے میرے لئے چھوڑ دو۔ مجھے یقین ہے کہ صدیوں کے اس سفر میں کہیں نہ کہیں اس کے من میں میرے لئے پریم پیدا ہو جائے گا۔“

”مگر تمہیں مجھ سے خدشہ کیوں ہے گوتم بھنساالی، ظاہر ہے بقول تمہارے میں ایک چھوٹی سی عمر کا انسان ہوں، تھوڑا عرصہ ساتھ رہوں گا اور اس کے بعد چلا جاؤں گا، پھر سب کچھ تمہارے لئے ہی ہوگا۔“

”لیکن وہ پہلی بار کسی سے متاثر ہوئی اور جس سے وہ متاثر ہوئی ہے وہ تم ہو۔“  
”ہوں.....“ میں نے یہ تمام باتیں اپنے ذہن میں رکھ لیں، کیونکہ بہر حال مجھے اپنی کتاب کی ترتیب اسی انداز میں کرنی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”مگر سنو میری بات سنو اگر تم اس بات کے شاکہ ہو کہ میں نے تمہاری صدیوں کی تپسیا بھنگ کر دی اور کوروتی میرے بالکل قریب آگئی تو اس میں میرا قصور تو نہیں ہے، اگر تم ہر وقت کوروتی کے ساتھ رہتے ہو گے تو یہ بات تم جانتے ہو گے کہ وہ خود جذباتی ہو گئی تھی۔“

گوتم بھنساالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے کہا۔  
”لیکن میں تمہیں اس کی ترکیب بتا سکتا ہوں جس سے تم اس کی آنکھوں سے روپوش ہو جاؤ۔ وہ تمہیں کچھ عرصہ تلاش کرتی رہے گی اور اس کے بعد خود مایوس ہو کر پیچھے ہٹ جائے گی اور میرا راستہ صاف ہو جائے گا۔“  
”تم مجھے سوچنے کا موقع دو میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے تمہاری اس خواہش کیلئے کیا کرنا چاہئے۔“  
وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا، پھر کچھ کہے بغیر دروازے کی جانب بڑھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ میری نگاہوں سے غم ہو گیا، لیکن میرے لئے جو وہ مضمون چھوڑ گیا تھا اس کی تکمیل میرے لئے بڑی ضروری تھی۔ چنانچہ میں اور کچھ سوچے سمجھے بنا آگے بڑھا اور اپنی کتاب کا مسودہ لے کر بیٹھ گیا جس میں مجھے یہ ساری تفصیل درج کرنی تھی۔ میں نے گوتم بھنساالی کی آمد اور اس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سارا مضمون اپنی کتاب میں لکھا اور پھر میرے ذہن میں کوروتی جاگنے لگی اور میں اس کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ ابھی میں نے لباس تبدیل ہی کیا تھا کہ ایک بار پھر میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور میں دروازہ کھولنے چل پڑا۔ دروازہ کھولا تو ایک اجنبی شکل میرے سامنے تھی۔ اس کی عمر انیس یا بیس سال کی ہوگی، دھلے دھلے سے حسین نقوش کسی بھی میک اپ سے بے نیاز انتہائی لمبے بال جو میری سب سے بڑی کمزوری تھی بادامی آنکھیں جن میں براؤن پتلیاں گردش کر رہی تھیں۔ قدرتی طور پر مسکراتے ہوئے ہونٹ اور اتنا دلکش اور متناسب بدن کہ ایک لمحے کیلئے انسان کھو کر رہ جائے۔ میں تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ فطری طور پر ایک حسن پرست انسان ہوں اور حسین وجود میری کمزوری ہیں۔ کچھ لمحوں کیلئے تو بھول ہی گیا کہ میرے دروازے پر ایک اجنبی حسینہ کھڑی ہوئی ہے، پھر اس نے خود ہی مجھے مخاطب کیا۔

”سنئے مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“

میں چونک پڑا۔ کیا یہ حسین اور مترنم آواز تھی، میں دو قدم پیچھے ہٹا اور میں نے کہا۔

”جی بتائیے..... آئیے۔“

اس کے ہونٹوں کے زاویوں میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہوئی، گویا وہ مسکرائی تھی، کام دروازے سے بھی پورا ہوسکتا تھا لیکن چونکہ میں پیچھے ہٹا تھا اس لئے وہ دروازے سے اندر آگئی تو میں نے کہا۔

”آئیے تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گزار پیئے۔“

وہ بے تکلف سے اندر آگئی۔ میری تو خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک انتہائی دلکش حسینہ میرے پاس آئی تھی۔ اسے مجھ سے کام کیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی، میرے گھر کا خود کار دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا تو وہ بولی۔

”میری آمد آپ کو کیسی لگی؟“

”بے حد خوش ہوں اور اس وقت مزید خوشی ہوگی جب آپ مجھے اپنے کام کا بتائیں گی اور میں اس کی تکمیل کر دوں گا۔“

وہ آہستہ سے ہنسی اور پھر بولی۔

”مرد کتنے عجیب ہوتے ہیں! اچھا مجھے ایک بات بتاؤ۔ نسوانیت تو یکساں ہوتی ہے پھر یہ مرد ہر لڑکی کو دیکھ کر پاگل کیوں ہو جاتے ہیں۔“

بڑا عجیب سا سوال تھا۔ بڑی گہرائی لئے ہوئے۔ میں کچھ لمحے اس کا جواب سوچتا رہا، پھر میں نے کہا۔

”اصل میں محترمہ ویسے تو ہر ایک کے دل میں اور سینے میں جذبات ہوتے ہیں، لوگ اپنی پسند سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں میں لفظ پسند کا خاص طور سے استعمال کروں گا۔ ہم اپنے لئے لباس خریدتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، ان میں ہماری ایک پسند شامل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہم خوبصورت لباس پہننا پسند کرتے ہیں، اچھا کھانا پسند کرتے ہیں، اسی طرح سے حسین نظر بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ حسین چہرے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور پھر اگر کچھ لمحوں کیلئے ہی ان کی قربت اور ان کی توجہ حاصل ہو جائے تو ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے۔“

”آپ کی بات مطمئن نہیں کر سکی..... خیر آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ کیونکہ آپ ادیب ہیں۔“

”آپ کو کیسے معلوم؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”اس لئے کہ میں کوروتی ہوں۔“ وہ بولی اور ایک لمحے کیلئے میرا دماغ سنسن کر رہ گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا تو وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔

”کیا میں اپنی اصل شکل میں آؤں۔“

”نہیں..... نہیں..... نہیں..... آپ کا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کوروتی ہیں۔ مگر..... مگر.....“

”کوروتی کا نام جاننے کے باوجود مگر کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے۔“ اس بار اس کی آواز بدلی ہوئی تھی اور یہ آواز سو فیصدی کوروتی ہی کی تھی۔ میں حیرت کے گہرے گہرے سانس لیتا رہا تو وہ بولی۔

”انسان زندگی میں تبدیلیوں کا خواہشمند ہوتا ہے۔ بے شک میرا تعلق قدیم صدیوں سے ہے اور میں اپنی عمر کے اس دور کے بعد جب میں نے امرت جل پیا تھا آج تک مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آئی ہوں۔ تم نے مجھے ارکاشر کے روپ میں بھی دیکھا اور مہا بھارت کے دور میں بھی۔ میرے روپ بدلے ہوئے تھے اور جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا گمان بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اپنے چہرے اپنے جسم بدل لینا میرے لئے بڑی معمولی سی بات ہے تو میں روپ بدل کر تمہارے سامنے آئی، کیونکہ میرے من کا روپ بھی بدل چکا ہے۔“

”من کا روپ.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ہاں.....! شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ میں زندگی میں پہلی بار کسی مرد سے متاثر ہوئی ہوں اور میں نے اپنا

وجود اس کے حوالے کر دیا۔ میں نہیں جانتی کہ صدیوں کا تجربہ کہاں گم ہو گیا، لیکن میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں، بہت..... اور جب میں نے تمہارے بارے میں سوچا تو میرا دل چاہا کہ میں تمہارے سامنے ایسے روپ میں جاؤں جس سے تمہیں بھی خوشی ہو۔“

دل تو چاہا ہر گھبرا کر اسے تیل میں ڈیو دوں، کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی میری اس کے اس احساس پر اور یہ بھول جانا چاہتا تھا میں کہ وہ ایک صدیوں پرانی روح ہے۔ میرے سامنے جو دلکش حسن آیا تھا مجھے اسی پر نگاہ رکھنی چاہئے تھی، پھر اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے کہا۔

”کوروتی مجھے ایک بات بتاؤ اور آرام سے بیٹھو۔“

وہ صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئی، میں نے سچی بات یہ ہے کہ بڑی ہوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا، کیونکہ میرے اندر بہت سے احساسات جاگ اٹھے تھے۔ پھر میں نے کہا۔

”تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ بے حد حسین اور میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے وہ مقام دیا جو کسی اور کو نہیں مل سکا جبکہ تم ایک بہت ہی عظیم کردار ہو۔“

وہ ہنسنے لگی، پھر بولی۔

”تم لوگ بعض اوقات الفاظ کا بہت عجیب استعمال کرتے ہو۔ میں عظیم کہاں سے ہو گئی۔ عظیم تو وہ ہوتے ہیں جو جیون میں ایسے کام سرانجام دیتے ہیں جس سے سنسار کو کوئی بڑا فائدہ پہنچے۔“

ایک بار پھر سر کھانے کی کیفیت میں آ گیا تھا۔ کیونکہ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر میں نے بات بنائی۔

”ہر انسان خود غرض ہوتا ہے، اس کی نگاہوں میں اسی کی عظمت ہوتی ہے جو اس کیلئے کسی دلکشی، محبت یا اس کی کسی ضرورت پوری کرنے کا باعث ہو۔“

”ہاں یہ کہہ سکتے ہو..... کیا سوال کر رہے تھے مجھ سے۔“

”ہاں! گوتم بھنسا لی آیا تھا میرے پاس۔“

”اوہ.....!“ کوروتی سنبھل کر بیٹھ گئی، پھر بولی۔

”کیوں؟“

جواب میں میں نے گوتم بھنسا لی کی باتیں اسے سنائیں جنہیں وہ غور سے سنتی رہی، لیکن اس کے چہرے پر کسی تشویش کے آثار نہیں تھے۔ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”اور میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں کبھی ہلاک نہیں کرے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ تم میری پسند بن چکے ہو اور میرا تمہارا ساتھ بہت گہرا ہے۔ اگر اس کے ہاتھوں تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو میرے دل میں اس کی نفرت مزید پیدا ہو جائے گی، وہ کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے گا۔ البتہ تمہیں ڈراتا دھمکتا ضرور رہے گا اور یہ اچھی بات ہے کہ مجھے اس کے بارے میں پتہ چلتا رہے۔“ کوروتی کے لہجے میں کسی قدر نفرت سی ابھر آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”اور شاید تم نے اس پر ایسا کوئی منتر کیا ہے جس سے وہ تمہاری طرح ایک حسین روپ نہیں دھار سکتا۔“

جواب میں کوروتی خوب ہنسی، پھر بولی۔



”ہاں میں نے اسے ایسے ہی روگ میں گرفتار کر دیا ہے۔ وہ ہر روپ اختیار کر سکتا ہے انسان تو انسان وہ جانور بھی بن سکتا ہے۔ لیکن ایک حسین نوجوان کا روپ نہیں دھار سکتا کہ مجھے دھوکہ ہو جائے۔ اصل میں میں تمہیں بتاؤں کہ میں صدیوں سے جی رہی ہوں اور آگے کی نجانے کتنی صدیاں مجھے جینا پڑے گا جبکہ تم میرے من میں پہلی بار اتنی دور چلے آئے ہو اور میں سوچتی ہوں کہ تم میرا زیادہ ساتھ نہیں دے پاؤ گے..... خیر چھوڑو کیا کر رہے تھے۔“

”اپنی صدی کو زندہ کر رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ بولی۔

”تمہارے پاس ایک اچھا مشغلہ ہے۔ خیر اب یہ تمہارا معاملہ ہے۔“

”کوروٹی ایک بات بتاؤ۔“

”ہاں پوچھو۔“

”جب تم میرے پاس نہیں ہوتی تو کہاں ہوتی ہو۔ کیا اپنے اسی گھر میں وہاں کیا کرتی رہتی ہو۔“

وہ مسکرائی پھر بولی۔

”جاننا چاہتے ہو۔“

”ہاں بتاؤ مجھے۔“

”تھوڑے سے رک جاؤ۔ ہر چیز آہستہ آہستہ منکشف ہوتی زیادہ اچھا رہتا ہے، اصل میں میں جینا چاہتا وجود ہوں لیکن میں آتماؤں کے بیچ بھی جاسکتی ہوں۔ کیا سمجھ میں آتماؤں کے بیچ بھی جاسکتی ہوں۔“

”موتم ہمسالی تمہیں تنگ تو کرتا رہتا ہوگا۔“

”نہیں اس کی یہ مجال نہیں۔ بس جیسا کہ تم نے دیکھا کہ یونانی دور میں وہ کسی طرح ایک جانور کا روپ دھار کر میرے قریب پہنچا تھا اور اس کیلئے اس نے بڑی لمبی پلاننگ کی تھی وہ خود کو سے کی گرد میں چھپا لیتا ہے۔ میں نے اس کے بہت سے روپ دیکھے ہیں۔ تم یقین کرو وہ ہر طرح کا جانور بھی بن سکتا ہے۔ لیکن جب وہ میرے سامنے آئے گا تو میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔“

”کیا اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”بس تم اسے دشمنی کر سکتے ہو۔ وہ اپنا روپ بدل کے اپنا وہ شریر چھوڑے گا۔ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”بڑا عجیب مسئلہ ہے واقعی بڑا عجیب مسئلہ ہے۔“

”کیا تمہاری کتاب کیلئے ایک اچھی کہانی نہیں ہے یہ.....“

”ہاں! اچھی اور پراسرار! ابھی تم نے کہا کہ تم آتماؤں کے بیچ بھی جاسکتی ہو۔ کیا کبھی تمہارا واسطہ کسی ایسے دور سے بھی رہا ہے جو انتہائی خوفناک اور بہت ہی دہشت ناک ہو۔“

”ہاں کیوں نہیں..... صدیوں میں کیا کیا ہوا ہے۔ ایک سے ایک زیادہ خوفناک وقت مجھ تک پہنچ چکا ہے۔“

”ویری گڈ یہ تو میرے لئے بہت اچھی بات ہے۔ زندہ صدیاں میں کچھ پراسرار..... واقعات بھی آسکتے ہیں۔“

”میں تمہیں ایلا بار بروسا کے دور میں لے جاؤں گی کیا سمجھ..... اور تم دیکھو گے کہ جادو کی بنیاد کیا ہے۔“

”ارے واہ..... ویری گڈ..... زبردست۔“ میں نے خوشی سے کہا پھر بولا۔

”مگر میں نے یونان کی پوری تاریخ نہیں دیکھی۔ اس کا چھوٹا سا دور ہی دیکھا ہے۔“

”تم اسی دور میں پہنچے تھے۔ یونان کی تاریخ تو بہت طویل ہے بلکہ دنیا کی تاریخ طویل ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں تم ان صدیوں کا ساتھ نہیں دے پاؤ گے۔ ویسے ایک بات بتاؤ تم نے پراسراریت کی بات کی ہے۔ تمہارے اس دور میں

پراسراریت کا کیا معیار ہے۔ کس طرح کے واقعات اس دور میں ہوتے رہتے ہیں۔“

”بس ایسا سب کچھ عجیب و غریب جو..... جو سمجھ میں بھی نہیں آتا۔“

”میری بات سنو! اس دور میں تم میرے میزبان ہو۔ میں بیچ بتا رہی ہوں کہ ابھی تک میں کوئی بڑا تجربہ نہیں کر سکی۔ حال میں آگئی ہوں لیکن جب چاہوں ماضی میں واپس جاسکتی ہوں۔ البتہ اس حال کے بارے میں تھوڑی معلومات میرے لئے کافی دلکش ہوگی۔ کیا تم مجھے ایسے واقعات دکھا سکتے ہو جو میرے لئے اجنبی ہوں اور زمانہ قدیم کے ادوار سے بالکل مختلف۔“

میں کسی سوچ میں ڈوب گیا میں نے سوچا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اس کیلئے وہ شاید میری سوچ کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔

”نہیں میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم مجھے فوری طور پر کسی ایسی جگہ لے جاؤ جہاں میری سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ہوں یا میرے تجربات میں اضافہ ہونے والی کوئی چیز ہو۔ بس ایسے ہی میں تمہاری دنیا کی تھوڑی سی سیر کرنا چاہتی ہوں۔“

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور کہا۔

”ٹھیک ہے کوروٹی میں تمہیں تلاش کر کے ایسے واقعات کی سیر کراؤں گا جو تمہارے لئے اجنبی ہوں۔“

”مجھے ان سے کافی دلچسپی ہے۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک۔ اب تم آئی ہو تو مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا خاطر مدارت کروں۔“

”یہ تو تم خود فیصلے کر سکتے ہو۔ میں ایک جینا چاہتا وجود ہوں کوئی آتما نہیں ہوں۔ زندگی کی تمام ضروریات سے آشنا ہوں اور ان کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہوں تم جس طرح سے چاہو۔“

میں تو خیر اپنے کچن میں جا کر کیا ہی کرتا۔ وہاں تھا ہی کیا جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کئی عرصوں میں مرے ہسپتال جا کر۔ یہاں تو یہی سارا مسئلہ تھا۔ لیکن میں نے اپنی یادداشت کے مطابق ایک بہت اچھے ہوٹل کو فون کیا اور اس کو عہدہ قسم کی چیزوں کا آرڈر لوٹ کر دیا۔ یہ ایسا ہوٹل تھا جو ہوم ڈیوری بھی کرتا تھا۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میرے آرڈر کی تکمیل ہوگئی اور میں کوروٹی کی خاطر مدارت کرنے لگا۔ یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اب تک کی زندگی میں بہت سی حسیناؤں سے دوستی رہی تھی۔ ان سے رابطہ رہا تھا۔ لیکن باہر ہی یہ میرا چھوٹا سا گھر جسے میں نے کبھی اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ وہاں کسی کو اس طرح سے دعوت دوں لیکن یہ میرے لئے بہت مقدس تھا۔ کیونکہ یہاں سے میری زندگی کے لاتعداد لحظات وابستہ تھے۔ زندہ صدیوں میں جو کچھ درج کیا جا رہا تھا میرے اپنے خیال کے مطابق ایسا کبھی کچھ پہلے نہیں لکھا گیا ہوگا جس میں کوئی ادیب آنکھوں دیکھا حال کھسے پراسرار کہانیاں لاتعداد خوفناک داستانیں لکھی جاتی ہیں لیکن بذات خود ان کا تجربہ کرنا ایک الگ کام ہے اور پھر ایسا تجربہ جسے صرف خواب کی بات ہی سمجھی جائے بلکہ ایسے خواب دیکھنا بھی ایک مشکل عمل ہوتا ہے جس میں تاریخ کا بالکل صحیح تجزیہ ہو سکے میں یہ کر رہا تھا اور کوروٹی میری معاون تھی۔

پھر اس وقت جب وہ ایک ایسی حسینہ کے روپ میں تھی جسے دیکھ کر دل کے تمام مسامات منہ کھول دیں تو اس سے زیادہ انسان کیلئے خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا جس کی تعریف کوروٹی نے کی اور بولی۔

”میں یہاں طویل عرصے سے اس دور میں ہوں۔ ظاہر ہے اس میں ہونا میری مجبوری تھی کیونکہ گزرے ہوئے وقت کے ساتھ میرا سفر آگے بڑھ رہا تھا اور ہے اور جیسا کہ میں نے کہا کہ مجھے ابھی اور آگے جانا ہے لیکن اس دور کی کچھ باتیں مجھے بہت ہی پسند آتی ہیں کتنا عجیب دور ہے یہ۔ میں نے بہت سے جادوئی ادوار گزارے ہیں اور ایسے کرداروں

سے روشناس ہوئی ہوں جو علم و فن میں ماہر تھے، لیکن یہ سب کچھ جو میں زندہ دیکھ رہی ہوں، مثلاً ایک ساحر سحر کرتا ہے، جادو کا ایک گولہ پھینکتا ہے اور بہت سے انسان فنا ہو جاتے ہیں یا وہ اپنے جادو کے آئینے میں اپنی من پسند چیزیں دیکھتا ہے لیکن وہ تنہا ہوتا ہے یا پھر اس کے ساتھ کوئی دیدہ ور جسے وہ دکھانا چاہتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ سڑکوں پر دوڑتی ہوئی بے جان چیزیں جو صرف مشینوں سے چلتی ہیں اور جادو کے وہ گولے جو گھر گھر میں موجود ہیں اور ایسا اسلحہ جسے ایک آدمی چلا کر لاتعداد لوگوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ اس جادو سے کہیں زیادہ جدید جادو ہے اور میں جب اپنی پتھر کی اس کتاب میں اس دور کا ذکر کروں گی تو ڈیٹان عالی تمہارا نام بھی میری کتاب کی زینت بن جائے گا اور جب اس دور کی باتیں اپنی کتاب میں درج کروں گی تو اس میں یہ بھی کہوں گی کہ مجھے ایک ایسا شخص ملا تھا جس نے ان ادوار کی سیر بھی کی تھی جن کی تفصیل میری اس کتاب میں موجود ہے جبکہ اس سے پہلے ایسا کوئی کردار میرے سامنے نہیں آیا تھا۔

یہ کھانا جو تم نے منگوایا ہے یہ بہت لذیذ ہے۔ ڈیٹان عالی! میں زیادہ سے زیادہ اس دور کی سیر کرنا چاہتی ہوں تاکہ جب میں اپنی کتاب میں اس دور کی کہانی لکھوں تو اس میں بڑی تفصیل موجود ہو۔ تم مجھے اس دور کی سیر کراؤ میں تمہیں ماضی کے ہر لمحے سے روشناس کراؤں گی۔ اس وقت سے جب سے میں نے اپنے علم کے سہارے اس دنیا کو محسوس کیا اور یہ دور کتنا قدیم ہے اور میں کن کن ادوار سے گزری ہوں اس کا اندازہ ایک مورخ کی حیثیت سے تم خود لگا سکتے ہو۔“

”میں سمجھتا ہوں کوروتی۔“ میں نے پرمسرت لہجے میں کہا اور پھر مسکرا کر بولا۔

”تو کیا تم میری مہمان رہنا پسند کرو گی؟“

”پسند کرو گی میں پسند کر چکی ہوں۔“

”اور اسی شکل اور اسی حیثیت میں؟“ میں نے سوال کیا اور وہ میرا مطلب سمجھ کر مسکرا دی، پھر اس نے بڑے محبوبانہ انداز میں کہا۔

”ہاں.....!“

میں ہنس پڑا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کوروتی ہے۔ صدیوں پرانا ایک وجود جس نے مجھے جو کہانی سنائی ہے اسی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جو واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ انہیں جھٹلانا ایک مشکل کام تھا۔

خیر وہ میرے سامنے موجود تھی، بے شک ایک بے مثال وجود کتنی تھی۔ لیکن یہ اندازہ مجھے تھا کہ وہ لاکھوں برس کی بات ہے۔ بات یہی ہے کہ انسان بھلا دینے کا ماہر۔ اپنی پسند کی چیز کو وہ کسی بھی شکل میں قبول کر سکتا ہے۔ سو کوروتی میری مہمان تھی اور اس رات ہم لوگ بہت دور تک یہ سوچتے رہے کہ ہمیں کہاں سے آغاز کرنا چاہئے، اس نے میری مدد کی اور بولی۔

”کوئی تعین تو نہیں کیا جاسکتا، جدھر دل چاہے نکل چلو۔“

خیر وہ رات گزرنے کے بعد کوروتی سے میری قربت اور زیادہ ہو گئی تھی۔ البتہ کوروتی کے ذہن میں کچھ ہونہ ہو لیکن گوتم بھنساں میرے ذہن میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا غصہ اور شدید ہو گیا ہوگا، لیکن مجھے اب اس کی پروا نہیں تھی۔ بات وہی ہے کہ زندگی کے چند لمحات اگر دلکش گزر جائیں اور انسان ان سے سیراب ہو جائے تو پھر باقی زندگی کی فکر بے مقصد ہے۔

کوروتی اب میرے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ اس نے کبھی اپنی کوشی کی جانب جانے کا رخ نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کے پاس کار موجود تھی اور وہ کار آسانی سے ڈرائیو کر سکتی تھی جبکہ میرے پاس کار تو تھی لیکن ایسی نہیں کہ میں اسے کسی لمبے سفر کیلئے استعمال کروں۔ البتہ ہم نے تمام سفری انتظامات کئے اور اس کے بعد آوارہ گردوں کی مانند چل پڑے۔

ایک حسین وجود ساتھ ہو، پراسرار قوتیں ہمراہ ہوں، ہر قسم کے خوف سے دور ہو، رنگین موسم کا لطف ہو تو آپ خود سوچ لیجئے کہ پھر ایک تنہا انسان کیلئے اور کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ کوئی منزل نہیں تھی، کوئی نشان نہیں تھا۔ کوروتی خود بھی خوش ذوق تھی اور اس نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کی عمر اتنی طویل ہے کہ مجھ جیسے ہزار آدمی بھی اس کا ساتھ دیں تو وہ خود دنیا سے چلے جائیں گے، لیکن وہ امرت چل پڑے ہوئے تھی، اسے اپنی زندگی کی فکر نہیں تھی۔ البتہ دوران سفر ہم نے ہمیشہ گوتم بھنساں کا خیال رکھا تھا اس نے یہ بھی مجھ سے کہا تھا کہ چونکہ ہم نے کسی منزل کا تعین نہیں کیا ہے اس لئے وقت ہمیں جہاں لے جائے اس کی کوئی فکر نہیں ہے اور ہم وقت کے سہارے سفر کرتے رہے۔ راستے میں ہم مختلف قسم کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔ جن میں موضوع دروہی، بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے بارے میں وہ اکثر پوچھتی رہتی تھی اور کبھی رہتی تھی کہ ایسا کوئی درویش ملے جو اسے بتا سکے کہ وقت کیسا گزر رہا ہے اور آخر کار ایک دور دراز کے علاقے میں ہماری ملاقات ایسے ایک شخص سے ہوئی۔ بڑا دلچسپ سا آدمی تھا۔ خاصی عمر کا ایک کٹیا بنا کر اس میں رہ رہا تھا۔ ہم نے ایک چوڑی سڑک سے گزرتے ہوئے بہت دور اس کٹیا کو دیکھا تھا اور کوروتی نے ایک دم سے مجھے کار روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”عالی! ذرا اس جگہ دیکھو وہ کیا ہے؟“

میں نے اس طرف نگاہیں دوڑائیں تو وہ کٹیا مجھے نظر آئی، چھوٹے چھوٹے پہاڑی پتھروں سے چن کر ایک جھونپڑی بنائی گئی تھی۔ اس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ وہاں تک جانے کیلئے ایک پگڈنڈی صاف نظر آرہی تھی۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی، البتہ خود رو درخت کافی اگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ایک چھوٹے سے قلعے میں شاید کھیتی کی گئی اور ترکاریاں اگائی گئی تھیں۔ ہم لوگ اس طرف چل پڑے۔

جیسے جیسے ہم قریب پہنچتے جا رہے تھے۔ کٹیا کی بناوٹ نمایاں ہوتی جا رہی تھی، اس کے آگے ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس میں دو تین بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچ گئے، ہم نے ایک شخص کو ایک چار پائی پر بیٹھے ہوئے دیکھا جو حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ شدید حیران ہوا اور دریائی گھوڑے کی طرح آنکھیں چہرے سے باہر نکال کر ہمیں نکلنے لگا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے ہمیں دیکھ کر کہا۔

”رب تیری حیاتی کرے..... کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“

”بابائی حیران ہونے کی ضرورت نہیں، ہم سیاح ہیں اور آوارہ گرد ہیں، بس اپنا وطن دیکھنے نکلے ہیں اور اس طرح گھومتے ہوئے آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ اگر آپ چاہو تو ہمیں ایک دودن اپنا مہمان رکھ لو۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں پتر، مہمان تو اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ آجا میرے پاس بیٹھ جا۔ میرے پاس دو تین چار پائیاں اور ہیں، تم لوگوں کے کام آجائیں گی۔“ بابا نے کہا اور ہم خوش ہو گئے کوروتی تو بہت ہی زیادہ خوش تھی۔

ہم نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک خاموش سادہ یا بہہ رہا ہے، اس کے بائیں سمت ایک قبرستان تھا جس میں ٹوٹی چھوٹی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک تھوڑا سا گہرا کھڈ نظر آ رہا تھا۔ شاید کسی وقت یہ نالے کی گزر گاہ ہوگا۔ کھڈ کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا مٹی کا قدرتی ٹیلا ابھرا ہوا تھا۔ تین اطراف سے ڈھلوان تھا اور ایک جانب سے عمودی۔ بہر حال ہم بابا کی جھونپڑی میں ٹھہر کر تھوڑا وقت گزارتے رہے اور اس کے بعد بابا کی دی ہوئی تھوڑی سی کھانے

پینے کی چیزیں لے کر ہم قرب و جوار میں نکل آئے۔ کوروتی چونکہ ایک نوجوان حسینہ بنی ہوئی تھی اس کے سارے انداز بالکل ویسے ہی تھے۔ چنانچہ ہم بندروں کی طرح پھلاکتے ہوئے کھڈ کر اس کر کے ٹیلے پر چڑھ آئے۔ یہاں سے بہت دور کافی فاصلے پر کسی گاؤں کی چھوٹی سی آبادی نظر آرہی تھی۔ ٹیلے کے تین اطراف میں بھی کھیت ہی کھیت تھے، لیکن ایسے

جیسے کئی موسموں سے یہاں کھیتی باڑی نہ کی گئی ہو جبکہ ذرا پرے دوسرے کھیتوں میں موسم کی فصل کھڑی تھی جو گاؤں سے قریب تھی۔

کوروتی ایک ایک چیز کو دلکش لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے یہ ماحول بے حد پسند آیا ہو۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر وہ بولی۔

”عالی! میری بات سنو ذرا یہ بتاؤ کہ یہ ٹیلا اور اس کے ارد گرد یہ کھیت وغیرہ اس قدر ویران کیوں ہیں جبکہ ذرا پرے سب کھیتوں میں فصلیں کھڑی ہوئی ہیں؟“

”ہاں! ہے تو سب کچھ عجیب۔“

”میں اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“

”اس کے بارے میں بوڑھا بابا ہی ہمیں سب کچھ بتا سکتا ہے۔“

”ایک بات کہوں تم سے مجھے وہ بوڑھا بابا بھی بے حد پراسرار لگا ہے۔ اس میں کوئی خاص بات ہے جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن سمجھ میں آنی چاہئے ویسے وہ باتیں بڑی دانشمندی کی کرتا ہے اور اس کی باتوں میں ایک عجیب سی کیفیت جھلکتی ہے۔“

”ہم نے اس سے اس کا نام تک نہیں پوچھا۔“

”ارے ہاں واقعی اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“

قرب و جوار کے خاصے اطراف گھوم کر اور خاصی سیر وساحت کرنے کے بعد ہم بابا کی جھونپڑی پر واپس پہنچ گئے۔ بابا ایک چارپائی پر ایک درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جب ہم اس کے قریب پہنچے تو اس نے کہا۔

”کہاں کہاں ہو آئے پچھ..... کہاں کہاں ہو آئے۔“

”بس بابا آپ کی یہ جنت تو بہت خوبصورت ہے۔“

”جنت..... سورگ..... سورگ..... کہنا چاہتے ہونا اسے۔“

”ہاں بابا! سورگ۔“

”نہیں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی جگہ نرک ہے اور کون سی جگہ سورگ۔“

”بابا آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا تو بوڑھا مسکرا دیا۔

”بڑی دیر کے بعد خیال آیا میرے نام کے پوچھنے کا۔ میرا نام جگجیت ہے لیکن سنسار میں مجھ سے زیادہ ہارا ہوا منش جیتا نہ ہوگا۔“

”بڑی عجیب بات کہی آپ نے۔“

”ہاں! تم عجیب کہہ سکتے ہو۔“ بوڑھا جگجیت بولا۔

ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص ہندو ہو سکتا ہے۔ یہ نام ہندوؤں ہی کا سا تھا۔ تاہم یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اطراف میں ہندو مسلمان سب ہی رہا کرتے تھے۔ طویل عرصے پہلے تو اس کی کوئی تخصیص ہی نہیں تھی۔ ہم لوگ چارپائی پر جگجیت کے پاس بیٹھ گئے، میں نے اس سے کہا۔

”میری یہ دوست سوال کر رہی تھی کہ یہ ٹیلا اور اس کے ارد گرد کے یہ کھیت اس طرح ویران سے کیوں ہیں جبکہ یہاں سے کچھ فاصلے پر کھیتوں میں فصلیں کھڑی ہوئی ہیں۔“

جگجیت کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر آہستہ سے بولا۔

”یہ ٹیلا اور اس کے آس پاس کے سارے کھیت ہماری ملکیت ہیں۔ بہت پرانی بات ہے کہ یہاں بھی معمول کے مطابق کھیتی باڑی ہوتی تھی پھر بھگوان کا کرتا یوں ہوا کہ بنجاروں کا ایک قبیلہ یہاں آکر ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ زمین ہماری ملکیت تھی بنجاروں کے سردار نے میرے دادا سے پراعتنا کی کہ انہیں سردیوں کا یہ موسم یہاں بسر کرنے کی اجازت دے دیں۔ میرے دادا نے انہیں منع نہ کیا تو وہ بڑے دل والے تھے۔ ان بنجاروں کے خاندان میں عورتیں زیادہ اور مرد کم تھے۔ یہاں پر پڑاؤ کے بعد اپنا سلسلہ جاری کر دیا جو بنجاروں کا کام ہوتا ہے مرد جھوپڑوں میں نشہ پانی کرتے یا پھر سوئے پڑے رہتے اور عورتیں ارد گرد کے گاؤں میں چھوٹے موٹے کاشتکاری، محنت کے کام یا پھر بھیک مانگتی پھرتیں۔

انہی عورتوں میں گہتی بھی تھی، گہتی ٹمن گہتا اس کا نام تھا۔ گہتی کے نام سے مشہور تھی۔ یہ گہتی بنجاروں کے اس قبیلے کے سردار کی اکیلی بیٹی تھی اور جیسی تھی بس اس کی کہانی زبان سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ دراز قامت، بھنگ کے نشے جیسی فضا میں جمونکے سے مارتی جوانی، وحشی ہرٹوں جیسی نینوں میں ایسی چمک جیسے کسی نے سچے موتی کوٹ کر بھر دیئے ہوں، ناک جیسے کنار کی دھار اور ابرو خنجر کی مانند بال انتہائی لمبے جو ٹخنوں کو چومتے ہوئے تھے۔ موتی کی کلیوں کو شرمندہ کرتے ہوئے سفید دانت، سراپا ایسا دلکش اور من موہنا کہ جیسے کسی نیم دیوانے بت تراش نے کسی لہک میں آکر چندن کاٹ سے اپنی تصوراتی محبوبہ کو تخلیق کیا ہو۔ اس کی گہری لمب رگت میں ایسا جادو تھا کہ جو کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا وہ دنیا بھر کے کھلے صاف اور گورے رنگ والوں پر تین حروف بھیج کر اسی کے نام کی مالا چننے لگے۔ ایک عجیب سا پراسرار رکھ رکھاؤ اور ایک پردہ قاری محنت تھی اس کی ہر حرکت میں، بس میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ کیا تھی۔“

ہم دونوں بوڑھے جگجیت کی ان باتوں پر سحر زدہ سے رہ گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہر حال میں نے کہا۔

”آپ نے عجیب نقشہ کھینچا ہے بابا بس میں بتا نہیں سکتا کہ ہمارے ذہن میں کیا آ گیا ہے۔“

”تم نے ایک جگہ نہیں دیکھی ہوگی۔“

”کون سی جگہ؟“

”رات کو کس سے تمہیں نیند آ جاتی ہے۔“

”کیوں بابا؟“

”میں تمہیں اس سے کچھ دکھانا چاہتا ہوں جب چاند نکلے گا اور یہ تو شروع کی راتیں ہیں۔ چاند جب ایک خاص جگہ پہنچ جاتا ہے تو جو نظر آتا ہے وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”بابا! ہم اس وقت تک جاگتے رہیں گے جب تک آپ یہ نہ کہیں کہ آپ ہمیں وہ دکھا رہے ہیں جو دکھانا چاہتے ہیں۔“

بوڑھا جگجیت خاموش ہو گیا۔ ہم بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس نے ہمیں اپنی جھونپڑی میں سونے کی پیشکش کر دی تھی شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں کیونکہ ہم اسی طرح اس کے سامنے آئے تھے لیکن ہمارے پاس نہیں کیوں کوروتی اس ماحول سے بہت متاثر تھی۔ ہم نے جھونپڑی میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ درخت کے نیچے چارپائی ڈال لی تھی اور وہیں پر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

بوڑھا اپنی چارپائی پر سو گیا تھا۔ اس کے خزانے کو بج رہے تھے کوروتی نے کہا۔

”بابا جگجیت نے ہمیں توجہ دیا ہے اور خود کسی مزے کی نیند سو رہا ہے۔ کیا یہ اس وقت جاگ جائے گا جب چاند

آسمان کے بیچ پہنچے گا۔“  
 ”اب ہم تو جاگ ہی رہے ہیں۔ اگر یہ بابا جیجیت نہ جا کا تو ہم اسے چکا دیں گے اور اس سے پوچھیں گے کہ وہ ہمیں کیا دکھانا چاہتا ہے۔“  
 کوروتی خاموش ہو گئی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور میں اس کے چہرے پر عجیب سے سائے رقصاں دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے کہے بغیر نہ رہ سکا۔  
 ”بوڑھے جیجیت نے جس طرح گہتی کے نقوش کا نقشہ کھینچا ہے اس نے ایک سحر سا قائم کر دیا ہے۔“  
 ”میں خود اسی احساس کا شکار ہوں کہ وہ لڑکی کتنی حسین ہوگی۔“ کافی دیر تک خاموشی رہی کوروتی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔



”میں نے بہت کچھ دیکھا ہے اس سناں میں۔ بڑا عجیب اور حسین ماحول لیکن اس سے نبھانے میں کیسا محسوس کر رہی ہوں۔ بڑا عجیب لگ رہا ہے مجھے بہت ہی عجیب۔“ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔  
 ”ہاں واقعی بڑا سحر انگیز ماحول ہے۔ میں تمہیں بتاؤں کوروتی تم تو خیر بہت سی صدیاں گزرا چکی ہوں تمہاری زندگی میں تو نبھانے کیسے کیسے مناظر آئے ہوں گے۔ میں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اپنی زندگی میں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ذہنی اختراع زیادہ ہوتی ہے۔ انسانی ذہن جہاں تک پہنچ سکتا ہے اگر الفاظ سے رشتہ ہو تو ایک ادیب اپنے مناظر میں پڑھنے والے کو نبھانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے جبکہ وہ منظر وہ ماحول صرف اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ وہاں سے گزرا نہیں ہوتا لیکن اس کی سچی لگن اور سچے الفاظ ان مناظر کو حقیقی بنا دیتے ہیں۔“  
 کوروتی میرے الفاظ سے بہت متاثر تھی۔ اس نے کہا۔  
 ”بڑا سحر انگیز ماحول ہے۔ وہ دیکھو..... چاند اپنی بلندی پر پہنچ رہا ہے۔“  
 میں اور کوروتی چاند کے آسمان تک پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ بوڑھا جیجیت خود ہی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا تو ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف چل پڑے۔  
 ”تم لوگ جاگ رہے ہو۔“  
 ”ہاں بابا! آپ نے ہمیں ایسی جگہ پہنچا دیا ہے کہ نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی ہے۔“  
 ”آؤ میرے ساتھ۔“ بوڑھے نے کہا اور ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔  
 چاند آسمان کے بیچوں بیچ جا کر تک گیا تھا۔ روشنی کا حسین منظر ناقابل فراموش تھا۔ میرے ساتھ صدیوں پرانی ایک انوکھی روح سفر کر رہی تھی اور ایسی روح جسے روح بھی نہیں کہا جاسکتا تھا اور لازمی طور پر ایک طویل عمر کے زندہ وجود کو تسلیم کیا جاسکتا تھا۔  
 ہم آگے بڑھتے رہے اور اس کے بعد اس ٹیلے پر پہنچ گئے۔ ٹیلے سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور ٹیلا سا بنا ہوا تھا اور اس ٹیلے پر ایک ابھری ہوئی سی جگہ نظر آ رہی تھی لیکن جو کچھ ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ ناقابل فراموش تھا۔ چاند کی روشنی اس جگہ کو نمایاں کر رہی تھی جہاں دو انسانی وجود اس ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں اور کوروتی دنگ رہ گئے اور بڑی عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گئے۔  
 ”یہ دونوں کون ہیں بابا؟“

”دو محبت کرنے والے دو پریم روگی جن کی کہانی میں تمہیں سنا رہا تھا اور چاند کی ان تاریخوں میں جب چند رماں جوانی پر ہوتا ہے یہ دونوں یہاں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور چاندنی میں ایک دوسرے سے راز و نیاز کرتے ہیں۔ میں تمہیں دشمن گہتی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے دادا سے اجازت ملے ہی یہ بنجارے ٹیلے کے آس پاس رہنا شروع کر چکے

نہ تو ماں زندہ تھی تا کوئی بھائی بہن جو اس کے بوڑھے باپ کو سہارا دیتے۔ روئے تو اس کی آنکھیں پونچھتے اور اس کی ڈھارس بندھاتے۔

بچی کا پھولوں جیسا بوجھ ہوتا ہے۔ پھر اس کا باپ بھی بوڑھا تھا۔ اس کی مرنے والی بیوی بھی بہت خوب صورت اور طرح دار تھی لیکن بچی کو جنم دیتے ہی وہ مر گئی تھی۔ ایک خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ بچی کو اوپر کے دودھ پر ڈال دیا گیا۔ دودھ کا اثر تھا یا جنم کا کوئی پھیر کہ کچھ عرصے کے بعد بچی کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہونے لگے۔ ان میں عجیب سے تل آگئے تھے۔

”لگتا ہے کوئی ہوا اس کو لگ گئی ہے۔ بھگوان بھلا کرے۔ عمر بڑھے گی تو ہو سکتا ہے کچھ فائدہ ہو جائے۔“

لیکن اس حسین ترین بچی کی یہ کیفیت دیکھ کر باپ کے دل پر جو کچھ بچی تھی وہ وہی جانتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بڑی ہونے لگی۔ تین یا چار سال گزر گئے لیکن ٹخن کے ہاتھ پاؤں اسی طرح ٹیڑھے کے ٹیڑھے رہے۔ ایسی بیماری بچی اور اس کی یہ حالت جو دیکھتا دکھ کا شکار ہو جاتا۔ یہ نامراد بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جو اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا کیا جاتا تھا۔ طرح طرح کے تیل جسم پر استعمال کئے جاتے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا رہا تھا۔ پھر بہت عرصہ بعد یہ بخارے کسی مسلمان بزرگ کے مزار پر گئے۔ رنگ و نسل..... مذہب و ملت سے دور بوڑھا باپ اسے سلام کرانے کے لئے بزرگ کے مزار پر گیا اور ان کے قدموں میں جا گرا۔ مزار سے تھوڑے فاصلے پر دریا۔ کہ کنارے خانہ بدوشوں کا ایک اور قبیلہ ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ یہیں اس کی ملاقات ایک عمر رسیدہ بزرگ سے ہوئی اور باپ نے بچی کو اس عمر رسیدہ بزرگ کی گود میں چھینک دیا اور بابا کے پاؤں پکڑ کر رو کر بولا۔

”بابا..... اس بچی کو دیکھو اس کی شکل و صورت کو دیکھو اور اس کے ہاتھ پاؤں کو دیکھو۔ میری اکلوتی بن ماں کی بچی میرا اس کے سوا سنسار میں اور کوئی نہیں ہے۔ یہ میری مرنے والی بیوی کی نشانی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں دیکھو۔ پیدا ہوئی تھی تو ٹھیک تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہونے لگے۔ بڑے جتن کئے لیکن کچھ بھی نہ حاصل ہو سکا۔ بابا میں اسے اس ارادے سے یہاں لایا ہوں کہ یا تو اس پاک مزار پر اسے صحت دلوادوں ورنہ پھر بزرگ سے کہیں کہ اسے موت دے دیں۔ میں اسے کہاں پار لگاؤں گا۔ اگر یہ ٹھیک نہ ہوئی تو میں اسے اسی دریا میں دھکیل دوں گا۔ بس اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ قبیلے بھر میں سب سے خوب صورت ہے مگر دیکھو کیا کر رہی ہے۔ یہ اب سمجھدار ہو گئی ہے۔ اپنی اپنا ج زندگی سے اکتائی ہوئی لگتی ہے۔ منہ سے کسی سے کچھ نہیں کہتی لیکن روتی رہتی ہے۔“

بزرگ آنکھیں بند کئے خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور جب بوڑھا باپ خاموش ہو گیا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ مسکراتے ہوئے ایک نظر بچی پر ڈالی اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ہاتھ سر پر رکھ کر انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور کہیں گم ہو گئے۔ ان کا ہاتھ بچی کے سر پر ہی رہا تھا اور وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ بچی بھی پتھر کی سل بنی رہی تھی اور کافی دیر کے بعد بزرگ نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے اس کے سر سے ہاتھ ہٹایا اور پھر بھوڑے بخارے سے بولے۔

”انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوتا ہے۔ جہاں تکلیفیں مرض بیماریاں آتی ہیں وہیں ان کے لئے شفا بھی اتاری گئی ہے لیکن کچھ بیماریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہی بیماریوں میں سے ایک بیماری یہ بھی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ پیدائش کے وقت اتاری دانیوں سے کچھ بھول چوک ہو جاتی ہے۔“

”لیکن بابا پیدائش کے وقت اور اس کے بعد بھی یہ بالکل ٹھیک تھی۔“ بخارہ کسی خوفناک سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”بابا صاحب اس کی بیماری کا کوئی علاج بھی ہے؟“

تھے۔ مگر گھر گھومنے والے بخارے فقیروں پر بندوں ہواؤں بادلوں کی طرح کہیں جم کر نہیں نکلتے۔ ان کے مزاج، لہجے جذبے ارادے خوبصورتیاں چاہتیں اور دشمنیاں بھی موسموں، رتوں، سمتوں، منظروں، جگہوں اور ضرورتوں کی سانسی ہوتی ہیں۔ بس ان کو رزق چاہئے اور رزق کی خاطر یہ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ غیرت، اخلاق، مذہب، حلال، جائز وغیرہ یہ کسی کے معنی اور مطلب نہیں جانتے۔ اکثر مرد بد شکل اور سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں اور لڑکیاں رنگی مٹھی اور حسین نقوش کی مالک ہوتی ہیں۔ ان کی اکثریت کے پاس انتہائی مہلک قسم کے ہتھیار ہوتے ہیں اور ان ہی کی بنا پر یہ ہر جگہ قیام کر لیتے ہیں۔ یہ خانہ بدوش ہوتے ہیں اور اپنی فطرت اور ضرورت کے مطابق میلہ کما کر کسی نئی جگہ کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ قیام کے دوران اگر کوئی مر جائے تو یہ بغیر کسی شور شرابے یا رونے پینے کے خاموشی سے مردے کو کسی بے آباد جگہ یا جھونپڑی جہاں ان کا قیام ہوتا ہے گڑھا کھود کر گاڑ دیتے ہیں۔ نہ کہیں اطلاع نہ اندراج۔ اسی طرح کسی بچے کی پیدائش بھی ان کے ہاں ایسے ہی ہوتی ہے۔ ان کی عورتوں میں زچگی کی حالت میں آرام اور احتیاط برتنے کا کوئی تصور نہیں اور تا ہی کسی خاص اہتمام کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ آخری دنوں کا حمل اٹھائے ہوئے بھی محنت و مشقت سے بھیک مانگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مستانہ آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر دنداسہ ناک میں دونوں طرف سونے اور چاندی کی لوٹکیں بڑے ناز و ادا سے پھیلے پھیلے بھیک مانگتی رہتی ہیں۔ ان کے مانگنے کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں بلکہ آپ کو اپنے حسن کی بھیک دے رہی ہوں۔ ویسے ٹولیاں بنا کر چلتی ہیں تاکہ کہیں کوئی ان کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

تو میں بات کر رہا تھا شن گپتی کی کہ وہ بھی دوسری عورتوں اور لڑکیوں کی طرح بھیک مانگنا یا خیرے دکھا کر لوٹ مار کرنا پسند نہیں کرتی تھی چونکہ بخاروں کے قبیلے کی سردار تھی۔ ہاں وہ کبھی کبھی دوسری لڑکیوں کے اصرار پر قرب و جوار میں ضرور نکل جاتی۔ اس کی ساتھی لڑکیاں تو گانا بھانا بھی کر لیتی تھیں۔ مگر یہ جگہ جگہ کڑوی بجا کر ماسیے بٹے سنانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ البتہ یہ اس کی برکت تھی یا اس کے حسن کی برکت کہ جب بھی دن ڈھلے وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ ڈیرے پر واپس لوٹی تو ان کے پلوں چادریں اجناس اور دوسرے کھانے پینے کی اشیاء سے بھری ہوتی تھیں۔ جھوٹی موٹی رقیں بھی پلوں کی گانڈھ میں بندھی ہوتی تھیں اور یہ سب اس وقت ہوتا جب شن گپتی ان کے ساتھ جاتی تھی۔

جب وہ واپس پلٹتی جب بھی خالص مدھ بھری معصومی، بھینی بھینی خوشبوداری ٹخن ہوتی۔ اس کا باپ اسے دیکھ کر جیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شن ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ آتی ہے۔ بھیک تو وہ مانگے جو بھکاری ہو یا جس کا ڈہن مانگنے والوں کا ڈہن ہو۔ اس کی سوچ اور خیالات بھکاریوں جیسے ہوں۔ اس کا انگ انگ بھکاریوں سا ہو۔ اس کے پیٹ میں بھوک اور طبیعت میں ہوس ہو۔ جو حسن و جمال سے سرشار ہو اس کا ان خیالوں سے کیا واسطہ۔ چنانچہ بوڑھا باپ جب بھی وہ واپس آتی اس کی پیشانی کو آگے بڑھ کر چوم لیتا اور پھر سوچ کی کوئی لہر اس کے جھریوں بھرے چہرے کو اور جھریوں میں لپیٹ دیتی۔ کہاں سے لاؤں گا میں اس کے لئے بر۔ اس ہیرے کو کہاں چھپا کر رکھوں گا۔ وہ تو سات پردوں سے نکل کر بھی اپنی شناخت کرا سکتی ہے لیکن اس شہزادی کے لیے شہزادہ کہاں سے آئے گا۔

اس کے اپنے قبیلے میں تو کہیں دور دور تک اس کی جوتیوں کو بھی چومنے کے کوئی قابل نہیں تھا۔ انجانے خدشے خیالات اس کو دھلا کر رکھ دیتے اور وہ بازو بڑھا کر اپنی تخت جگر کو اپنی گود میں بھر لیتا جیسے وہ اسے اپنی حفاظت میں لے کر دنیا سے چھپا لینا چاہتا ہو۔

یہ تو وہ چنگاری ہے جسے بھوسے بھرے گھر میں زیادہ دیر رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اس چنگاری کے متعلق سوچ بچار کر کے اگر عملی جامہ نہ پہنایا جائے تو پھر ذرا سی کوتاہی اور غفلت سے پورے گھر گھرانے کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ شن گپتی کی

”ہاں! بیٹا ہر وہ مشکل بیماری جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہو۔ ایسی بیماری کا بھی ایک حتمی علاج ہوتا ہے لیکن وہ علاج بڑی سکت اور تپسیا مانگتا ہے۔ ہیمنٹ چاہتا ہے وہ۔“

”میں اپنی بیٹی کے جیون کے لئے اپنی جان تک ملی کر سکتا ہوں بابا۔“ بوڑھے نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

”نہیں اپنی جان کی ملی دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ ملی بھی اسی بیٹی کو دینی پڑے گی۔“

بوڑھے باپ نے حیرانی سے بزرگ کو دیکھا تو بزرگ کہنے لگے۔

”میں سمجھتا ہوں تجھے۔ دیکھو یا تو اس کو یونہی رہنے دو یہ مکمل ہے۔ اس کی شادی بھی کر سکتے ہو۔ گھر ہال بچے یہ سب کچھ ہوگا اور یہ بالکل نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے پیدا ہونے والے بچے بھی اسی طرح کے ہوں گے۔ یہ تو پیدا کرنے والے کی اچھا ہوتی ہے۔ کیا سمجھے؟“

”لیکن بابا! آپ سمجھ نہیں رہے۔ جس ناری کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے ہوں اس سے کون مورکھ بیاہ کرے گا۔ یہ صرف عورت ہی تو نہیں ہے ماں بھی ہوگی، گھر کی بہو بھی ہوگی، گھر کے کام کاج بھی ہوں گے۔ ہم بنجارے جس طرح جیون بتاتے ہیں آپ کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے ہمارا تو کام ہی بدر پھرنا، بھیک مانگنا اور جیون بتانا ہوتا ہے۔ اسے کون قبول کرے گا صرف صورت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو..... ٹھیک کہتے ہو لیکن ایک علاج بھی ہے اس کا اگر اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ امید کی ایک کرن بوڑھے باپ کے دل و دماغ پر چمکی اور اس نے آگے بڑھ کر بزرگ کے پاؤں پکڑ لئے۔

”کیا بابا! وہ کون سا علاج ہے؟“

”اگر اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہو جائیں تو پھر یہ شادی نہیں کر سکے گی۔ اس کی شادی نہ کرنا بہتر ہوگا کیونکہ جو مرد اس کے جیون میں آئے گا وہ جیتا نہ رہے گا اور مر جائے گا۔“

”کیا؟“ بوڑھا باپ حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں وہ پھر جیتا نہ رہ سکے گا۔ دیکھ لو اور سوچ لو یا تو اس کا علاج کر کے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دو یا پھر اسے اسی طرح رہنے دو۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”بابا! کوئی بھی باپ اپنی بیٹی سے اس کی عورت جھیننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ دنیا میں لاکھوں عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے پتی نہیں ہوتے۔ مرنے جاتے ہیں یا وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں لیکن انہیں یہ احساس ہی سکون دیتا ہے کہ وہ مکمل عورت ہیں اور ایک ایسی چیز جو بھلے اندر سے عورت ہی ہو مگر اپنا جی جھجھی جائے اور اس کا مرد اس کے ساتھ جیتا نہ رہ سکے تو یہ تو ہیں تو ایک عورت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے لئے تمام عمر کا دکھ ہوگا۔ بابا اگر اس کا کوئی علاج ہے تو بھگوان کے لئے مجھے بتا دو۔ کیسی لگتی ہے یہ۔ اس کا ہاتھ دیکھو اس کی آنکھیں دیکھو اس کے ہونٹ، دانت اس کا بھول پن، مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کتنا عجیب لگتا ہے۔ اسے پیالہ تھا کر لبا سبز جھولا پہنا کر بازار لے جائیں تو لوگ اسے خیرات کے خزانے بھر دیں گے لیکن..... لیکن بابا اس کا عورت پن ختم ہو جائے گا۔ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں، مجھ سے کوئی میری سرداری لے لے سب کچھ جھین لے پر میری بیٹی کے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہو جائیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جو میں تجھے بتاؤں گا اسے تو اپنے من میں رکھے گا۔ اگر تو نے میری ان بتائی ہوئی باتوں کو کسی اور کو بتا دیا تو سمجھ لے کہ جو کچھ ہوگا تو سوچ بھی نہیں سکے گا۔ تیرا سارا قبیلہ پانچ ہو جائے گا۔“

”میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا بابا جی! آپ مجھے بتائیے۔“

اور بوڑھا بابا اسے آہستہ آہستہ سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن جب ساری تفصیل اس کے علم میں آئی تو اس کی

آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ایسا جو کم والا کام پر کیا کیا جائے۔ اولاد تو بڑے بڑے امتحانوں سے گزار دیتی ہے۔ اس کے لئے مانتا پتا کو بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے بابا! میں یہ سب کچھ کروں گا.....“

”تو جیہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور سنسار اس کے نام کی مالا جپے گا۔“

بہر حال بوڑھا باپ واپس آ گیا اور اس کے بعد اس نے اس جگہ سے اپنی ڈیرے اٹھا دیئے جہاں وہ مقیم تھا۔ بزرگ کی ہدایت پر وہ سارے کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کو لے کر ایک دور دراز علاقے میں جا نکلا جو کتنا پھٹا ہے آب و گیاہ تھا۔ وہاں اس نے اپنی چھوٹا دریاں نصب کر دیں۔

ادھر شمن گہتی اب بیٹی نہ رہی تھی جو اپنے بھلے برے باپ کی پریشانی اور اس کے جذبات کو سمجھ پاتی۔ وہ سب کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔ اس نے وہ منگتو بھی سنی تھی جو اس بزرگ اور اس کے بوڑھے باپ کے درمیان ہوئی تھی۔ بابا نے اسے جیون کا ایک نیا سندیس دیا تھا۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس بات سے بھی آگاہ ہو چکی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھیک ہونے کے بعد بیاہ کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو سکے گا اور وہ جس مرد کو چاہتی یا عورت کی حیثیت سے چھوئے گی وہ مر جائے گا۔

آنے والے چند دن اس کے پتانے بہت مصروف گزارے اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ بنجارہ تھا۔ میدانوں، جنگلوں، پہاڑوں اور ان میں رہنے والے حشرات الارض کے بارے میں خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے ساتھی بنجاروں نے کئی بار بڑے بڑے سانپ پکڑے انہیں مارا اور انہیں بیچا تھا اور اب اسے ایک ایسے ناگ کی ضرورت تھی جس کے بدن پر کوئی بھی دھبہ نہ ہو۔ سر سے پاؤں تک کالا سیاہ دانتوں کے بغیر زندہ یا مردہ چاہئے تھا اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ خود بھی سانپ پکڑنا جانتا تھا۔ جیون میں بہت سے سانپ پکڑے تھے۔ ایک بار تو اسے شیش ناگ ملے ملتے رہ گیا تھا اور اسے برسوں حسرت رہی تھی کہ کاش شیش ناگ اسے حاصل ہو جاتا اور وہ اس کا منکا لے لیتا۔

خیر وہ اپنی کوشش میں سرگرداں رہا اور آخر کار اسے ایک ایسا ناگ مل گیا جو اس کی ضرورت کے لئے پورا تھا۔ اس نے ناگ کو جان جو کھوں میں ڈال کر پکڑ لیا اور اسے ٹوکرے میں بند کر دیا۔ اب اسے کالی سرسوں کے بیج اور دیگر ضروری چیزوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ یہ تمام چیزیں لے آیا اور دوسرے دن صبح وہ اپنے جمونپڑے کے پھوڑے ایک جگہ منتخب کر کے کھربلی سے زمین کھودنے لگا۔ جب حسب شفا زمین کھد چکی تو اس نے بابا کی ہدایت کے مطابق بغیر دانتوں کے کالے ناگ کو ٹوکرے سے باہر نکالا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے جڑے دبا کر منہ کھولا، بائیں ہاتھ سے وہ بوٹی نکالی جسے تلاش کرنے میں بھی اسے کافی مشکل پیش آئی تھی لیکن بنجارے جڑی بوٹیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی حکیموں اور ویدوں کے ہاتھ یہ جڑی بوٹیاں منگے دامنوں فروخت کر دیتے ہیں۔ کاسنی بوٹی اسے آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی لیکن مل گئی تھی۔ جب اس نے کاسنی بوٹی ایک چنگی سے دبا کر اس کے قطرے ناگ کے حلق میں اتارے اور اسے دوبارہ ٹوکرے میں بند کر دیا۔ دو چار منٹ کے بعد اس نے ٹوکرے کو کھول کر دیکھی تو وہ خوفناک کالا ناگ جو کوئی چار ہاتھ لبا تھا سر چکا تھا۔ کاسنی بوٹی سانپ کے زہر سے بھی زیادہ خوفناک تھی جس کو یہ کالا ناگ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور حیرانی کی بات تھی کہ اس نے انسان کے اس ازلی خوفناک دشمن کو دو چار منٹوں میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بہر حال بابا کی ہدایت کے مطابق بوڑھے بنجارے نے کوئی ڈیڑھ باشت بھر زمین کھودی اور اندر مردہ سانپ چلیبی کی شکل میں پھیلا کر رکھ دیا۔ اوپر ہرل کے دانے چھڑک کر گردن تک مٹی سے بھر دیا اور کالی سرسوں کے بیج بکھیرے اور ایک بار پھر حقے کا بدبودار پانی اس پر ڈالا اور اوپر بڑا ٹوکرہ رکھتے ہوئے شمن گہتی کو بلا یا اور بولا۔

”دیکھو بیٹا یہ سب میں تیرے لئے کر رہا ہوں۔ تجھ سے زیادہ بھروسہ میں کسی پر نہیں کر سکتا۔ حالانکہ میں بنجاروں کا



سردار ہوں اور یہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں لیکن چونکہ بابا صاحب نے یہ کام میرے اور تیرے لئے کیا ہے اس لئے تو خود ہی سب کچھ کرے گی میں تجھے بتا رہا ہوں کہ یہ تیرے جیون کے لئے بہت بڑا کام ہو رہا ہے۔ اب تو اس جگہ پر ہر وقت نظر رکھو..... کوئی بھی یہ رکھا ہوا نوکرا نہ اٹھائے۔ نہ کوئی جناور ادھر آئے۔ تیس دن جب پورے ہوں گے تو یہاں سروسوں آگ آئے گی جس کے چمچ میں نے اندر ڈالے ہیں اور پھر ان دانوں سے تیرے لئے ایک تیل نکالا جائے گا۔ تجھ پر یہ لازم ہے کہ ہر روز صبح شام نوکرے کے اوپر سے ہی پانی سے ترائی کرتی رہو۔“

یہ کہہ کر بوڑھے بخارے نے نوکرے کے ارد گرد ایک بڑے بانس کی ٹلیاں ٹھونک دیں اور سی کی مدد سے کھونٹے گاڑ کر نوکرے کو مضبوط کر دیا تاکہ اسے ہٹایا نہ جاسکے۔ وقت کی چکی چل پڑے تو صبح دوپہر شام رات ایک دن پھر وہ بات ہفتوں عشروں اور پھر مہینے سال صدیوں لسلوں تک سب کچھ پھس کر کھل کر دیتی ہے۔ یہ تو پھر ایک چاند کا ارتنا چڑھنا تھا۔ چند دن نیلی پھلی رتوں ایک آدھ بارش کی جس کی راتوں اور چمکتی ہوئی دوپہروں کے آجانے سے کالی سروسوں کے پھول پتوں سے نوکرا بھر گیا بلکہ پھول پتے نوکرے کے چھترے سوراخوں سے باہر بھی جھانکنے لگے تھے۔ قرب و جوار کے ماحول نے سروسوں کی خوشبو سے ہواؤں کو معطر سا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ چودھویں کے چاند کی آخری رات آگئی۔

یہ وہی وقت اور سماں تھا جب اس کالی سروسوں کے بیجوں والے پھولوں کو چاند کی دھیمی دھیمی روشنی میں علیحدہ کرنا تھا اور انہیں محفوظ کرنا تھا۔ شمن گہتی اپنے پتا کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسے خود بھی اس بات کی خوشی تھی کہ ہو سکتا ہے بھگوان اسے بھی عام لڑکیوں جیسا کر دے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی سیدھے ہو جائیں۔

چنانچہ سے آنے پر باپ بیٹی ایک کھلے منہ والا شیشے کا مرتھان لے کر نوکرے کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر جونہی رات کا دوسرا پہر لگا بوڑھے بخارے نے نوکرے کی رسیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ سروسوں کی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا نوکرا بڑی مشکل سے علیحدہ ہو گیا۔ چاندنی ماحول کو بہت پر اسرار رکھتے ہوئے تھی۔

چاندنی اپنے شباب پر تھی۔ زمین کا ایک ایک زرہ گینوں کی مانند دک رہا تھا۔ آخر کار سروسوں کے پتوں سے نوکرا علیحدہ کر لیا اور یوں لگا جیسے حیرت کا کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ عجیب سی پر اسرار خوشبو جو انسانوں کے لئے سونگھنے کے لئے نہ ہو پریوں اور پری زادوں کے پردوں کے پسینے جیسی جسے اگر زیادہ دیر تک سونگھا جائے تو انسان ایک عصر لطیف میں تبدیل ہو کر فضا میں تحلیل ہو جائے۔ چمکتے ہوئے سیاہی مائل نیلگوں پتوں پھولوں اور ڈنٹلوں کا چھوٹا سا ایک جنگل ہر ڈنٹل کالی ناگ بوٹی کی طرح دل میں خوف پیدا کر دینے والا۔ سو یہی کیفیت ان دونوں باپ بیٹی کی تھی اور وہ آنکھیں پھاڑے ان جھاڑیوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بوڑھے بخارے نے ہاتھ بڑھا کر اس میں سے ایک ڈنٹل اکھاڑ لیا لیکن اچانک ہی اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی ڈنٹل کی ڈنڈی سے ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈنٹل پھینک دیا۔

کافی دیر تک دونوں باپ بیٹی بیٹھے حیرت سے ان سانپوں کی کھتی کو دیکھتے رہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک تنکے سے کیڑے کو چھیڑا تو کیڑا ڈنٹل سے علیحدہ ہو کر نیچے زمین پر گر پڑا۔ نہ تو کیڑے نے کوئی حرکت کی اور نہ ہی اس کے اندر کوئی مزاحمت پیدا ہوئی۔

بخارے نے دوبارہ اسے تنکے سے الٹ پلٹ کیا۔ نیلے رنگ کا ننھا سا سانپ اسی طرح بے حس و حرکت رہا۔ جیسے زندہ ہی نہ ہو۔ تب بخارے نے دوسرا قدم اٹھایا۔ دونوں نے ڈنٹل اکھاڑنے شروع کر دیے۔ ہر ڈنٹل سے کیڑے لپٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس کیڑوں کا بھی ڈیر لگ گیا۔ سارے ہی چھوٹے چھوٹے سانپ بے حس و حرکت تھے جیسے

زندہ نہ ہوں۔ غرض یہ کہ باپ بیٹی ساری کالی سروسوں اٹھا کر اندر اپنے جھونپڑے میں لے آئے اور باپ کے اشارے پر بیٹی بھی بیجوں والے پھول علیحدہ کر کے شیشے کے مرتھان میں ڈالنے لگی۔

ایک گھنٹے میں دونوں نے مل کر یہ کام مکمل کر لیا۔ بے کار ڈنٹل اور پتے وغیرہ اٹھا کر وہ باہر آ گئے تاکہ انہیں دوبارہ ان کی جگہ گاڑ دیا جائے لیکن وہاں پہنچ کر ایک بار پھر حیرت نے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سارے کیڑے کالے اور نیلے پانی میں تحلیل ہو چکے تھے اور کچھ کیڑے ابھی تک ایسے بھی موجود تھے جو آدھے پانی تھے آدھے کیڑے۔ یہ انہیں غور سے دیکھتے رہے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی زہریلے نیلے پانی میں تبدیل ہو گئے۔

خیر اس کے بعد انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس جگہ سے مٹی ہٹا کر ڈنٹل اور پتے بھی اسی جگہ دفن کر دیے۔ ایک انوکھے عمل سے گزرے تھے۔ چنانچہ حیرت کا شمار تھے۔ ساری رات وہ دونوں باپ بیٹی جاگتے رہے اور مدھم سی روشنی میں وہ سروسوں کے پھولوں سے کالے کالے چمچ نکالتے رہے۔

دوسرے دن صبح بخارے نے کالی سروسوں کے دوسیر کپے بیجوں کو لے کر پاس کے گاؤں ایک کولہو والے کے پاس پہنچا۔ ان بیجوں میں یہ سانپ والے چمچ بھی موجود تھے۔ ایک بڑی بوتل میں تیل بنوایا گیا اور وہ یہ انوکھا تیل لے کر دوپہر سے پہلے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ ایک علیحدہ بوتلی میں بیجوں کا بچا ہوا کچلا بھی موجود تھا۔ وہ کچلا اس نے واپس ایک ایسی جگہ دبا دیا کہ کہیں کسی کا ہاتھ اس تک نہ پہنچے یا کوئی جانور منہ مار کر ہلاک نہ ہو جائے۔ وہ دنیا کا بدترین زہر تھا جس کا ایک چھوٹا سا حصہ کسی کو دے دیا جائے یا کسی جانور کی خوراک میں شامل ہو جائے تو جانور بھی ان کالے کیڑوں کی طرح پانی بن کر بہہ جائے۔

اب بزرگ کے بتائے ہوئے عمل کے تحت اس تیل کو پورا مہینے دھوپ دکھائی تھی۔ پھر کہیں جا کر یہ استعمال کرنے کے قابل ہوتا۔ بڑا خوفناک اور پر اسرار ماحول تھا۔ موسم بھی بدل رہا تھا اور اب یہ جگہ بڑی ہمایا تک ہو گئی تھی۔ خاص طور سے وہ کیڑوں والی اور فصل اگانے والی جگہ جہاں ابھی بھی کیڑے سے کلہاڑتے دکھائی دیتے تھے۔

بہر حال کچھ وقت گزارنے کے بعد یہ قافلہ کسی اور نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا کہ بخاروں کی یہی زندگی ہوتی ہے۔ کئی دن کا سفر کیا گیا اور جب کھانے پینے کی اشیاء میں کمی پیدا ہونے لگی اور کسی آبادی کی تلاش ضروری ہو گئی تو آخر کار انہیں ایک آبادی مل ہی گئی۔ تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن گزر رہی تھی اور ریلوے لائن کی لگا ہوں کی حد کے سرے پر بستی آباد تھی۔ اس بستی سے کچھ فاصلے پر بوڑھے سردار بخارے نے بھی ڈیرے ڈال دیے۔ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی تھی اور وہ آبادی جو ریلوے لائن کے آخری سرے پر نظر آ رہی تھی ایک اچھے خاصے بڑے شہر کی آبادی تھی۔ عورتوں کی ریلوے اسٹیشن پر اچھی خاصی دیہاڑی لگ جاتی تھی اور بچے بالے بوڑھے بھی آتی جاتی ریلوں کو دیکھ کر جی بہلاتے رہتے۔ اس کے علاوہ اس جگہ سے بوڑھے بخارے کی ایک اور یاد بھی تعلق رکھتی تھی۔ یہاں اس کی مرنے والی بیوی کے بہن بھائی بھی موجود تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شمن گہتی کے علاج کے لئے جس احتیاط اور راز داری کی ضرورت تھی وہ یہاں بآسانی میسر آ سکتی تھی۔

علاقہ بہت خوب صورت تھا۔ رونق بھی تھی، تھوڑے فاصلے پر دوسرا قبیلہ بھی آباد تھا جو انہی کی طرح بخاروں کا قبیلہ تھا۔ شمن بھی یہاں پہنچ کر بہت خوش ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے ماموں ممانیاں اور ان کے بچے یہ بڑا سا جوہر درخت آتی جاتی گاڑیاں دھواں اٹھاتا ہوا سیاہ انجن سگنل ڈاؤن نہ ہونے پر پھاٹک کے پرے کھڑی ریل کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے مسافر بچے اور بار بار انجن کی سیٹی کا بجنا یہ سب کچھ سب ہی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ شمن گہتی بھی اس سے بہت خوش ہوتی تھی۔ بخارے نے یہاں کھتے ہی سب سے پہلے اپنے سالوں کو شمن گہتی کے علاج کے بارے

میں اعتماد میں لیا۔  
بابا صاحب نے جو کچھ بتایا تھا اس کے بارے میں ان لوگوں کو بتایا گیا اور چونکہ مری ہوئی بہن کے محبت بھرے بھائی، بھانجی سے محبت رکھتے تھے چنانچہ اس مسئلے میں مکمل طور پر وہ بوڑھے بنجارے کے ساتھ شریک ہو گئے۔ بنجارے نے سروسوں کی بوائی تک ایک ایک لمحے کی کٹھا کہانی تفصیل سے سنائی تھی۔ پھر ان کے مشورے سے یہ کالے سروسوں کے تیل والی بوتل اچھی طرح بند کر کے مضبوط رسی کے ساتھ شیشم کے درخت کے اوپر والی شاخ میں باندھ دی گئی تاکہ مہینے بھر تیل خوب دھوپ کھائے۔ یہ شیشم کا درخت اس کی جھونپڑی کے بالکل ساتھ تھا اور اندازے کے مطابق اب یہ تیل اگلی چودھویں کے چاند کی رات کو اتارنا تھا۔ یہ دن بھی کسی ریل کی طرح شوں شوں کرتے گزر گئے اور آخر وہ لمحے آ گئے کہ بوتل کو اتار لیا جائے۔

رات کے دوسرے پہر بنجارے کا چھوٹا سالہ بوتل اتارنے کے لئے ایک مضبوط سی رسی لے کر اوپر چڑھا۔ رسی اس لئے کہ بوتل کو باندھ کر احتیاط سے نیچے لٹکا دیا جائے۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ وہی چاندنی رات کا سرگردو پیش کی ہر چیز دودھ میں نہائی ہوئی آسمان کے سمندر میں بادبانی کشتیوں کی طرح تیرتے ہوئے سرمئی بادلوں کے ٹکڑے۔ بوتل والی مہنی ابھی چند قدم آگے تھی کہ اچانک ہی بنجارے کے سالے نے گہرائی ہوئی آواز میں اوپر سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اس کے منہ سے نہیں نکل پا رہا تھا لیکن گہرا ہٹ کی حالت میں عجیب و غریب سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نیچے بنجارہ موجود تھا اور اپنے سالے کے بوتل کے لٹکانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس کی خوفناک آوازیں سنیں اور ایک دم گہرا گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو اسے عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے قریب ہی کوئی خوفناک کالا سانپ لہرا رہا ہو۔ لازمی طور پر یہ پراسرار چیز سانپوں کے لئے بڑی سنسنی خیز ہوگی اور ممکن ہے وہ سانپ اس سالے کو ڈس لے۔ وہ پھرتی سے پیچھے ہٹا اور منہ پر ہاتھوں کا بھونپنا کر بولا۔

”گہرا نا نہیں یہ سانپ کا سایہ ہے۔ اصلی سانپ نہیں ہے۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ جہاں بیٹھے ہو وہیں مہنی کو مضبوطی سے پکڑ کر جے رہو۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔“

بنجارہ اوپر پہنچا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس بوتل سے ایک انتہائی خوفناک کالا سانپ لپٹا ہوا ہے۔ ایک لمحے تک تو سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا کرے کیا نہ کرے لیکن پھر اپنی طویل محنت کو ضائع ہوتے دیکھ کر اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک بڑی سی مہنی توڑی آگے بڑھا کر سانپ کی طرف لہرائی، لیکن سانپ جو بوتل سے لپٹا ہوا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت رہا۔ بنجارے نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر ڈراڈور سے سانپ کی بوتل کے گرد گرفت کو ڈھیلا کر کے ایک جھونکا دیا تو سانپ نیچے گر گیا۔ بنجارے نے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے یہ بوتل اتاری اور رسی سے باندھ کے نیچے لٹکا دی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ سالے کا بھی خیال تھا کہ کہیں وہ درخت کی بلندی سے گر نہ پڑے لیکن نیچے اتر کر ایک اور منظر اس کا منتظر تھا۔ کالا لمبا سانپ جس جگہ گرا تھا وہاں ایک گاڑھے سے کالے ناگ کے مواد کو دیکھ کر بنجارے کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس کے سالے کا بدن اب بھی کانپ رہا تھا اور وہ دہشت بھری نگاہوں سے کالے سانپ کے اس حال کو دیکھ رہا تھا لیکن بنجارہ جانتا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ اس نے فوراً اس جگہ پر گھاس پھوس ڈال کر آگ لگا دی۔

رات کا باقی حصہ بھی جاتے ہی گزرا۔ وہ اپنے سالے کو تفصیل سے ساری باتیں بتا رہا تھا۔ پھر دوسرے روز ایک اور عمل کرنا تھا۔ جو بنجارہ بزرگ کے بتائے ہوئے طریقے کے ساتھ کر رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے تیل کی بوتل سے باہر

نکال کر صاف کیا اور پھر دو تین چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں بھر کر محفوظ کر لیا۔ جس کا انتظام اس نے کر لیا تھا لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ تیل کی خوشبو سے پوری بستی مہک اٹھی۔ ایسی نادر اور پراسرار خوشبو کو جسے کوئی بھی اندر سے محفوظ کئے بغیر نہ رہ سکے۔ بزرگ کی ہدایت کے مطابق اس تیار تیل کی ایک چھوٹی سی شیشی کو خالص سروسوں کے تیل میں ایک اور آٹھ کی نسبت سے ملا کر استعمال کیا جانا تھا اور باقی یہ تریاق مضبوط شیشیوں میں بند کر کے حقے کے پانی سے بھرے ہوئے منگے میں ڈبو کر محفوظ کرنا تھا۔

آخر کار وہ وقت آ گیا جو مٹن گپتی کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ باپ ہی کو ماں کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اور کون ہوتا جو اس لگن اور خطرے سے بے نیاز ہو کر اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مالش کرتا۔ بنجارے نے تمام کام صحیح طریقے سے سرانجام دینا تھا۔ صاف اور سننے پڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں بنائی گئی تھیں اس کے بعد اس نے مٹن گپتی کے پیروں پر بہت اچھی طرح اس تیل کی مالش کی اور اس کے بعد ان پر چوڑی چوڑی پٹیاں لپیٹ دیں۔ پھر اسی تیل سے اس نے اس کے ہاتھوں پر مالش کی اور خوب اچھی طرح سے ہاتھوں کی مالش کر کے پٹیاں لپیٹ دی گئیں۔ ایک ایک عمل وہ بزرگ بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کر رہا تھا اور اس طرح یہ علاج شروع ہو گیا۔

مٹن گپتی بھی اس علاج کے معاملے میں بڑی دلچسپی لے رہی تھی۔ بس ایک قباحت تھی اور وہ تھی اس تیل کی مہک نہ خوشگوار نہ ناگوار ملی جلی کیفیٹوں کی حامل جیسے گھٹکتے ہوئے امبر پر کوئی پسا ہوا کافور ڈال دے یا دھاتی اور سلکتی ہوئی جاوڑی پر کوئی اڑھن کے تیل سے جھینٹا دے۔

بہر حال مٹن گپتی کے لئے یہ بڑا عجیب تجربہ تھا۔ ویسے بھی وہ عام طور سے خاموش اور تنہا رہنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ حالانکہ اس کے بے پناہ حسن کے کارن اس کی سکھیوں کی تعداد بے پناہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ زیادہ تر رہنا پسند کرتی تھیں لیکن مٹن گپتی احساس کمتری کا شکار تھی اسے اندازہ تھا کہ اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں اس کے سارے حسن کو ختم کر دیتے ہیں۔

بہر حال تین چار دن اسی طرح گزر گئے اور اچانک ہی اس کے ہاتھوں پیروں میں ہلکا ہلکا درد سارہنے لگا۔ ایک دوبار بنجارہ کی کیفیت بھی طاری ہوئی لیکن وہ یہ ساری تکلیفیں بڑی سخت جانی سے جھیل رہی تھی اور کسی پر اپنی تکلیف ظاہر کئے بغیر اپنی کول سی جان کو سنبھالے رہتی۔ ساتھ میں روز آدھی رات کے وقت اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہوں۔ اس کی ہڈیاں ترخ رہی ہوں۔ باپ تھوڑے فاصلے پر سو رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں تیل ملا ہوا تھا اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے بمشکل ایک دیوار سے ٹک لگائی اور بیٹھ کر اپنے پیروں کو دیکھنے لگی لیکن اچانک ہی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ترختی ہوئی ہڈیاں نبھانے کس طرح جنبش کر رہی تھیں۔ اس جنبش میں اس کے اپنے عمل کو دخل نہیں تھا۔ بس ہاتھ مڑ رہے تھے۔ پاؤں مڑ رہے تھے اور اس نے کئی بار چھوچھو کر انہیں دیکھا اور پھر دفعتاً ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھوں کا رخ بدل رہا ہو۔ ہڈیوں کی ترخ شدید درد کا احساس دلا رہی تھی۔ جس طرح یہ ہڈیاں مڑ کر سیدھی ہو رہی تھیں وہ اسے عجیب سی حیرت و مسرت کا احساس دلا رہی تھیں۔ یکا یک ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور بوڑھا بنجارہ جو اس سے تھوڑے فاصلے پر سو رہا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے بتی کی روشنی بڑھائی اور اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن اسے بھی عجیب سا احساس ہوا اور وہ آگے بڑھا۔ آگے بڑھ کر اس نے جلدی سے سب سے پہلے مٹن گپتی کے پیروں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو کچھ اسے دکھا رہی تھیں وہ اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ پیروں کا رخ تبدیل ہو گیا تھا اور وہ بالکل سیدھے نظر آ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے مٹن گپتی کے ہاتھوں کو پکڑ کر دیکھا اور پھر اس کے منہ سے ایک ٹھنکی ہوئی سی آواز نکل۔

”ٹمن..... ٹمن..... میری بیٹی..... میری بیٹی..... ذرا اپنے ہاتھوں کو دیکھ ذرا اپنے پیروں کو دیکھ۔“

ٹمن نے تو پہلے ہی انہیں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ خوشی سے ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ بوڑھا اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی ساری پٹیاں کھول دے لیکن پتہ نہیں ابھی اسے یہ پٹیاں کھولنی تھیں یا نہیں۔ اس کے ہاتھ پیروں کو ہوا لگتی چاہتے تھے یا نہیں لگتی چاہتے تھے لیکن وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں اپنی آغوش میں رکھ لئے۔ وہ حیرت و مسرت کے طے جلے اظہار کے ساتھ ٹمن گپتی کے ہاتھوں اور پیروں کو پکڑ پکڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ تو بہت ہی خوب صورت ہاتھ پاؤں تھے بہت ہی خوب صورت وہ بڑی عجیب و غریب سی لگ رہی تھی۔ بنجارے کا دل خوشی سے تاج اٹھا۔

قبیلے والوں کو یہ تو معلوم ہوا تھا کہ بوڑھا سردار اپنی بیٹی کے علاج کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہا ہے لیکن کیا کر رہا ہے یہ ان کے علم میں نہیں تھا۔ سب کو اس بات کا پتا تھا کہ حسین ترین لڑکی حسن و جمال کا نادر نمونہ مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے بڑے دکھوں کا شکار ہے۔ وہ سب اس سے محبت کرتے تھے لیکن اسے ٹھیک کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر جب پہلی بار کام مکمل ہونے کے بعد ٹمن گپتی قبیلے والوں کے سامنے آئی اور اس کی دوست لڑکیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے تو کچھ کر ٹنگ رہ گئیں۔ پھر جو خوشی کی لہر دوڑ گئی تو سارا قبیلہ خوشی سے تاج اٹھا۔ سردار کو بدھائیاں دی جانے لگیں۔ لوگ خوشی سے پاگل ہو گئے تاج رنگ ہونے لگے۔ ہر شخص خوشی منارہا تھا۔ ہر شخص خوش تھا لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ٹمن گپتی کے حسن میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے نقوش بے پناہ تھکے ہو گئے ہیں۔

پھر ایک دن رات کا وقت تھا جب بوڑھے سردار کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جو کچھ دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس کے حلق سے آواز سی نکل گئی۔ وہ ایک خوفناک کالا سانپ تھا جو ٹمن کے سرہانے پھن پھیلانے کھڑا تھا۔ ٹمن سو رہی تھی۔ باپ کو خوف ہوا کہ کہیں سانپ ٹمن کو ڈس نہ لے۔ اس نے فوراً اپنی پگڑی کے پلو سے اسے ہٹانا چاہا۔ سانپ بغیر کسی مزید جنبش کے وہیں ڈھے گیا۔ اس دوران ٹمن بھی جاگ گئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کو اور سانپ کو دیکھا۔ بوڑھے نے بنا ڈرے سانپ کو دم سے پکڑ کر باہر پھینک دیا اور اس کے بعد یہ عمل اکثر ہونے لگا۔ ٹمن گپتی کے پیروں سے سانپ لپٹے نظر آتے لیکن وہ مر چکے ہوتے تھے۔ یہ بات کبھی کسی کو بتائی نہیں گئی لیکن یہ سانپ ٹمن گپتی اور اس کے باپ کے لئے خوف و دہشت کی علامت بن چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا حل ہو۔

دن رات، صبح شام اور زندگی پھر چل پڑی۔ ٹمن گپتی کا حسن بے مثال ہوتا جا رہا تھا جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بزرگوں نے بنجارے سردار کو مشورہ دیا کہ ٹمن گپتی کو نقاب میں رکھا جائے اور شہری آبادی میں بھیجنے سے گریز کیا جائے۔ کہیں کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے کیونکہ دیکھنے والا اس کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس کے بدن کی خوشبو بھی جیسی بھی تھی لیکن نجانے اس میں کیا کشش تھی کہ سامنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ٹمن گپتی ان حالات سے بے خبر زندگی کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ جگہ ان لوگوں کے لئے بڑی بھاگوں ثابت ہوئی تھی۔ بہت سے فائدے ہوئے تھے۔ تیل کی مالش کا سلسلہ ترک کر دیا گیا کیونکہ ٹمن گپتی کے ہاتھ پاؤں بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔ اس قدر حسین لمبی لمبی خروٹلی انگلیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور جو بھی اس کے ہاتھوں اور پیروں کو دیکھتا ہی رہ جاتا۔

وقت گزرتا رہا اور حالات بھی جوں کے توں رہے۔ نفیسی جان ایک عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ہر رات کسی نہ کسی سانپ کیڑے سے نبرد آزمائی ایک الگ اذیت پریشانی تھی لیکن آج تک کبھی کسی کیڑے نے اسے یا ڈیرے کے

کسی اور فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ پھر بھی دہشت تو دہشت ہی ہوتی ہے۔

بوڑھے بنجارے کے علاوہ بھی کوئی اس کے جھوپڑے میں سوتا بھی نہیں تھا۔ بوڑھا جانتا تھا کہ یہ کیڑے اور سانپ وغیرہ اس طلسماتی تیل کی مہک سے کھنچے چلے آتے ہیں اور پھر اس کے اثر سے ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ ان کی سدھ بدھ ماری جاتی ہے۔ وہ کسی کو نقصان یا فائدہ پہنچانے کے قابل ہی نہیں رہتے اور یہ کہ اس کے کچھ دیر بعد ہی ان کے اندر کا گوشت پھل جاتا ہے۔ بس ظاہری جسم باقی رہتا ہے جیسے گتے کاغذ لکڑی کو جلایا جائے تو جل جانے کے باوجود بھی وہ کچھ دیر کے لئے پہلی والی حالت میں قائم رہتی ہے۔ ہوا کے تیز بہاؤ یا انہیں چھیڑنے ہلانے سے یہ راکھ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ کیڑے سانپ بھی ذرا سے ہلانے پر گاڑھے نیلے سیال مادے میں بہہ جاتے تھے۔ اپنی اس قیاس آرائی کو اس نے بیٹی کو بھی آسان طریقے سے سمجھا دیا تھا کہ وہ آئندہ کے لئے اس قسم کی صورتحال کے ڈر اور خوف سے خود کو بچا سکے۔

یوں وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس ٹھکانے کو چھوڑنا پڑا۔ پوری زندگی پڑی تھی ٹمن گپتی کی اس کے سامنے۔ وہ اس دنیا میں رہا نہ رہا جب تک جیتا رہے گا کس طرح اس اذیت اور عذاب کو سہار سکے گا اپنی سوچوں کی اذیت سے چھٹکارا پانے کے لئے اب اس نے ایک اور راستہ تلاش کیا۔ وہ جلد از جلد اپنے پڑاؤ ٹھکانے بدلے لگا۔ چار پانچ مہنتوں سے زیادہ کہیں ٹھکانہ نہ کرتا۔ اس کے اندر ایک بے چینی پل رہی تھی۔ قبیلے والے اس کے دکھ اور پریشانی کو سمجھتے تھے لیکن اس کے دکھ اور درد کا درماں کسی کے پاس نہیں تھا۔ دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کی خاک چھانتا، فاصلے ناپتا ناپتا وہ اس علاقے میں آٹکلا اور یہاں کے نمبردار سے اجازت لے کر اس نے یہیں پر اس ٹیلے پر ڈیرہ جمالیا۔ ویسے اس جگہ ڈیرہ ڈالنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سانپوں اور کیڑوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ قبیلے کے دوسرے لوگ بھی ہر وقت سب سے دور ڈرے ڈرے رہتے تھے۔ دن کا چھین اور راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ خود ٹمن ان سے عاجز آ چکی تھی اور کئی مرتبہ باپ سے اس کی شکایت کر چکی تھی کہ بابا لوگ میرے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ میری سہیلیاں تک مجھ سے دور ہو گئی ہیں۔ انہیں خوف رہتا ہے کہ کہیں کوئی سانپ انہیں ڈس نہ لے۔

بوڑھا باپ خود اس کے لئے پریشان تھا اور اس کا کوئی حل تلاش کر رہا تھا۔ پھر چانک اس کی ملاقات ایک پرانے تجربہ کار سپیرے سے ہوئی۔ اس سپیرے نے بنجارے کی پتا سننے کے بعد اس کو چار عدد لونگ دیئے اور پھر ایک منتر بتاتے ہوئے کہا کہ ایک مٹی یا پتھر کی ایسی جگہ تلاش کی جائے جو زمین سے کم از کم دس بارہ فٹ اونچی ہو اور اس کی کھوکھڑوں یا سوراخوں میں چھوٹے جانور یا پرندے رہتے ہوں۔ یہ چار لونگ ذرا دور ہٹ کر چاروں کونوں میں گاڑ دو۔ اس حصار کے اندر کبھی کوئی کیڑا سانپ یا موذی جانور داخل نہیں ہو سکے گا۔ پھر اس راستے سے گزرتے ہوئے بنجارے کو یہ جگہ عین اس کی مرضی کے مطابق نظر آئی۔ یہ چھوٹا سا ٹیلا دراصل مٹی کا ایک تودہ تھا۔ نہ جانے کس طرح معرض وجود میں آیا تھا کہ اس کی مغربی دیوار بالکل سیدھی کھڑی تھی اور اس کی طرف چیل، کوؤں، ابا بیلوں اور دوسرے چھوٹے موٹے جانوروں کے سوراخ تھے۔

ٹیلے کے دوسری طرف ایک زمیندار کے نوجوان بیٹے نے بانس اور جھاڑ پھوس سے ایک چنان سی بنا رکھی تھی۔ یہاں ان کے ایک دو ملازم ان کی گائے بھینسوں کا چارہ وغیرہ کاٹتے رہتے تھے۔ صبح شام دودھ نکالتے اور اطراف کے کھیتوں کی رکھوالی بھی کرتے۔

یہ نوجوان جس کا نام نواز خان تھا اور عرف عام میں اسے نوازا کہا جاتا تھا بڑا ہی پروجاہت، چیتے کی طرح خوب صورت، تن و مند اور خاموش سا بے عیب نوجوان تھا۔ کام کاج کے علاوہ اس کا واحد شوق یا عشق بانسری بجانا اور ہیر گانا

تھا۔ اکثر وہ کام کاج سے فارغ ہو کر یہاں ٹیلے کے اوپر آ کر بیٹھ جاتا۔ شام کا سماں ہو یا رات کا کوئی پہر، گاؤں کی فضا میں اگر کیف و مستی رہتی رہتی ہوئی، جانور ڈھور ڈھور اگر ساکت و جامد مسکور کھڑے ہوتے اور کچے گھروں کھیتوں، تندوروں اور چکیوں پر بیٹھی میاں گم سی ہو جاتیں تو سمجھ لیں کہ نواز بانسری الاپ رہا ہے۔ اس کی سریں ایسی پاکیزہ اور مسکور کن ہوتی تھیں کہ دلوں میں سرور اور سرمستی پیدا کرتی تھی۔ اس سے بھی کسی کو کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی اور وہ تو گاؤں کی گلیوں میں بھی بہت کم دکھائی دیتا تھا۔

پھر جس دن ان بخاروں نے اس جگہ اپنے جمونہڑوں کے کھونٹے ٹھونکے تھے نوازے اس روز شہر میں پٹواری کے ساتھ اپنے باپ کی زمین کے کسی بکھیرے میں الجھا ہوا تھا اور جب وہ سر پڑی رات واپس لوٹا تو بخاروں کا بچا گلہ ٹیلے کے عین وسط میں پکڑ چکا تھا۔ وہاں پہنچنے سے جگمگا رہے تھے۔ ایک عجیب سا منظر تھا جیسے یہ جگہ بدل گئی ہو۔ فضا اور ہوا میں ایک انجانی سی مہکارتھی۔ جسے کوئی نام بھی نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس پر اسرار سی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے نواز اگھر جانے کے بجائے کھیتوں میں اپنے ڈیرے پر ہی رک گیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس نے کمی سے پوچھا۔

”عنایت خان یہ آج کیسی موج لگی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں سے جنوں پر یوں کی بارات گزر رہی ہو۔ یار یہ جگہ آج کیسی بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔ یہ ہلکا ہلکا لہراتا ہوا دھواں اور ٹھمٹاتے ہوئے دیے۔“

عنایت خان نے اسے دودھ کا پیالہ پکڑا دیا کہ ”بخاروں کا ایک قافلہ ادھر آ گیا ہے۔ بڑے چوہدری صاحب نے انہیں ساون تک یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“

”اچھا۔“ نوازے کو عجیب سا احساس ہوا۔ دودھ پی کر وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ عنایت خان نے اسے یوں لیٹتے دیکھ کر پوچھا۔

”باؤ جی! حکم ہو تو گھر سے کھانا بھیجیں لے آؤں یا گھر جاؤ گے۔“

نوازے نے ایک عجیب شان محبوبیت سے ٹیلے کی طرف دیکھا اور بولا۔

”عنایت خان ایک بات بتاؤ۔“

”جی باؤ نوازے!۔“

”کیا تمہاری آنکھیں اور ناک کام کرتے ہیں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں باؤ!۔“ عنایت خان نے حیرت سے کہا۔

”عنایت خان نا تو میں نے عربی بولی ہے نا فارسی۔ ایک سیدھا سادا سوال کیا ہے کہ تمہاری آنکھیں اور ناک کام کرتے ہیں یا نہیں۔“

”باؤ نوازے اللہ کا شکر ہے دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔“ عنایت خان نے جواب دیا تو نوازے نے اسی مسکور کن لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں صرف وہی کچھ نظر آ رہا ہے جو روز نظر آتا تھا یا آج کچھ علیحدہ سا مختلف نظر آ رہا ہے۔“

عنایت خان نے پھر حیرت سے گردن ہلاتا تو نوازہ پھر بولا۔

”اور ہاں یہ بھی بتاؤ کہ آج تم کوئی عجیب سی خوشبو بھی محسوس کر رہے ہو یا یہ صرف میرا وہم ہے۔“

عنایت خان عجیب سے بے وقوفوں کے انداز میں ناک کے نچنے مچلی کے پھمڑوں کی طرح پھیلاتے ہوئے سو گھنے لگا پھر بولا۔

”لگ تو مجھے بھی رہا ہے باؤ نوازے لیکن آپ کہتے ہیں تو میں کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیتا ہوں۔ ویسے باؤ ایمانداری

کی بات تو یہ ہے کہ ہم لوکروں چاکروں کی دیکھنے سننے سو گھنے اور سوچنے کی طاقتیں تو ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ہم یہ سب کچھ اپنے مالکوں کی طاقتوں سے دیکھتے ہیں۔ جو وہ ہمیں دکھانا اور سنانا چاہیں وہی سب کچھ دیکھتے ہیں۔“

نوازے چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”آج تو بڑی سیانی باتیں کر رہا ہے تو۔ لگتا ہے یہاں کی ہر شے کی طرح تو بھی عجیب سا ہو گیا ہے۔“

نوازہ کچھ مسرورہ سا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ وہیں لپٹا رہا۔ ٹیلے کی طرف چاند ابھر رہا تھا۔ ہلکے ہلکے دودھیائی اجالے کا ہالہ ٹیلے کو اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ وقت کو بھی کسی نے جیسے ہاتھ پکڑ کر تھام لیا ہو۔ نوازے اسی کروٹ سے لیٹا ہوا گہری محویت میں آنکھوں تک ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اس سحر انگیز ماحول کی جل قہل میں بھیگ چکا تھا۔

عنایت خان اجازت لے کر پانی لگانے کھیتوں کی جانب نکل گیا تو نوازے نے اپنی جان سے محبوب بانسری نکالی۔ بانسری کو وہ ہمیشہ رومال میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔ کہتے ہیں جو سائیں سانس سے زندہ ہوتے ہیں ان کا پہلا سر چاہے وہ کسی لے یار رنگ سے بھرا ہو مست کن ہوتا ہے۔ دیوانہ کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ آہنگ فطری ہوتا ہے قدرتی ہوتا ہے۔ سانس کا تعلق دم سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ دم دم مست بانسری کے سروں میں ایک ایسا بانک پن ہو کہ ہلکے کھکے کرب اور کشش ہے کسی اور ساز میں کیا۔ نوازے نے اپنی محبوبہ کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی پھر اپنے سانسوں کا سحر پھونکا۔ وقت ماحول رات کا جگر کاٹا ہوا ایک مضطرب سا سرکی ستارے کی طرح ٹوٹ کر اس جگہ تک پہنچا۔۔۔۔۔ جہاں ثمن گہتی موجود تھی۔

نجانے کیسے اس کا دل دھڑکا اس دھڑکن میں ایک نیا پن تھا۔ اس سے پہلے بھی دل کی دھڑکن اس طرح تیز نہ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی سانسوں کا سفر اس جگہ نہیں پہنچا تھا۔ جہاں کوئی آواز اٹھ رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک شدید زخم لگا۔ کوچ کی طرح کر لاتی بانسری نے اس کا اندر زندہ کر دیا اور جب اندر زندہ ہو جائے تو پھر انسان کا باہر مردہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بانسری کے سروں نے ایک ایک کر کے تمام بھید کھول دیے جیسے ثمن گہتی کو اپنے اندر کی خوشبو کا سراغ مل گیا ہو۔

ادھر نوازے کو بھی اپنے ان سروں کا جواب ملنے لگا۔ نجانے کس طرح رات گزری تھی۔ نجانے کس طرح۔۔۔۔۔ دو طرف دلوں کے راستے تعمیر ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ کئی برسوں کے بعد آج پہلا سورج طلوع ہوا تھا کہ ثمن کے آس پاس کوئی سانپ یا کیڑا نہیں تھا اور جیسے اسے ایک نیا جیون ملا تھا۔ نئی زندگی ملی تھی۔ وہ راتوں رات ثمن گہتی نہیں رہی تھی وہ تو کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ ثمن گہتی تو پچھلی رات سوئی تھی۔ یہ جو جاگی تھی وہ تھی ہی نہیں۔ اسے ایک نیا سا روپ ملا تھا جیسے کوئی راج ہنسی جیسے کوئی ہوا کے پروں پر سوار ہو کر کسی راج محل سے آئی ہو۔ رعب رعونت سے چہرہ تپا ہوا کوہ قاف سے جیسے ابھی ابھی پر یوں نے اسے غسل صحت دلا کر خوشبوؤں میں بسا کر سنگھاسن پر لا بٹھایا ہو۔ جس نے اسے دیکھا حیران ہو گیا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایسے ناز عشوے تو دلہنیں سہاگ کا سہاگہ چاٹ کر دکھاتی ہیں۔

ادھر بوڑھا باپ بھی حیرت و خوف میں ڈوبا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بھلا باپ بیٹی سے کیا پوچھے کہ تو اس قدر خوبصورت کیوں لگ رہی ہے؟ تو اس قدر خوش کیوں ہے؟ بس وہ اسے تنکے جا رہا تھا۔ جب ثمن کو احساس ہوا اور اس نے خود ہی اٹھلا کر پوچھا۔

”کیا ہوا یا تو اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کیا میرے سینک نکل آئے ہیں؟“

بخارے کے دل میں محبت کا طوفان جاگا۔ دلارے اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”کیا میں اپنی بیٹی کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ بس تو آج بہت پیاری لگ رہی ہے۔ رب تجھے بری نظر سے بچائے۔“

”ممن گہتی نے پیار سے باپ کے شانے پر رخسار رکھتے ہوئے کہا۔

”بابا اب تو میری فکر نہ کیا کر اب میں بڑی بھی ہو گئی ہوں اور ٹھیک بھی ہو گئی ہوں۔ اب تو ادھر بیٹھ کر آرام کیا کر۔ میں خود ہی سب کچھ سنبھال لوں گی۔“ بخارے نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو بڑی ہو گئی ہے اور اب میں تیری فکر نہ کروں پگلی۔ تیرے بڑے ہونے کی فکر ہی تو مجھے کھائے جا رہی ہے اور تو کہتی ہے کہ میں تیری فکر نہ کروں۔“ اس کی آواز میں بھراہٹ پیدا ہو گئی۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں اس نے دوبارہ کہا۔

”میں کیسا بد نصیب اور مجبور باپ ہوں کہ کہیں تیرا بیاہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب کچھ جانتی ہے تو..... سب کچھ جانتی ہے تو مثن..... بتا میں کیا کروں۔ تجھے دیکھتا ہوں تو دل گھٹنے لگتا ہے۔ خون کے گھونٹ پی کر دم سادھ لیتا ہوں۔ بس کیا بتاؤں بیٹی کیا کہوں تجھ سے۔ تو میرے لئے وہ زہر اور ایسا امرت ہے جسے نہ پی سکتا ہوں اور نہ پھینک سکتا ہوں۔“

”ممن گہتی اپنے باپ کی باتوں سے بے خبر یوں مسکرا رہی تھی جیسے اس کا باپ اس سے کوئی مذاق کر رہا ہو۔

”کہہ دیا تا میں نے بابا اب تجھ سے اب تو میری فکر چھوڑ اور یونہی اپنا جی میلانہ کیا کر۔ تجھے میرا بیاہ کرنے اور اس کے بارے میں چننا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنا برجن لیا ہے۔ میرا نت مجھ مل گیا ہے۔“

”ممن گہتی نے اتنی بڑی بات آسانی سے کہہ دی۔

”ایں.....“ بوڑھے بخارے نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بابا! پیٹ کے لئے بس اناج ہی ضروری نہیں ہوتا اسے تو بس بھرنا ہی ہوتا ہے۔ میرے بیاہ کے لئے برکی ضرورت نہیں ہے صرف بانسری کی ضرورت ہے۔“ وہ جھونپڑے سے باہر نوازے کے ڈیرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”رات ایک بانسری چھڑی ہوئی تھی اور میں اس کے سروں کے بھیدوں سے چھڑی ہوئی تھی۔ ایک ایک تان سمجھ رہی تھی میں۔ وہ بانسری جو کچھ کہہ رہی تھی وہ میرے من میں اتر رہا تھا اور بابا اب بانسری کی وہ تانیں میرے سارے وجود میں بسی ہوئی ہیں۔ وہی میرا بر ہے وہی میرا سب کچھ ہے۔ میں نے اپنا نت پالیا ہے۔ سب کچھ مل گیا ہے مجھے بابا۔“ ممن گہتی نیند کے عالم میں بول رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہے یہ سب کچھ تو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ بخارے نے اس کی بے تکی باتوں پر غور کرتے ہوئے کہا۔

”بس یہی تو ایک بھید ہے بابا جو سمجھ لے وہ بھیدی ہے جو سمجھ نہ پائے وہ..... وہ..... بابا ایک بھید یہ بھی ہے کہ بندہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ تو نے ڈھیر ساری زندگی یونہی انگل منگل میں گزار دی۔ چار دن جہاں بتا دیئے تو دھن ہونے لگی پھر اگلی کھوج میں نکل پڑا..... پھر اگلی پھر اس سے اگلی۔ بابا یہ جیون کی کھوجیں کبھی ختم نہیں ہوتیں بس یہی بھید ہے کہ جس حال میں رہو راضی رہو۔ تجھے اتنے بڑے جیون نے ایک چھوٹا سا بھید بھی نہیں دیا مجھے تو ایک سکھ کی ہوک نے سارے بھید دے دیئے۔ بابا میں آج اس طرف جاسکتی ہوں؟“ اس نے نوازے کے ڈیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایسے پوچھا جیسے کوئی بالائی اچانک اپنے باپ سے کہے کہ ابا میں یہ کھلونا لے سکتی ہوں۔ بوڑھے بخارے نے پیار سے کہا۔

”جہاں تیرا جی چاہے ضرور چلی جا پر اکیلی کہیں مت جائیو“ سکھیوں سنگ جائیو۔“ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”مگر گاؤں تو اسی طرف ہے۔ جدھر کا تو بول رہی ہے ادھر تو کھیت ہی کھیت ہیں ری۔“

”ہاں بابا ادھر کھیت ہی کھیت ہیں مگر کھیتوں میں بھی تو انسان رہتے ہیں اور جس نے مجھے اتنے سارے ڈھیر جیسے

بھید سمجھائے وہ بھی تو انہی کھیتوں میں ہی رہتا ہوگا۔“

نوازے اپنی بانسری کو اپنے سینے پر رکھے ٹیلے کی جانب کلنگی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ قبیلہ اسے کوہ قاف محسوس ہوتا تھا۔ پچھلی رات کے چاند اور ستارے تو کب کے کہیں جا کے سوئے پڑے تھے۔ مسلسل جاگ رہی تھیں تو وہ اس کی آنکھیں اور وہی من موہنی خوشبو جو پچھلی رات سے اس کے سارے وجود میں جا بسی تھی۔ وہ پچھلی رات کا شہر سے واپس لوٹا ہوا تھا۔ رات گئی۔ کھانا پینا اور دیگر ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ جب اندر کی لپک جاگ پڑے تو باہر کچھ بھی اہم نہیں ہوتا۔ کھیتوں کے رکھوالے کھیتوں کو پانی دکھا کر نیند بھر سوئے۔ پھر صبح کو ڈنگروں سے دودھ نکالا اپنے اپنے گھروں کو پہنچا کر واپس آ گئے۔ لیکن نوازے ایسا خوشبو کے سنگ سفر کرتا رہا کہ واپسی کا کوئی پتہ ہی نہ چل سکا۔ آفاقی ملکوتی، ماورائی خوشبو میں دیوانوں، مستانوں کے خوابوں کی طرح ہوتی ہیں اور جب خواب اور خوشبو میں آپس میں گڈمڈ ہو جائیں تو پھر دیوانوں کی نیند کہاں۔ بانسری کی لے ابھی تک فضا میں رنگ گھولے ہوئے تھی کہ عنایت خان نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

”باؤ نوازے طبیعت ٹھیک ہے نا تیری۔ بڑے لالہ پوچھ رہے تھے کہ نواز ارات کو گھر کیوں نہیں آیا۔ جاؤ گھر جا کر تھوڑا سا آرام کر لو۔“

”ایں.....“ نوازے یوں چونکا جیسے عنایت خان نے اسے کوئی نا سمجھ میں آنے والی بات کہہ دی ہو۔ پھر اسے جیسے بھولی ہوئی کوئی بات یاد آ گئی۔ وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور بولا۔

”ہاں..... ہاں..... ہاں.....“ پھر اس نے بانسری کو پیار سے دیکھا اور اسے رومال میں لپیٹ کر ہولے سے کہا۔

”اب تو بھی تھوڑا سا آرام کر لے چندا۔“ کاغذات کا تھیلا اور بانسری سنبھالے وہ گاؤں کے راستے پر چل پڑا۔ گاؤں کی جانب نکلنے والی یہ پگڈنڈی کوئی ڈیڑھ فرلانگ آگے جا کر ٹیلے کے دامن کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ ٹیلے سے ذرا پہلے معمولی سی گہرائی سے گزرتا پڑتا تھا۔ یہ ایک برساتی پانی کی گزرگاہ تھی۔

جیسے جیسے نوازے آگے بڑھتا گیا اسے یوں لگا جیسے وہ کسی خوشبو کے پہاڑ کی جانب چل پڑا ہے۔ وہ پہاڑ اسے مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ اس کے پاؤں تیزی سے اٹھ رہے تھے جبکہ اس عمل میں اس کے اپنے کسی ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح بے سدھ سا آگے بڑھ رہا تھا۔ سورج اس کے پیچھے اور سایہ بیس قدم آگے۔ وہ اپنے سائے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ سایہ تو کسی جسم کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ کیسا سایہ ہے وہ کچھ سوچ کر رک گیا بلکہ اپنے قدموں پر بیٹھ گیا مگر سایہ نہ رکا اور نا ہی بیٹھا۔ وہ اپنی راہ پر چلتا اور بڑھتا رہا۔ آگے برساتی ٹالے کے کنارے ایک کھل آم کا چھوٹا سا درخت تھا۔ سایہ اس درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ نوازے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اچانک ہی اس کی نظر آم کے درخت کی جانب اٹھی وہاں ایک مست شاب کھڑی اس کو لگاوت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی ساتھ ہی مسخ کر دینے والی خوشبو کا ایک زبردست جھونکا اس کے نتھنوں سے نکلا۔

”ممن گہتی جیسے سائے کے قالین پر پیر دھرتی ہوئی اس کی جانب آ رہی تھی۔ ایک حسین وجود نا قابل یقین حیثیت رکھنے والا کوہ قاف کی پریوں کے بارے میں صرف کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ یہ کہانی زندہ جاوید ہو گئی تھی۔ وہ سایہ سنا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نوازے کے سامنے قریب آ کر رک گئی۔ کئی صدیاں یہیں کھڑے کھڑے گزر گئیں۔ یہ ایک دوسرے کو پہچاننے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بھی نوازے کے منہ سے ایک غیر اختیاری آواز نکلی۔

”تم وہی خوشبو ہو جس نے یہاں ہر زندہ چیز کو دیوانہ کر دیا ہے۔“



یہ جیلے صرف اس کے ہونٹوں نے ادا کئے تھے۔ ان کی ساخت میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جن چیزوں میں ارادے کا دخل نہیں ہوتا ان کی بناوٹ کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ ثمن کے نازک لیوں پر جنبش ہوئی۔

”اور تم بھی وہی بانسری ہو جس کی سروں کے تالوں نے وہ سارے بھید کھول دیے جو ابھی تک میرے سپنوں کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔“

”تم یہاں ٹیلے پر رہنے کو آئی ہو نا۔“

”ہاں! وہیں سے آئی ہوں اور اب سنسار کے آخری دن تک وہیں رہوں گی۔ جب تک کہ سنسار بادلوں میں نہ کھو جائے گا۔ تمہاری بانسری کے بیٹھے بیٹھے بھید کھولنے والے سروں کو سنا کروں گی۔ تمہاری کھوج میں کیسی کیسی مشکلیں اور مصیبتیں جمیلی ہیں میں نے۔ بڑے بڑے نفعن امتحان سے گزری ہوں تب کہیں جا کر تم مجھے ملے ہو۔“

پتا نہیں یہ آواز ثمن گہتی کے دل کے کون سے حصے سے آ رہی تھی۔ نوازے بھی خوابوں میں ڈوبے لہجے میں بول رہا تھا۔

”ہاں! تم بھی تو وہی ہو جو میرے سپنوں اور خیالوں کی خوشبو ہو۔ میں نے جب سے بانسری پکڑی ہے میں تمہاری سریں ہی تو الٹا پتا رہا ہوں۔ میں اپنے اسی ڈیرے پر چاندنی راتوں میں اس ٹیلے پر تمہیں ہی دیکھتا رہا ہوں اور تم ہی کو بانسری سناتا رہا ہوں۔ میرے اندر کوئی کہتا تھا کہ تم ایک دن ضرور آؤ گی۔ تمہاری خوشبو میرے لئے اجنبی نہیں ہے یہ تو سدا میرے ساتھ رہی ہے۔ مجھے جینے کا حوصلہ دیتی رہی ہے۔“

ثمن گہتی اور نوازے یکجا ہو گئے۔ ایک سر تھا دوسری خوشبو ان کا چرچا آبادیوں میں پھیل گیا۔ ادھر بخارے کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ اس نے یہاں سے پڑاؤ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے لوگوں سے بات بھی کر لی جس کی زمین تھی اس نے بھی یہاں رہنے کے لئے ایک وقت دیا تھا۔ جو پورا ہو چکا تھا اور بخاروں کو اپنا ڈیرہ اٹھانا پڑا۔ لیکن ثمن گہتی اور نوازے اپنی دنیا میں مست تھے۔ کبھی ثمن کھیتوں والے ڈیرے پر پہنچ جاتی اور کبھی نوازے ٹیلے کے پاس پہنچ جاتا، لیکن اس سر اور خوشبو کے طمن کی خبر ابھی عام لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ ہاں کھیتوں کے لوکر چاکر یا پھر عنایت خان جانتا تھا۔ ثمن گہتی کے قبیلے والے بھی اتنا جانتے تھے کہ یہ شخص وقت گزاری ہے جب ٹیلے سے جھوپڑے اکھاڑے جائیں گے اور بخاروں کا یہ قافلہ کسی نئی منزل کی جانب روانہ ہو جائے گا تو یہاں کے معاملے، تعلق، ناتے بھی یہیں رہ جائیں گے اور بخارے اپنا لادالا کر کہیں اور روانہ ہو جائیں گے البتہ یہاں رہ کر بوڑھے بخارے نے بڑی دولت کمائی تھی بلکہ اس نے یہ نسخہ کچھ مقامی سپیروں اور سنیا سیوں کو بھی بتا دیا تھا کہ تم اسے بناؤ اور مال کھاؤ جبکہ اصل مسئلہ خوشبو کا نہیں تھا۔ بخارے نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تا کارہ اور فاج زہد جسم اس تیل کی مالش سے اپنی اصل حاصل کر لیتے ہیں اور یہ اس کا الگ کام ہے چنانچہ اسے اس کے بھی کافی پیسے ملے تھے اور وہ ایک طرح سے مالامال ہو گیا تھا۔

قافلے کے سفر کا یہ پڑاؤ اسے سب سے زیادہ فائدہ مند رہا تھا۔ پھر روانگی سے ایک دن پہلے بوڑھے بخارے نے ثمن کو بتایا کہ ”بٹی کل صبح سویرے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اس علاقے کا مالک رحیم خان ہے جس نے ہمیں یہاں صرف دو مہینے رہنے کی اجازت دی تھی اور اب تیسرا مہینہ بھی ختم ہونے کو ہے پھر اب میرا دل بھی یہاں نہیں لگ رہا“ ہم یہاں سے آگے چلنے والے ہیں۔“

ثمن نے غیر متوقع طور پر بڑے اطمینان سے باپ کی بات سنی اور بولی۔

”ٹھیک ہے بابا تم نے بالکل ٹھیک سوچا اور یہاں سے جانے کا صحیح فیصلہ کیا تم پورے قبیلے کے کھیا ہو تمہارا یہ فیصلہ ہر کوئی سنتا ہے۔ کل اس قبیلے کو روانہ ہو جانا چاہئے مگر بابا اس قبیلے کا ایک فرد اس کارواں میں شامل نہیں ہوگا اور وہ تمہاری

بٹی ثمن گہتی ہوگی۔“

بوڑھے بخارے کا منہ حیرت سے کھل گیا، لیکن ثمن گہتی وجد کے عالم میں بولی۔

”یہ میرے مقدر کے کھیا کا حکم ہے اور میرے اندر کے بھیدوں کا فیصلہ ہے۔ جس طرح تم اپنا جیون بتانے کے لئے سفر میں رہتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے جیون کے سفر میں چل پڑی ہوں۔ میرے وجود کا انت یہیں میرے سیانے کے پاس ہے مگر میں جانتی ہوں کہ یہ بات تمہاری بدھی میں نہیں آئے گی۔ البتہ ایک سچائی تم بھی جانتے ہو کہ میں کسی مرد کو چھو نہیں سکتی، میرا بیاہ نہیں ہو سکتا، میں وہ چیز نہیں ہوں جسے گھریا جھوپڑی میں سجایا جاسکے اور نہ ہی میں وہ گائے بکری ہوں جسے کھونٹے کے ساتھ باندھا جاسکے۔ میں تو ایک جاگتی آنکھوں کا خواب ہوں، ایک آوارہ منزل خوشبو ہوں، میں اسی کی ہوں بابا جس کے سپنوں میں بھی ہوئی ہوں۔“

بوڑھے بخارے کے تصور میں نہ جانے کیا تھا ادھر ثمن مسلسل کچھ کہہ رہی تھی، اس نے کیا کہا اور کیا لیلیں پیش کیں، بخارے نے سنا ہی نہیں تھا۔ البتہ جب وہ چپ ہوئی تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ باپ بٹی کے درمیان ایک بھیا تک سی خاموشی پھیل گئی اور جس طرح ہر گہری خاموشی کے بعد کچھ نہ کچھ منظر بدلتا ہے بالکل اسی طرح نوازہ بھی اچانک ہی آگیا اور بیک وقت باپ بٹی کی نظریں اٹھ کر اس کی طرف جم گئیں۔ تب نوازے نے بے خودی کے عالم میں کہا۔

”بابا میں تم سے ثمن کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ کل یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ کام میرا نہیں تھا جو میں کر رہا ہوں بلکہ میرے ماں باپ کا تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے التجا کی کہ وہ تمہارے پاس اس مقصد کے لئے آئیں، مگر انہوں نے میری اس گستاخی پر نہ صرف مجھ سے ہمیشہ کے لئے تعلق ختم کر لیا، بلکہ سوائے اس ٹیلے کے انہوں نے مجھے اپنی تمام جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی دے دی ہے اور اب.....“ اس نے خاموش ہو کر ثمن کی طرف دیکھا اور بولا۔

”اب میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں، بناؤ کیا کہتے ہو؟“

بوڑھے بخارے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے، عیاش اور دل پھینک قسم کے لوگ اکثر ان کی چھو کر یوں کے پیچھے شادی یا جی محبت کے چکر میں ان کے جھوپڑوں تک پہنچ جاتے ہیں اور روپے پیسے کا لالچ بھی دیتے ہیں، مگر یہ خانہ بدوش بڑی خوبصورتی سے کھا چاٹ کر طرح دے جاتے ہیں اور اگر یہ بوڑھے اپنی چھو کر یوں کے عاشقوں کی مرادیں ان کی خواہش کے مطابق پوری کرتے رہیں تو پھر ایک ایک کر کے ساری چھو کر یاں چھو منتر ہو جائیں، مگر اس معاملے میں بوڑھے بخارے نے اپنے طریقوں سے کافی ہٹ کر حقیقت پسندی اور سچائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”سنو لو جوان لڑکے! میں اس وقت یہ بحث چھیڑ کر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ ہم خانہ بدوش اپنی لڑکیوں کے بیاہ قبیلے سے باہر کرتے ہیں یا نہیں، اس وقت میں صرف ایک حقیقت تمہارے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی کچھ خاص وجوہ کی بنا پر تم سے کیا کسی سے بھی بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کو چھوٹا اور اسے اپنی بیوی بنانا بالکل اپنی موت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ تم اس بات کی تصدیق پورے قبیلے سے کر سکتے ہو اور خود ثمن گہتی بھی تمہیں اس کے بارے میں بتا سکتی ہے۔“

”بابا ثمن صرف ثمن ہے اور اگر وہ ہاتھ پاؤں سے ادھوری بھی ہوتی تو بھی اگر وہ موت کا فرشتہ ہوتی تو بھی میرے لئے وہ صرف ثمن ہے۔ بابا جو کچھ تم نے مجھے بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ سب مجھے جاننے کی ضرورت نہیں ہے“



تمہارے قبیلے کے رسم اور رواجوں سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ نیلہ شمن کی خوشبو اور میری بانسری کے سروں کا بھید محل ہے یہ یہاں کی مہارانی ہے اور میں اس کے چٹوں کی دھول بالکل یہی باتیں میں اپنے ماں باپ کے آگے بھی کھری کھری کر کے آیا ہوں میرا فرض تھا کہ شمن کے باپ ہونے کی حیثیت سے تم سے اس کا ہاتھ مانگوں سو میں نے اپنا فرض پورا کر دیا یہ شمن موجود ہے اس سے پوچھو اور مجھے بتاؤ کہ میری زندگی کا یہ فیصلہ موت سے بھی زیادہ سنگین ہے۔“

شمن بظاہر بے نیازی کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی جیسے یہ باتیں اس کے بارے میں نہ ہوں بلکہ کسی اور کا معاملہ زیر بحث ہو۔ بوڑھا بخارہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا بے چاری کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر لہرا رہی تھیں انتہائی مجبوری اور کرب کے عالم میں اس نے شمن کی جانب دیکھ کر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تو بھی تو کچھ بول شمن! اپنا آپ دیکھ! اپنا بوڑھا باپ! اپنا قبیلہ ریت رواج سب کچھ تول اور پھر بتا، مگر ایک بات یاد رکھ! فیصلہ یا بات وہ کرنا جو تیرے من میں بھاؤنا ہو میں نے تیری خاطر اپنا سارا جیون تیاگ دیا۔ اب جو بھی کر سوچ سمجھ کے کر! فیصلہ میں نے تیرے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔“

شمن باپ کی جانب دیکھ کر بڑے پراسرار انداز میں مسکرائی، ایسی جگر پاش مسکراہٹ خوشی کرنے والوں زہر کا پیالہ ہونٹوں پر رکھنے والوں یا کسی کی خوشیوں پر قربان ہونے والوں کے ہونٹوں پر آخری بار نمودار ہوتی ہے۔ اس نے اپنی پاٹ دار اور حسین آواز میں کہا۔

”بابا میری خاطر تم نے اپنے بال چاندی کر لئے اور اپنی سونا جیسی جوانی پیش کر لی۔ میری خوشی اور بھلائی کے لئے تم نے جو کچھ کیا وہ بہت کچھ تھا لیکن تم لاکھ میرے لئے کچھ کرو میرا انت نہیں بدل سکتے اب وہ سے آگیا ہے جہاں تمہاری اور میری آزمائشیں ختم ہو رہی ہیں۔ میں تمہارا بیٹا نہیں بنی ہوں اور کوئی بیٹی سدا اپنے باہل کے گھر بیٹھی نہیں رہتی۔ ایک نہ ایک دن وہاں سے اپنا رزق پانی سینٹا پڑتا ہے۔ اپنے باہل کے پاس سے جانا پڑتا ہے۔“

بوڑھے بخارے نے سر جھکا لیا، بہت دیر تک سوچتا رہا جو کچھ سوچا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اسے فیصلہ کرنا تھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا، پھر اسی رات شمن اور نوازے کا بیاہ کر دیا گیا بوڑھے بخارے نے ان انوکھے دولہا دلہن کے لئے اپنا جمونپڑ جملہ عروسی بنا دیا، محبوب ساری رات اندر جمونپڑے میں اپنے سہاگ کی بیج بناتا رہا اور ادھر قبیلے والے اپنے جمونپڑے ڈھور ڈھگر سامان سینٹے رہے ساری رات اسی ککھش اور تنگ و دو میں گزر گئی۔

صبح دم اذان سے پہلے بوڑھے بخارے نے جمونپڑے کے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ شمن گہمتی اور نوازے ایک دوسرے کے قریب بے سداہ دراز ہیں۔ دونوں میں زندگی کی ایک بھی سانس نہیں ہے۔ شمن کے سینے پر ایک کالا ناگ پھن اٹھائے بیٹھا ہے اور نوازے کے سینے پر بانسری رکھی ہے خوشبو اور سر کا ایسا انت کسی نے نہ دیکھا ہوگا بوڑھے بخارے نے اوپر کھڑے ہو کر چند لمحے دونوں کو دیکھا۔ اپنے آپ دو آنسو ٹپک کر دونوں گال پر گرے ایک نیلچہ اٹھایا اور ارد گرد کی مٹی سمیٹ کر قبر بنانے لگا، پھر چند لمحات قبر کو دیکھا، اٹنے پاؤں واپس پلٹ آیا اور باہر آ کر اس نے بخاروں سے قافلہ اٹھانے کی درخواست کر دی اور کچھ دیر کے بعد یہ قافلہ کسی نئی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

بوڑھا جگجگت خاموش ہو گیا اور چند ہی لمحوں کے بعد اس خاموشی میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہوئی۔ کوروتی نے اور میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ بخاروں کا قافلہ جا رہا ہے فضا میں ایک ناقابل یقین سی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور بانسری کے سر اس خوشبو میں اپنے فضاؤں میں منتشر ہو رہے ہیں۔ ہماری نگاہیں صبح کے دھندلے سے اجالے میں اس کا رواں کوٹیلے سے نیچے اترتے دیکھ رہی تھیں۔ جانوروں کے گلوں میں بندھے ٹھنکھرو اور گھنٹیاں کپڑوں سے باندھ دی گئی تھیں تاکہ شور نہ ہو۔ یہ قافلہ اپنی شمن گہمتی کی خوشبو کو اس کے انت سر کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ ان کے چہروں کی دیرانی اور بوڑھے

بخارے کے آئندہ جیون کی محرومی صاف نظر آ رہی تھی۔ ادھر کوروتی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا کرب سمٹ آیا تھا۔ جیسے وہ شمن گہمتی ہو اور اپنی درد بھری کہانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو تبھی بوڑھے جگجگت کی آواز ابھری۔

”خانہ بدوش صبح ہی صبح چلے گئے اس رات نوازے کے گھر میں غصے اور پریشانی کا راج تھا۔ کوئی بھی اس گھر میں نہیں سویا تھا نہ کسی نے کچھ کھایا یا پیتا تھا۔ ساری رات اس ککھش اور پریشانی میں کئی اگلی صبح لوگوں نے اطلاع دی کہ نیلہ خالی ہے بس ایک جمونپڑا ابھی تک وہاں کھڑا ہے نوازے کے باپ نے اور دادا نے تو رات ہی کو نوازے اور اس کی ضد پر لعنت بھیج کر اس کی آخری خواہش کے طور پر یہ نیلہ اسے بخش کر باقی تمام جائیداد اور خاندان سے عاق کر دینے کا اعلان کیا تھا۔ اب اس نے یہ اعلان کر دیا کہ کوئی بھی گھر اور گاؤں میں نوازے اور شمن گہمتی کا ذکر نہ کرے۔ مشرقی کنارے پر وہ جمونپڑا بخاروں کے جانے کے بعد بھی ثابت سالم اپنے ڈنڈوں اور بانسوں پر تنہا کھڑا تھا۔ پھر ایک دن وہاں پر جانے والے کچھ لوگوں نے پرودہ ہٹا کر اندر دیکھا، جمونپڑی کی ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ ساتھ ہی انہیں ایک قبر نظر آئی جو تازہ تازہ کھدی ہوئی تھی۔

دیکھنے والے یہ قبر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے ساری بات نوازے کے گھر والوں کو بتائی۔ انہوں نے کتنی ہی لاپرواہی برتی ہو لیکن اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔ گاؤں کے گورکن کو بلا کر قبر کشائی کا حکم دیا۔ اس وقت پورا گاؤں ٹیلے کے اوپر نیچے جمع ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے کھوڑے کھول لئے کہ خانہ بدوشوں کا پچھا کرتے ہیں اور ان کو پکڑتے ہیں، مگر انہیں منع کر دیا گیا اور کہا گیا کہ پہلے قبر کو کھولو اور دیکھو کہ اندر کیا ہے قبر زیادہ گہری نہیں تھی۔ قبر کے اوپر سے پتھر ہٹائے تو خوشبو زانے مارتی ہوئی باہر اٹھ آئی، ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی بانسری بھی سامنے آگئی، ہاتھوں سے مٹی صاف کی تو دو تازہ جسم جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ مٹی ہو چکے ہیں ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ قابل دید تھی دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ یہیں ہاتھ رک بھی گئے۔ نکالی ہوئی مٹی واپس قبر میں ڈال دی گئی۔ قبر برابر کر کے دو بھاری پتھر اوپر رکھ دیئے گئے لیکن بڑے نمبردار کے حکم سے گاؤں کے کسی گھر میں سوگ منانے کی اجازت نہیں ملی نہ رونا دھونا ہوا یہ ساری صورت حال ہے اور تم نے دیکھا کہ رات کی اس خاموشی میں یہاں وہ دونوں قبر کے اوپر بیٹھے ایک دوسرے سے راز و نیاز کرتے ہیں کبھی کبھی جب چاند پورے کا پورا آسمان پر ہوتا ہے تو بانسری کی تانیں فضا میں ابھرتی ہیں اور ایک خوشبو ہوا میں لہراتی ہوئی اس سارے علاقے کو مہل کر دیتی ہے۔ اس وقت بستی کے لوگ اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ ان کے دل خوف سے بند ہونے لگتے ہیں اور سانپ تو جیسے یہاں آگے ہیں ہر سال سینکڑوں سپرے ادھر آتے ہیں اور سانپوں سے اپنی ٹوکریاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں، لیکن آج تک کبھی یہاں کسی سانپ کے کاٹنے کی واردات نہیں ہوئی، ادھر ادھر جاؤ دو چار سانپ ضرور دکھائی دیں گے۔ تم اگر اس ٹیلے پر جاؤ تو وہاں بھی تمہیں بہت سے سانپ نظر آ جائیں گے۔“

بوڑھا خاموش ہو گیا، میں نے کوروتی کی طرف دیکھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ خود میری اپنی کیفیت بھی زیادہ بہتر نہیں تھی میں نے کوروتی سے کہا۔

”آؤ چلیں۔“ ہم لڑکھڑاتے قدموں سے واپس اپنی آرام گاہ پر آ گئے۔ کوروتی پر ایسی عجیب کیفیت طاری تھی کہ مجھے حیرت ہونے لگی، میں بھی متاثر ضرور تھا اس انوکھی کہانی سے، لیکن بہر حال اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ البتہ میں نے کوروتی سے کہا۔

”کوروتی..... تم بھی اس طرح رو رہی ہو جبکہ تمہاری زندگی تو ایسی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔“

”نہیں..... میں نے صدیوں میں عمر گزاری ہے اب تمہیں کوئی بات بتانا بیوقوفی کی بات ہے۔ تم میرے بارے

میں اور میری کیفیت کے بارے میں اچھی طرح جاننے ہوا اس لئے کچھ کہنا بے مقصد اور بے سود ہے لیکن یہ درد بھری کہانی آہ اس نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور تم کیسی باتیں کر رہے ہو ذیشان عالی! کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ تم جانتے ہو کہ میں ایک زندہ وجود ہوں کوئی پرانی روح نہیں ہوں بے شک صدیوں سے جی رہی ہوں لیکن آہ کیسے عجیب عجیب لوگ ہیں اس سنسار میں۔ اپنی پریم کہانی امر کر جاتے ہیں کیا کوئی ایسا دل والا بھی ہے جو اس کہانی کو بھول سکے۔“

”ہاں واقعی اس میں کوئی شک نہیں ہے زندہ صدیوں میں اپنے دور کی کہانی لکھتے ہوئے مجھے بڑا عجیب محسوس ہوگا“

یہ کہانی تو ایک الگ ہی کہانی تھی اور اگر میں اسے لکھتا تو بڑے خوب صورت انداز میں لکھ سکتا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ بھی زندہ صدیوں کی زینت بنے گی۔“

”چلو یہاں سے واپس چلتے ہیں۔“

”کیوں کوروتی تم تو کہتی تھیں کہ میری دنیا کو بہت قریب سے دیکھو گی؟“

”آہ چلو مجھے ایک عجیب سی وحشت ہو رہی ہے میری زندگی میں بھی بہت عجیب سے واقعات آئے ہیں لیکن اس کہانی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔“

کوروتی کی خواہش پوری کرنا میری زندگی کا بھی ایک مقصد سا بن چکا تھا۔ وہ میرے وجود میں اس طرح اثر مئی تھی کہ کبھی کبھی مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی۔ اگر میں کسی کو یہ بتاتا کہ صدیوں پرانا ایک وجود جو زندہ شکل میں آب حیات پانی کر میرے ساتھ زندگی گزار رہا ہے تو لوگ یقین نہ کرتے یہی کہتے کہ افسانہ نگار ہے اور ایک افسانہ لکھ رہا ہے۔ اب لوگ جو کچھ بھی سمجھیں لیکن یہ کہانی زندہ صدیوں ہی کی زینت بن سکتی تھی۔ کوروتی نے میرے شہر واپس آ کر کہا۔

”میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی کچھ وقت تمہارے ساتھ ہی گزاروں گی۔ پتہ نہیں میرے اعصاب پر اتنا برا اثر کیوں پڑا ہے؟“

”کوروتی کو اپنے گھر لا کر مجھے بھی بڑی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ تمہارا زندگی میں ایک ایسا انوکھا مسفر ملا تھا کہ یقین کرنا خود میرے لئے بھی مشکل ہو جائے کئی دن تک کوروتی پر بوڑھے عجیت کی سنائی ہوئی کہانی کا اثر رہا پھر اس نے کہا۔

”ذیشان چلو باہر چلتے ہیں۔ میرے اعصاب بڑے متاثر ہیں میں چاہتی ہوں کہ تھوڑا سا وقت ایک خوشگوار کیفیت میں گزارا جائے۔“

میں تو خود کوروتی کی معیت میں خاموشی سے گھر کی چار دیواری میں وقت گزار رہا تھا۔ ویسے ایک بات آپ سے بالکل سچ کہوں مجھے ایک انوکھے پن کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ وہ احساس جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری زندگی میں کوئی انوکھا سا سہمی آگیا ہو جو دوسروں سے بالکل منفرد ہو۔ جیسا کہ میں اپنے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کوئی پارسا انسان نہیں تھا۔ زندگی کی تمام تر دلچسپیوں میں حصہ لیتا رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے میری دوستی بھی رہی تھی میں نے ان کے ساتھ خاصا دلکش وقت گزارا تھا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے میری بہت سی پرستار لڑکیاں بھی تھیں اور مرد بھی جو میری کہانیوں کو میری داستانوں کو پسند کرتے تھے لیکن میری فطرت میں کسی سے بہت زیادہ گھٹنا ملنا نہیں تھا۔ بس جو اچھا لگا اس کے ساتھ وقت گزار لیا دوبارہ کوئی ملا تو مل لیا نہ ملا تو نہ ملے لے دیوانہ گھٹنا ملنا کوروتی ایک ایسا انوکھا وجود تھا جو میری زندگی کو اور خاص طور سے میری تحریروں کو ایک انوکھے رنگ سے دو چار کر رہا تھا۔ اس کی معیت میں میرے شب و روز بہت اچھے گزر رہے تھے۔ وہ ایک پراسرار وجود تھا اور جیسا کہ اس نے مجھے بتایا کہ صدیوں کے اس طویل سفر میں اس نے لاتعداد پراسرار علوم بھی سیکھے۔ اس کی زندگی میں انتہائی پراسرار واقعات

بھی آئے۔ ایسے کردار بھی جو ناقابل یقین قوتوں کے مالک تھے۔ اس نے کہا کہ ان سے ان کے فن سیکھ کر بہت بار ایسا ہوا کہ ان سے جان چھڑانا بھی ایک مشکل امر ثابت ہوا اس نے صاف گوئی سے کہا کہ میں نے ان سے ان کا فن لے کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا اگر میں امرت جل نہ پی چکی ہوتی تو جب انہیں یہ علم ہوا کہ میں نے ان کا گیان ان سے لے لیا ہے تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے پر تل گئے لیکن ایسا نہ کر سکے۔

”کوروتی! کیا کبھی تمہارا دل اس سنسار سے اکتایا؟“ میں نے اس سے پوچھا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

”فیصلہ نہیں کر سکتی میں بس اگر کہیں من لگ گیا تو خوشی سے گزار لیا میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ میں تمہارے جیون کے آخری دن تک رہوں تو میرا تو کچھ نہیں ہوگا لیکن آخر کار تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے کبھی کبھی ایسی جدائی مجھے بڑی دکھتی ہے اور نجانے کتنے عرصے تک میں دکھوں میں ڈوبی رہتی ہوں۔“

”ایسے واقعات ہوئے ہیں؟“ میں نے اس سے سوال کیا اور مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ وہ صدیوں پرانی عورت تھی اور میں اس کا لحوں کا ساتھی لیکن انسان کی فطرت میں تھوڑی سی رقابت ضرور ہوتی ہے لاکھ صاف اور کشادہ ذہن کا مالک تھا۔ لیکن اس کے ان الفاظ پر میں نے ایک رقابت کی سی کیفیت محسوس کی۔ وہ بہت ذریعہ تھی اس نے میرے چہرے پر یہ کیفیت لوٹ کر لی اور میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”مگر من سے کہہ رہی ہوں تم میرے لئے بہت بڑی حیثیت کے مالک ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا ہم خوب سیر و سیاحت کرتے رہے وہ بہت متاثر ہو رہی تھی کہنے لگی۔

”دیکھو ذیشان عالی! اس دن میں نے تمہیں ایک بات بتائی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ تمہارا دل اداس ہو گیا ہے۔ تم میرے بارے میں دوسرے انداز میں سوچنے لگے ہو لیکن میں سچ بتا رہی ہوں کہ میں اس سے تک تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں جب تک جیون تمہارا ساتھ دے کہیں اور نہیں جاؤں گی کسی اور کو نہیں دیکھوں گی لیکن جب بھی تمہارے بنا سوچوں گی تو مجھے بہت عجیب لگے گا۔ تم جیسا کردار میرے جیون میں کبھی نہیں آیا البتہ ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

”گوتم بھسالی کہاں جا مرا اسے دن ہو گئے تمہارے ساتھ وہ نظر نہیں آیا حالانکہ وہ اب شدید رقابت کا شکار ہوگا کیونکہ میں تمہارے ساتھ جو سے بتا رہی ہوں گوتم بھسالی اس کے ایک ایک لمحے کے لئے ترستا رہا ہے۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی۔“

”ہاں پوچھو۔“

”تم نے پہلے بھی مجھے بتایا تھا کہ گوتم بھسالی روپ بدل سکتا ہے وہ تمہارے من پسند وجود کی حیثیت سے بھی تمہارے سامنے آ سکتا ہے اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

”میں نے بتایا تھا میرا گیان اس سے کہیں زیادہ آگے ہے وہ اپنے گیان سے ہی مار کھا گیا ہے۔ وہ نہیں سیکھ سکا جو میں سیکھ چکی ہوں۔ وہ اگر ایک چیونٹی کی شکل بن کر بھی میرے سامنے آئے تو میں اسے پہچان لوں گی کہ وہ گوتم بھسالی ہے۔“

”ہاں تم نے بتایا تھا کوروتی!“ میں نے کہا۔

کئی دن مزید گزر گئے میں نے اپنی کتاب میں کچھ نہیں لکھا تھا پھر اس دن اس نے خود ہی کہا۔ ”اگر تم اجازت دو تو

اپنے گھر ہو آؤں۔“

”ہاں اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ اس کے بعد تم مجھے بتانا کہ میرے ہی دور کی کوئی اور کہانی تم دیکھنا پسند کرو گی، میرا مطلب ہے اس وقت میرے ذہن میں تو کچھ نہیں ہے لیکن جس طرح ہم ایک اجنبی علاقے میں جا نکلے تھے اور وہاں ہمیں شمن گیتی مل گئی اسی طرح یہاں اور بھی حسن و عشق کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں یہ تو انسان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے۔“

”تمہیں بابا نہیں، میرے اندر ہمت نہیں ہے، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ بہت کچھ دیکھا ہے میں نے سنسار میں لیکن شمن گیتی کی کہانی نے میرے اوپر جو اثر ڈالا ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ ایک بات اور بتاؤں تمہیں۔“

”ہاں بولو۔“

”گوتم بھنساالی ہم سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔ وہ مجھ سے زیادہ تمہارا دشمن بن چکا ہے اور تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، میں تمہیں ایک ایسا اپائے بتاتی ہوں جس سے تم بھی اسے پہچان لو گے اور اگر کبھی وہ کسی بدلی ہوئی حیثیت سے تمہارے سامنے آیا تو اس سے اپنی حفاظت کر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تو پھر سنو، میں تمہیں ایک دو دن کے بعد ایک جاپ بتاؤں گی جسے کر کے تم ایک چھوٹا سا سامان حاصل کر سکتے ہو، یعنی گوتم جس شکل میں بھی آئے گا تم اسے پہچان سکتے ہو۔“

”کورتی مجھ سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی گئی اور میں نے زندہ صدیاں نکال لیں۔ میں بہت عرصے سے ان میں اپنی تحریر درج نہیں کر سکا تھا اور پھر اس رات میں شمن گیتی کو لکھتا رہا۔ میں نے ٹیڑے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کا وہ نسخہ بھی اپنی کہانی میں تحریر کر دیا کہ اگر کبھی میری یہ کتاب چھپ جائے اور انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچے تو ہو سکتا ہے وہ اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔“

”کورتی سے کسی طرح کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی اور اس رات بھی میں اپنی کہانی میں مصروف تھا اور میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ بہت عرصے یہاں رہ لئے اب کورتی سے کہوں گا کہ کتاب کے راستے مجھے کسی اور دنیا میں لے جائے۔ واقعی زندگی کے لمحات اس قدر دلچسپ ہوتے ہیں۔ رات کے دو بجے تھے۔ میں زندہ صدیاں تحریر کر رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی اور میں بری طرح چونک پڑا۔“

◆\*◆

حیرت اور خوف کے طے چلے تاثرات کے ساتھ میں گھر کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر دیکھا، مجھے دوبارہ چونکنا پڑا تھا۔ اول تو میرے گھر رات کے دو بجے آنے والا کوئی تھا ہی نہیں، پھر بھی میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کوئی پڑوسی ہو، کسی مشکل کا شکار ہو اور مدد مانگنے کے لئے میرے پاس آیا ہو، لیکن جس شخص کو میں نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے دیکھا وہ گوتم بھنساالی تھا۔ مکروہ شکل کا پورا، وہ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی مکروہ سی آواز ابھری۔

”مجھے اندر آنے دو۔“

میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا، خود دروازہ بند کرنے کے لئے رکا لیکن وہ سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا، پھر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے خود ہی ڈرائنگ روم کی لائٹ آن کی، اس دوران میں اس کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس شخص سے مجھے بدستور خطرہ تھا۔ لیکن اب میں اتنا بزدل بھی نہیں تھا۔ خاص طور سے مہابھارت کے دور میں اور اس کے بعد یونان میں پولیسیس کی حیثیت سے میں نے جو عمل سرانجام دیا تھا اس نے تھوڑا سا نڈر کر دیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ٹیکسی نگاہوں سے گوتم بھنساالی کو دیکھا اور کسی قدر ترش لہجے میں بولا۔

”آگے ہوتو میں نے تمہیں بلا لیا ہے، جس دور سے تم گزر رہے ہو اس کی تہذیب ذرا مختلف ہے اول تو رات کے دو بجے ایسے کوئی کسی کے گھر میں نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو میزبان کی اجازت کا انتظار کرتا ہے، تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے مجھے پسند نہیں، بیٹھو۔“

وہ ایک صوفے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، پھر اس کی آواز ابھری۔ ”میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا، تمہارا مہمان نہیں ہوں بلکہ تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔“

”کرو کرو کرو.....“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور خود اس صوفے کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جس سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ گوتم کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم اس کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں مصیبت میں پھنسا دوں گا، کیا سمجھے؟“

”ٹھیک، کب تک پھنساؤ گے، کیا آج ابھی اور اسی وقت؟“ میں نے کہا اور اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا۔

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ اس وقت بھی اگر میں چاہوں تو تمہیں کونسلے میں تبدیل کر دوں۔ تمہارے پورے بدن سے آگ ابل پڑے گی، اس طرح.....“ اس نے ایک ڈیکوریشن پیس کی جانب انگلی اٹھائی۔ اس کی انگلی سے نیلے رنگ کی ایک شعاع خارج ہوئی اور میرا انتہائی قیمتی ڈیکوریشن پیس سلگنے لگا، ایک لمحے کے لئے میرا منہ غصے سے کھلا لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ ڈیکوریشن پیس بہت خوبصورت تھا اور کسی نے گفت کیا تھا۔ اس کے جل کر راکھ ہو جانے سے مجھے دلی افسوس ہوا، میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”زمانہ قدیم کے شعبہ گر! میرے دور کے لوگ بھی ایسے شعبہ دے دکھا سکتے ہیں! پستول کی ایک گولی تیرے سینے میں سوراخ کر سکتی ہے۔ بے شک تو نے آب حیات پیا ہوا ہے اور وہ گولی تجھے موت نہیں دے سکتی! لیکن تیرے بدن کے زخم ضرور تجھے تکلیف دیں گے اور ان کے بھرنے میں وقت لگے گا۔“

”تم یہ بھی نہ کر سکو گے میرے نوجوان ادیب! میرے پاس اس کا حل بھی موجود ہے لیکن نیلے رنگ کی یہ شعاع تمہیں اسی طرح خاکستر کر دے گی جیسے یہ.....“ اس نے ڈیکوریشن ٹیبلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہوں تو پھر تو اس سے گریز کیوں کر رہا ہے جبکہ بقول تیرے مجھ سے دشمنی ہے۔“

”کوروتی کے لئے، کوروتی کے لئے، اگر میں نے تجھے ہلاک کر دیا تو وہ پیٹنگوئی غلط ہو جائے گی جس کے لئے مجھے نجانے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”پیٹنگوئی۔“

”ہاں! محبت کبھی نہ کبھی رنگ لے ہی آتی ہے میں اسے بہت چاہتا ہوں! میں اسے کسی کرب کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے اگر تجھے ہلاک کر دیا تو وہ مجھ سے بہت متنفر ہو جائے گی۔“

”پیٹنگوئی کرنے والے نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اسے اس حد تک نہ پہنچانا کہ اس کے سینے میں نفرت کا درخت اگ آئے اور وہ جب بھی تم پر نگاہ ڈالے نفرت کی نگاہ ڈالے! ایک وقت ایسا آئے گا جب اس کے دل میں تمہارے لئے محبت بیدار ہوگی اور وہ تمہیں اپنا لے گی! بس میں کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جس سے نفرت کا وہ درخت اگ آئے اور میرے راستے ختم ہو جائیں! لیکن تو دیکھ ادیب کہ میں کتنا صبر والا ہوں! کتنا انتظار کر رہا ہوں اور کب تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔“

”تو پھر تو مجھے کون سی مصیبت میں پھنسا دے گا گوتم بھنسا۔“

”یہ راز تو مجھ تک ہی رہنے دے! بس اتنا سمجھ لے کہ اگر میں صرف تیرے خلاف کچھ کرنے پر آ جاؤں تو تو اپنی زندگی سے تنگ آ جائے گا۔ تجھے صرف موت کی آغوش میں پناہ ملے گی اور وہ موت میں خود نہیں دوں گا تجھے وہ تیری طلب ہوگی اور میرا انتقام۔“

”تو ٹھیک ہے گوتم بھنسا! میں بھی زندگی کے انوکھے تجربے کر رہا ہوں! وہ تجربے میں جاری رکھوں گا۔“

وہ مجھے گھورنے لگا پھر بولا۔ ”تیری مرضی ہے تیار رہنا مجھے تیری موت درکار ہے لیکن وہ موت جو خود تجھے تیرے اپنے ہاتھوں آئے! میں کوروتی کے سامنے سرخرو رہنا چاہتا ہوں! چلتا ہوں۔“ وہ واپسی کے لئے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا! پھر بڑے دروازے سے بھی باہر نکل گیا۔

میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا کوروتی سے میرا جو رابطہ ہو گیا تھا اور جو رشتہ میرے اور اس کے درمیان قائم ہو گیا تھا وہ اتنا ہلکا نہیں تھا کہ اسے موت کے خوف سے فراموش کر دیا جاتا اور ویسے بھی میں ایک نڈر انسان ہوں! میرے بہت سے افکار و خیالات ہیں! موت کے بارے میں بھی۔ بہر حال میں نے سوچا کوئی نیک سکا ہے آج تک! لیکن یہ آب حیات پینے نہیں اس کا اعتقاد کیا ہوتا! میں نے بہت سی کہانیاں میں آب حیات کا ذکر کیا ہے! لیکن صرف خیالی حد تک حقی طور پر میں نے کبھی نہیں کہا کہ آب حیات کا وجود ہے یا اگر وجود ہے بھی تو کیا کوئی عام انسان چشمہ حیوان سے آب حیات حاصل کر سکتا ہے۔ خیر میں اس پر کوئی اپنی رائے نہیں دے سکتا! لیکن عام لوگوں کی وہی بات ہو جاتی ہے کہ وہ صرف کہانی کی حد تک ہے یا پھر کہانی سے آگے بھی کچھ ہے۔

کوروتی اور گوتم بھنسا! اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ آب حیات کا وجود ہے اور وہ بقول ان کے یہ امرت جل پی چکے ہیں۔ کوروتی سے اپنی اس عمارت میں نہ رہا گیا! وہ دوسری صبح ہی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے میرے بازو سے

رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں رہ سکتی اب میں تمہارے بناؤیشان عالی! نہیں رہ سکتی میں اب تمہارے بنا! پتا نہیں کیا ہوگا! کبھی کبھی تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم بوڑھے ہو جاؤ گے! مر جاؤ گے! اور میں پھر ویران ہو جاؤں گی۔ پھر میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر میں امرت جل نہ لی چکی ہوتی تو اپنے پریمی کے ساتھ بے بنا کر بھی راکھ بن چکی ہوتی یا دھرتی کی گہرائی میں جا چکی ہوتی۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے! منٹس کیا کیا سوچتا ہے! کبھی صبح کبھی فلف۔“ ناشتے کے دوران میں نے اس سے کہا۔

”رات کو گوتم بھنسا! میرے پاس آیا تھا۔“

”ایں۔“ وہ اچھل پڑی۔

”ہاں وہ مجھے دھمکیاں دے کر گیا ہے! تم نے وہ ڈیکوریشن ٹیبلٹ نہیں دیکھا جو بڑا خوب صورت تھا لیکن راکھ بن گیا ہے۔“ میں نے اسے اس ڈیکوریشن ٹیبلٹ کی درگت دکھائی اور اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیل گئے! تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

”وہ کمینہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے! جہاں تک بات رہی تمہاری تو اس کی مجال نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایسے چاپ بتاؤں گی کہ تم اس سے ہی نہیں بلکہ اپنے ہر دشمن سے محفوظ رہو گے۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی؟“

”ہاں پوچھو۔“

”وہ تم تک کبھی نہیں پہنچ سکا! میرا مطلب ہے تمہاری قربت نہیں حاصل ہوئی اسے؟“

”کبھی نہیں مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے۔“

”لیکن لیو سکی کی حیثیت سے تو اس نے تم پر قابو پا لیا تھا۔ میں وہاں پولیسیس کی حیثیت سے موجود تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس نے تمہارے بدن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔“

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو۔“

”تم پولیسیس کی حیثیت سے وہاں موجود تھے نا؟“

”ہاں۔“

”تم کیا تم پولیسیس تھے؟“

”نہیں۔“

”تو میں بھی وہ نہیں تھی جو تمہیں نظر آ رہی تھی! یہ تاریخ کے دو کردار تھے۔ میں شاید پہلے بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ ماضی جو گزر چکا ہوتا ہے اور اس کی ترتیب جس طرح ہوتی ہے اس میں نئے کرداروں کی گنجائش نہیں ہوتی! زیادہ سے زیادہ اگر کوئی دیدہ ور کی حیثیت سے تاریخ میں داخل بھی ہو جائے تو وہ صرف دیدہ ور ہوتا ہے! اور وہ نہیں سمجھ پاتا جو تاریخ کا اصل ہوتا ہے۔ ہم جب تاریخ میں داخل ہوتے ہیں تو اپنی جگہ تلاش کرتے ہیں کہ ہم کہاں سا سکیں گے! لیکن ہم پر جو اس دوران بتی ہے وہ ہم پر نہیں بتی! بلکہ تاریخ کے وہ کردار ہماری شکل میں اپنی کہانی بیان کرتے ہیں۔ لکھنا اپنی کتاب زعمہ صدیاں میں یہ بات کہ جیون کا ایسا موڑ بھی ہوتا ہے جب ہم خود اپنی ذات کو نہیں سمجھ پاتے۔“ میں واقعی اس کی فلسفیانہ گفتگو سے الجھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”تو وہ تم نہیں تھیں۔“

”نہیں وہ اشاریہ ہی تھی میں نے صرف اس کا روپ دھارا تھا۔ اس کا میرے جیون سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”ٹھیک اور میں.....“

”تم نے بھی پولیس میں اس کا روپ دھارا تھا۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا اس سلسلے میں جبکہ تم نے روپ دھارا ہوا ہوگا۔“

”میری یہ کتاب جب تم اس کے حروف پر جاتے اور تاریخ کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہو تو پھر تمہارا ایک کردار منتخب ہو جاتا ہے یہ میرا عمل ہے یہ میرا گیان ہے۔ ایک بار میرے ساتھ بڑا دلچسپ مسئلہ ہوا تمہیں یونان سے دلچسپی ہے نا میں یونان کے ایک بڑے ہی اہم کردار کے ساتھ جس حیثیت سے رہ چکی ہوں سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔“

مجھے بڑی دلچسپی محسوس ہوئی تھی میں نے کہا۔ ”میں سننا چاہتا ہوں اور دنگ رہ جانا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ”تو کیوں نہ اس دور میں اور اس کے آخر تک سفر کیا جائے خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ ایک بار میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو طویل واقعہ تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ ایک پرچار علاقے میں ایک ایسا استاد اعظم موجود ہے جو بڑے انوکھے گیان جانتا ہے جس کا نام ایلی گوس تھا۔ ایلی گوس سے میں نے ایک علم سیکھا بڑا انوکھا علم تھا اور بڑی مشکل سے میں نے ایلی گوس کو اس بات کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ مجھے علم کی اس منزل تک لے جائے۔ اس کے لئے مجھے اس انوکھے کردار میں اس حد تک پہنچنا پڑا تھا۔ اس کا وہ گیان اور علم اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اصل میں میں کون ہوں۔ وہ مجھے بڑے پیار سے اپنا وہ علم سکھاتا رہا اور جب میں نے اس کا مکمل علم سیکھ لیا تو پھر میں نے اس سے جدا ہو جانا مناسب سمجھا اور مجھے معاف کرنا ڈیڑھالی عالی! ایک کام میں نے کیا ہے کہ اگر کوئی ایسا علم میرے ہاتھ آ گیا جس میں میں نے سوچا کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا اس سے واقف نہ ہو تو میں نے علم سکھانے والے کو تباہ کر دیا یا اسے اس طرح ساکت کر دیا کہ پھر وہ جنبش تک نہ کر سکے تو یہی ہوا میں نے ایلی گوس کی وہ قوت سلب کر لی اور ایلی گوس کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ غضب ناک ہو گیا وہ میرا بدترین دشمن بن گیا۔“

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے اندر ابھی بہت سی خامیاں ہیں۔ میں زخمی ہو سکتی ہوں دکھ درد اٹھا سکتی ہوں بس یہ کمر نہیں سکتی۔ اگر میرے بدن پر کوڑھ پھوٹ آئے اگر میرے اعضاء مفلوج ہو جائیں تو بھی میں زندہ رہوں گی اور وہ زندگی کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے تمہیں اس کا علم نہیں۔ میں بتا رہی تھی کہ وہ میرا دشمن بن گیا پھر میرے گیان ہی نے مجھے بتایا کہ وہ میری تاک میں ہے۔

یہاں مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی میں اپنی طاقت کے زعم میں اس کے سامنے آ گئی اور اس سے کہا کہ ”وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟“

وہ سخت غضبناک تھا۔ اس نے کہا کہ ”وہ میرا اتنا کچھ بگاڑ سکتا ہوں کہ میں صدیوں اسے نہیں بھول سکوں گی۔“ اور اس نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔

ایک انتہائی طاقتور ہاتھی نما گینڈا تھا جس کا قد و قامت دیکھنے کے قابل تھا۔ اس نے نمونے کے طور پر اس گینڈے پر اپنا وہ علم آزما کر مجھے دکھایا گینڈا اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ وہ سانس لیتا تھا۔ بول سکتا تھا لیکن اس کے بدن میں جنبش نہیں ہوتی تھی۔ ایلی گوس نے کہا کہ ”وہ مجھے بھی ایک زندہ مجسمہ بنا سکتا ہے۔“ کسی بھی جگہ میں ساکت ہو سکتی ہوں اور پھر میرے جیون کا باقی سے اس پتھر ائے ہوئے بدن کے ساتھ گزرے گا اور میں کسی طور اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کر پاؤں گی۔“

میں خوفزدہ ہو گئی۔ اگر وہ یہ کر لیتا تو میرے لئے اس سے بھیا نک سزا اور کوئی نہ ہوتی میرے پاس گیان ہوتے طاقت ہوتی سب کچھ ہوتا لیکن مجھے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک جگہ ساکت رہنا پڑتا سو میں نے وہاں سے فرار مناسب سمجھا اور جو بھی پہلا زاویہ مجھے نظر آیا میں اس زاویے میں گم ہو گئی کوئی جانا پہچانا راستہ نہیں اختیار کیا تھا میں نے بس مجھے ایلی گوس کے سامنے سے غائب ہونا تھا۔ وہ زاویوں کا علم نہیں جانتا تھا۔ لیکن اپنے گیان سے اس نے یہ پتہ لگا لیا کہ میں کس سمت گئی ہوں اور اس نے اسی سمت کا سفر شروع کر دیا۔

میں سچ سچ اس سے ڈر گئی تھی میں نے ہواؤں میں اور فضاؤں میں اپنا ٹھکانہ بنایا بلکہ ایک اندھیرے غار کا رخ کیا اور غار میں جا چھی۔ جس وقت میں اس غار میں داخل ہوئی دن کی روشنی تھی لیکن غار میں اندر سے بھیا نک تاریکی تھی۔ ایلی گوس میرا پہچان کر رہا تھا اور میری خوشبو سونگھتا پھر رہا تھا۔ میں درحقیقت ڈر گئی تھی کیونکہ جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس نے مجھے دباؤ نہ کر دیا تھا۔ میری ساری کوششیں ساری قوتیں اس جگہ ختم ہو جاتی تھیں جہاں میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے مجسمے کی شکل اختیار کر لیتی۔

ذرا سوچو ڈیڑھالی عالی مجھے موت نہیں ہے اور میں صدا جیتی رہوں گی لیکن کس انداز میں..... ایلی گوس مجھ سے انتقام لینے میں حق بجانب تھا کیونکہ میں نے اس سے اس کی قوتیں چھین لی تھیں۔

غار میں کافی سے گزار لیا پھر رات میں ایک پتھر لی زمین پر بیٹھ کر ایک جگہ لیٹ کر سوچنے لگی کہ ایلی گوس سے پیچھا کیسے چھڑایا جاسکتا ہے۔ پھر نجانے رات کا کون سا سے تھا مجھے نیند آ گئی تھی اور میں گہری نیند سو رہی تھی کہ دفعتاً ہی میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ ایسی آہٹیں ابھری تھیں میں دہشت سے سکو گئی میرا خیال تھا کہ ایلی گوس آخر کار میرا پتہ پانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا جو غار دن کی روشنی میں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اب وہاں مدھم مدھم روشنی ہوتی جا رہی تھی اور اس روشنی میں میں نے کچھ بوڑھے آدمیوں کو دیکھا۔ وہ گردن سے لے کر پیروں تک لبادوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کے چہرے روشنی میں نمایاں تھے۔ آہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ جانتے ہو ان میں سے کچھ شناسا چہرے کون سے تھے؟

میں چونکہ یونان میں کافی سے بتا چکی تھی اور یونان کی تاریخ سے مجھے پوری طرح شناسائی حاصل تھی اس لئے میں نے انہیں پہچان لیا ان میں سے ایک افلاطون تھا۔ دوسرا بطلیموس تیسرا ابقراط چوتھا سقراط اور اس کے علاوہ کچھ ایسے اجنبی جنہیں میں نہیں جانتی تھی لیکن ان کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ یونان کی قدیم تاریخ کے کچھ اہم کردار ہوں گے۔ وہ سب میری ہی جانب نگراں تھے اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ میرے قریب پہنچ گئے۔ غالباً وہ بطلیموس تھا جس نے مجھ سے اٹھنے کے لئے کہا۔ سب کے چہروں پر فکر مندی کے آثار تھے۔ بطلیموس بولا۔

”سنو! ہم تمہیں جانتے ہیں تم کو روتی ہو کیا ہم نے غلط کہا؟“

میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولی۔ ”نہیں.....“

تب سقراط آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ ”کوروٹی تم کوئی نوجوان لڑکی نہیں ہو اپنا اچھا برا سب سمجھتی ہو۔ ایلی گوس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے وہ چیخ چیخ کر تمہیں پکارتا پھر رہا ہے وہ ہواؤں سے مدد مانگ رہا ہے وہ فضاؤں سے باتیں کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کریں۔ وہ اس غار میں آ سکتا ہے وہ تمہیں پاس سکتا ہے لیکن میں تمہیں ایلی گوس سے بچنے کی دعوت دیتا ہوں تمہیں ہمارا کام کرنا ہوگا اور تم اس سے بچ سکتی ہو۔“

میں جانتی تھی کہ یہ قدیم رجس ہیں جو یہاں میرے گرد جمع ہو گئی ہیں میں نے خود کو سنبھالا اور ان سے سوال کیا کہ وہ کون سا ایسا عمل ہے جس کے تحت ایلی گوس سے اپنا جیون بچا سکتی ہوں۔ تب سقراط کہنے لگا۔

”میرا شاگرد سکندر اس وقت ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہے اس کی محبوب ہستی اصنا کیہ جو اس کی بیوی ہے کم ہو گئی ہے۔ سکندر کہیں مصروف ہے لیکن اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ اصنا کیہ لاپتہ ہے۔ اس نے اپنے خاص آدمیوں کا ایک دستہ اصنا کیہ کی تلاش پر مامور کیا ہے اور وہ اسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ سکندر کو جو کچھ کرتا ہے وہ تاریخ کا بہت بڑا حصہ بننے والا ہے۔ لیکن اگر اصنا کیہ اسے نہ ملی تو خیال ہے کہ وہ دلبرداشتہ ہو جائے گا اور اس کے بعد تاریخ نجانے کون سا رخ اختیار کر لے۔

لیکن کوروتی اصنا کیہ زندہ نہیں ہے وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر مر چکی ہے اور اس کی لاش اسی غار میں ہمارے پاس محفوظ ہے، ہم غور کر رہے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بہت سی باتوں کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ وہ کس حیثیت کی حامل ہوئی ہیں کیونکہ ہم اس دنیا سے دور نکل چکے ہیں اور ایک نئی دنیا کے مسافر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کوروتی کہ تیرے پاس پوشیدہ علوم ہیں اور تو آب حیات پی چکی ہے یعنی تو زندہ رہنے والوں میں سے ہے جو علم تیرے پاس ہیں ان میں سے ایک علم یہ بھی ہے کہ تو مردہ اجسام میں داخل ہو کر ان کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ تو بالکل اتفاقیہ طور پر ادھر نکل آئی ہے۔

لیکن یہ گیلیاس پیش گوئی کر رہا ہے کہ بہت جلد اصنا کیہ کی زندگی کے لئے ایک حل نکلے والا ہے۔ یہ ستارہ شناس ہے اور یونان کی تاریخ میں گیلیاس کا نام ایک ستارے کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ یونانیوں کا کہنا ہے کہ گیلیاس کی راتیں کہکشاں میں ستاروں کے ساتھ گزرتی ہیں اور وہ ان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے تو گیلیاس ستارہ شناس نے یہ بتایا کہ ایک عورت آنے والی ہے جو ان مشکلات کا حل بنے گی۔ اگر تو ابلی گوس سے نجات چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ ابلی گوس تیرا پتہ نہ پاسکے اور تجھ سے اپنا انتقام نہ لے سکے تو تو اصنا کیہ کے قالب میں چلی جا اور اس کی حیثیت سے دو قاعدے حاصل کر پہلا یہ کہ ابلی گوس سے محفوظ رہ جائے گی دوسرا یہ کہ سکندر کی زندگی کا ایک اہم باب شروع ہو جائے گا اور وہ پورے اطمینان سے وہ سب کچھ کر سکے گا جو تاریخ کا منصب ہے۔“

ذیشان عالی زندہ انسان کے ذہن میں خوف کا عنصر بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے سانس لینے کا۔ درحقیقت جسم کے مختلف حصے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک حصے کا الگ الگ کام ہوتا ہے اور اس کے بغیر اجسام مکمل نہیں ہوتے تو خوف بھی ایک وجود ہے جس کی مثال یہ ہے کہ ایک نوزائیدہ بچے کو جسے دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا سوائے ان دو چیزوں کے یعنی ایک بھوک جس میں وہ روتا ہے یہ اس کی طلب ہے جو آنسو اور آواز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرا خوف تم ایک چھوٹے سے بچے کے قریب ایک زور کی آواز پیدا کرو تو وہ اچھل پڑتا ہے یعنی اس کے خیر میں خوف کا جو عنصر ہے وہ نومولودیت کے ساتھ بھی ہوتا ہے تو میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ابلی گوس کے تاثر سے مجھے بھی خوف کا احساس ہوتا تھا اور میں ایک پتھر یا زندہ مجسمہ نہیں بننا چاہتی تھی۔

سو میں نے ان دنیا سے چلے جانے والے مفکروں کی وہ تجویز قبول کر لی اور انہوں نے مجھے اصنا کیہ کا وہ جسم دکھایا جو وہیں اس غار میں موجود تھا اور ابدی نیند سو رہا تھا۔

کیا ہی حسین عورت تھی۔ ایسے دلکش یونانی نقوش کہ آنکھیں ان پر جم کر رہ جائیں اور پھر جواں مرد سکندر جس کی کہانیاں میرے کانوں تک پہنچ چکی تھیں مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا اور میں نے اپنے گیان سے کام لے کر اصنا کیہ کے قالب میں داخل ہونے کا عمل شروع کر دیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس کے روپ میں اچھ کھڑی ہوئی۔

پراسرار بوڑھے مجھے اس طرح اٹھتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ انہوں نے اس فاتح اعظم سکندر کو نئی زندگی دے دی۔

اس وقت میری سب سے پہلی طلب بھوک تھی جس کا میں نے ان لوگوں سے اظہار کر دیا اور آخر کار تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں سے سکندر کے لوگوں نے مجھے دیکھ لیا اور خوشیوں میں ڈوب کر مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔

میں ایک دلکش حیرت سے دو چار تھی اور سوچ رہی تھی کہ آنے والا وقت میرے لئے کتنی دلچسپی کا حامل ہوگا میں نے اپنے اندر اصنا کیہ کی فطرت اور اس کے ماضی کا جائزہ لیا اور چونکہ اب میں اصنا کیہ تھی اس لئے اس کے بارے میں اب میں سب کچھ جانتی تھی۔

اصنا کیہ کو فارس کے تاریک ایام میں اپنے وطن کی مدد کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور وہ یعنی بعد میں باختر کے گورنر کی پہلی اولاد تھی میرا یعنی اصنا کیہ کا باپ شاہ فارس کی سلطنت میں سکودیہ کا حکمران تھا۔ ان دنوں فارس کی حکومت ایشیا کے ایک تہائی حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میری ماں سینی رامس ایک اعلیٰ خاندان کی بیٹی تھی جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا اور وہ میرے باپ کی پہلی بیوی تھی۔

وہ کس دلچسپ کہانی کا آغاز ہوا ہے اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں ذیشان عالی کہ صدیوں کے اس سفر میں ایک قدیم روح کا سفر بہت ہی دلکش اور دلچسپ تھا اور چونکہ میں خود بھی تاریخ کی دیوانی تھی اس لئے مجھے اپنے اس نئے روپ سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

فارس کا قدیم اور تاریخی شہر شرد چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے حسن پر جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ اسی خوبصورت شہر کے ایک پر شکوہ محل میں میرے والدین کی رہائش تھی۔ محل کی دیواریں چکنی اور رنگین اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے سرخ اور فیلے رنگ کے درمیان بنے ہوئے سنہری ستون اور چمکتے رنگ برنگ نقش و نگار منامی کے نادر نمونہ تھے۔ شاہ دار پوش سوئم کے دور حکومت کے آٹھویں سال میں چوتھے ماہ کی چھٹی تاریخ کو میں نے اصنا کیہ کی حیثیت سے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں نے محل کے اس اندرونی حصے میں بسر کئے جو حرم کہلاتا تھا۔ ویسے مجھے اپنے باپ کو بہت کم دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ میں جب پانچ برس کی تھی تو ایک دن وہ بڑے غصے میں اندر آیا اور اس نے میری ماں سے کہا کہ اس نے معبد سے اجازت لے کر مجھے اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تب میری ماں نے حیرت زدہ ہو کر کہا کہ لڑکی کس طرح جانشین ہو سکتی ہے لیکن میرے باپ نے ماں کی بات رد کر دی اور جواب دیا کہ وقت یہی کہتا ہے کہ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ چار بیویوں اور کنیزوں سے میرے باپ کی چوبیس اولادیں ہوئیں لیکن سب کی سب لڑکیاں تھیں۔ وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے اور پھر بڑے معبد نے جو اس دور کے مذہبی رہنما تھے اس کی اجازت دے دی تھی اس لئے میرے باپ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر کے کہا خدائے ہرمز کو یہی منظور ہے تو اصنا کیہ ہی میری جانشین بنے گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ لڑکا ہوتی تو پانچ برس کی عمر میں معبد کے پاس تربیت کے لئے جا چکی ہوتی اب یہ میری جانشین بن چکی ہے اس لئے آئندہ زندگی اسے لڑکے کی طرح بسر کرنا ہوگی۔ ذیشان عالی اس نے یعنی میرے باپ نے یعنی اصنا کیہ کے باپ نے مجھے اٹھا کر اپنے گھٹنے پر بٹھالیا اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اصنا کیہ! آج سے تو میری جانشین ہے میری ساری دولت، ملکیت محل اور خزانے آج سے تیرے ہیں لیکن تجھے ان کی حفاظت کے لئے بہت کچھ سیکھنا ہے میں چاہتا ہوں کہ تو بیٹے کی طرح میرا نام روشن کرے۔“

آہ ذیشان عالی ذرا سوچو کیا ہی دلکش اور دلچسپ منظر تھا جب میں اپنا بچپن دیکھ رہی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ اس کے زانو پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مجھے مستقبل کے لئے نصیحتیں کر رہا تھا۔



میرا باپ بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا، لیکن ماں میری جدائی پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایک طرح سے میں اس سے دور ہی ہو رہی تھی۔ مجھے محل میں بنی ہوئی عبادت گاہ میں بڑے معبد کی رہائش گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں میری رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میرا بستر ایک چھوٹی سی میز کپڑے رکھنے کی چوب ضرورت کے سامان اور کنیز کے سونے کے لئے لکڑی کا ایک تختہ تھا۔ میری کنیز امتارہ بڑی بد صورت تھی، عبادت گاہ میں خوبصورت کنیزیں نہیں رکھی جاتی تھیں تاکہ پجاریوں کے جذبات قابو میں رہیں اور میرے استاد کا نام باروس تھا۔

میری تعلیم زرتشت مذہب کے بنیادی اصولوں سے ہوئی جن کے مطابق حضرت زرتشت خدا کے پیغمبر تھے۔ ان کا ظہور ایک ہزار سال قبل ہوا تھا۔ زرتشت دین کی مقدس کتاب اوستا تھی جس کی ایکس جلدیں سونے سے لکھی ہوئی تھیں۔ یہ مقدس کتابیں شہر کی پولیس کے شاہی خزانے میں محفوظ تھیں۔ میرے استاد نے اپنے درس میں مذہب کے جو اصول بتائے ان کی بنیاد نیک گفتار، نیک کردار اور نیکیوں کے تمام اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ مذہبی رہنماؤں کا ایک علیحدہ قبیلہ تھا جسے مغ کہتے تھے۔ میرے معبد بھی مغ کے درجے پر فائز تھے۔ پجاریوں ہوا کہ میری تعلیم کے ابتداء کے کچھ ہی عرصے کے بعد میرے باپ کو اپنا جانشین مل گیا یعنی وہ بیٹا جو میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور جس کا نام راوش رکھا گیا۔ میں اپنے بھائی سے حسد کرنے لگی، لیکن میرے استاد نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ والدین کی محبت کا سمندر بہت گہرا ہوتا ہے تو فکر نہ کر خدائے بزرگ و برتر نے تجھے پہلے منتخب کیا ہے اپنے باپ کی جانشین تو ہی رہے گی۔ میں نے مقدس آتش کدے کے سامنے سورج طلوع ہونے کا منظر دیکھا، کیونکہ زرتشت مذہب کی عبادت اس وقت کی جاتی تھی اور عبادت کے موقع پر مذہبی کلمات پڑھے جاتے تھے۔ پھر سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی تیز دھار خنجر قربانی کے تیل کی شہ رگ کاٹ دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ میں اس ہولناک منظر سے خوفزدہ ہو کر رونے لگی، لیکن آہستہ آہستہ اس خوبی نظارے کی عادی ہو گئی۔

ذیشان عالی میں پوری دلچسپی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی البتہ مجھے چودھویں سالگرہ کے بعد ایک اور استاد کے سپرد کر دیا گیا، ماں نے مجھے بتایا کہ میری عمر چودہ برس ہو چکی ہے چنانچہ مجھے نسانی تعلیم کے لئے حرم میں واپس طلب کیا گیا ہے۔ میں نے سخت احتجاج کیا لیکن ہدایت تھی کہ مجھے حرم میں واپس جانا ہے اتنے عرصے تک لڑکے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے بعد مجھے حرم کا ماحول بے حد ناگوار محسوس ہوا۔ عود و عنبر کی تیز خوشبو خواجہ سراؤں کی بے سری آوازیں اور بچوں کی مسلسل چیخ و پکار سے میرے نا آشنا کان ناواقف ہو چکے تھے لیکن اب یہ سب کچھ مجھے سنائی دے رہا تھا اور مجھے بے حد ناگوار تھا۔ میری ماں کی محل سرا میں شاہانہ سجاوٹ تھی، دیواروں اور دروں پر سنہرے تاروں سے بنے پردے، چھتوں پر خوب صورت جھاڑ فائوس، نمائیں نرم و گداز گدے کھانے کے لئے اعلیٰ ترین غذا میں اور کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی خوشامداندہ خدمت گزاریاں یہ سب میرے سامنے لایا جا رہا تھا۔ حال میں انہیں دیکھنا میرے لئے ایک ناپسندیدہ عمل تھا جبکہ ماضی میں نجانے میں کن کن لمحات سے گزر چکی تھی۔

پھر ایک دن میری ماں نے مجھ سے کہا۔

”اصنا کیہ ایک بہت بڑی خوشخبری ہے تیرے لئے۔“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”تو نے سکندر کا نام سنا ہے؟“

میں نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا نجانے وہ کیا کہنا چاہتی ہے تاہم میں نے اس سے کہا۔ ”ہاں ماں! مجھے یہ نام بتایا گیا ہے، وہ مقدونیہ کے شاہ فلپ کا بیٹا ہے، یونان کو فتح کرنے کے بعد اس نے ایشیا کا رخ کیا ہے اور اس نے ہمارے شاہ

فارس کی فوجوں کو بھی جنگ میں حیرت انگیز طور پر شکست دے دی ہے لیکن آپ کس خوشخبری کا ذکر کر رہی ہیں۔“

”شاہ فارس نے اعلان کیا ہے کہ اب وہ سکندر کو شکست دینے کے لئے خود فوج لے کر جائیں گے اور اس کے لئے پورے ملک سے افواج کو جمع کیا جا رہا ہے۔ آج تمہارے باپ کو بھی وہ فرمان لا کر دیا گیا ہے جس کے مطابق شاہ نے بائل میں تمام سرداروں کو طلب کیا ہے تاکہ سکندر کو شکست کے لئے جنگی تیاریوں کو آخری شکل دی جاسکے اس لئے ہم سب بائل جا رہے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”نجانے کیوں میرے دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔“ بائل! ہم واقعی بائل جا رہے ہیں۔“

”ہاں میری بیٹی! کیا تو نے واقعی بائل کے بارے میں تفصیل سنی ہے۔“

”ہاں میں جانتی ہوں بائل دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے اور فارس کی آخری سرحدوں پر واقع ہے لیکن ماں! ہم کب تک وہاں چلیں گے؟“

میرے سوال پر میری ماں نے ہلکا سا ہتھکڑ لگا دیا اور بولی۔ ”پگلی نام سن کر ہی اتنی خوش ہو رہی ہے لیکن بائل شہر میں تجھے دربار شاہی میں بھی حاضری دینا ہوگی یہاں سارے ملک کے امراء، سردار اور خاندان شاہی کے افراد موجود ہوں گے تیرے باپ کی خواہش ہے کہ اصنا کیہ اس انداز میں وہاں داخل ہو کہ اس کے حسن و جمال کی روشنی سب کو سحرزدہ کر دے۔ خدائے تجھے ایسا حسن دیا ہے جو مرد کی نگاہوں کو خیرہ کر دے تیرے بدن کو اس انداز میں تراشا ہے کہ بیٹس کا جینا جاگتا وجود سامنے محسوس ہوتا ہے۔ تیرے حسن میں وہ کدو ہے کہ مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے لیکن خیال رکھنا میری بیٹی! حسن کو ہمیشہ آرائش کی ضرورت ہوتی ہے تجھے اچھی لباس پہننے کا سلیقہ سیکھنا ہے اور دربار شاہی میں نشست و برخاست پر گفتگو کے آداب کی تربیت بھی حاصل کرنی ہے اس کے لئے میں نے بندوبست کر دیا ہے۔“

جو بندوبست میری ماں نے وہاں کیا تھا وہ یہ تھا کہ مجھے خواجہ سرا موسال اور مشاطہ کے حوالے کر دیا گیا، انہوں نے میرے حسن کو بے حجاب کیا تو میں خود محسوس ہو گئی۔ درحقیقت ذیشان عالی میں اپنی زندگی کے اس دور کو کبھی نہیں بھول سکتی جب میں نے خود اپنا اجنبی بدن دیکھا جو میرا نہیں درحقیقت ادھار کا بدن تھا تو میں اس کی دیوانی ہو گئی، میرا یہ جسم سنگ مرمر کی طرح شفاف اور بلوریں تھا۔ ایک ایک انگ قدرت کی صنائی کا نمونہ تھا۔ پھر مجھے وہ سب کچھ سکھایا گیا جو ایک عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جس کے بغیر اس کی زندگی حقیقی مسرتوں سے محروم رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور آخر کار روانگی کی صبح آگئی۔

ذیشان عالی میں صدیوں پرانی روح بلکہ ایک زندہ وجود ایک اجنبی بدن کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور یہ سفر اس قدر دلکش تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ فتم نہ ہو لیکن ستائیس دن تک ہمارا یہ قافلہ بلند پہاڑی راستوں، تنگ دروں، خطرناک گھاٹیوں اور جھلتے ہوئے ریگستانوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا، جب سفر کے دوران دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت ہو جاتی تو دن کو قیام کیا جاتا اور رات کو سفر تاریکی کی بنا پر مشعل بردار سوار ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ رہنمائی کرتے۔ ہم اس قدیم راستے پر سفر کر رہے تھے جو سائرس اعظم نے اختیار کیا تھا۔ باختر کی کارواں سرائے میں قیام کر کے ہم نے پھر آریہ جا کر دم لیا۔ سوسا پری پولیس اور بائل سے آنے والے قافلے ہمیں ان کارواں سرائوں میں ملتے رہے ان کے ذریعے ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ موسم سرما میں آرام کرنے کے بعد اب سکندر نے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ حملے کر کے ایشیا میں پیش قدمی شروع کر دی ہے اور اب پورا فارس اس بات کا منتظر تھا کہ کب شاہ دارا اپنی فوجوں کے ساتھ آگے بڑھ کر سکندر کی سرکوبی کرتا ہے۔

اب تک ہم آرام سے سفر کرتے چلے جا رہے تھے۔ پھر ایک رات جب تاریکی اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ بھائی دے ہمارے کتوں نے اچانک زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا اور اسی کے ساتھ بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آتی سنائی دیں۔ پتہ چلا کہ ڈاکوؤں نے اچانک حملہ کر دیا ہے فوراً ہی ہمارے مسلح سواروں نے عورتوں کو سونے اور قیمتی سامان سے لدے ہوئے خچروں کے گرد حفاظتی ڈیرہ ڈال دیا ڈاکوؤں کا حملہ بہت شدید تھا۔ اس وقت میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میری چھوٹی بہن مجھ سے لپٹی ہوئی تھی کہ ہم نے بیٹریوں کی طرح خوفناک ڈاکوؤں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے بالوں میں ڈھکے ہوئے تھے اور وہ ہمارے محافظوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی میں نے ڈاکوؤں کے سردار کو حصار توڑ کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکوؤں نے خوب صورت کینیزوں کو گاڑیوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے گھوڑوں پر بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن سردار کا رخ ہماری گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا لیکن ایسا کوئی عمل ذہن میں نہ آیا جس سے سردار سے رہائی حاصل کر سکتی ہو۔ غور و فکر والا سردار تیر کی طرح ہماری گاڑی پر چھٹا اور دوسرے ہی لمحے میری کلائی اس کی آہنی گرفت میں تھی میری بہن اور میری ماں نے اپنے بالوں کی ٹوکیلی پن اس کے بازو میں چھوئیں لیکن اس جنگلی پر جیسے اثر ہی نہ ہوا۔ وہ ایک زوردار قہقہہ مار کر چلا یا۔

”ارے واہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھے مل گئی ہے۔“ اس نے مجھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن میری ماں اور میری بہن میرے جسم سے لپٹ گئیں اس وحشی نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے گھسیٹ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا، لیکن اس جدوجہد میں میرے باپ کو نہ دیکھ سکا جو جھپٹ کر اس کے سر پر پتھر پھینک چکا تھا۔ اس کے تیز دھار پیٹنے نے ایک ہی وار میں ڈاکوؤں کے سردار کی گردن تن سے جدا کر دی اپنے سردار کو گرتے دیکھ کر ڈاکوؤں نے راہ فرار اختیار کی اور تھوڑی ہی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد ہمارا سفر پھر سے آگے جاری ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے اس حملے میں میں نے محسوس کیا تھا ڈیٹان عالی کہ مجھے کوئی نقصان بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔ جس منزل کی جانب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور جہر سفر میرے لئے ضروری تھا اس میں رکاوٹ پیش آ جاتی۔ مجھے تو جس منصب کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ میں اس کی تکمیل کر کے اہلی گوس سے چٹا چاہتی تھی اور اس سے چھینے ہوئے علم کو اپنے لئے مستحکم کرنے کی خواہش مند تھی۔ راستے میں سکندر کی مسلسل پیش قدمی کی خبریں ملتی رہیں البتہ میں نے کسی سے پوچھا کہ آخر سکندر کی ان فتوحات کا سبب کیا ہے تو مجھے بتایا گیا کہ سکندر پر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔ یونانیوں میں ایک روایت یہ بھی ہے ڈیٹان عالی کہ دیوتا زپوس کو سکندر کی ماں اولیمپس سے عشق ہو گیا تھا پھر ایک دن زپوس سانپ بن کر اس کے بستر پر سو گیا اور سکندر کی پیدائش اسی کا نتیجہ ہے اس بات کو سننے کے بعد اس نے اعتراض کیا کہ سانپ کو زپوس دیوتا تو نہیں کہا جاسکتا میرے اتالیق نے ہنس کر مجھے جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی یہ سب محض روایتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یونانی فوج بڑی دلیر اور فن حرب سے واقف ہے سکندر کی تربیت یونان کے مشہور فلسفی ارسطو جیسے عالم نے کی ہے۔“

”مجھے ایک بات بتائیے اتالیق اعظم کیا شاہ دارا اس کی فوجوں کو عبرت ناک شکست دے سکیں گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو حالانکہ شاہ دارا کی فوجوں کی تعداد سکندر کی افواج سے بہت زیادہ ہے، لیکن بد قسمتی سے ہماری فوجیں کرائے کی ہیں۔“ اتالیق کے لہجے کی فکر مندی نے مجھ پر ایک عجیب سا تاثر قائم کیا اور میں سکندر کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں جنہیں ایک بات بتاؤں ڈیٹان عالی عورت بھی عجیب چیز ہوتی ہے حالانکہ میں جس ملک اور جس وطن

سے تعلق رکھتی تھی وہ سکندر کے دشمنوں کا دیس تھا۔ لیکن سکندر اعظم کی بہادری اور اس کے متعلق بیان کی جانے والی داستانوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں اصنا کیہ کی حیثیت سے جاگتی آنکھوں اس کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ کیسا ہو گا؟ یونان کے حسن و جمال کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ وہاں کھڑے کھڑے نقوش کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ دلکش شخصیتوں کے مالک تو اپنے دشمن کے خواب مجھے نظر آنے لگے تھے لیکن تم ہنسو گے کہ میں اس کی دشمن بھی نہیں تھی میں تو اپنی زندگی بچانے کے لئے اس روپ میں سفر کر رہی تھی۔

”ارے یہ تمہارے چہرے کے تاثرات کیا بتا رہے ہیں؟“ اچانک ہی کوروتی نے کہا اور میں چونک پڑا، مجھے بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے میں دارا کی فوجوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں راستے کا ہر منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں خود اس لشکر کا لشکر ہی ہوں، بس یہ بھی شاید کوروتی کے طرز گفتگو کی خوبی تھی کہ انسان اس ماحول میں کھو جائے، بھی میں نے چونک کر کہا۔

”کیا ہوا کوروتی؟ تم نے کیا محسوس کیا میرے چہرے سے۔“

کوروتی ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”میں صدیوں سے جی رہی ہوں ڈیٹان عالی صدیوں کا تجربہ میرے وجود میں بہت ہے لیکن میں جنہیں ایک بات بتاؤں انسانی فطرت۔ شاید جب سے انسان وجود میں آیا ہے یکساں رہی ہے اس کے اندر حسن پرستی خود پسندی اور کسی بھی چیز سے متاثر ہونے کے جذبے اتم حیثیت رکھتے ہیں جب میں سکندر اعظم کا تذکرہ کر رہی تھی تو میں نے تمہارے چہرے پر رقابت کا تاثر محسوس کیا، تم سکندر اعظم کی تعریف سے خوش نہیں ہوئے تھے۔“

میں نے اسے دیکھا اور پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی واقعی میں تھوڑی سی جلن محسوس کرنے لگا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کوروتی اب میری محبوبہ تھی چاہے خود فراموشی ہی کی بات کہہ لی جائے یعنی کہاں میں اور کہاں وہ ہزاروں سال پرانی شخصیت جو بے شک انسانی جسم رکھتی تھی، لیکن اگر اس کی زندگی کی تاریخ پر غور کر لیا جائے تو انسان کو اپنے آپ پر ہنسی آنے لگے لاکھوں سال کی یہ عورت موجودہ زندگی میں میری محبوبہ تھی اور میں اس سے بہت متاثر تھا۔ میری ہنسی پر وہ بھی ہنسنے لگی پھر بولی۔

”میں نے کہا تا تم آج کی بات کر رہے ہو میں لاکھوں صدیوں سے ان تمام کیفیات سے دوچار ہوتی ہوئی آئی ہوں

یہاں انسان اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر سکتا۔“

”آہ میں بیچارے گوتم بھسالی پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھی تمہارے ساتھ لاکھوں صدیوں سے سفر کر رہا ہے۔ صرف تمہاری محبت میں ورنہ جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بھی بے شمار علوم ہیں اور ان علوم کے ذریعے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، لیکن وہ دیکھ لو اس کائنات میں جب عشق کی کہانیاں جنم لیتی ہیں تو پھر ایسے ہی انوکھے واقعات وجود میں آتے ہیں محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور محبوب کا تصور اس کے لئے اس کی زندگی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اگر راستے میں آنے والے کسی بھی شخص سے وہ نفرت کرتا ہے تو اس میں وہ غلط نہیں ہے چونکہ یہ بھی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔“

”میں تم سے اتفاق کرتی ہوں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“

”چلو آگے بڑھو میں سکندر کی فوجوں کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ سکندر اور دارا کی جنگ کس طرح سے وجود میں آئی اور

اس میں کیا ہوا؟“

کوروتی میری اس دلچسپی سے بہت خوش ہوئی اس نے کہا۔ ”یوں کرو کہ جب میں اپنی داستان دوبارہ شروع کروں تو تم میری آنکھوں میں دیکھتے رہو ورنہ برابر یہ احساس نہیں ہو گا کہ تم اس دور کا کوئی کردار نہیں ہو۔ اس بار جب ہم

سے فارغ ہو گئی۔ میرے رزق برق لباس اور کھرے ہوئے حسن کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرا دی، پھر بولی۔  
”تمہارے باپ کو شاہ کے دربار میں حاضری دینا ہے اصنا کیہ! اس لئے آج رات خوب آرام کر کے سفر کی تھکن دور کر لو، کل ہم باہل کی سیر کو چلیں گے۔“

لیکن ذیشان عالی مجھ میں انتظار کی تاب نہیں تھی۔ میں یہ رات آرام کر کے ضائع کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اب تک جو کچھ دیکھا تھا اور جو کچھ تم نے میری آنکھوں سے دیکھا مجھے بتاؤ کیا وہ نظر انداز کرنے کے قابل تھا۔ اپنی بات تو میں یوں کہوں گی کہ مجھے باہل کے حسن نے دیوانہ کر دیا تھا اور میں یہ رات باہل کی رونقیں دیکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میرا اتالیق پہلے ہی باہل کے کاهنوں سے ملنے جا چکا تھا اور میں جانتی تھی کہ میری ماں رات کو کسی اور کے ساتھ مجھے سیر کی اجازت نہیں دے گی۔ اس لئے میں نے ان سے بحث کرنا فضول سمجھا۔ میری بے تابی اس درجے تھی کہ اس وقت کوئی قوت میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی لیکن میرے لئے باہل کی سیر کا صرف ایک راستہ تھا۔ مجھے رازداری کے ساتھ باہل کی کسی کنیز کا سہارا لینا ہوگا، میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور پھر میری نگاہ انتخاب اس کنیز پر پڑی جس نے بڑی خوبصورتی سے میرے بدن کی مالش کی تھی۔ اگر میں اسے دوست بنا لوں تو ہو سکتا ہے وہ کسی تدبیر سے مجھے خفیہ طور پر محل سے باہر لے جاسکے اور میں اس شہر عجیب کی رنگا رنگ رونقوں کا نظارہ کر سکوں۔ یہ کنیز بہت خوب صورت تھی اور اس کا سڈول جسم شباب کی فتنہ سامانیوں سے پھنپھناتا تھا۔ میں نے اس پر حیرت بھرا دیا اور بڑے محبت بھرے انداز میں بولی۔

”لڑکی! تیرے ہاتھ میں جادو ہے تو نے جس طرح میرے بدن کا مساج کیا ہے میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے اس سے کتنا سکون ہوا، کیا نام ہے تیرا؟“

”مجھے صبا کہتے ہیں شہزادی!“ کنیز نے خوش ہو کر کہا۔

”صبا تو بھی کسی شہزادی کی طرح حسین ہے، تجھے دیکھ کر تو مرد دیوانے ہو جاتے ہوں گے لیکن ایک بات مجھے بتا؟“

”کیا شہزادی عالیہ؟“ وہ میرے ایک ایک لفظ سے خوشی سے پھولی جا رہی تھی۔

”کیا تو غلام پیدا ہوئی تھی؟“ میں نے سوال کیا تو اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی اداسی کی لہر پیدا ہو گئی، اس نے کہا۔

”نہیں شہزادی، میں تو آزاد پیدا ہوئی تھی لیکن میرا باپ بہت غریب آدمی تھا۔ ہم بارہ بہنیں تھیں اس لئے اس نے دولڑکیوں کو فروخت کر دیا، مجھے جس شخص کے ہاتھوں فروخت کیا گیا تھا وہ ایک بد صورت اور عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بد بخت جب تک زندہ رہا میرے حسین جسم کو کتے کی طرح لوچتا رہا، لیکن شکر ہے جلدی مر گیا اس کے بعد مجھے غلام بنالیا گیا اور میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس شخص نے مجھے غلام بنایا وہ اسی حرم میں رکھیں خواجہ سرا ہے، لیکن میرے لئے وہ بے حد مہربان آقا ہے، اس نے مجھے کبھی عام کنیزوں کی طرح نہیں سمجھا۔ پچھلے پانچ برس سے میں بڑے عیش و آرام سے ہوں۔ میرا مالک مجھ پر بڑا بھروسہ کرتا ہے۔ خفیہ کاموں کے لئے وہ ہمیشہ مجھے ہی شہر میں بھیجتا ہے اور آج رات بھی مجھے اس کے ایک کام سے جانا ہے۔“ ذیشان عالی اسے کہتے ہیں تقدیر کا کھیل، جس بات کے لئے میں نے اسے اتنا قریب بلایا تھا وہ خود بخود ہو گیا، تب میں نے رازداری سے اس سے کہا۔

”میرا دل بھی باہل کا حسن دیکھنے کے لئے بے قرار ہے صبا، کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی؟“

”آپ کو شہزادی؟“ صبا کے دل میں خوف بیدار ہو گیا، پھر اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”میں جس جگہ جا رہی ہوں وہ باب نینا کے باہر واقع ہے، آپ کو اس جگہ لے جانا بہت خطرناک ہوگا کیونکہ رات کو باہل میں چور اور رہزن گھومتے رہتے ہیں۔“

صدیوں میں داخل ہوں گے تو میں تمہیں کوئی وجود نہیں دے سکوں گی، کیونکہ میں خود وہاں ایک ایسے وجود میں سفر کر رہی ہوں جو کوروتی کا وجود نہیں ہے بلکہ ادھار کا بدن ہے جسے جینا ہے۔“

”تمہاری باتیں بے شک ابھی ہوئی ہیں جب زندہ صدیاں کتابی شکل میں آئے گی اور لوگ اسے پڑھیں گے تو اس کے بعض واقعات میں اس طرح الجھ جائیں گے کہ ان کا ذہن ان واقعات کا کوئی حل نہیں نکال پائے گا، لیکن میں اپنی اس کتاب میں تمہارے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کا تذکرہ کروں گا۔ اپنے احساس کی ہی نہیں تمہارے احساس کی بھی صحیح ترجمانی کروں گا۔“

”آہ تمہاری ہر خواہش تمہاری زندگی میں پوری ہو جائے، میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے اور کبھی کبھی ذیشان عالی کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہم جس کو چاہتے ہیں اسے اپنے ساتھ دور تک نہیں لے جاسکتے کیوں کہ وہ فنا کا مقام رکھتا ہے اور وہ میرے ساتھ جی نہیں سکتا، خیر چلو چھوڑو آؤ میری آنکھوں کے راستے سکندر کے دور کا سفر کرو۔“ اس نے کہا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں، درحقیقت مجھے یوں لگا جیسے میرے اطراف میں تاریخی رنگ بکھرتا جا رہا ہو، یہ بھی شاید گزرے لمحات کا کوئی تاثر تھا۔ تاریخی رنگ فضا میں پھیلتا چلا گیا اور اس کے بعد جب فضا صاف ہوئی تو میں نے دیکھا کہ دارا کی فوجیں آگے کا سفر کر رہی ہیں باہل کی طرف۔

باہل اس دور میں عالمگیر شہرت کا شہر تھا۔ یہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں دنیا کے گوشے گوشے کے تاجر خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔ سرسبز اور خوبصورت باغات نے شہر کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ شہر کے گرد ایک گہری خندق تھی اور عین درمیان سے دریائے فرات خراماں خراماں بہتا تھا۔ جس میں بحری جہاز اور کشتیاں رواں دواں تھیں۔

یہ عظیم الشان کارواں دروازے سے باہل میں داخل ہوا، میری آنکھیں اس طرح کوروتی کی آنکھوں میں گم ہو گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی سحر میں گرفتار ہو گیا ہوں، میری نگاہوں کے سامنے شہر باہل تھا۔

باہل کے حسن نے مجھے اس طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا کہ میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک جدید ملک کے جدید ترین شہر کے خوب صورت سے گھر میں بیٹھا ہوں جو ایک تحریر نگار ذیشان عالی کا گھر ہے بلکہ میں اس وقت باہل کے حسین مناظر میں گم تھا اور یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ قافلہ شہر کے بڑے بازار میں پہنچا، یہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ مختلف ممالک کے لوگ رزق برق پوشاکوں میں مغموم رہے تھے۔ ان کے خوبصورت چہروں کی دمک سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ہماری منزل آگئی، پھر کوروتی کی آواز ابھری۔

”ہمیں قیام کے لئے جو محل دیا گیا تھا وہ شاہی محل کے بالکل قریب تھا۔ اس کی خوب صورت عمارت چکنے فرش، رنگین نقشیں ریشمی پردے سب بے حد شاندار تھے۔ عورتوں کے لئے ایک حصہ درمیان میں پردے ڈال کر مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہر سمت خوشبو سے فضا مصطر تھی۔ آئینے، میزیں اور مسکریاں انتہائی سخی ہوئی تھیں، لیکن میں بہت تھک گئی تھی۔ میں نے اپنی ماں سے اپنی تھکن کا تذکرہ کیا تو اس نے کسی اور سے کہا اور اس نے فوراً ہی میرے لئے غسل کا انتظام کر دیا۔ کنیزوں نے خوشبودار پانی سے میرے جسم کو غسل دیا۔ باہل کی کنیزیں بھی اپنے فن کی ماہر تھیں۔ انہوں نے چند ہی لمحوں میں مجھے تازہ دم کر دیا۔ جسم کو مساج کر کے ساری تھکن دور کر دی، پھر مشاطہ نے نیل لگا کر میرے بال سنوار دیئے اور مجھے ایسے نرم ریشمیں کپڑوں میں ملبوس کیا گیا جو میں نے واقعی پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ نہ کوروتی کی حیثیت سے اور نہ ہی اصنا کیہ کی حیثیت سے۔ سنگھار سے فارغ ہو کر جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

آہ کم بخت گوتم بھمسالی! تیرا استیلا ناس جائے، اپنی شکل دیکھ بد نصیب اور پھر مجھے دیکھ، بہر حال میری ماں بھی غسل

”مگر میں اس لباس میں نہیں جاؤں گی نہ ہی زیور اور جواہرات پہنوں گی۔ تم مجھے بھی کسی کنیز کا لباس لا کر دے دو بھلا کنیزوں کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے اور سنو انکار نہ کرنا میں تمہیں اس کام کا بھاری انعام دوں گی۔“

”ٹھیک ہے تمہیں یہ ساری تیاریاں کرنی ہیں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”باہر تو خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ہم محل سے باہر نکل پائیں گے؟“

”ہاں میرے پاس خصوصی اجازت نامہ موجود ہے، محل کے دربان اور سنتری مجھے نہیں روکیں گے اور چونکہ آپ میرے ساتھ ہوں گی اس لئے آپ سے بھی کچھ نہیں پوچھا جائے گا بشرطیکہ آپ نقاب میں ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”جیسے ہی سب سو جائیں تو لباس لے کر آ جانا۔“ اور ڈیٹان عالی محل کے پھانک پر دربانوں نے ہمیں روکا لیکن وہ اجازت نامہ جو اس خصوصی پتھر کی لوح کی شکل میں تھا۔ ان کے لئے کافی تھا۔ وہ لوح دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی، میں بے حد خوش تھی۔ میرے پورے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ امنا کیہ کی حیثیت سے میری زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا پہلا اتفاق تھا اور چونکہ میں نے امنا کیہ کو اپنے پورے ذہن اور پورے وجود میں ضم کر لیا تھا اور کچھ وقت کے لئے بھول گئی تھی کہ صدیوں سے جینے والی کوروتی، امنا کیہ کے جسم میں ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں امنا کیہ کے جسم میں عمر کی منازل طے کر کے بچپن سے جوانی تک آئی تھی، بس یہ تجربہ تھا اور یہ تجربہ میرے لئے اتنا دلکش تھا۔ دل چاہتا تھا کہ امنا کیہ کا انجام دیکھوں۔

ہاں ڈیٹان عالی! یہ بات بڑے دکھ کی ہے۔ بے شک میں جانتی ہوں کہ کچھ لوگ میرے اتنے قریب آئے اور انہوں نے میرے ساتھ بڑا وقت گزارا اور بڑا اچھا وقت گزارا، لیکن میں یہ سوچ کر ہی دکھ ہو جاتی تھی کہ آخر کار وہ بوڑھے ہو جائیں گے، چلے جائیں گے۔ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور میں زندہ رہوں گی ان کی یادوں کو ساتھ لے کر، میں تمہیں سچ بتاؤں ڈیٹان عالی! میں نے اس کے لئے بڑا ایک خصوصی عمل کیا ہے، میں نے بہت سے جاپ کئے ہیں۔ ایسے فنکاروں کی مدد سے جو یہ فن جانتے تھے کہ انسانی ذہن کو کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ جو یادوں کی شکل میں انسانی ذہن میں باقی رہ جاتے ہیں انہیں کس طرح اپنے ذہن کے غلیوں سے مٹایا جاسکتا ہے، مجھے معاف کرنا تم خود بھی اس بارے میں سوچو گے کہ اتنا اچھا وقت گزارنے کے بعد میں تمہیں بھول جاؤں گی، لیکن تم مجھے خود بتاؤ حقیقت یہی ہے۔

تو میں بتا رہی تھی کہ اس وقت امنا کیہ کی حیثیت سے محل سے پہلی بار باہر نکل تھی۔ زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا یہ ایک انوکھا اتفاق تھا چنانچہ ہم دونوں آگے چلتی ہوئی ایک کشادہ شاہراہ پر آ گئیں جس کے دونوں جانب مجھوروں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی روشنی میں باہل کا شہر عجائب میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ کوروتی نے خوشی سے صبا کا بازو دباتے ہوئے کہا کہ۔ ”باہل کی ساری رنگینیاں مجھے دکھا دے۔“ وہ شوخ سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

”شہزادی کیا آپ واقعی شہر کی رنگینیاں دیکھیں گی، حالانکہ کہ اس میں خطرہ بہت ہے ایسی جگہوں پر قتل و عصمت دری، چوری اور رہزنی عام ہوتی ہے۔“

میرا دل تو چاہا کہ میں ہنسوں اور اس کو بتاؤں کہ ایسے خطرات کی مجھے پروا نہیں ہے اور میں نے اس سے یہی کہا لیکن مفہوم دوسرا تھا میں نے اس سے کہا۔

”صبا تو اطمینان رکھ، مجھے کسی خطرے کی پروا نہیں ہے۔“

”تو پھر آئیے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

باہل دیکھنے کے شوق نے امنا کیہ کو یعنی مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہم سب سے پہلے بڑے مندر میں گئے۔ صبا نے مجھے بتایا کہ مذہبی روایت کے مطابق ہر عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ زندگی میں ایک مرتبہ کسی اجنبی کے ساتھ سوئے۔ مندر کے پائیں باغ میں بیٹھی ہوئی عورتیں اسی لئے منتظر ہیں یہ باغ آپ جیسی شہزادیوں کے کھومنے کے لئے نہیں ہے۔“

اس کے بعد ہم ایک اور بہت بڑے باغ میں پہنچے وہاں جگہ جگہ درختوں میں لٹکی ہوئی قدیلیں روشن تھیں اور لوگوں کا ایک جھوم میلے کا سماں پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ تماشے اور رقص و سرود کی محفلیں جبی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ بڑا سا سٹیج بنا ہوا تھا جس کے گرد ساز بجانے والے بڑی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے۔ ایک شخص جیج جیج کر لوگوں کو دعوت دے رہا تھا کہ اہل باہل آؤ، مصر کی نامور رقاصہ کے فن کا تماشہ دیکھو۔ ذرا دیر کے بعد ایک لڑکی اسٹیج پر آئی، اس کے رقص میں جادو تھا۔ جھوم تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لڑکی کا قیامت خیز شباب اور پیمان خیز رقص لوگوں کو بدست کئے دے رہا تھا۔ ان کی بے باک دست درازیوں پر ہتھکڑیاں کا شور بلند ہوتا۔ صبا نے میرے کندھے پر ہتھکی دی اور بولی۔

”جلدی چلو شہزادی یہاں سے جلدی آگے بڑھو۔“

تھوڑے ہی مناظر دیکھے تھے کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ باہل واقعی شہر طرب ہے، ہر جگہ بے حجابی تھی، عیش و طرب تھا۔ خوبصورت جوڑے بے باکی کے ساتھ داد عیش دینے میں مصروف تھے۔ بازاروں کی چہل پہل روشنیوں اور تاریکیوں میں بکھرتے ہوئے بدست قہقہے ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک کاہنہ کے خیمے پر پڑی۔ میں نے محض تفریح کی خاطر اسے ہاتھ دکھانے کا ارادہ کیا۔ خیمے میں صرف ایک شخص روشن تھی۔ بوڑھی کاہنہ ایک پرانے غالیچے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے چاندی کا ایک سکہ دیا تو اس کے جھریوں دار چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے شرارتاً پہلے صبا کو آگے دھکا دیا۔ کاہنہ نے اس کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

”لڑکی تو کنیز ہے لیکن تو جلدی سے باہل سے دور بہت دور دراز کا سفر کرے گی اور تو ہمیشہ ملازم نہیں رہے گی، کوئی عورت تجھے آزاد کر دے گی، بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ صبا کا چہرہ فرط مسرت سے دکھ اٹھا۔ اس نے فوراً ہی مجھے آگے بڑھا دیا۔ میں نے ہچکچا کر اپنا ہاتھ سامنے دیا تو کاہنہ چونک اٹھی، چند لمحے وہ آنکھیں بند کئے زیر لب بڑبڑاتی رہی، پھر سرگوشی میں بولی۔

”کون ہے تو؟ تو کون ہے، تیری لکیریں تیری اپنی نہیں ہیں، ان لکیروں میں فرق ہے اور شاید تو ان کو نہ دیکھ سکے لیکن یہ دہری لکیریں ہیں، پہلے کچھ لکیریں ابھر آتی ہیں پھر وہ کم ہو جاتی ہیں اور نئی لکیریں ابھر آتی ہیں۔ ارے میں نے ایسا حیرت انگیز ہاتھ پہلے کبھی نہیں دیکھا یہ سب کیا ہے؟“

میرا دل تو چاہا کہ میں اپنا ہاتھ پیچھے کر لوں لیکن بوڑھی کاہنہ پر جو بیت رہی تھی اس میں بھی مجھے مزہ آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تو میرا ہاتھ دیکھ۔“

”میں کیا کہوں؟ کیا کہوں تجھ سے دنیا کے بہت بڑے بڑے لوگ محبت کریں گے، کیا سمجھی اور اور نہیں ہرگز نہیں؟ کوئی غلام لڑکی اتنا بڑا درجہ حاصل نہیں کر سکتی لیکن لکیریں جھوٹ نہیں ہوتیں۔ دنیا کا عظیم ترین مرد اپنی تلوار کے ذریعے تجھ تک رسائی حاصل کرے گا۔ وہ تجھے اپنی ملکہ بنائے گا تو نے سونے کی قسمت پائی ہے، بس بس اب چلی جا۔ ورنہ میرا ذہنی توازن خراب ہو جائے گا۔ میں تیرے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتی۔ تو تو تو..... پتہ نہیں تو کیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی لکیروں میں کائنات کے بہت سے راز چھپے ہوئے ہیں۔ آہ میں ان رازوں سے واقف نہیں ہو سکتی، لیکن ہر لکیر مجھے آواز دے رہی ہے کہ مجھے پڑھ، مجھن، مجھے دیکھ۔ آہ میرا دماغ پھٹ جائے گا، لڑکی تو چلی جا چلی جا۔“

دے اور یہ بٹوہ لے جا۔“ اس نے ایک مومی تختی بڑھائی جس پر صبا نے بمشکل اپنا نام لکھا اور وہ چڑے کی خمیلی اڑوبہ کے ہاتھ سے لے لی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اونچا اٹھایا ہوا تھا۔

”اب کچھ دیر بیٹھ کر آرام کر لے اور شراب سے اپنی تھکن دور کر۔“ اڑوبہ بولی۔

”نہیں..... تمہاری مہربانی ہے ہمیں جلد واپس پہنچنا ہے، ہمیں یہی ہدایت کی گئی ہے۔“ صبا نے وہ چڑے کی خمیلی اپنے لباس میں چھپاتے ہوئے کہا۔ نجانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا چنانچہ میں نے اپنی باطن کی نگاہیں اس خمیلی پر جما دیں اور مجھے پتہ چل گیا کہ اس کے اندر ایک شیشی ہے جس میں ایک بہت ہی خوفناک قسم کا زہر موجود ہے۔ بہر طور اڑوبہ اٹھ کر چلی گئی اور صبا واپسی کے لئے مڑی تو میں نے صبا کا بازو پکڑ کر اسے روکا اور کہا۔

”ذرا کچھ وقت اور رک صبا! میں اس پر اسرار جگہ کو ابھی اور دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے میری صورت دیکھی بہر طور میں اس وقت ایک شہزادی کا رتبہ رکھتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے کینزوں کا حلیہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ انکار نہ کر سکی اور ہم ایک کونے میں رکھی ہوئی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک خوب صورت سے نو عمر لڑکے نے لکڑی کے پیالوں میں شراب لا کر ہمارے سامنے رکھ دی لیکن وہ اتنی تلخ تھی کہ میں بمشکل دو گھونٹ حلق سے اتار سکی۔ میں نے خود کو لہادے میں اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ ہمارے قریب ہی تین سپاہی ایک عورت کو لئے بیٹھے تھے۔ شراب پینے کے ساتھ وہ جنگ کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور میں ان کی گفتگو سننا چاہتی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”میں نے گیرانی کی جنگ میں خود حصہ لیا تھا اور میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سکندر کے سپاہی سپہ گری میں ہم سے بہت بہتر ہیں ان کے نیزے زیتون کی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے سارے ہتھیار ہم سے بہتر ہیں وہ شاندار ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ تم چاہو تو اس سے تصدیق کر لو۔ یہ بھی میرے ساتھ تھا۔“ اس نے دوسرے سپاہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک کہتا ہے۔“ اس کے ساتھی نے تصدیق کی۔ ”مقدونیوں کے نیزوں نے ہمارے بے شمار سپاہیوں کا صفایا کر دیا تھا۔“

”کیا تم فضول باتیں کہنے جا رہے ہو جب سے واپس آئے ہو صرف جنگ کی باتیں کرتے ہو۔“ ان کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”چپ رہ حرام زادی!“ تیسرے سپاہی نے عورت کو ڈانٹا۔ ”میں بڑی دور سے آکر شاہی فوج میں بھرتی ہوا ہوں۔ مجھے بھی سکندر کی فوجوں سے جنگ کرنا ہے اس لئے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں تو خاموشی سے بیٹھ اور شراب کے گھونٹ پی کہ تیری یہی اوقات ہے۔“

وہ لوگ دوبارہ جنگ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دلوں سپاہی جنگ میں سکندر اور اس کے سپاہ کی دلیری کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کر رہے تھے اور ان کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت جس کا کچھ اور ہی مقصد تھا بری طرح بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ آخر میں اس سے خاموش نہ رہا گیا اور اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”برادر! اگر تم سکندر کے اتنے ہی پرستار ہو تو اس کی فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہو جائے۔“ اس نے اتنی زور سے یہ جملے کہے تھے کہ سب بے ساختہ اس کی بات پر ہنس پڑے۔

”بازاری عورت!“ سپاہی نے غصے میں کہا۔ ”دیوتا جانتے ہیں کہ میں سکندر کو اپنے ہاتھوں دوکڑے کرنے کی آرزو رکھتا ہوں لیکن جو بچ ہے اسے بیان کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔“

”گھبراؤ نہیں۔“ ایک کونے سے ایک سپاہی کی آواز آئی۔ ”شاہ دارا اپنی عظیم فوج لے کر اس کی سرکوبی کے لئے خود

مجھے ہنسی آمگنی۔ میں نے مسکراتے ہوئے صبا کو دیکھا تو صبا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی تو صبا نے سر دلچ میں کہا۔

”یقین کرو شہزادی! تم نے مجھے جو عزت اور اہمیت دی ہے، میں سمجھتی ہوں یہ میری بلند قسمتی کا ایک عمل ہے اور میں تمہیں دیکھ کر خود بھی اندازہ لگاتی ہوں کہ تم واقعی ایک عجیب و غریب شخصیت ہو۔ کہیں سے مجھ میں نہ آنے والی۔“

”چل چل آگے چل۔ بیکار باتیں مت کر۔“ میں نے اس سے کہا اور ہم فرات کا پل پار کر کے ایک نسبتاً ویران علاقے میں داخل ہو گئے صبا بولی۔

”سڑک کے درمیان چلو تار یک دروازوں میں چور اور رہزن اچانک دیوبچ لیتے ہیں۔“

میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ تیز تیز قدم رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کون سی جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے؟“

”اڑوبہ..... اڑوبہ ہے اس جگہ کا نام لیکن وہ جگہ بہت خطرناک ہے۔ میں اپنے ساتھ عموماً کسی محافظ کو لے کر وہاں جاتی تھی۔ یہ سامان مجھے جہاں پہنچانا ہے وہ بہت ہی عجیب جگہ ہے۔“ اس نے بازو میں لٹکی ہوئی چھوٹی سی ٹوکری کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ میں شروع ہی سے حیران تھی کہ نجانے اس میں کیا رکھا ہے جو وہ اتنی احتیاط سے اسے سنبھالے ہوئے ہے وہ کہنے لگی۔

”اس سرائے میں طرح طرح کے لوگ جمع رہتے تھے۔ فنکار، پہلوان، سپاہی، شمشیر زن اور خطرناک قسم کے چور اور ڈاکو یہ سب کا اڑوبہ ہے۔ اڑوبہ میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں وہاں کی ایک خاص عورت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور صبح معنوں میں اسی کا نام اڑوبہ ہے آپ جانتی ہیں کہ حرم کی خواتین کے لئے اپنی پردہ داری میں بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن ضروری ہے۔ اور اڑوبہ آفت کی پرکالہ ہے وہ خطرناک زہروں اور تیر بہدف دواؤں کی بھی ماہر ہے اور آج بھی اسی سلسلے میں جا رہی ہوں۔“

ہم لوگ اڑوبہ پہنچ گئے اور میں نے اس عورت کو دیکھا جو ایک بدروح ہی معلوم ہوتی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے اسی سرائے میں باہل کا مشہور شراب خانہ بھی تھا۔ پھانک سے اندر داخل ہوتے ہی قہقہوں کا شور وغل سنائی دینے لگا۔ صبا مجھے مختلف کمروں سے گزار کر ایک درمیانے کمرے میں لے آئی جو کافی کشادہ تھا۔ دیواروں میں تیل سے جلنے والے لیمپ لگے ہوئے تھے۔ ہر سمت بچھی ہوئی میزوں کے گرد رکھے ہوئے عجیب و غریب کوردالوں پر مختلف قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں شراب کا دور چل رہا تھا۔ کہیں شطرنج اور چوسر کا کھیل جاری تھا۔ کہیں بچھڑکی کا۔ صبا ان تمام باتوں سے بے پروا کمرے کے آخر میں رکھی ہوئی میز کے گرد بیٹھی اس عورت کے پاس جا بیٹھی جس کا نام اڑوبہ تھا۔

”بڑے سردار نے تمہیں سلام بھیجا ہے اڑوبہ۔“ صبا نے جھک کر اسے تعظیم دی اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

”بڑے سردار کو میرا بھی سلام کہنا اور یہ تو اپنے ساتھ آج کسے لے آئی ہے؟“ اڑوبہ کی نگاہیں پوری طرح میرے جسم پر گڑ گئی تھیں۔

”یہ نئی کینز ہے بڑے سردار نے کہا ہے کہ اسے یہاں کا راستہ دکھا دوں۔“

صبا نے بڑی احتیاط سے بند ٹوکری میری سمت بڑھائی اور سرگوشی میں بولی۔ ”ڈھکن نہ کھولنا۔“ اور پھر میں آگے بڑھی اور اڑوبہ کو وہ لوح دکھائی۔

”ہاں میں سب کچھ پہچانتی ہوں۔“ اڑوبہ مکار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”چل یہ جگہ دیکھ اور اس پر اپنا نام لکھ



جارہا ہے سکندر کو اب اس کے اپنے گھر میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔“

سپاہی نے اپنا مقصد بیان کیا تھا جو اس کی وطن پرستی کی غمازی کرتا تھا۔ لیکن میرے کان برابر میز کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ دو نو جوان مذہب پر بحث کر رہے تھے۔

”تمہارے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے ہم بائبل والوں کا مذہب سب سے پرانا ہے ہمارے عظیم دیوتاؤں کا ثانی نہیں ہے۔“

یہ الفاظ جس شخص نے کہے تھے وہ درمیانی عمر کا ایک بھاری بھر کم اور مضبوط شخص تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہودی نو جوان کافی خوب صورت اور خوش مزاج تھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی پتہ نہیں کیوں مجھے یہ نو جوان لڑکا دل کو بھایا اور میں پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

”تمہاری باتیں بڑی دلکش ہیں اشورا کیا سمجھے؟“

یہ لوگ جس زبان میں بات کر رہے تھے وہ ان دنوں فارس میں عام تھی اس کے لہجے میں بڑی مٹھاس تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”لیکن ہم یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مٹی سے تخلیق کیا اور خدا صرف ایک ہے اور توریث اس کی کتاب ہے وہی سب سے بزرگ و برتر ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ سپاہی نے غصے سے کہا۔ ”ہم اہل بائبل عظیم دیوتاؤں کے سامنے والے ہیں جن کے سامنے تمہارا خدا کوئی حیثیت نہیں رکھتا یہ نہ بھولو کہ تم یہودیوں نے بھی پہلے مردوق اور عشر کے مندروں میں پناہ پائی تھی اور خود تمہارے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بھی بائبل سے ہی تھا۔“

سپاہی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا جبکہ دوسرے شخص کے چہرے پر سکون تھا۔

”میرے دوست تم بھی یہ بھول گئے کہ تمہارے عظیم دیوتا و انبال کا تعلق بھی اہل یہود سے تھا اور تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہیں شیر کے پنجرے میں ڈال کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”مگندے کیڑے تیری یہ مجال.....“ نو جوان غصے اور غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اگر سائزس اعظم تیری قوم کو آزاد نہ کرتا تو تو بھی ہمارا نوکر ہوتا ذلیل کتے۔“ اس شخص نے اچانک خنجر نکال کر دوسرے شخص پر حملہ کر دیا لیکن وہ دوسرا نو جوان پھرتی سے سامنے سے ہٹ گیا اور حملہ کرنے والا سپاہی توازن کھو کر ہماری میز پر گرا لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ اسی وقت صبا اور میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہم نے میز پر گرے ہوئے سپاہی کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میری پوشش سر سے سرک گئی اور ایک لمحے کے لئے میری نظریں نو جوان کی نیلی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ میں جیسے سکتے میں رہ گئی اچانک ہی میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت اور مسرت سے پھیلتے ہوئے دیکھا اور تب مجھے ہوش آیا کہ میرا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنی پوشش کو نیچے کیا لیکن دیر ہو چکی تھی۔

”دیوتاؤں کی قسم! یہ کیز تو حسن کی دہلی ہے۔“ ایک بھاری بھر کم شخص جس نے پہلوانوں کا سا لباس زیب تن کیا تھا بدست ہو کر چیخا اور اس سے پہلے کہ میں سمجھتی اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی پوشش بھی کھینچ لی اب دوسرے لوگ بھی میری سمت بڑھنے لگے تھے لیکن ایک سپاہی اچھل کر آگے بڑھا۔

”دیوتا بانی کی قسم کیز تو ہماری ملکہ سے زیادہ حسین ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑنا چاہی لیکن پہلوان نے اسے دھکا دے دیا۔

”دور ہنو پہلے میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس لئے پہلا حق میرا ہے۔ بول لڑکی تیرا آقا کون ہے؟ میں تجھے اس سے

منہ مانگے داموں پر خرید لوں گا۔“

”ہمارا آقا بڑا سردار ہے شاہ فارس کا رئیس خواجہ سرا یاں۔“ صبا نے حقارت سے کہا پھر بولی۔ ”اور اس کی کیزیں فروخت کے لئے نہیں ہوتیں۔“

”آہ لیکن میں تجھے یوں نہیں جانے دوں گا۔“ پہلوان نے جھپٹ کر میری کلائی پکڑ لی اور پھر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

”حیرت ہے اس کیز کی کلائی پر کسی کا داغ نہیں ہے بہت خوب یہ تو کوئی خاص کیز معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

”بول لڑکی سچ سچ بتا تو کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو صرف میرے لئے آئی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”سور ذلیل کیبنے.....“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے مارنا شروع کر دیا، لیکن اس کی آہنی گرفت نے مجھے بے بس کر دیا۔ اس نے میری آواز کو اپنے ہونٹوں سے بند کر دیا، میں اس وقت واقعی اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھی۔ ذیشان عالی میرے بدن میں کسی ہاتھی سے زیادہ قوت ہے لیکن اس وقت میں اپنی قوت کو استعمال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میں کوروتی نہیں اصنا کیہ تھی۔ ایک اور آواز بولی۔

”اے جلدی کر حیرے بعد میری باری ہے۔“ سپاہی خوشی سے چیخا۔

”اور ہماری بھی۔“ دوسری آوازیں ابھریں اور میرے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اصنا کیہ کے روپ سے نکل آؤں اور کوروتی کی طاقت استعمال کروں۔ تاہم میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اگر ایسا کرتی تو اب تک اس کی تمام کوششیں بیکار جاتیں، مجھے آج بھی ایلی گوس کا خوف تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا کیونکہ وہ علم والا تھا اور پراسرار علوم رکھتا تھا۔ بے شک میں نے اس سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ لیکن میں جانتی تھی کہ وہ خاموش نہ ہوگا جہاں تک عمروں کا تعلق ہے تو کم از کم میری تو وہی عمر تھی جو اس نے دیکھی تھی اب یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں ادھار کے بدن میں تھی۔

اچانک ہی میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھری اور میں نے پوری قوت سے اس وحشی کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اسی وقت صبا غضبناک شیرنی کی طرح گرہی۔

”کیبنے کتے تم نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے تو نے موت کو دعوت دی ہے اے شخص۔“ یہ کہہ کر اس نے برق رفتاری کے ساتھ ہاتھ میں پکڑی ہوئی نوکری سے دو مرتبہ اس وحشی پہلوان پر بھرپور وار کئے اور جیسے کوئی جادو ہو گیا۔ اس کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑنے لگی پھر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ پسینے سے تر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی اب اس کے منہ سے جھماک ٹپکنے لگا تھا۔ پھر اچانک وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

”جادو گرئی جادو گرئی ساحر۔“ یہ کہہ کر کٹے ہوئے درخت کی طرح وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ سرائے میں ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ اسی وقت اژدہ جو کسی وقت واپس اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئی تھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی اور اس نے پہلوان کی نبض دیکھی پھر اس کی سرد آواز ابھری۔

”یہ تو مر گیا؟“

چاروں طرف جھنجھٹا ہٹیں گونج اٹھیں اژدہ نے کہا۔ ”تم لوگ اسے دریا میں اٹھا کر پھینک دو اگر شایہ دستہ گشت پر آگیا تو مصیبت آجائے گی چلو جلدی کرو۔“



”آؤ.....“ صبا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھینٹے ہوئے کہا اور ہم دونوں تیر کی طرح باہر نکل آئے، لیکن ابھی سیڑھیاں بھی نہ اترے تھے کہ اندر سے لوگ چلائے۔

”یہ جادوگرئی ہے، دونوں ساحر ہیں پکڑو انہیں قتل کر دو۔“ مجمع تیر کی طرح ہماری طرف لپکا لیکن وہی نوجوان اچھل کر درمیان میں آگیا، اس نے ایک ہاتھ صبا کی طرف بڑھایا اور بولا۔

”جلدی کرو وہ سانپ والی نوکری مجھے دے دو۔“

صبا نے فوراً ہی نوکری اس کی سمت بڑھادی اور پھر اس سے پہلے کہ قتل پر آمادہ مشتعل ہجوم آگے بڑھتا نوجوان نے نوکری میں ہاتھ ڈال کر زہریلا سانپ باہر نکال لیا اور مجمع کو خوفزدہ کرنے کے لئے آگے بڑھ آیا، اس دوران صبا مجھے گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی اور ہم نے جان بچانے کے لئے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

”وہ سانپ“ وہ سانپ کہاں سے آگیا صبا؟ اس نے میری جان اور آبرو بچائی، میں تجھے انعام سے مالا مال کر دوں گی۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”میں نوکری میں سانپ لئے بغیر بائیل سے کبھی باہر نہیں نکلتی۔“ صبا نے کہا۔ ”جلدی تیز بھاگے شہزادی بھاگے اور تیز۔“

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ہم فوراً تاریکی میں چھپ گئے، چند ہی لمحے کے بعد ایک گھوڑا برق رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرا، چاندنی میں مجھے اس نوجوان کا چہرہ صاف نظر آگیا تھا۔ وہ گھوڑے کی گردن سے چٹا ہوا تھا۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”آہ کتنا حسین ہے وہ کس قدر خوب صورت“ صبا اب تو میری دوست بن چکی ہے۔ ہر قیمت پر اس یہودی نوجوان کو تلاش کرنا، میں اس کی دلیری کا انعام دوں گی۔“ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مجھے معاف کرنا، ڈیشان عالی! مجھے معاف کرنا وہ کوروتی نہیں بلکہ اصنا کیہ تھی جو سب کچھ ہونے کے باوجود ایک عام سی لڑکی تھی اور اس یہودی نوجوان کو جو بے حد خوب صورت تھا اپنا دل دے بیٹھی تھی۔ صبا تو بالکل نہیں جانتی تھی کہ میں اسے کیا انعام دینا چاہتی ہوں۔ دوسرے دن میں نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنا راز دار بناتے ہوئے رات کے تمام واقعات کی تفصیل سنائی۔ پھر صبا کو حکم دیا کہ وہ سرائے جا کر اس یہودی نوجوان کی خبر لے کر آئے۔ اس نے آکر بتایا کہ نوجوان کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں ہے اور اسے پہلی بار ہی اس سرائے میں دیکھا گیا تھا۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ میں نے صبا سے کہا کہ ”شاید اس شخص سے اس کے متعلق کچھ پتہ چل سکے جس سے اس نوجوان کی لڑائی ہوئی تھی۔“ لیکن سب نے جواب دیا کہ اس وقت وہ سرائے میں موجود تھا۔ تمام لوگوں سے پوچھ گچھ کے باوجود کچھ پتہ نہیں چل سکا، حیرت کی بات ہے کہ کوئی بھی شخص اس یہودی جوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں بے قرار ہو گئی۔ صبا کو میں نے تاکید کی کہ دوبارہ سرائے جا کر ہر قیمت پر اس کا پتہ چلائے کیونکہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک کہ میں اس کا شکریہ ادا نہ کر لوں۔

”ڈیشان عالی! ہر دور میں انسان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے تم اسے بالکل محسوس نہ کرنا۔ میں تو اس وقت صحیح معنوں میں کوروتی تھی ہی نہیں بلکہ اصنا کیہ کے روپ میں تھی اور اس کی سوچیں اپنائے ہوئے تھی، کیا تمہیں میری بات بری لگ رہی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ظاہر ہے تم میری ملکیت تو نہیں ہو میری دوست ہو۔“

کوروتی جواب نہیں دے پائی تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”آخر کار دس دن گزر گئے اور اس

نوجوان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ اس رات کے بعد اس سرائے میں واپس نہیں آیا۔ میں اندر سے سلگ رہی تھی۔ اس کی کنول جیسی آنکھیں، اس کا خوب صورت چہرہ ہر لمحے میری نظروں میں قفس کرتا رہتا تھا۔ ایک انجانی سی بے قراری اور خلش مجھے ہر لمحے بے چین کئے دیتی تھی۔ میرا اتالیق مجھے اور میری چھوٹی بہن کو روزانہ بائیل کی سیرا کرانے لے جاتا اور میری نگاہیں ہر سمت اسی نوجوان کو تلاش کرتی رہتیں، لیکن افسوس وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تمام ملک سے آئے ہوئے سرداروں سے صلاح و مشورے کے لئے ہونے والی جنگی مجلس اختتام کو پہنچی تو شاہ فارس نے ایک بہت اعلیٰ پائے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس شامی دعوت میں شرکت کے لئے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ صبا نے مجھے خوشبودار پانی سے غسل دیا۔ یہ افواہیں گردش کر رہی تھی کہ شاہ کو پھر کسی ملکہ کی تلاش ہے۔ ادھر صبا اور دوسری مشاطا میں میرا سنگھار کر رہی تھیں تو میں نے کسی قدر الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے علم ہے کہ شاہ کے حرم میں پہلے ہی تین سو ساٹھ بیبیاں موجود ہیں پھر وہ کسی اور ملکہ کی تلاش میں کیوں دیوانہ ہو رہا ہے؟“

میرے اس سوال کے جواب میں صبا نے ہنس کر کہا۔ ”شہزادی! مردوں کی حرص عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے، بس سمجھ لو یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔“

خیر صبا اور دوسری کنیزوں نے مجھے دلہن کی طرح سجا دیا، بائیلی انداز میں میری چوٹیاں گوندھی گئیں، پلکوں اور آنکھوں پر کاجل لگانے کے بعد رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی لگائی گئی۔ مجھے زرد اور نیلے رنگ کی چولی پہنائی گئی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ زرق برق رنگ کے باریک ریشمی لباس میں میرا حسن دمک رہا تھا۔ گلے میں نیلم اور زمرہ کا بہت ہی خوب صورت ہار تھا۔ یہاں تک کہ میری جوتیوں میں بھی قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔ صبا نے بتایا کہ دستور کے مطابق شاہ جس کو پسند کرے اس کو دربار خاص میں رقص کرنا لازم ہوتا ہے اس لئے مجھے تیار ہو کر جانا چاہیے اور جب میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

میں دیوان خاص میں پہنچایا گیا، جہاں تخت شامی تھا اور ہم سب شاہ فارس کی خدمت میں بازیابی کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ امراء و رؤسا سردار شامی مہمان باری باری تعظیم کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر سمت خور و مردوں اور حسین عورتوں کا ہجوم تھا۔ میری چھوٹی بہن نے جواب خوب جوان ہو چکی تھی مجھے ٹھوکہ مار کر خوشی کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔

”دیکھ رہی ہو تم اصنا کیہ ساری نگاہیں تم پر ہی مرکوز ہیں۔“

میں چونک پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ مرد درحک بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے لیکن عورتوں کی نگاہوں کا حسد صاف نمایاں تھا۔ جب میرے باپ کی باری آئی تو پہلے دو شہزادوں نے آگے بڑھ کر انہیں بوسہ دیا، یہ اعزاز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا تھا جنہیں برابری کا درجہ مل جائے ورنہ باقی امراء اور سرداروں کو یہ شرف حاصل نہیں تھا۔ آخر کار شاہ فارس کی خدمت میں بازیابی کا موقع آیا۔ ہم دونوں بہنیں اپنے باپ سے دو قدم پیچھے کھڑی تھیں اور ہمارے درمیان ہماری ماں تھی، شاہ کا شامی لباس پہرے اور جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔ وہ دراز قد چھپرے بدن کا خوب صورت شخص تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے۔ داڑھی ٹھنکھریالی تھی اور رنگ کانسی کی طرح تھا۔ ناک خمیدہ اور آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں۔ اس کا تخت سونے کا تھا۔ اس کی عبا پر دوسرے عقاب کڑھے ہوئے تھے اور شانے پر ایک بہت بڑا ہیرا دمک رہا تھا۔ میرے باپ نے شاہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے تعظیم دی اور کہا۔

”شاہ شہان آپ کا غلام قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔“

شاہ سوئم مسکرایا اور بولا۔ ”ہم نے تمہارا سلام قبول کر لیا اب ہماری خدمت میں وہ سب کچھ پیش کر دو جس کے لئے تم

یہاں تک آئے ہو۔“

میرا باپ ادب اور عقیدت کے ساتھ کھڑا ہوا اور اس نے ہم لوگوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”عالی جاہ یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بڑی بیٹی اصنا کیہ جو میری جانشین بھی ہے اور یہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔“

میں نے دیکھا کہ شاہ کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں، میں ان کی تاب نہ لا سکی اور جلدی سے نظریں جھکا لیں، شاہ نے کہا۔

”ہم تمہاری خواتین کی باریابی سے بہت خوش ہوئے۔ ایسے حسین چہروں کو ہمارے دربار میں جگہ ملنی چاہئے۔ یہ ہمارے دربار میں ہمارے داہنے جانب جگہ پا گئیں گی۔“

”خداے برتر و عالی، عالی جان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔“ میرے باپ نے تعظیم پیش کی۔

ضیافت کے دوران ہمیں شاہ کے داہنی جانب جگہ ملی، اس کی کرسی ہم سب سے بلند تھی، شاہی خدام انواع و اقسام کے کھانے پیش کر رہے تھے۔ سونے کے ساغروں میں شراب کا دور چل رہا تھا۔ میرے برابر ایک نوجوان ایرانی سردار بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شاہ کے بازو میں ملکہ سطرہ بیٹھی ہوئی ہے لیکن شاہ کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں اور میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے اپنے حرم کی زینت نہ بنالے۔ میں نے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں شہ کی داشتہ بننے پر موت کو ترجیح دوں گی۔ کھانا ختم ہوا تو خادموں نے میز صاف کر کے اس پر مختلف قسم کی شراب اور منھائیاں لاکر چن دیں اور اس کے بعد محفل طرب کا آغاز ہوا۔ موسیقاروں کی ایک ٹولی نے سامنے آ کر شاہ کو تعظیم دے کر اجازت لی اور طریقہ موسیقی کا آغاز کیا، ساز بڑے دلکش اور نغمہ بے حد دل پذیر تھا۔ اس کے بعد نغمہ میں بانسری کی سریلی آواز ابھری اور اسی کے ساتھ ایک گلوکار نے محبت کا ایک دلگداز گیت شروع کر دیا جو یوں تھا۔

”اے حسینہ تجھے کیا خبر کہ میں تیرے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں۔“

آواز میں اتنا درد تھا کہ میں تڑپ اٹھی اور میں نے گردن اٹھا کر گلوکار کی سمت دیکھا۔ تبھی میرا دل خوشی سے اچھل پڑا، کچھ فاصلے پر کھڑا گلوکار میری ہی سمت دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی اور نہیں وہی یہودی نوجوان تھا جس نے میری جان بچائی تھی اور جس کی تلاش میں میری آنکھیں اتنے دنوں سے سرگرداں تھیں، وہ گاتا رہا اور میں گردو پیش سے بے خبر اسے گھورتی رہی۔ زندگی میں ایسی مسرت کا احساس ہوا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ میرا دل بے ساختہ اس کی سمت کھینچا چلا جا رہا تھا۔ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے گیت میں مجھ سے مخاطب ہے۔ اس کی آواز میرے ہوش و حواس پر چھاتی جا رہی تھی اور میں سحر زدہ ہو کر اس آواز کے جادو سے مدھوش ہو رہی تھی۔

نغمہ ختم ہوا تو تمام حاضرین نے زبردست داد دی اور شاہ نے خوش ہو کر اشرافیوں کی قبلی نوجوان کو دی، اس نے جبکہ کر تعظیم دی۔

اچانک ہماری نگاہیں چار ہوئیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو اصنا کیہ میں نے تیری محبت کا نذرانہ قبول کر لیا ہے وہ چلا گیا لیکن میں محویت کے عالم میں کم صم بیٹھی رہی۔ تب ایرانی نوجوان نے بتایا کہ سردار نے اس گلوکار کو اپنے دربار کے شاہی فنکاروں میں شامل کر لیا ہے، میرے لئے یہ خبر ایک ناقابل بیان مسرت کا باعث تھی۔ اس کے بعد شراب کا دور اور رقص و سرور کی محفل اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ بیشتر لوگ نشے میں مدھوش ہو کر قہقہے لگانے لگے۔ خود شاہ کی آنکھیں خمار آلود ہو چکی تھیں۔

اچانک ہی اس نے پری پولیس کے ایک امیر کی بیوی کو اشارہ کیا۔ دستور کے مطابق اب اسے بے حجابی کا رقص پیش کرنا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس رقص کے لئے مجھے منتخب نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جیسے ساری

محفل کو بے حجابی کی دعوت عام مل گئی، بدست مرد و عورت تمام آداب سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے، میرے قریب بیٹھے ہوئے ایرانی نوجوان نے بے تابی کے عالم میں مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

”آہ روئے زمین کی ملکہ حسن، میں کتنا خوش قسمت ہوں۔“ اس نے حد سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟“ میں نے اسے دھکا دے کر غصے سے کہا۔

”پاکل نہ بنو اصنا کیہ بائل میں تو اسی کو زندگی کہتے ہیں اور اس میں برائی بھی کیا ہے؟“

میں اسے دھکا دے کر دور ہٹ گئی۔ دوسری طرف میری بہن خود کو ایک دوسرے نوجوان کی دست دراز یوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ میری ماں نے پریشان اور بے بسی کے عالم میں میرے باپ کی سمت دیکھا اور بولی۔

”ہماری آبرو خطرے میں ہے، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہاں سے فوراً نکل چلیں؟“

لیکن میرے باپ نے مایوسی سے جواب دیا۔

”نہیں جب تک بادشاہ رخصت نہ ہو جائے کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، ایسا کرنا شاہ کی توہین ہوتی ہے۔ کاش میں تم لوگوں کو بائل نہ لایا ہوتا۔ البتہ اسی لمحے بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ واپسی کے لئے مڑا تو ہماری آبرو بھی بال بال بچ گئی اور ہم واپس چلے آئے۔ غرضیکہ کچھ اور وقت گزرا یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہودی نوجوان جس کا نام بعد میں اولاش پتہ چلا تھا شاہی طائفے میں شامل ہے۔

صبا کو اپنا راز دار بنانا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی میں نے اس کنیز کو وفادار اور قابل اعتماد پایا تھا۔ اس لئے میں نے اس کو ہدایت کی کہ وہ یہودی نوجوان سے ملنے کی کوئی سبیل نکالے تو میں اسے مال مال کر دوں گی۔ وفادار صبا شاید میرے دل کا راز جان گئی۔

دوسرے دن وہ خوشی خوشی واپس آئی اور مجھے بتایا کہ ملاقات کا سامان ہو گیا ہے۔ میرا باپ شاہی دربار میں جنگی مجلس میں حاضری دینے گیا ہوا تھا اور ماں رات کی ٹھکن دور کر رہی تھی، چنانچہ میں نے بازار جا کر بائل کے پارچہ جات خریدنے کا بہانہ کر کے اجازت لے لی اور ساتھ ہی اپنی چھوٹی بہن کو لے لیا۔ صبا جب ہمیں لے کر بازار پہنچی تو اولاش ایک دکان کے سامنے ہمارا منتظر تھا۔ میرے چہرے پر چونکہ نقاب پڑی ہوئی تھی اس لئے مجھے نہ پہچان سکا، تب میں اس کے قریب پہنچی اور میں نے کہا۔

”میرا سلام قبول کرو اولاش۔“

وہ اچھل پڑا، خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”میرا بھی سلام قبول کرو اصنا کیہ۔“ اس کی آواز میں بے پناہ مسرت تھی۔ اس نے پھر کہا۔ ”اور اس عزت افزائی کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس نے میری جان بچائی تھی، اس کی آنکھوں میں جو تشکر تھا وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا البتہ اس نے بازار میں گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا۔

”قریب ہی ایک باغ ہے اس میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔“ میں نے مڑ کر دیکھا میری چھوٹی بہن اور صبا کچھ فاصلے سے ہمارے تعاقب میں آرہی تھیں۔ آخر کار ہم ایک کنجے میں جا کر بیٹھ گئے جو گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں تھا۔ میں نے اپنی نقاب الٹ دی۔

”تم سے مل کر مجھے جو خوشی ہوئی ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکو گی۔“ اولاش نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”اصنا کیہ جب میں نے سرائے میں پہلی بار تمہارا بے نقاب چہرہ دیکھا تو ہوش و حواس کو بیٹھا، یقین

جانو تم نے بے مثال حسن پایا ہے جو ہر کسی کو دیوانہ بنا سکتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم جیسی اعلیٰ نسب خاتون بدنام جگہ پر کیا کر رہی تھی؟“

جواب میں میں نے اسے تفصیل بتائی تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”تم واقعی بے حد دلیر اور مہم جو خاتون ہو۔ جب صبا نے یہ بتایا کہ تم کنیز ہو تو میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر تم کو آزاد کرا لوں گا“ اس کے بعد سے ہر لمحہ تمہاری شکل آنکھوں میں گھومتی رہی۔ ایک لمحے کو قرار نہیں تھا۔ بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح تم کو ہمیشہ کے لئے اپنالوں۔“

”لیکن اولاش.....“ میں نے بے چینی سے کہا۔

”ہاں بس کیا بتاؤں کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے کہاں ایک اتنے بڑے سردار کی بیٹی اور کہاں ایک عام گویا۔“

”نہیں اولاش! میں نے صبا کو بھیج کر تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ہے تم بے تکلف ہو کر بات کرو۔“

اولاش نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”ہاں یہ میری خوش قسمتی ہے۔“ پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں حاصل کرنے کا تصور کیسے کر سکتا ہوں؟“

میں تڑپ اٹھی اور اس کی نگاہوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ لیکن اس کی گہرائیوں میں بے کسی اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔

”تم مایوس کیوں ہوتے ہو اولاش؟ محبت چھوٹے بڑے کے امتیاز سے بے نیاز ہوتی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی حجاب نہیں محسوس ہوتا کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں۔“

”اوہ اصنا کیہ! میری زندگی میری آرزو.....“ اس نے بے تاب ہو کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا کہ ”میں کتنا خوش نصیب ہوں میں کتنا خوش نصیب ہوں۔“

ہم دونوں گرد و پیش سے بے خبر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے اولاش کا چہرہ مسرت سے دک رہا تھا۔ میں صبر و قرار کے بندھن توڑ چکی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو سورج ڈھل چکا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی اولاش اب مجھے جانا چاہیے۔“

”ابھی نہیں میری زندگی ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے کچھ دیر اور ٹھہرو۔“ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ”یہاں سے کچھ فاصلے پر صبا اور میری بہن بیٹھی انتظار کر رہی ہیں اور محل میں میرا انتظار ہو رہا ہو گا“ بس بہت ہو چکا ہے۔“ میں نے بمشکل خود کو اس کے بازوؤں سے علیحدہ کیا۔

”ہم پھر ملیں گے اولاش اور تم یقین کرو میں اس ملاقات کے لئے ہر لمحہ بے قرار رہوں گی۔“ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ پھر میں نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

”لیکن تم ملو گے کہاں؟“

”میں دریا کے کنارے یہودیوں کی بستی میں رہوں گا“ مجھے کسی ایسے قابل بھروسہ آدمی کی تلاش ہے جو بادشاہ کی عنایت کی ہوئی اشرفیاں یروشلیم میں میرے والدین کو پہنچا دے۔“

”تم یروشلیم کے رہنے والے ہو؟“

”ہاں آج سے اکیس برس پہلے میں وہیں پیدا ہوا تھا۔ تین سال پہلے موسیقاروں کے ایک طائفے کے ساتھ مصر گیا اور وہاں سے شاہ فارس کے ایک درباری نے میرا گانا سنا اور اتنا پسند کیا کہ مجھے یہاں لے آیا اور میں شاہی طائفے میں ملازم ہو گیا۔“

”میں اس درباری کی احسان مند ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میری زندگی ہمیشہ نامکمل رہتی۔“

”آہ ایسا نہ کہو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم اتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک آئی ہو۔ ورنہ میں محبت کے اس درس سے مرحوم رہتا جو میری زندگی کی اہم دولت ہے“ لیکن افسوس کہ نو دن کے بعد ہم کو جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا“ کیونکہ

شاہ اس دن سکندر کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور شاہی طائفہ فوج کے ساتھ جائے گا۔“

”صرف نو دن“ نہیں ایسا نہ کہو تمہارے بغیر باہل میرے لئے ویران ہو جائے گا اولاش۔“ ہم جدائی کا اذیت ناک تصور دل میں چھپائے ہوئے جدا ہوئے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نو دنوں کا ایک ایک لمحہ اولاش کے بازوؤں میں گزار دوں اور شاید میری یہ دعا سن لی گئی“ کیونکہ دوسرے دن سے جنگی تیاریوں کے سلسلے میں میرے بابا اس قدر مصروف ہو گئے کہ

رات گئے تک دربار شاہی میں رہتے اور اس طرح میرا بیشتر وقت اولاش کے ساتھ گزرنے لگا۔ ماں سے باہل کی سیر کا بہانہ کر کے میں میری چھوٹی بہن اور صبا صبح صبح نکل جاتے اور شام تک باغ کے ویران کونے میں ہم دونوں محبت کے عہد و پیمان کرتے کبھی کبھی وہ ہم سب کو ساتھ لے کر باہل کی سیرا کرانے نکل جاتا۔ اس دوران میں نے اپنی بہن کا تعارف

بھی اس سے کرا دیا تھا۔ ایسے موقع پر صبا بھی ساتھ ہوتی تھی۔ اولاش نے ہمیں باہل کے مندر کی عالیشان عمارت دکھائی“

مینار باہل کی سیر کردائی اور پھر ایک دن جب ہم تنہائی میں محبت کی لذتوں سے ہمکنار ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ یہودی عقیدے کے ماننے والے کسی غیر مذہب کے لوگوں میں

شادی نہیں کر سکتے ان کے عقیدے کے مطابق یہ گناہ ہے میں اس انکشاف پر چند لمحے کے لئے اداس ہو گئی۔



کوروتی بتا رہی تھی کہ اصنا کیہ کی حیثیت سے وہ اپنے محبوب اولاش کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی اور اولاش اسے بتا رہا تھا کہ یہودی عقیدے کے ماننے والے کسی غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتے ان کے عقیدے کے مطابق یہ گناہ ہے اور کوروتی یعنی اصنا کیہ اس انکشاف پر اداس ہو گئی تھی، لیکن بہر حال روایتیں اسی طرح کی ہوتی ہیں اس طرف سکندر سے جنگ کرنے والا لشکر مکمل طور پر تیار تھا اور اسے صرف دو دن کے بعد روانہ ہو جانا تھا، شہر کی سڑکوں پر ہنگامے برپا تھے ہر سمت جنگ کے لئے جانے والے سپاہ کے گھوڑوں اور خچروں کی آمدورفت کی بنا پر خوب رش ہوتا تھا اور باہر نکلتا ممکن نہیں تھا جبکہ کوروتی کا کہنا تھا کہ وہ اپنے محبوب اولاش سے ملنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھی اس نے کہا۔

”میں نے صبا کو اشرافیوں کی حیلی دی کہ محل کے درباریوں کو رشوت دے کر کسی طرح اولاش کو اس کے پاس لے آئے اور یہ ترکیب کارگر ہوئی اس دن ٹھیک دوپہر کے وقت جب سب لوگ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے صبا اسے ایک خالی کمرے میں لے آئی، میں خاموشی سے وہاں پہنچ گئی اور میں نے صبا کو نگرانی کے لئے باہر چھوڑ دیا جبکہ اولاش اس کمرے میں آ گیا تھا میں نے اپنے رخسار اس کے سینے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

”دو دن کے بعد تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے میری زندگی کے سب سے بڑے ساتھی اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ قسمت ہمیں دوبارہ ملاتی بھی ہے یا نہیں۔“ میرے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔

زندہ صدیاں پڑھنے والو..... انسان لمحات پر جب کوروتی مجھے یہ بتا رہی تھی اور میں جدید دور کے ایک جدید انسان کی حیثیت سے شدید رقابت محسوس کر رہا تھا، لیکن اس وقت کوروتی میری جانب متوجہ نہیں تھی اس کے ذہن میں اپنے اس محبوب کا تصور تھا وہاں میرے پاس سوچنے کے لئے خاصی باتیں موجود تھیں یعنی یہ کہ میں دیشان عالی صدیوں پرانے ایک کردار میں گم تھا اور مجھے میرے فن میں مدد مل رہی تھی، سمجھائے اس کے کہ میں حسن و شوق کے جال میں گرفتار ہو کر اپنے منصب سے ہٹا بہتر یہی تھا کہ اس بات کو اپنے ذہن سے جدا کر دیا جائے جبکہ کوروتی افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

جب مجھ سے اولاش نے کہا۔ ”ماپوس نہ ہو اصنا کیہ! میرا دل کہتا ہے کہ ہم دوبارہ ملیں گے اور میں تم سے اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک تم سے محبت کرتا رہوں گا۔“

”اوہ میری زندگی میری روح“ میرے محبوب کا ش تم فارس کے باشندہ ہوتے تو جنگ کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے باپ سے اتھا کرتی کہ تمہیں کسی اچھے عہدے پر فائز کر کے ہماری شادی کر دے۔“

”شادی.....“ اولاش نے چونک کر کہا۔ ”آہ اصنا کیہ! صرف یہی نہیں کہ ہمارے درمیان فاصلہ ہے، رعبوں کا فاصلہ درجوں کا فاصلہ، بلکہ میں یہودی ہونے کی بنا پر تم سے کبھی شادی نہیں کر سکتا۔“

”لیکن ہم انسان بھی تو ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن صدیوں کی ریت نہیں توڑی جاسکتی۔“

”تو کیا ہماری محبت ناکام رہے گی؟“ میں نے تڑپ کر کہا۔ وہ بھی میری طرح دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے بے تاب ہو

کر مجھے بازوؤں بھی بھر لیا اور بولا۔

”میں ان آنکھوں میں یہ موتی نہیں دیکھ سکتا اصنا کیہ! خدا کے لئے آنسو نہ بہاؤ ہماری محبت شادی کی محتاج نہیں ہے، میری زندگی تمہارا جسم کسی اور کا ہو سکتا ہے لیکن تمہاری روح ہمیشہ میری رہے گی۔“ جسمانی فاصلے ہمیں کبھی جدا نہ کر سکیں گے، ہم زندگی کے آخری لمحے تک صرف اور صرف ایک دوسرے کے رہیں گے۔“

تجھی صبا نے دروازے پر دستک دے کر خبردار کیا کہ کوئی آ رہا ہے اور اس کے بعد ہمارے لئے اس کمرے میں رہنا ممکن نہ رہا، البتہ اولاش نے کہا تھا کہ ابھی کل کا دن باقی ہے اور کل وہ پھر یہیں پر آ جائے گا، یہ وعدہ کرنے کے بعد اولاش وہاں سے چلا گیا اور میں اداسی سے اس کے تصور میں کھو گئی۔ اس روز میرے ابارات تک نہیں آئے تھے اور میں بے حد اداس تھی۔ اس لئے میں اپنے استاد کے پاس چلی گئی اور اس سے پوچھا کہ ستارے جنگ کے بارے میں کیا کہتے ہیں، میرا خیال تھا کہ استاد محترم مجھے فتح کی خوشخبری سنائیں گے، لیکن ستارہ شناس اپنے فن کا ماہر تھا اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”جو کچھ قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ہم اسے تبدیل نہیں کر سکتے اصنا کیہ! ستارے ابھی تک مجھے کوئی خوشخبری نہیں دے رہے ہیں۔“

”لیکن ہمارا لشکر تو بہت عظیم ہے، بہت ہی عظیم اور یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ سکندر کی فوجیں اس کے آگے نہ رک سکیں گی۔“

ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ خواجہ سرا اندر آ گیا اس نے استاد اعظم کو تعظیم دی۔

”مقدس بزرگ! میں شاہی حرم کے خواجہ سراؤں کا رئیس ہوں اس وقت شاہ اعظم نے اپنے کمرہ خاص میں شہزادی اصنا کیہ کو طلب کیا ہے اور وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

خواجہ سرانے مودبانہ انداز میں کہا اور مجھے اپنا خون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اس خبر نے اوسان خطا کر دیئے، میں جانتی تھی کہ اس طلبی کا مقصد کیا ہے، تاہم استاد اعظم نے فوراً ہی کہا۔

”بادشاہ کو اطلاع دو کہ شہزادی اس کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہیں۔“ استاد اعظم کے لہجے کا کوئی اندازہ نہیں تھا، ظاہر ہے ان کے لئے یہ کوئی مشکل عمل نہیں تھا، لیکن مجھے اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت میرے حلق سے ایک دہشت زدہ آواز نکلی۔

”خبریں نہیں..... میں نہیں جاؤں گی، میں کسی کی کنیز نہیں ہوں۔“ میرے لہجے میں بے پناہ خوف تھا، لیکن استاد اعظم کو اس صورت حال کا اندازہ تھا اس نے خوف زدہ لگا ہوں سے خواجہ سرا کی طرف دیکھا اور پھر غصے سے میرے شانے جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

”لو کی کیا دیوانی ہو گئی ہے شاہ کے حکم سے سرتابی کی جرأت کون کر سکتا ہے، کیا تجھے اس کا انجام نہیں معلوم؟“ میں نے روتے ہوئے التجا کی کہ استاد محترم خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے۔ میں بادشاہ کی کنیز نہیں بن سکتی۔ میں حرم کی قید و بند برداشت نہیں کر سکتی۔ میں شاہی گلوکار اولاش سے محبت کرتی ہوں یہ نہ پوچھئے کہ میری محبت کیسے ہوئی یہ سمجھ لیجئے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ وہ میرا محبوب ہے۔“

”تم جس سے چاہو محبت کر سکتی ہو اصنا کیہ! لیکن آج کی رات تم کو بادشاہ کے ساتھ بسر کرنا ہوگی۔ جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے شاہ کے اعصاب کو سکون کی ضرورت ہے۔“

”آہ کیا آپ کسی صورت مجھے اس عذاب سے نہیں بچا سکتے، کوئی صورت نکالئے۔“

”اصنافِ میری بچی..... اکوئی ایسی صورت نہیں ہے شاید قسمت کو بھی منظور ہے۔ ہاں لیکن میں تمہیں یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ تم بادشاہ کی حرم میں ہمیشہ نہیں رہو گی تمہارے ستارے بہت بلند ہیں اور تم تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کرو گی اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اتنا میں بھی جانتی تھی ذیشان عالی! کہ انکار کی صورت میں میرا انجام کتنا بھیانک ہوگا، لیکن جو کچھ ستارہ شناس نے کہا تھا اس نے ایک دم مجھے سہارا سادیا۔ اس نے ستاروں کی پیشگوئی جو کی تھی اس نے مجھے بڑی تسلی پہنچائی۔ خیر میرے لئے سواری تیار تھی میں صبا کے ساتھ شاہی محل پہنچ گئی، خواجہ سرا اور کنیزوں نے مجھے عطر آمیز پانی سے غسل دیا۔ میرے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش کی گئی اور دہن کی طرح مجھے سجا کر شاہ کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ میں شاہ فارس کی سونے سے بنی ہوئی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی، آنے والے لحات کے تصور سے میرا دل اچھل رہا تھا کہ اچانک ہی شاہ دارا اندر داخل ہوا اور میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر تعظیم کے لئے سجدہ ریز ہو گئی۔“

”بھٹو! اصناف! تم چاند کی طرح روشن ہو تمہارا حسن و شباب مسرتوں سے چمکتا ہوا جام ہے۔“ شاہ نے کہا کہ میرا جسم لرز رہا تھا وہ بولا۔

”میں نے پہلی نظر میں تمہیں منتخب کر لیا تھا اور تمہیں شاید اعزاز نہیں ہو سکے گا کہ اس دن سے آج تک میں نے کتنی بے چین راتیں گزاری ہیں۔ جنگ کی تیاریاں میرے سر پر مسلط تھیں جس کی وجہ سے میں نے تم سے دوری برداشت کی، خیر آؤ میری آغوشِ محبت میں سا جاؤ۔“

میرے لئے تعظیم کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا ذیشان عالی! دوسری طرف شاہ کی محبت میں شدید اضطراب تھا بے قراری تھی اس نے کہا۔

”تمہارے قرب میں جو کشش ہے وہ انسانوں کو دہانہ بنا سکتی ہے اور میں بھی آخر ایک انسان ہی ہوں بے شک میں جانتا ہوں کہ میری پرستش جائز ہے لیکن اس کے باوجود تو میں انسان ہوں میری سمت دیکھو اصناف! میں ان آنکھوں میں مسرت دیکھنا چاہتا ہوں مجبوری نہیں میں اس ملکوتی حسن کی ساری مستیاں اپنی آنکھوں سے پی جانا چاہتا ہوں۔“

مجھے میرے استاد نے بتایا تھا کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں شاہ کی محبت کو قبول کر لوں اس کی قربت کو قبول کر لوں چنانچہ میں دل پر جبر کر کے مسکرا دی۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے اندھے موسیقار نے بجانِ خیر دھن چھیڑ دی، تھوڑی دیر کے لئے میں نے یہ بھلا دیا کہ میں کون ہوں میری تصور کی نگاہیں خود پسندی کے عالم میں شاہ کو دیکھ رہی تھیں جس کے روپ میں میں نے اپنے محبوب اولاش کو دیکھا دوسری طرف شاہ کہہ رہا تھا۔

”حسن کی دیوی! اصناف! تم نے مجھے نئی زندگی عطا کر دی ہے، اودہ تم کس قدر حسین ہو۔ میں نے تم جیسی لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی اور اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، تم میرے ساتھ چلو گی کیا سمجھیں، تم میرے ساتھ چلو گی۔“

ایک لمحے کے لئے تو میرا دل دھک سے رہ گیا، ذیشان عالی! لیکن دوسرے لمحے میں خوش ہو گئی چونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس سفرِ جنگ میں اولاش بھی ساتھ ہی ہوگا۔ خیر سکندر کی سرکوبی کے لئے شاہ چھ لاکھ کی سپاہ لے کر روانہ ہوا، اس میں ہندوستان اور عرب سمیت چالیس ممالک کے جنگجو شامل تھے۔ زمین انسانوں اور جانوروں کی اتنی بڑی تعداد کے قدموں کی چاپ سے ہلنے لگتی تھی، لشکر کے ساتھ میں شاہ کی ملکہ اور بچے تین سو کنیزیں اور میرا اپنا خاندان بھی تھا، ہم نے تیس دن کی مسلسل مہم آزمائش مسافت کے بعد آخر کار ایک جگہ قیام کیا۔

آسودہ کے میدانی علاقے میں تاحد نظر خیمے ہی خیمے لگ گئے، سرداروں کے رنگ برنگے خیموں پر ان کے اپنے پرچم لہرا رہے تھے میدان کے سبزہ زار پر ہزاروں جانور گھاس چر رہے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو ہر سمت پھیلا

ہوا تھا۔

ذیشان عالی! چشم تصور سے دیکھو اور صدیوں کی زندگی کو تسلیم کر دو زندہ صدیوں میں جو مناظر سائے گئے ہیں وہ دنیا کی ہر جنگ سے زیادہ خوبصورت اور حقیقتوں سے قریب ہیں۔ جنگ کی مشقیں جاری تھیں، کہیں رتھوں کی مرمت ہو رہی تھی کہیں ہتھیار تیز کئے جا رہے تھے، کہیں تیغ زنی اور اور تیر اندازی کی مشق کی جارہی تھی اور ان سب سے الگ ایک جگہ شاہی خاندان کے خیمے تھے انہی میں سے ایک خیمہ میرا بھی تھا۔ بادشاہ کی تین سو کنیزوں میں مختلف ممالک کی حسینائیں تھیں ان میں بعض ایسی تھیں کہ جن کے حسن پر نگاہیں نہ ٹھہریں ان میں سے کتنی ہی ایسی تھیں جن کو شاہ کی بیج پر ایک مرتبہ سے زیادہ جگہ نہ ملی تھی۔ لیکن ان بے بس قیدیوں کی ذرا سی بیوفائی ان کی موت کا پروانہ بن سکتی تھی۔ مجھے ان کی بے بسی پر ترس بھی آتا تھا، حالانکہ شاہ کی منظور نظر ہونے کی بنا پر وہ سب مجھ سے حسد کرتی تھیں۔

ہر رات مجھے خیمے شاہی میں پہنچا دیا جاتا جوتا بڑا تھا کہ اس کے ایک حصے میں شاہ دارا کی خواب گاہ تھی دوسرے میں کھانے کا کمرہ اس سے ملحق دربار کا ہال۔ جب میں شاہ دارا کے ساتھ کھانا کھا رہی ہوتی تو برابر والے حصے میں میرا محبوب اولاش شاہ فارس کے لئے نغمہ نکھیر رہا ہوتا۔ ہمارے درمیان صرف ایک معمولی سا پردہ تھا، لیکن میں اس سے ملنا تو کجا اس کا دیدار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی تھی؟ میرے والد کو دن میں ایک مرتبہ مجھ سے ملنے کی اجازت تھی۔ عورتوں کے خیمے ایک علیحدہ حصے میں تھے۔ وہاں سرگوشی میں باتیں کی جاتی تھی میرا باپ ہمیشہ خفیض و غضب میں ہوتا اور شاہ دارا کو جی بھر کے کوستا، اس کے علاوہ اور وہ کربھی کیا سکتا تھا۔ میں ان کو تسلی دیتی اور یقین دلاتی کہ جلد ہی شاہ کی اس قید سے نجات مل جائے گی۔

بہر حال یہاں قیام کی تیرہویں رات تھی شاہی خیمہ گاہ کی خواب گاہ کے پردے میں سے جھانک کر میں دربار شاہی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ وسیع ہال نما خیمے میں شاہ سونے کے تخت پر مسند نشین تھا، گرد و پیش کمانداروں سرداروں کا حلقہ تھا اس کے بعد مختلف صوبوں کے گورنر جن کو ساتراک کہتے تھے اور ان کے بعد درجہ بہ درجہ دستہ کھڑا ہوا تھا اور ان کے قریب ہی ویس کھڑا ہوا تھا۔ وہ الوطر کا ساتراک اور بہت دلیر کمانڈر تھا جسے شکست دے کر سکندر نے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کے بعد سے سکندر کا جانی دشمن خیال کیا جاتا تھا۔

”جو کچھ تمہارا حال ہے اسے بے دھڑک میرے سامنے ظاہر کرو ویس۔“ شاہ دارا نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم ہماری جنگی تیاریوں کا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی شاہ عالم کہ میری راست گوئی حضور کو ناگوار گزرے گی۔ میں حقیقت پسندی سے کام لوں گا۔ لاکھوں جنگجو سپاہی ان کی زر برق پوشاک اس کے چمکیلے ہتھیار یہ سب شان و شوکت دیکھ کر اہل فارس آپ کی قوت سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور ان کے سامنے سلطنت کا کوئی فرد سراٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن مقدونیہ کا حکمران سکندر یا اس کے بہادر جنگجو سپاہی دشمن کی بڑی تعداد یا اس کے لشکر کی شان و شوکت کو خاطر میں نہیں لاتے، ان کی وردیاں معمولی ہیں، لیکن ان کے نیزوں کی نوکیں اور ان کی تلواروں کی کاٹ کے آگے شاہی لشکر کا ٹھہرنا محال ہوگا۔ مقدونی سپاہی ناقابل شکست ہیں ان کی شجاعت اور دلیری بے مثال ہے۔ ان کا خصوصی تربیت یافتہ دستہ بڑی سے بڑی فوج کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر سکندر کا لشکر اپنے سردار کے اشارے پر جان نثار کرنے کا جذبہ لے کر لڑتا ہے۔ وہ شکست کے نام سے واقف نہیں ہے، ان دلیر اور جنگجو جوانوں کے سامنے شاہی لشکر کا ٹھہرنا میرے خیال میں ممکن نہیں ہوگا۔“

دربار میں کچھ دیر کے لئے موت کا سناٹا طاری ہو گیا، لیکن پھر اچانک ہی ایک سردار نے گرجدار آواز میں کہا۔

”زبان کو لگام دے دیس۔ تو شاہ دارا کے سپاہیوں کی توہین کر کے شای غیض و غضب کو دعوت دے رہا ہے۔“  
دیس اس کی سمت غصے میں پلٹا اور بولا۔ ”لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں سکندر کے سواروں کے آگے کرائے کے لشکر کا ٹھہرنا مشکل ہے۔ اس کے جوان اپنے سردار اپنے ملک کے لئے جنگ کرتے ہیں وہ ہمارے لشکر کی طرح کرائے کے فوجی نہیں ہیں میں پھر یہی کہوں گا کہ اس سے پہلے کہ سکندر کا شیر دل لشکر یہاں پہنچے بھاگ نکلوا اس میں سلامتی ہے۔“

”مگر قمار کرو اسے۔“ شاہ دارا کی گرجدار آواز فضا میں گونجی اور بیک وقت بہت سے سردار تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور دیس کو گرفت میں لے لیا۔

”اگر آپ نے مجھے قتل کر دیا شاہ دارا تو بھی سکندر کے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔“ وہ چلایا، لیکن اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور شاہ کے اشارے پر ایک محافظ نے اس کی گردن ایک ہی وار میں اڑا دی۔ دیس کا بے سر کا بدن زمین پر ترپنے لگا، میں نے ایسا بھیانک منظر اپنی اس حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا تھا ڈیٹان عالی! میں بھانکتی ہوئی آئی اور بستر پر گر پڑی البتہ دربار ختم ہونے کے بعد جب شاہ خوابگاہ میں آیا تو بے حد متحیر اور پریشان تھا۔ اس نے اپنی پریشانی کو میری محبت اور میرے حسن کی شادابیوں سے دور کرنے کی کوشش کی اور پھر تھک کر سو گیا لیکن اس کی جو حالت تھی وہ قابل دید تھی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا وہ جھج مار کر اٹھ بیٹھا اور چلایا۔ ”خدا رحم کر خدا رحم کر۔“ وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے میرے آقا کیا بات ہے آپ کو کیا ہو گیا؟ کیوں اس طرح خوف زدہ ہیں؟“ شاہ نے چونک کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”آہ امنا کیہ! میری زندگی میں نے بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے۔“

اس کا بدن تھر تھر کاٹپ رہا تھا اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھا کہ سکندر کے خیمے کے گرد حیر روشنی پھیلی ہوئی ہے جیسے آگ لگ گئی ہو اور پھر ڈرامی دیر کے بعد سکندر اس روشنی میں نمودار ہوا اس نے میرا شای لباس زیب تن کر رکھا تھا میرا تاج اس کے سر پر تھا وہ بائیں طرف روانہ ہوا اور اپنے سفید گھوڑے کو دوڑاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کانپنے لگا۔ پھر اس نے اسی وقت حکم دیا کہ شای کا ہنڈ کو طلب کیا جائے، کاہن کو مٹھ یا معبد کہتے تھے ذرا دیر میں کاہن اعظم دوسرے معبدوں کے ہمراہ پہنچ گیا۔ شاہ کا خواب سننے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔

”بڑا مہارک خواب ہے شاہ عالی مقام دشمنوں کے خیمے میں آگ لگ جانا اور سکندر کا فرار اس کی شکست کی پیشگوئی ہے اور چونکہ وہ شای لباس میں بائیں کی سمت بھاگ رہا ہے اس لئے اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وہ آپ کے پاس قیدی کی حیثیت سے آئے گا۔“

کاہن تو پیشگوئی کر کے چلے گئے، لیکن شاہ مطمئن نہیں تھا اس نے کہا۔ ”اور میں جانتا ہوں امنا کیہ یہ کاہن بھی صرف میری غرضنودی کے لئے ایسی جھوٹیاں کہتے ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ خواب بڑی محنت کی علامت ہے۔“ اب میں اس بارے میں کیا کہتی ڈیٹان عالی! میں تمہیں صرف یہ بتا رہی ہوں کہ زعمہ صدیاں میں جب اس دور کی تاریخ لکھو تو یہ لکھنا کہ انسان کتنی ہی جاہ و ثروت کا مالک ہو لازی طور پر بد عقیدہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی موت سے خوف زدہ۔ خیر رات کا باقی حصہ اس نے جاگ کر گزارا میں نے اسے بہت سی تسلیاں دیں لیکن اس کی وحشت دور نہیں ہو سکی۔ سورج نکلنے ہی رودانہ کے معمول کے مطابق مجھے میرے خیمے میں بھیج دیا گیا، کاہنوں نے جنگ میں کامیابی کے

لئے قربانی شروع کر دی تھیں میں آرام کرنے لیٹ گئی۔

دوپہر کے بعد بیدار ہو کر میں نے غسل کی تیاری شروع کر دی کہ میری خاص باغی صبا نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ میرے کان میں سرگوشی کی اور مجھے خوشخبری سنائی کہ اولاش نے ایک ترکیب سوچی ہے مجھ سے ملاقات کرنے کی میں نے چونک کر صبا کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”وہ اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔“

”نہیں اس کی ترکیب بہت اچھی ہے۔“

میں صبا کی صورت دیکھنے لگی۔ حالانکہ دل اس لمحے کے تصور سے اچھل رہا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ اگر وہ مجھ سے ملنے کے لئے جان خطرے میں ڈال سکتا ہے تو پھر میں یہ خطرہ کیوں نہ مول لوں۔ سنہری ریشمی قاتوں سے بنائے ہوئے حمام میں بیٹھے ہوئے مجھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پردہ ہٹا اور ایک خواجہ سرا مسطر پانی لئے ہوئے داخل ہوا پھر ایک آواز ابھری۔

”امنا کیہ!.....!“ یہ آواز سرگوشی میں تھی میں نے حیرت سے چونک کر دیکھا تو خواجہ سرا کے لباس میں اولاش میرے سامنے کھڑا ہوا تھا، میں بے خودی کے عالم میں اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سا گئی، جذبات سے ہمارے بدن کانپ رہے تھے اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

”تمہارے بغیر میں زعمہ نہیں رہ سکتا امنا کیہ! میں مر جاؤں گا۔“ وہ انتہائی بے قرار نظر آ رہا تھا، جذبات ٹھنڈے ہوئے، محبت کا مدوجز رخت ہوا اولاش نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”میری زندگی میں یہ تصور ہی جان لینے والا ہے کہ تم شاہ دارا کے بستر کی زینت بنو۔ میں نے اب تک سب کچھ برداشت کیا ہے لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ اس ظالم کو قتل کر دوں جو میری محبت کا اس طرح مذاق اڑا رہا ہے میں جانتا ہوں کہ تم مجبور ہو ورنہ ہرگز اس جبر کے لئے تیار نہ ہوتیں، لیکن بس اب بہت ہو چکا ہے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم رات کی تاریکی میں فرار ہو جائیں، تمہاری خاطر میں اپنے اہل خاندان کو بھی چھوڑ دوں گا۔ ہم فرار ہو کر ہندوستان چلے جائیں گے راستے میں ایسے نشانات چھوڑ دیں گے جن سے ثابت ہو کہ تمہیں ہلاک کر دیا گیا ہے، ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے میں بسنے ہوئے باتیں کرتے رہے میں نے کہا۔

”اولاش! شاید دیوتاؤں کو یہی منظور ہے میں تیرے بغیر زعمہ نہیں رہ سکتی، ہم ہندوستان چلیں گے ضرور چلیں گے۔“ فرار کے اس فیصلے نے میری رگوں میں مسرتوں کا طوفان برپا کر دیا تھا، اولاش کے جانے کے بعد میں نے صبا کو خوشی سے گھونٹ کر پیار کیا اور اسے اپنا راز دار بناتے ہوئے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں اسے خرید کر آزاد کر دوں گی اور آئندہ سے وہ میری کیز نہیں میری سہیلی ہوگی، خیر اس رات جب میں شای خیمہ گاہ پہنچی تو بے حد خوش تھی جبکہ شاہ دربار میں تھا، میں نے جھانک کر دیکھا۔ شاہ دارا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک کمانڈر اس سے کہہ رہا تھا۔

”عالم پناہ ہم تمام کمانڈروں نے بہت غور فکر کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ہم بیٹھ کر سکندر کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس کے مقابلے پر آئیں گے مجھے یقین ہے کہ سکندر کے اس طرف آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔“

کمانڈر کی اس تجویز پر ہرست سے مخالفت میں آواز بلند ہوئی لیکن ایک دوسرے کمانڈر نے سب کو خاموش کر دیا اور بولا۔

”عالی جاہ میں اس تجویز سے اتفاق کرتا ہوں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شای دستہ اتنی بڑی تعداد میں اس کا منتظر ہے اس کا ارادہ شاید تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی وقت ایک سردار اچانک چیخا۔



تھائی فورس کو دی گئی سب سے آگے رتھوں پر جس دستے کو دشمن کا سامنا کرنا تھا وہ میرے باپ کی کمان میں دیا گیا تھا۔ لشکر کی ترتیب اور مفت بندی میں رات پوری ہو گئی۔ شاہ دارا جب مجھ سے رخصت ہونے آیا تو میں نے اسے فتح اور نصرت کی پیشگوئی کر کے تسلی دی لیکن اس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنے والے معرکے سے خوف زدہ ہے۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی نگاہوں نے دشمن کو تلاش کرنا شروع کر دیا، شاہ کا خیمہ بلندی پر نصب تھا اس لئے پہاڑی ڈھلوانوں سے دور دور تک کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ خواجہ سرائے اندر آ کر خبر دی کہ ابھی تک سکندر کی فوجوں کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ درے کے اوپر سے گردوغبار نمودار ہوا اور ہر سمت شور مچ گیا کہ سکندر آ گیا۔ سکندر آ گیا۔ پورے لشکر میں کھلبلی مچ گئی، حرم کی عورتوں نے خوف زدہ ہو کر رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ خواجہ سرائے اور دوسرے ملازمین ان کو چپ کرانے کے لئے تسلیاں دینے لگے، میں نے خیمے کا پردہ اٹھا کر دیکھا، سکندر کا لشکر اب درہ پار کر کے ہماری سمت بڑھ رہا تھا وہ ہر لمحے قریب آتے جا رہے تھے پھر وہ اتنے نزدیک آ گئے کہ ہمیں صاف نظر آنے لگے۔

سکندر کے سپاہیوں کے چہرے سخت گیر تھے ان کا لباس بھدا اور ان کے سواروں کے گھوڑے ہماری طرح بھاری ہتھیاروں سے لدے ہوئے نہیں تھے ان پر صرف چمڑے کی ہلکی سی زین تھی ہمارے تیر انداز دستوں کی زد سے فاصلے پر وہ رک گئے اور فوجوں کی صف بندی کرنے لگے۔ سواروں کے آگے سکندر خود ایک سیاہ مٹھی گھوڑے پر سوار تھا وہ پستہ قد تھا لیکن شجاعت اور دلیری کے لحاظ سے اتنا بلند تھا کہ پورا ایشیاء اس کے قدموں کے دھمکے سے لرزنے لگا تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو سکندر اپنے گھوڑے کو لے کر ہمارے لشکر پر تیر کی طرح چھٹا۔ اس کے سپاہی بڑے نظم و ضبط کے ساتھ بڑھ رہے تھے ان کے فلک شکاف نعرے ایلولا ایلولا سے فضا کانپ رہی تھی۔ ادھر سے شاہ دارا کے سپاہی شیر کی طرح دشمنوں پر چھپتے اور دوسرے لمحے گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ لاشوں کے انبار لگتے چلے گئے۔ سکندر کا قلبی دستہ فرانک ہمارے سپاہیوں کو گرجا مولیٰ کی طرح کاٹا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چیخ و پکار اور ہتھیاروں کا شور فضا میں گونج رہا تھا۔

شاہ دارا کی فوجیں آہستہ آہستہ ہر سمت سے پسپا ہو رہی تھیں۔ شاہ اپنے رتھ پر بیٹھا سپاہیوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ درمیان میں افراتفری کا عالم تھا، مینڈ اور میسرہ پسپا ہو رہے تھے شاہ کا مخصوص شاہی دستہ جو سپاہ جادو کہلاتا تھا۔ شاہ کے گرد حفاظتی حصار بنا چکا تھا لیکن سکندر کسی غیر فانی شجاع کی طرح ایرانی سپاہ کو کاٹتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، اچانک سپاہ جادو نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ سکندر کے سپاہی اب اتنے قریب آ گئے تھے کہ ان کے نیزے شاہی رتھ کے اوپر سے گزرنے لگے تھے اور پھر ایک نیزہ رتھ کے گھوڑے کے جسم میں بیوست ہو گیا۔ گھوڑے کے اچھلنے سے رتھ الٹتے الٹتے بچا اور میں نے شاہ دارا کو اچانک چھلانگ لگا کر ایک بے سوار گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میرا خیال تھا وہ خود سکندر سے مقابلے کو جا رہا ہے لیکن میری حیرت زدہ نگاہوں نے دیکھا کہ شاہ کے گھوڑے کا رخ پیچھے کی سمت ہو گیا۔ وہ بائبل کی سمت بھاگ رہا تھا، دوسرے لمحے شور بلند ہوا۔

”بادشاہ فرار ہو گیا، بادشاہ فرار ہو گیا۔“ ان خوف زدہ چیخوں کا بلند ہونا تھا کہ ایرانی فوجوں کے پاؤں اکٹڑ گئے۔ اس نے بدحواس ہو کر راہ فرار اختیار کی، لیکن سکندر کے دلیر نوجوان ہر سمت سے موت بن کر ان پر چھٹ پڑے۔ اچانک بائیں سمت کے سواروں کا رخ شاہی خیمے کی سمت گھوما، عورتوں نے خوف سے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ خواجہ سرائے بھاگتا ہوا ہمارے خیمے میں داخل ہوا، اس نے کہا۔

”عالم پناہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اسی جگہ قیام فرمائیے، یہ کشادہ میدان اتنے بڑے لشکر سے جنگ کے لئے موزوں ترین ہے۔“

ہر سمت سے آوازیں بلند ہونے لگیں لیکن شاہ دارا کو شاید کمانڈر کی تجویز پسند آئی تھی اس نے کہا۔ ”خاموش!.....! ہم انتظار نہیں کر سکتے، سکندر کو اپنی طاقت پر بڑا غرور ہے، ہم آگے بڑھ کر اس کے غرور کا سرپاش پاش کر دینا چاہتے ہیں، چلو تیار یوں کا حکم جاری کرو۔ ہم دودن کے بعد اس کی طرف کوچ کر دیں گے۔“

اتنے بڑے لشکر کو لے کر آگے بڑھنا ایک دشوار مرحلہ تھا، شاہ دارا کو کوہ اماؤس کی بلندیوں کو پار کر کے دوسری جانب علاقے تک پہنچنے میں تین دن لگ گئے۔ جیسے ہی لشکر ٹیہی علاقے میں پہنچا وہاں کے باشندوں نے یہ خوشخبری دی کہ سکندر اپنی فوجوں سمیت فرار ہو گیا ہے اور اب شام کے پہاڑی علاقے کی سمت جا رہا ہے یہ خبر سننے ہی لشکر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی انہوں نے اسے اپنی فتح تصور کر کے نعرہ لگانے شروع کر دیئے، سکندر جاتے ہوئے بہت زخمی چھوڑ گیا تھا، دارا کے کمانڈروں نے ان سب کو ہلاک کرنے کا حکم جاری کر دیا اور اس کے بعد ہم نے دریائے فارس کی سمت بڑھنا شروع کیا۔ یہاں ایک تنگ پہاڑی درے کے قریب جس کی دوسری جانب سمندر ہے لشکر کے قیام کا حکم دیا گیا، پہاڑ کے ڈھلوانوں پر ہر سمت گھنے جنگل بکھرے ہوئے تھے، حسب معمول مجھے شاہی خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ شاہ دارا اپنے کمانڈروں کے ساتھ مصروف تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو شاہ کی آواز سنائی دی۔

”اب ہمارے اور ہمارے دشمن کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے، کل ہم سکندر کو شام کے علاقے میں جا دیو چھیں گے اور اسے مقابلے پر مجبور کر دیں گے۔“ شاہ کا جملہ مکمل بھی نہ ہو سکا تھا کہ ایک کمانڈر بڑی تیزی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا اور دارا کے سامنے تعظیم دے کر بدحواسی کے عالم میں بولا۔

”عالی جاہ! ابھی ابھی جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ سکندر نے اچانک رخ بدل لیا ہے اور واپس پیش قدمی شروع کر دی ہے وہ بہت تیزی سے ہماری سمت آ رہا ہے۔“

دربار میں کھلبلی مچ گئی۔ کمانڈر اپنے اپنے دستوں میں بھاگے مقابلے کے لئے سپاہی مسلح ہونے لگے۔ ذرا دیر میں نقشہ بدل گیا چونکہ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ سکندر رات کی تاریکی میں حملہ کر دے گا اس لئے پورے زور و شور سے تیار یوں شروع ہو گئیں، دارا نے اپنے دربار میں کمانڈروں کے ساتھ جنگ کا نقشہ ترتیب دینے کی مصروفیت اپنائی۔

”ہمیں درے کے ہر حصے پر ابھی سے مورچے بنالینے چاہئیں۔“ ایک کمانڈر نے مشورہ دیا۔

”اور سمندر کے کنارے اپنے مخصوص دستوں کو ابھی سے مورچہ بند کر دینا چاہئے تاکہ سکندر کے فرانک دستے پر زبردست حملہ کیا جاسکے۔“

”بہت مناسب مشورہ ہے۔“ شاہ نے خوش ہو کر کہا پھر اپنے ایک کمانڈر سے بولا۔

”تم دس ہزار سواروں کو لے کر ساحل کی مورچہ بندی کر لو۔“

کمانڈر کے جاتے ہی مصر کے گورنر سائباس نے مشورہ دیا۔ ”عالم پناہ! ہمارے اور دشمن کے درمیان یہ دریا حائل ہے اس محاذ کی حفاظت بھی ضروری ہے۔“

شاہ دارا نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ ”بے شک تم ٹھیک کہتے ہو، تم بیس ہزار کمان برداروں کے ساتھ دریا کی حفاظت کے ذمہ دار ہو۔“

شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس میز کے پاس جا کھڑا ہوا جس پر جنگ کی منصوبہ بندی کا نقشہ پھیلا ہوا تھا، وہ نقشے پر فوجوں کی ترتیب کرنے لگا، سکندر کا مخصوص دستہ فرانک سب سے زیادہ خطرناک تصور کیا جاتا تھا، اس کے مقابلے کی کمان

ساتھ لے گیا، شدید بخار کے عالم میں وہ کئی ماہ ہوش و حواس سے بیگانہ رہے، پھر جیسے ہی طبیعت سنبھلی بابل روانہ ہو گئے۔ لیکن میرا محبوب اولاش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے انتظار کا وعدہ کر لیا تھا، میں اس امید کے دیئے جلائے اس کے انتظار میں وقت گزار رہی تھی۔ محل کی ہر چیز ویسی کی ویسی تھی، کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا، میں نے سوچا کہ شاید خود مجھ میں تبدیلی آگئی ہے اور حقیقت یہی تھی کہ میرا دل پہلے سے درد سے آشنا نہیں تھا، پہلے میں ایک بندگی تھی اور اب مہکتا ہوا پھول بن گئی تھی۔ یہ بات میں تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں ذیشان عالی! کہ میں بالکل ہی بدل چکی تھی اب جب کبھی میں اپنی اصل حقیقت کا تصور کرتی مجھے یوں لگتا جیسے میں اپنی اصلیت گم کر چکی ہوں ہاں یہ حقیقت ہے کہ میں نے بچپن سے یہاں تک کا سفر کیا تھا اور یہ سفر اس طرح میرے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا کہ میں کو روٹی کو بھول گئی تھی، البتہ یہ بھی ایک خاص بات تھی کہ اب میں مہکتا ہوا پھول بن گئی تھی۔ لیکن اصنا کیہ کی حیثیت سے شاہ دارا کی بیچ پر میری مجبوری نے مجھے وہ سب کچھ برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا جس کا تصور بھی اذیت ناک تھا، لیکن عورت ہر روپ میں مجبوریوں کی اس قربان گاہ پر شمار ہوتی چلی آئی ہے، کہنے کو میں شہزادی تھی، لیکن شاہی بیچ پر ایک بے بس کنیز۔

میرا ذہن تجربات سے پختہ ہو گیا تھا۔ مشاہدے اور تجربے نے مجھے ایک نیا شعور عطا کیا تھا۔ میرے بابا اور استاد نے بھی میرے اندر اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور مجھے انتظامی مجلس میں شامل کر لیا گیا۔ میں نے بھی ان کے اعتماد کو تقویت پہنچانے کے لئے خود کو مجلس کی ذمہ داریوں کے لئے وقف کر دیا، عسکرانی کی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کرنا اور فارس کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی صورت میں شاہ دارا کی ہر ممکن مدد کرنا ہماری حکومت کے اولین فرائض میں سے تھا۔ میرے والد کی صحت بہت متاثر ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے فرائض میں منہمک تھے۔ وہ فوجی قوت کو جلد از جلد بحال کرنا چاہتے تھے تاکہ شاہ فارس کو جب بھی ضرورت ہو کسی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔

ہم جنگ کے محاذ سے بہت دور تھے لیکن سکندر کی کارروائیوں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ سکندر نے طائر کے ناقابل شکست قلعے کو بھی مسلسل سات ماہ کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی فتوحات سے پورا ایشیاء خطرے میں پڑ چکا تھا، میں ہر روز بلا ناغہ صبا کو شہر کے پھاٹک پر روانہ کرتی تھی جہاں سے مغرب کی سمت آنے والے قافلے اندر داخل ہوتے تھے ہر روز دھڑکتے دل سے انتظار کرتی تھی کہ شاید آج وہ اولاش کے بارے میں کوئی خوشخبری لائے لیکن ہر شام مایوسی میرے حصے میں آتی تھی صبا مجھ سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ اس سے میری یہ اذیت دیکھی نہیں جاتی تھی وہ مجھے تسلی دیتی رہتی تھی کہ ممکن ہے اولاش زندہ ہو اور ایشیاء سے فرار ہو کر اپنے ماں باپ کے پاس پر وشم چلا گیا ہو۔ میں نے صبا کو آزاد کر دیا تھا لیکن اب بھی وہ پہلے کی طرح میری خدمت گزار تھی۔ اس کی کلائی پر غلامی کا جو داغ کندہ تھا۔ میں نے جراح کے ذریعے اس کو ہٹا دیا تھا، میں نے اس کو پہننے کے لئے بہترین لباس اور زیورات دیئے تھے اور اس سے اپنی چھوٹی بہن جیسا سلوک کرتی تھی۔ وہ فاشعار تھی اور میری خدمت کو اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا، پھر ایک دن اس نے اجازت لے کر مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

”شہزادی آپ کب تک اولاش کے فراق کی آگ میں جلتی رہیں گی، مظہر یزدان نے آپ کو وہ حسن و جمال عطا کیا ہے کہ چاند تارے بھی شرماتے ہیں۔ بابل میں آپ کے ایک اشارے پر کتنے شہزادے قربان ہو جائیں گے، آپ اولاش کو بھول جائیے ایک سے ایک خوب رو نو جوان آپ پر جان نثار کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔“

میں اس کی بات پر افسردہ ہو گئی میں نے کہا۔ ”پنگی تو سمجھتی ہے کہ محبت بھی کوئی ایسا سودا ہے جس سے چاہے کیا جا سکتا ہے میں اولاش سے انتظار کرنے کا وعدہ کر چکی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک اس کا انتظار کروں گی۔ آہ تو محبت کا درد نہیں جانتی یہ قسمت ہی سے ملتا ہے۔ اولاش کے علاوہ اور کوئی میری محبت نہ حاصل کر سکے گا۔“

”ہم جنگ ہار گئے شہزادی از زندگی عزیز ہے تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بھاگ نکلے ابھی اسی حال میں۔“ ہم نے خیمے کی عقب سے نکل کر بھاگنا شروع کر دیا صبا۔ میرے پیچھے تھی ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ اگلے خیموں پر سکندر کے سپاہیوں نے ہمد بول دیا۔ ”ہمیں اپنی موت کا یقین ہو گیا، اسی لمحے کسی نے پکارا۔ ”اصنا کیہ! اصنا کیہ۔“ جنگ کے شور و غل میں یہ آواز مجھے اپنا وہ ہم محسوس ہوئی، لیکن دوسرے لمحے خیموں کے عقب سے ایک سوار ہمارے پاس پہنچ کر نیچے کو جھکا اور میرے حلق سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔

”اولاش۔“

اس نے پھرتی کے ساتھ مجھے اور صبا کو اٹھا کر گھوڑے کی پشت پر سوار کر دیا اور پیچ کر بولا۔

”خدا حافظ اصنا کیہ پوری رفتار سے بابل کے راستے پر نکل جاؤ، زندگی رہی تو پھر ملیں گے میرا انتظار کرنا۔“

میں نے چیخ کر کہا۔ ”نہیں اولاش! میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی۔“

لیکن اس نے گھوڑے کو زور سے چابک مارا اور میں کچھ اور نہ کہہ سکی، فرار ہونے والے فوجیوں نے ہمارا راستہ بند کر رکھا تھا، چنانچہ بحالت مجبوری میں نے گھوڑے کا رخ تبدیل کیا، افراتفری کے عالم میں کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ ہر شخص جان بچا کر بھاگ رہا تھا، اگر ہم بابل جانے والی سرک کا رخ کرتے تو یقیناً مارے جاتے، شاہی خیموں سے عورتوں کی کرہناک چیخیں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں، اس لئے میں گھنے جنگل میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ تمام رات اور دوسرے دن ہم اس ویران جنگل میں چھپے رہے اور جب دوسری شب شروع ہوئی تو ڈرتے ڈرتے پھر روانہ ہو گئے جنگل سے نکلنے ہی خوش قسمتی سے ایک گاؤں مل گیا جہاں ایک نیک دیہاتی نے ہمیں پناہ دی تھی۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ کی ملکہ کو قید کر لیا، شاہی خزانے اور سامان حرب پر قبضہ کر لیا گیا۔ میں نے خدا ترس دیہاتی کو چند قیمتی گلینے دے کر دو تیز رفتار گھوڑوں اور راستے کے لئے غذا کا بندوبست کیا اور ہم بابل کی سمت روانہ ہو گئے، راستے میں ہمیں یہ خبریں ملتی رہیں کہ دشمن کے گورنر نے غداری کی اور پورا علاقہ اور شاہی خزانہ سکندر کے حوالے کر کے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

شاہ دارا فرار ہو کر بابل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، آخر ہم بھی بابل پہنچ گئے، میری ماں اور میری بہن جان بچا کر وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ لیکن میرے باپ کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میری واپسی پر انہیں مسرت ہوئی جو اس خیال سے مدہم پڑ گئی کہ شاید میرے باپ جنگ میں کام آگئے۔ مجھے بار بار اولاش کا خیال آ جاتا، جانے وہ زندہ بھی تھا یا نہیں، جب بھی اس کی یاد آتی میں تڑپ اٹھتی۔ وہ چاہتا تو فرار ہو سکتا تھا لیکن اس نے میری جان بچانے کے لئے خود کو موت کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔

اس طرح وقت گزرتا رہا، کئی مہینے گزر گئے لیکن میرے بابا اور اولاش کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میرا سارا گھر سو گوار تھا اور آہستہ آہستہ ہم ان کی زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔ ادھر روزانہ بری خبریں موصول ہو رہی تھیں، سکندر نے شام اُدارس اور فونیسیا کے سارے علاقے کو فتح کر لیا تھا۔ شاہ دارا نے سکندر کو ایک خط لکھ کر اپنی ماں اور بیوی کو واپس طلب کیا تھا جس کے جواب میں سکندر نے تحریر کیا تھا کہ اگر وہ خود اس کے پاس آ کر سکندر کو ایشیاء کا شہنشاہ منتخب کر لے تو جو بھی طلب کرے گا دے دیا جائے گا۔

پھر ایک دن اچانک میرے بابا واپس آ گئے۔ میرے گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے کیونکہ ہم ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ میرے بابا کو پہچانا دشوار تھا، وہ دیہاتیوں کا پھٹا پراتا لباس پہنے ہوئے تھے، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکا تھا۔ جنگ میں ایک تیران کو لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ مقدونیہ نے انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، رات کو انہیں ہوش آیا تو کسی طرح گرتے پڑتے جنگل میں پہنچے جہاں دوسرے دن ایک دیہاتی نے پڑے ہوئے پایا اور اپنے

اور وہ دن بھی آگیا جب میرے بابا تازہ دم لشکر لے کر شاہ دارا کی مدد کے لئے روانہ ہونے لگے۔ اپنے کمرے میں جب وہ رخصت کی تیاری کر رہے تھے تو میرے بھائیوں نے ان کے جسم پر ہتھیار سجائے۔ بابا نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے تمام بیٹے سعادت مندی کا ثبوت دیں گے پھر میرا بازو پکڑ کر مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے ان کی سیاہ چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”امنا کیہ میری بیٹی! تمہاری عمر بہت کم ہے، لیکن منہ نے تم کو بچپن ہی سے غیر معمولی فہم و دانش عطا کی ہے اس لئے میں سکودیہ کی حکمرانی تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں، تم اپنے استاد و سلطنت کے رؤسا اور مشیروں کی مدد سے کاروبار حکومت چلانا حکومت کا دبدبہ قائم رکھنا ہر ایک سے انصاف کرنے کو اپنا اولین فرض تصور کرنا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”بابا میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی، خدا ہر مڑ کی مدد شامل حال رہی تو میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی۔“

میرے باپ کی روادارگی کے بعد ہی سکندر کی پیش قدمی کی خبریں آنے لگیں، ایک خونخوار جنگ کے بعد غارتہ بھی فتح ہو گیا تھا، پھر یروشلم کے لوگوں نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد مصر بھی فتح ہو گیا اور وہاں کے ایرانی سستراپ نے اسے فرعون ثانی کے لقب سے نوازا۔ میں نے ایک فرمان جاری کر کے سکودیہ کے تمام باشندوں کو سکندر سے جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔ پورے سکودیہ میں جنگ کی تیاری شروع ہو گئی، پھر ایک دن میں ان تیاریوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے پہرے دار کے ہمراہ ہمیں بدل کر خود شہر کے گشت پر نکلے۔ بازار میں ایک جگہ بڑا مجمع لگا ہوا تھا اور ایک شخص چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا۔

”لوگو میری بات سنو، شاہ فارس نے سکندر کو صلح کا پیغام بھیجا تھا اور اسے خبردار کیا تھا کہ فارس کی سر زمین کا رخ نہ کرے ورنہ جبر تاک شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جانتے ہو سکندر نے کیا جواب دیا۔“

”اس نے صلح کی پیشکش مان لی ہوگی۔“ بہت سے لوگ خوشی سے چلائے۔

”نہیں اس نے جواب میں تحریر کیا ہے کہ سکندر کے بڑے ہونے قدم کبھی واپس نہیں ہوتے۔ وہ دن دور نہیں جب میرا لشکر تمہارے دار السلطنت پر نازل ہوگا اور پورے فارس پر قابض ہو جائے گا، تم کو فارس کی سر زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

اس خبر سے سارے لوگوں پر مایوسی اور دہشت طاری ہو گئی۔ پھر خبر آئی کہ دارا کی ملکہ سکندر کی قید میں انتقال کر گئی۔ سکندر نے بڑی عزت و احترام سے اس کی آخری رسومات ادا کیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خوش کن اطلاعات بھی آ رہی تھیں کہ دارا نے اتنا بڑا لشکر جمع کر لیا ہے کہ اربلا کے سارے میدانی علاقے سے لے کر فرات کے دوسرے کنارے تک فوجیں پھیلی ہوئی ہیں اس لشکر میں صرف سواروں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے شاہ نے ان تمام علاقوں سے غلے کا ذخیرہ اندرون ملک روانہ کر دیا ہے تاکہ سکندر کی فوجوں کو کہیں سے رسد نہ مل سکے۔ پورے سکودیہ کے علاقے میں معبدوں نے شاہ کی فتح اور نصرت کے لئے خصوصی دعائیں شروع کر دی ہیں قربانیاں دی جانے لگی ہیں، کانہوں نے اپنا عمل شروع کر دیا ہے۔

لیکن پھر ایک دن یہ منحوس خبر آئی کہ اربلا کی جنگ میں شاہ دارا کو شرمناک شکست ہو گئی۔ میرا جی چاہا کہ یہ خبر لانے والے قاصد کو زندہ دفن کرادوں لیکن میں نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ شاہ دارا کی دوسری شکست سے واضح ہو گیا تھا کہ سکودیہ کا مستقبل بھی خطرے میں ہے۔ میں نے حکم دیا کہ دس سال سے اوپر کے تمام لو جو انوں کی جنگی تربیت شروع کر دی جائے، جنگی سرداروں سے مشوروں کے بعد میں نے سونے اور چاندی کے عوض ہتھیار خریدنے کے لئے لوگوں کو ہندوستان

روانہ کر دیا اور یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ سکودیہ کے علاقوں میں جتنا بھی اناج مل سکے خرید کر ذخیرہ کر لیا جائے۔

سکندر کی پیش قدمی کی خبریں برابر مل رہی تھیں، اربلا کی فتح کے بعد وہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا، میں نے آخر کار پہاڑ کی چوٹی پر واقع مضبوط ترین قلعے میں اناج کا اتنا ذخیرہ کر دیا کہ محاصرے کی صورت میں کئی برس تک کام آ سکے۔ شاہ دارا تیسری مرتبہ فوجیں جمع کر رہا تھا۔ میرے باپ نے مجھے تحریر کیا کہ جتنے زیادہ سپاہی جمع ہو سکیں روانہ کر دو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی لیکن دونوں جنگوں اور دفاعی تیاریوں میں خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ ادھر سکندر نے سوسا، بابل اور پھر پرسی پولیس پر قبضہ کر لیا اور پھر اس طرح بے حساب شاہی خزانے اس کے ہاتھ لگتے چلے گئے۔ اس نے شاہی محلات کو آگ لگا کر تباہ و برباد کر دیا، تباہی اور بربادی کی ان خبروں نے ہمارے حوصلے بالکل پست کر دیے تھے۔ پھر ایک بھیانک آواز آئی ایسا لگتا تھا جیسے بہت بڑی تباہی آنے والی ہے ہر سمت موت کی ویرانی طاری ہو چکی تھی، میں نے اپنے استاد کو بلا بھیجا، غم و اندوہ سے استاد کا سر جھکا ہوا تھا۔

”امنا کیہ، ہم کانہوں نے بہت پہلے سکندر کے ستارے پڑھ لئے تھے، وہ پورے فارس پر قابض ہو چکا ہے۔ ابھی ہم کو بہت سے صدے برداشت کرنے ہیں انہوں نے بتایا کہ محل کے احاطے میں کتوں نے اچانک رونا شروع کر دیا ہے۔ اس پیشگوئی سے میں کانپ اٹھی اور ہمیں صبح تک اس کا ثبوت بھی مل گیا، شاہ فارس مر چکا تھا۔ ہم سب غم اور مایوسی میں ڈوب کر رہ گئے۔ چند روز کے بعد تفصیلات پتہ چل گئیں۔ کیونکہ میرے باپ بچی ہوئی سپاہ کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ باختر کے گورنر نے اقتدار کے لالچ میں شاہ دارا کو قتل کر دیا وہ گورنر بہت طاقتور سردار تھا اور اس کا نام ہیمنز تھا، اس کے پاس لشکر بھی بہت بڑا تھا اس نے شاہ کو گرفتار کرنے کے بعد سکندر کو پیشکش کی کہ اگر اسے باختر کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا جائے تو شاہ دارا اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ سکندر سے ملاقات کے لئے ایک مقررہ مقام پر گیا، لیکن سکندر کو ایسی غداری ناپسند تھی اس لئے جیسے ہی ہیمنز اس مقام پر پہنچا سکندر نے اچانک اپنے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا ہیمنز نے بدحواس ہو کر فرار ہوتے وقت شاہ کو قتل کر دیا، کہتے ہیں شاہ دارا کی موت پر سکندر آبدیدہ ہو گیا اور اسے شاہی مقبرے میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ میں فارس کے اس عظیم حکمران کی بے بسی کی موت پر رو پڑی۔

”بابا کیا سکندر ابھی اور پیش قدمی کرے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں امنا کیہ، اب سکندر کے قدم بڑھتے ہی چلے آئیں گے اور ہماری سرحدیں محفوظ نہیں رہی ہیں۔“ میرے باپ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن ہم اسے روکنے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

دن گزرتے رہے، فضا میں ایک عجیب قسم کی سوگواری چھائی رہتی تھی۔ میرے بابا اپنی باقی فوجوں کو لے کر باختر کی سمت جا چکے تھے، میں مملکت کے کاروبار چلانے کے لئے خود کو زیادہ سے زیادہ معروف رکھنے لگی تھی۔

ذیشان! ذرا غور کرو، صدیوں سے جینے والی عورت جو دہری شخصیت رکھتی تھی ایک طرف قوت اور جادوگری میں باکمال، لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اپنی اصل حیثیت سے سامنے آئی تو ایلی گوس جس سے اس کا سب کچھ چھن چکا ہے اسے پتھر میں تبدیل کر دے گا، ایک زندہ بت کیسا لگے گا تمہیں، ذرا غور کرو اس بات پر۔

خیر ایک دن جب میں دربار میں بیٹھی ہوئی تھی اور لوگوں کی فریادیں سن کر انصاف کر رہی تھی کہ ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے بتایا کہ ایک جراح نے اس کے چار غلام ہلاک کر دیے ہیں، ثبوت میں اس نے پانچویں ملازم کو پیش کیا جس کا نام بوغا تھا، بوغا کی صورت دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑی۔ میں نے اسے اولاش کے ساتھ شاہ فارس کے محل میں دیکھا تھا۔ یہ بھی ایک گویا تھا۔ خیر میں نے جراح کی جائیداد ضبط کر کے فریادی کا نقصان پورا کرنے کا حکم دیا اور بوغا کو خرید

لیا، دربار ختم ہونے کے بعد میں نے بوغا کو فوراً محل میں طلب کیا اور اس سے اولاش کے بارے میں دریافت کیا۔  
 ”آہ شہزادی! اولاش میرا عزیز دوست تھا لیکن ایشیز میں جنگ کے دوران جب مقدونیہ نے ہمارے خیمے پر حملہ کیا تو اولاش وہاں موجود نہیں تھا، مجھے نہیں معلوم کہ اس کا انجام کیا ہوا، گرفتاری کے بعد ہمیں بابل میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔ یہ ہے میری داستان۔“

میں نے اسے آزاد کر دیا، بے چارہ بوغا غلامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس لئے آزادی کا سن کر بے ساختہ میرے قدموں میں گر کر رونے لگا، میں نے اسے اپنے بھائیوں کی تربیت پر مامور کر کے محل میں ملازم رکھ لیا۔

”غم نہ کرو بوغا! اس کے علاوہ تم میرے ذاتی فشی کے عہدے پر بھی کام کرو گے۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور اس کے لئے محل میں ہی رہائش کا بندوبست کر دیا۔ اس دوران سکندر کی مسلسل پیش قدمی جاری تھی۔ جو طوفان کی طرح ہماری سرحدوں کی سمت بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی فوجوں نے باختر کی سرحدوں میں داخل ہو کر بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، ایسوس نے میرے باپا کے ساتھ مل کر سکندر کو روکنے کی ناکام کوشش کی اور پھر فرار ہو کر اسکودیا میں مورچہ بندی شروع کر دی، لیکن اسکودیا کا انجام بھی واضح تھا۔ کسی وقت بھی سکندر ادھر کا رخ کر سکتا تھا۔ میں آنے والے وقت کے لئے وفاقی تیاریوں میں مصروف تھی کہ ایک قاصد میرے باپا کا خط لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔

”منجانب آخرتس اپنی بیٹی اصنا کیہ کے نام..... باپا نے تحریر کیا تھا۔“

میں حکم دیتا ہوں کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ملک چھوڑ کر ایسوس کے قلعے میں جا کر پناہ لو۔ اہل خاندان کے علاوہ محل کے تمام افراد اور اہلکار اور میرے وفادار دوستوں کو ساتھ لے جاؤ۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہم ہر قدم پر دشمن سے مقابلہ جاری رکھیں گے، زندگی ہے تو جلد ملاقات ہوگی۔“

مجھے اپنا محل چھوڑنے کا بے حد صدمہ ہوا، لیکن باپا کے حکم کی تعمیل فرض تھی۔ ہم اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے ہوئے ایسوس کے قلعے میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح ایک سال بیت گیا، اس طویل بارہ ماہ کی مدت میں ہمارا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی میرے باپ کے قاصد ہمیں باہر کے حالات سے باخبر کر دیا کرتے تھے۔ باپا کی عمر کافی ہو چکی تھی، تھاریس قلعے کے فوجی دستے اور تین ہزار کسانوں کی نگرانی کے جو قلعے میں پھلوں اور سبزیوں کی کاشت کے علاوہ مویشیوں کے پالنے کے ذمہ دار بھی تھے۔ ان کی دیکھ بھال ایک عمر رسیدہ سردار کرتا تھا، میرے پاس اب کوئی مصروفیت نہیں تھی کیونکہ دیگر کام کاج کی تمام ذمہ داری وفادار بوغا نے سنبھال لی تھی۔ چونکہ میں بچپن ہی سے اس قلعے میں قیام کرتی رہی تھی اس لئے اس کا چہرہ میرا دیکھا ہوا تھا۔

اس وقت صورت حال الگ تھی جب ہم مختصر قیام کے لئے یہاں آتے تھے تو ماحول بڑا خوشگوار ہوتا تھا، رقص و موسیقی کی محفلیں اور شکار و تفریح کی سرگرمیوں میں ہر لمحہ ہنسی خوشی گزرتا تھا لیکن اب یہاں کچھ نہیں تھا۔ ہر طرف ویرانی کا راج تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کتنے عرصے یہاں قیام کرنا پڑے گا۔ شہر کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں تھی اور اسی طرح مایوسی میں دن گزر رہے تھے۔ سکندر کی پیش قدمی کی اطلاعات ملتی رہتی تھی اور سب سہم جاتے تھے۔ باپا نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ سکندر کی فوجوں سے مختلف مقامات پر جنگ کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن کہیں کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے لئے ابھی یہی حکم تھا کہ قلعہ سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کی جائے۔

پھر ایک دن میں حسب معمول صبا اور بوغا کے ساتھ قلعہ میں گھوم رہی تھی۔ قلعہ کے میدان میں میرے چھوٹے بہن بھائی دوسرے بچوں کے ساتھ برف میں گھوم رہے تھے۔ اس کھیل میں بھی سکندر کی فوج پر حملے کر کے مقدونی سپاہیوں کو

ہلاک کر رہے تھے۔ میں مسکراتی ہوئی ان کے کھیل کے میدان سے گزر کر سنان سڑکوں پر آگے بڑھتی رہی۔ ہر سمت موت جیسی ویرانی تھی، قلعے کی تفصیل پر ایک فوجی کے پاس پہنچ کر میں رک گئی اور پتھر کی منڈیر کے سہارے کھڑے ہو کر باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ انسان تو کیا کسی حیوان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا تھا، میں نے کہا۔

”نجانے کب اس قید سے نجات ملے گی؟“

”ہمارے پاس خوراک اور ضروریات زندگی کا ذخیرہ ابھی دو سال کے لئے کافی ہے۔“ بوغا نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا جنگ اتنے عرصے جاری رہ سکتی ہے؟“

”خدا بہتر جانتا ہے.....“ میں نے جواب دیا۔ ”ہمارے شہر پر بھی سکندر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ نجانے بابا اب کس حال میں ہوں گے، بیس دن گزر چکے کوئی قاصد بھی نہیں آیا۔“

”خدا اسے غارت کرے شہزادی۔“ بوغا نے غصے میں جواب دیا۔ ”اس نے ہم سے زندگی کے چند دن کا سکون بھی چھین لیا ہے۔“

ہم محل میں واپس آئے تو میری ماں اور میری چھوٹی بہن بیٹھی ہوئی پانسہ کھیل رہی تھیں، ماں نے میرا بوسہ لے کر کہا۔ بیکاری کے لمحات بڑی مشکل سے بسر ہوتے ہیں بیٹی، بوغا تم ہمیں اس منحوس سکندر کے بارے میں کچھ سناؤ، تم نے تو اسے قریب سے دیکھا ہے۔“

”مجھے اسے دیکھنے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ لیکن مختصر آتا سکتا ہوں کہ اپنی شہرت کے برخلاف وہ بہت پست قد اور معمولی سا آدمی ہے، تخت پر بیٹھا ہے تو اس کے پاؤں لٹکتے رہتے ہیں۔“

”تعب ہے کہ اتنے معمولی سے آدمی نے اتنے بڑے معرکے سر کر لئے۔“ میری چھوٹی بہن بولی۔ ”فارس کی عورتیں اس پر جان دینے لگی ہیں۔“

”تمہیں ایسی افواہوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے۔“ ماں نے غصے سے سرزنش کی پھر بولی۔ ”سکندر کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو ہمارے قلعے کو سر نہیں کر سکتا۔ اسی لئے تمہارے باپ نے ہمیں یہاں پناہ لینے کی ہدایت کی تھی۔“

”یہ قلعہ.....“ میری چھوٹی بہن نے غصے میں کہا۔ ”خدا غارت کرے اس قلعے کو میں تو اس سے عاجز آ چکی ہوں اس تنہائی سے تو یہی بہتر تھا کہ مقدونی اس کو بھی فتح کر لیں۔“

”زبان کو لگام دے لڑکی۔“ ماں نے گرج کر کہا۔ ”خدا نہ کرے اگر کبھی ایسا ہوا تو ہماری آبرویک لوٹ لیں گے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو، ہم کب تک آبرو کے خوف سے قید تنہائی برداشت کریں گے، میں تو دعا کرتی ہوں کہ سکندر جلد سے جلد اس قلعہ کو بھی فتح کر لے۔“

میں نے غصے سے بے قابو ہو کر ایک قمیض اپنی بہن کے رخسار پر رسید کیا اور بولی۔ ”کیا تمھ پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے گمائیہ! باہا مقدونیوں سے جنگ کر رہے ہیں اور تو دشمن کی فتح کی دعا مانگ رہی ہے۔“

”تمہارے جذبات تو سرد ہو چکے ہیں۔“ میری چھوٹی بہن گمائیہ سسکیاں لیتی ہوئی چیخی۔ ”تم نے مرد کی طرح پرورش پائی ہے۔ کیا جاو تم تنہائی کیا چیز ہوتی ہے، خدا کرے تم کسی مقدونی کی بیج کی زینت بنو۔“ گمائیہ نے چلا کر مجھے گالی دی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی، میری ماں رونے لگی میں نے انہیں تسلی دی اور وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ گمائیہ کی اس بے ہودہ حرکت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹنے لگا، میں نے صبا کو استاد کے پاس بھیجا کہ وہ مجھے خواب آور شربت لا کر دے، شربت پی کر میں بے خبر سو گئی۔

نیند کے عالم میں مجھے ایک عجیب سا خواب نظر آیا۔ میں نے دیکھا میں بابل میں ہوں۔ شاہانہ لباس پہنے ہوئے میں

شاہ دارا کے تخت پر بیٹھی ہوں لیکن محل میں ایک بھی ایرانی نہیں ہے۔ میرے گرد دکندر کے مقدونی کمانڈر باداب کھڑے ہیں لیکن میں ان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ اچانک محل کے باہر کچھ شور شراب کی آوازیں بلند ہوتی ہیں جیسے ہزاروں لوگ غم و اندوہ سے نڈھال آہ و بکا کر رہے ہوں، کمانڈر ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں، پھر ایک کمانڈر چلا کر کہتا ہے۔

”امنا کیہ کا حمل چھ ماہ کا ہو چکا ہے، خدا نے اگر اسے بیٹا عطا کیا تو اب وہی اصلی وارث اور جانشین ہوگا۔“ میں گھبرا کر بیدار ہوئی تو تمام جسم پسینے سے تر تھا۔ میں سوچنے لگی کہ خدایا یہ کیسا بھیانک اور منحوس خواب ہے۔ جانے کیا مصیبت آنے والی ہے، میں نے کینز کو آواز دے کر کھجور کی شراب منگوائی اسے پیا تو طبیعت ذرا سی سنبھلی پھر بھی بدن خوف سے کانپ رہا تھا البتہ شراب کے اثر میں پھر سو گئی، جب صبح کو بیدار ہوئی تو طبیعت بحال تھی، لیکن بھیانک خواب کی یاد اب تک تازہ تھی، میں سیدھی عبادت گاہ تک پہنچی اور میں نے اپنے استاد ہاروس کو خواب کی تفصیل بتائی، وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے اور انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولے۔

”اُصنا کیہ! میں کئی ماہ سے تمہارے ستاروں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ قسمت تمہیں بہت جلد اس مرتبے پر لے جانے والی ہے جس کے لئے تم پیدا ہوئی ہو لیکن اس خواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ منزل اب قریب آگئی ہے میں خدائے بزرگ و برتر کے اس اشارے سے سمجھ گیا ہوں اُس نے تمہیں جس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے اس کی تعبیر مل چکی ہے۔ سنو اُصنا کیہ! اس خواب کی تعبیر بہت واضح ہے۔ تمہارے گرد و پیش مقدونی کمانڈروں کی موجودگی اور ان کا خائف نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تم دوستوں کے درمیان ہو اور تمہارے بطن میں سکندر کا بچہ پرورش پانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو تم اس کی ملکہ بنو گی اور تم سے جو بیٹا پیدا ہوگا وہ سکندر کا چاٹھین اور فارس کے تخت کا وارث ہوگا۔“

”نہیں.....“ میں غصے میں چبھی۔ ”یہ وقت آنے سے پہلے میں مرجانا پسند کروں گی۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

”خدا کی مرضی میں انسان کا دخل ممکن نہیں ہے۔“ استاد نے کہا۔ ”اس نے یہی بشارت دی ہے کہ سکندر جیسے عظیم فاتح کا وارث ایرانی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوگا اور ایک دن یہی بچہ پھر فارس کی سرزمین کا وارث ہوگا۔ اس طرح مقدونیوں کی فتح کے باوجود تم فارس کو اس کے جائز وارثوں کو واپس دلانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔“

”نہیں استاد ہاروس! یہ ناممکن ہے، میں کبھی اس پر رضامند نہ ہوں گی۔“ میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں فارح دشمن سے شادی ہرگز نہیں کروں گی، سکندر۔۔۔۔۔۔“ میرا جملہ نامکمل رہ گیا، باہر اچانک شور سنائی دینے لگا۔

”سکندر آگیا، سکندر آگیا، مقدونیہ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے۔“ لوگ محل کے باہر چل رہے تھے، میں نے گھبرا کر ہاروس کی طرف دیکھا۔

”خدا نے تمہیں جواب دے دیا ہے اصنا کیہ۔“ ہاروس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”خواب کی تعبیر مل گئی ہے اور بہت جلد سکندر قم سے یہاں اسی قلعہ میں شادی کرے گا۔“

”نہیں ہو سکتا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، وہ کبھی اس قلعے کو سر نہیں کر سکتا۔“ میں غصے سے چلائی، ہم جب محل سے باہر نکلے تو قلعے کی ساری آبادی فصیلوں کی سمت بھاگی چلی آ رہی تھی، محافظ دستوں نے مورچے سنبھال لئے تھے۔ ہاروس اور ہم سب نے بھی قلعے کی فصیل پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ سکندر کے لشکر نے واقعی قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن قلعے کی سپاٹ دیواریں اتنی بلند تھیں کہ کسی انسان کے لئے ان پر چڑھنا ناممکن تھا۔ اس لئے میں مطمئن تھی، قلعے کے لوگ فصیلوں سے جھانک کر دشمن کو لگا کر رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اچانک دشمن کے لشکر سے ایک سوار آگے بڑھا اور بیرونی چھانک کے نیچے پہنچ کر اس نے بلند آواز سے یکارا۔

”قلعہ کے حاکم کو سکندر کا سلام پہنچے۔ سکندر اعظم کا یہ حکم ہے کہ قلعہ کو پر امن طور پر ہمارے حوالے کر دیا جائے، ہمارا یہ وعدہ ہے کہ سب کو مکمل امان ملے گی۔“

سالار ہاروس نے حقارت آمیز انداز میں ہتھکڑی لگا کر جواب دیا۔ ”سکندر سے کہہ دو کہ جب اس کے سپاہیوں کے پر نکل آئیں تو اڑ کر قلعہ پر قبضہ کر لیں اس وقت تک قلعہ ہمارے پاس رہے گا۔“

تمہا سائیںوں نے اس جواب سے پر جوش نعرے لگا کر تالیاں بجائیں۔ میں بھی بے ساختہ ہنس پڑی، لیکن ہاوس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”خدا کی مرضی یہی ہے کہ سکندر قلعہ کو تخیر کر لے۔“ میں نے حیرت اور غصے سے اپنے استاد کو دیکھا اور کہا۔ ”یہ قلعہ ناقابلِ تخیر ہے محترم ہاروں! ہم دو سال تک محاصرہ برداشت کر سکتے ہیں سکندر اس دوران خود بھاگ جائے گا۔“

ہارس نے غصے کے عالم میں میرا بازو اتنی زور سے دبایا کہ میں دہشت سے چیخ اُٹھی۔ ”امنا کیہ! میری بات مانو! میں کاہن ہوں تمہارے ستاروں کے مطابق سکندر کا قلعہ پر قبضہ ہونا لازم ہے۔ تم خدا کی مرضی کو نہیں بدل سکتی ہو سکندر کو قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت ملنی چاہئے۔“

اس سے پہلے میں نے اپنے استاد کی ہمیشہ اطاعت کی تھی لیکن اس وقت برداشت نہیں کر سکی اور سخت لہجے میں بولی۔ ”تو جا کر اس کو میرے خواب اور اپنے الہامی حکم کی تفصیل بتا دیجئے“ محافظ دستوں کے سپاہیوں سے کہہ دیجئے کہ خدا کا حکم یہی ہے کہ ہم قلعہ سکندر کے حوالے کر دیں۔ ان سے کہئے کہ سکندر کے خیر مقدم کے لئے پھاٹک کھول دیں پھر دیکھئے وہ کیا کرتے ہیں۔“

”ایسی صورت میں مجھے غداری کرنا ہوگی۔ ہاروس نے کہا۔

”محترم ہاروس‘ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے۔“ میں نے التجا کی۔

ہاروس کی آنکھوں میں ایک سرخی مائل چمک نمایاں ہو گئی تھی۔ ”میں غدار بن کر بھی وہی کروں گا جو اس کی مرضی ہے۔ میں ایک غدار کے ذریعہ سکندر کو یہ بتاؤں گا کہ کس طرح اس کے وہ آدمی جو کوہ پیما کی ماہر ہیں کمندوں کے ذریعہ پہاڑی کی اس گکرت تک پہنچ سکتے ہیں جو آبادی سے اوپر واقع ہے اس کے بعد قلعہ پر قبضہ کرنا آسان ہوگا۔“

”نہیں، اس طرح غداری نہ کریں محترم ہاروس!“ میں تڑپ کر زور سے چلائی۔

”تقدیر کے لکھے پر عمل ہو کے رہتا ہے اصنا کیہ!“ ہاروس نے سر دلچے میں کہا اور چلا گیا۔

میں شدید غم و غصہ کے عالم میں اپنی خواب گاہ کے اندر ٹہل رہی تھی رات کافی گزر چکی تھی ہر سمت سناٹا طاری تھا، اچانک ہاروس اندر داخل ہوا۔ ”خدا کی مرضی پوری ہوگئی اصنا کیہ۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہاروس‘ یہ آپ نے کیا کھا؟“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”وہی جو خدا کی مرضی ہے، آؤ ہم عبادت کرتے ہیں، میں نے غلاموں سے کہہ دیا ہے کہ کسی کو بھی اندر داخل نہ ہونے دیں۔ عبادت تمہاری بے چین روح کو تسکین پہنچائے گی۔“ انہوں نے میرے گرد ایک بڑا سا حصار کھینچ دیا تاکہ بدرجہا اندر داخل نہ ہو سکیں۔ ان کی انگاروں جیسی سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں، وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے تھے، مجھے اپنا جسم ہلکا ہوتا محسوس ہونے لگا، کچھ دیر بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں فضا میں پرواز کر رہی ہوں۔ میرے کانوں میں ہاروس کی آواز گونج رہی تھی۔ ”امنا کیہ! تیرا ہر حکم میرے غلاموں کے لئے مقدس فریضہ ہے اور وہ وہی سب کچھ کریں گے جو تیری مرضی ہے۔“

میں شاید خود بھی یہی الفاظ دہرانے لگی تھی، لیکن اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میری آنکھ کھلی تو صبح نمودار ہو چکی



تھی۔ ہاروس میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ”اٹھو اصناکیہ۔“ انہوں نے کہا۔ ”خدا کی مرضی پوری ہو چکی ہے۔ ہاروس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، مقدونی سپاہ قلعہ پر قابض ہو چکی ہے، سکندر کے استقبال کی تیاری کرو۔“

صبا اور مشاطاؤں کے سنگھار کے بعد جب میں دربار میں داخل ہوئی تو ہال میں سناٹا طاری ہو گیا۔ ہال مقدونی کمانڈروں سے کھینچ بھرا ہوا تھا۔ قلعہ کے محافظ دستے کے افسران بھی مقدونیوں کے ساتھ گھل مل کر فتح کا جام پی رہے تھے۔ لیکن میری آنکھیں سکندر کو تلاش کر رہی تھیں اور بالآخر میں نے اسے ڈھونڈ لیا وہ سردار ہاروس کے ساتھ کھڑا مبہوت لگا ہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اپنے پستہ قد کے باوجود سب میں نمایاں تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک سحر تھا، اس کی شخصیت میں شہنشاہوں کا وقار اور دبذبہ تھا، اس کی نگاہیں ملیں تو میرے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئی۔

”عظیم فاتح!“ برابر کھڑے ہوئے ہاروس نے سکوت توڑا۔ ”اجازت دیجئے کہ میں سردار آخرس کی دختر شہزادی اصناکیہ سے آپ کا تعارف کرواؤں۔“

”یہ لڑکی واقعی حسن کی شہزادی ہے، ایشلس۔“ سکندر نے برابر کھڑے ہوئے یونانی کمانڈر سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”خوش آمدید حسن کی دیوی! تم پہلی عورت ہو جس نے میری تعظیم میں جھکنا پسند نہیں کیا۔“

میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بے باکی اور جرأت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”سکندر اعظم! تم ایرانی نہیں یونانی ہو! اس نے تمہارا استقبال مقدونیوں کی طرح کیا ہے؟“

سکندر کی آنکھیں چمک اٹھیں کیونکہ میں نے جواب اسی کی زبان میں دیا تھا۔ ”اصناکیہ! تم جتنی حسین ہوتی ہی ذہین اور خوش زبان بھی ہو۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ تم اتنی شستہ یونانی بولتی ہو۔“

میرے دل میں نفرت کی آگ لگ رہی تھی لیکن لبوں سے شیریں بیانی جاری تھی۔ ”میرے آقا! میں ہمیشہ ویرانوں میں نہیں رہی ہوں۔“ میں نے دلکش لہجے میں کہا۔ ”صرف ایک سال پہلے میرے باپ نے مجھے یہاں اس لئے بھیج دیا تھا کہ میں دشمنوں کی زد سے محفوظ رہوں۔“

”ایسا ہی ہوگا اصناکیہ..... میں زیوس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ باوجود کہ تمہارا باپ مجھ سے اب بھی برسر پیکار ہے، لیکن تم میری دشمن نہیں ہو۔“

میں دل ہی دل میں اس کی دیوانگی پر مسکرا رہی تھی، لیکن سکندر نے اچانک اپنی کلائی سے ایک طلائی کڑا نکال کر میری کلائی میں پہنا دیا۔ ”یہ ادنیٰ سا تحفہ قبول کرو اصناکیہ، یہ میری دوستی کا ثبوت ہے۔“

”میرے آقا! آپ واقعی ایک فراخ دل فاتح ہیں۔“

”لیکن تمہارے حسن نے مجھے فتح کر لیا ہے۔ میں فاتح کے بجائے ایک ادنیٰ غلام بن گیا ہوں، مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان چٹانوں کے درمیان ایسا نایاب ہیرا پوشیدہ ہوگا۔“

”مجھے یوں شرمندہ نہ کریں میرے آقا! سکندر اعظم کے قدموں پر مجھ جیسی کیزیں سجدہ کرتی ہیں۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”آج مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں۔“

”واہ تمہاری یہ دعوت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی حسین اصناکیہ۔“ سکندر نے خوشی سے مخمور ہو کر جواب دیا۔

سکندر کا یہ حکم تھا کہ فتح کے بعد خواتین کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ اس لئے ایرانی حرم کا رخ کسی نے نہ کیا تھا، شائع انداز

ضیافت کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، میرا دل اپنی بے بسی پر تڑپ رہا تھا، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنے وطن کو تاراج کرنے والے فاتح کا خیر مقدم بھی مجھے خود کرنا ہوگا۔ اس کا دیا ہوا طلائی کڑا میری کلائی میں چمک رہا تھا۔ مجھے یہ غلامی کی زنجیر لگ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دعا کرنے لگی کہ مجھے حالات سے نمٹنے کی قوت اور

صلاحیت عطا فرمائے۔ اس طرح کچھ سکون ہوا تو ہارپس کی دانش مندی سمجھ میں آئی، اگر سکندر نے اجازت دی ہوتی تو اب تک اس کے لشکر کی ہم سب کی عزت لوٹ چکے ہوتے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ ہم باعزت طریقے سے ان کو اپنانے کی کوشش کریں۔

میں جب کمرہ ضیافت میں داخل ہوئی تو ایک بار پھر سب مبہوت ہو گئے، مجھے اپنے حسن پر پہلی بار غرور اور بے پناہ مسرت کا احساس ہوا تھا۔ ضیافت کے کشادہ ہال میں ہر سمت شاہانہ سجاوٹ تھی، نرم قالین اور غالیچوں پر بیٹھ جھٹتے تھے۔ دیواروں پر شیر کی کھالیں لٹک رہی تھیں۔ ہال کے آئینوں میں آگ روشن تھی۔ درمیان میں رکھی ہوئی گول میز پر سونے کے جام و ساغر رکھے ہوئے تھے، میں سکندر اور اس کے سرداروں کے درمیان بڑے وقار سے بیٹھی ہوئی تھی۔ میری بہن گماریہ بڑی بے شرمی کے ساتھ ایک اور مقدونی سردار سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ زرق برق پوشاکوں والے غلام کھانا لگا رہے تھے ہال میں ہر سمت جشن مسرت کا رنگین ماحول تھا، سکندر کی مخمور نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”اصناکیہ! میں دیوتاؤں کا شکر گزار ہوں، اگر طوفان کچھ دیر اور جاری رہتا تو میرا لشکر اس قلعہ کو دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتا، لیکن شاید دیوتاؤں کو ہماری ملاقات مقصود تھی جو ہم یہاں پہنچ گئے۔“

”میرے آقا! یہ ملاقات تو لوشہ نقدیر تھی، بہت عرصہ قبل بائبل میں ایک کاہنہ نے مجھ سے پیشگوئی کی تھی کہ روئے زمین کا ایک عظیم بادشاہ اپنی تلوار کے ذریعے مجھ تک دسترس حاصل کرے گا۔“

”زیوس کی قسم اصناکیہ! تجھے حاصل کرنے کے لئے تو میری تلوار ہزار راستے تلاش کر لیتی، مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں نے آج تک تجھ جیسی عورت نہیں دیکھی تھی۔“ اس نے اور قریب ہوتے ہوئے والہانہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”تمہاری آنکھیں تو بالکل میری ماں کی طرح ہیں۔“

مجھے بہت جلد انداز ہو گیا کہ سکندر اعظم جیسا فاتح مجھ پر دیوانہ وار فریفتہ ہو چکا ہے۔ یہ میرے حسن کی ایک عظیم فتح تھی، غرور و حسن سے میں سرشار ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کی سائنس میں سبقت لے جانے میں مصروف رہے، میں نے کوشش کا ایک ٹکڑا اٹھایا تو سکندر نے میرے عریاں بازو کو پکڑ لیا، میرے جسم میں برقی سی دوڑ گئی اس نے اپنی گردن آگے بڑھائی تو میں نے ہنستے ہوئے نوالہ اس کے منہ میں رکھ دیا۔

”تمہارے ان خوبصورت ہاتھوں نے کھانے کا ذائقہ اور زیادہ کر دیا ہے اصناکیہ۔“ اس نے مجھے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔ میں اسے کھلاتی رہی، شراب کے کئی جام میرے ہاتھوں سے پی کر وہ آہستہ سے بولا۔ ”تم نے جانے کون سی شراب مجھے پلا دی ہے اصناکیہ! ایسا لگا ہے کہ میں تمام زندگی تمہارے حسن کی پوجا کرتا رہوں گا، مجھے اپنے ہارے میں بتاؤ۔“

میں نے اسے اپنے ہارے میں بتایا وہ بڑے امہاک سے سنا رہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تمہارا کاہنہ اعظم بھی ارسطو سے کم دانشمند نہیں ہے۔ اس نے تمہیں حسن سلوک میں بھی ماہر بنا دیا ہے۔“ اس نے میرے دونوں شانے پکڑ کر بوسہ لینا چاہا تو میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی، پھر میں اپنی اس جرأت پر خوف زدہ ہو کر بولی۔

”میرے آقا! میں سرعام اس بے تکلفی کی عادی نہیں ہوں۔“

سکندر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”اطمینان رکھو اصناکیہ! میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔“ اور پھر ضیافت کے بعد رقص و موسیقی کے جشن کے دوران بھی اس نے احتیاط برتی اور بیشتر وقت اپنے کمانڈر سے مصروف گفتگو رہا۔ ضیافت ختم ہونے پر جب میں اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو میرا استاد ہارپس میرا منتظر تھا۔

”میری بچی نے سکندر پر جاوہر کر دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیشہ تمہارا غلام رہے گا۔ لیکن بڑی احتیاط سے کام لینا

”میرے آقا! میں سرعام اس بے تکلفی کی عادی نہیں ہوں۔“

سکندر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”اطمینان رکھو اصناکیہ! میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔“ اور پھر ضیافت کے بعد رقص و موسیقی کے جشن کے دوران بھی اس نے احتیاط برتی اور بیشتر وقت اپنے کمانڈر سے مصروف گفتگو رہا۔ ضیافت ختم ہونے پر جب میں اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو میرا استاد ہارپس میرا منتظر تھا۔

”میری بچی نے سکندر پر جاوہر کر دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیشہ تمہارا غلام رہے گا۔ لیکن بڑی احتیاط سے کام لینا



ہوگا اس کی خواہشات کا احترام تم پر لازم ہے۔“

دوسری شب بھی سکندر کی نگاہیں والہانہ انداز میں محبت کا پیغام دے رہی تھیں اور وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کس طرح میں ایک مملکت کی ساری ذمہ داریاں ادا کرتی تھی اچانک اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

”اصناکیہ! کافی عرصہ تک تم صرف ایک ملک پر حکمرانی کرتی رہی ہو لیکن سچ پوچھو تو تم دلوں پر حکمرانی کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ حیرت ہے کہ اب تک کسی کی نگاہ انتخاب تم پر نہیں پڑی۔“

”میرے آقا! اب تک آپ نے ہمیں چین سے بیٹھنے کب دیا جو کسی اور جانب توجہ دے سکتے۔“

”اصناکیہ! آج تک کسی عورت نے مجھے اس طرح متاثر نہیں کیا۔ کسی کو اپنانے کی خواہش اس شدت سے محسوس نہیں

ہوئی اس لئے آج میں ایک مثال قائم کرنا چاہتا ہوں۔“ سکندر اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے میز پر زور زور سے ہاتھ مار کر سب کو متوجہ کیا ہال میں سناٹا چھا گیا سب سکندر کو دیکھنے لگے۔

”میرے کمانڈر!.....“ اس نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”میں تمہارے سامنے ایک فیصلے کا اعلان کرنے والا ہوں جو

ممکن ہے تم سب کو حیران کر دے۔ تم جانتے ہو میں کتنی تیزی سے فیصلے کرتا ہوں۔ ہماری بیشتر فتوحات میری اس عادت کی مرہون منت ہیں ایک مرتبہ بھر میں نے ایک اہم اور فوری فیصلہ کیا ہے بہت غور کرنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ

اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مقدونی سردار ایرانی خواتین سے شادیاں کریں۔ صرف اسی صورت میں مقدونیوں کے ذہن سے غرور اور ایرانیوں کے ذہن سے شکست کی شرمندگی دور ہو سکتی ہے۔“

”میرے خدا یا!.....“ میں نے حیرت زدہ ہو کر سوچا میرے خواب کی تعبیر ملنے والی ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں لیکن سکندر نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا۔

”اپنے فیصلے کی عملی مثال پہلے میں خود پیش کروں گا۔ میرے کاہن نے میری شادی کے لئے وقت کا تعین کر دیا ہے

اور میں آج اور ابھی شہزادی اصناکیہ سے شادی کا اعلان کرتا ہوں۔“

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سکندر کے مسکراتے ہوئے چہرے کو گھور رہی تھی۔ ”سکندر پر اس عورت نے جادو کر دیا ہے“ سکندر سحر زدہ ہو گیا ہے۔ ”لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔

”سکندر سحر زدہ ہو گیا ہے۔“ سکندر نے بلند آواز میں کہا۔ ”اور اس بات پر خوش ہے کہ اصناکیہ نے اس پر جادو کر

دیا ہے۔“ اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ”روٹی..... مجھے روٹی دو۔“ وہ چلایا۔ سکندر نے روٹی میز پر رکھ کر اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے دیا۔

”کھاؤ اصناکیہ!.....“ اس نے کہا۔ ”میں مقدونیوں کے رواج کے مطابق شادی کی رسم ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے جیسے ہی روٹی دانتوں سے کاٹی سکندر خوشی سے چلایا۔ ”رسم ادا ہو گئی اب شہزادی اصناکیہ سکندر کی بیوی ہے۔“

سارا ہال تالیوں اور خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا اور میں بے ہوش ہو کر سکندر کے بازوؤں میں جمول گئی۔ میری آنکھ اپنی خواب گاہ میں کھلی۔ میرے بستر کے گرد استاد ہاروس، شاہی طبیب اور پریشان سکندر کھڑا

تھا۔ میرے ذہن میں ہاروس کے الفاظ گونج اٹھے۔ مجھے سکندر کو اس کا جانشین دینا تھا۔

”زیوس تیرا شکر ہے.....“ سکندر نے اطمینان کی سانس لے کر کہا اور میں مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

”میرے آقا! آپ نے اچانک مجھے اتنا بڑا اعزاز بخش دیا تھا کہ خوشی سے بے ہوش ہو گئی۔ لیکن اب میں بالکل

ٹھیک ہوں۔“

پھر سب کے جانے کے بعد صبا مجھے شب عروسی کے لئے تیار کرنے آئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”شاہی طبیب سے میرے لئے کوئی انتہائی مفرح اور مدہوش کن شربت لے آؤ۔“

صبا اور دو مشاطاؤں نے بناؤ سنگھار کے لئے تیار کیا سکندر جب جگہ عروسی میں داخل ہوا تو دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اس کے لئے میرے حسن کی تاب لانا مشکل ہو رہا تھا۔

”شاید میرے کمانڈر ٹھیک کہتے ہیں اصناکیہ تمہارے حسن نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔“

عظیم فاتح اور شہنشاہ سکندر میرے سامنے پرستار بنا کھڑا تھا۔ وہ پرستش بھری نگاہوں سے میرے حسن کی فتنہ سامانیوں کو گھور رہا تھا۔ اس کے سنہرے بال مجھے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے اس کی نیلی آنکھوں میں بچوں جیسی معصومیت جھلک رہی تھی۔

”میرے آقا! میں آپ کی کنیز ہوں۔ مجھے اپنا بنا کر آپ نے ہمیشہ کے لئے مجھے خرید لیا ہے۔“ میں نے جھک کر اس کے قدم چوم لئے۔ اس نے جلدی سے شانے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور دیوانہ وار اپنی محبت کی پہلی مہر میرے لبوں پر شبت کر دی۔ ”تم کنیز بننے کے لئے نہیں بلکہ پرستش کے لئے پیدا ہوئی ہو اصناکیہ!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اور اس رات میں نے اپنے حسن و جمال کے سحر سے سکندر کو ہمیشہ کے لئے غلام بنا لیا۔ قدرت نے مجھے اپنے حسن کے ساتھ ساتھ محبت کے فن سے بھی نوازا تھا۔ سکندر کو میرے اوپر شہ نہ ہو سکا، لیکن تمام تر کوشش کے باوجود میں اس سے

نفرت نہ کر سکی بے شک میں نے اپنے حسن و جمال سے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا، لیکن اس نے مجھے وہ تمام مسرتیں اور لذتیں عطا کیں جن کی کوئی عورت تمنا کر سکتی ہے۔

سکندر کو ایک لمحہ کے لئے بھی میری جدائی گوارا نہ تھی۔ اس لئے وہ مجھے اپنے ساتھ باہل لے گیا، خود اپنے ہی محل میں میری حیثیت ایک محکوم کی سی تھی۔ یہاں مقدونیوں کا دور دورہ دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ لیکن میں بے بس

تھی۔ میرے اہل خاندان شہر کے ایک دوسرے محل میں مقیم تھے۔ میرے بابا کو جب میری شادی کی خبر ملی تو انہیں سخت حیرت و صدمہ ہوا۔ لیکن جلد ہی انہیں اس فقر کا احساس ہوا کہ سکندر جیسے عظیم فاتح نے پورے ایران سے ان کی بیٹی کو شادی

کے لئے منتخب کیا ہے۔ انہوں نے سکندر سے صلح کر لی اور باختر اور سگود یہ کے دوسرے سرداروں کو بھی صلح پر آمادہ کر لیا۔

چونکہ سردیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا اور برف باری ہونے لگی تھی اس لئے سکندر نے اپنا قیام باہل میں جاری رکھا۔ میری شادی کے ساتھ دن پلک جھپکتے گزر گئے سکندر سے نفرت کی جگہ اب میرے دل میں اس کے لئے احترام پیدا

ہونے لگا تھا۔ وہ مجھ سے ایسی والہانہ محبت کرنے لگا تھا کہ اکثر خود شرمندہ ہو جاتی تھی سچ پوچھو تو وہ میری پرستش کرنے لگا تھا اس نے میرے ایک بھائی کو اپنے خاص مخلصین میں شامل کر لیا تھا۔ ایرانی رؤسا کو شاہانہ اعزازات سے نوازا

تھا۔ سرداروں کو گورنر مقرر کر دیتا تھا اور ان کو مقدونیوں کے برابر کا درجہ دیتا تھا اور ایک دن سکندر یہ سب مجھے بتا رہا تھا میں نے جرأت کر کے پوچھ لیا۔

”سچ بچ بتائیے کیا آپ نے مجھ سے شادی صرف ایرانیوں کو خوش کرنے کے لئے کی تھی؟“ اس کی آنکھوں میں

نری سی پیدا ہو گئی۔ ”اصناکیہ! تم سے شادی میں نے صرف اپنی خوشنودی کے لئے کی ہے۔“ سکندر نے بڑے پیار سے کہا۔ ”تم نے پہلی نظر میں ہی میرے دل کی گہرائیوں میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ تم نے مجھ پر کیسا

جادو کر دیا ہے۔ تمہارے بغیر مجھے اپنی زندگی نامکمل محسوس ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو محبت میں تمہاری ذہانت کا بھی بڑا دخل ہے۔“

سکندر کے جانے کے بعد میں نے استاد ہاروس کو بلا بھیجا۔ ”محترم استاد! اب تک خواب کی تعبیر مکمل نہیں ہوئی

ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سردیاں کم ہوتے ہی سکندر یہاں سے روانہ ہو جائے گا“ اس کی بیوی اور بچہ ایک مخصوص جگہ موجود ہیں، ممکن وہاں جا کر میری یاد کے نقوش مدہم پڑ جائیں۔“ ہاروس نے بڑے مطمئن انداز میں مجھے دیکھا۔

”رواگی سے قبل تمہارے بطن میں سکندر کا جانشین وجود میں آئے گا، کسی تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تم سکندر کو ہندوستان فتح کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہو۔“

”لیکن پیشتر کمانڈر اور مقدونی ہندوستان پر فوج کشی کے مخالف ہیں اور واپسی کے لئے بے تاب ہیں۔“ ”گھبراؤ نہیں، خدا نے چاہا تو وہ واپس نہیں جائے گا۔“ ہاروس نے اطمینان دلایا۔ ”سکندر کے کاہن سے میری بات ہوگئی ہے وہ ہندوستان پر فوج کشی کی راہ ہموار کرے گا۔“

مجھے جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ سکندر کتنی خوبی اور دانشمندی کے ساتھ مملکت کے کاروبار کو چلاتا ہے۔ صبح سے شام تک دور دراز شہروں کے قاصد آتے رہتے تھے اور وہ ان کی اطلاعات کی روشنی میں احکامات صادر کرتا رہتا تھا۔ مقدونیہ سے اس کی ماں بار بار اسے وطن واپسی کے لئے پیغام روانہ کرتی رہتی تھی۔ ادھر گورنر بھی ہمیشہ اس کی ماں اور بھین کی بے جا مداخلت سے شاکی رہتا تھا۔ سکندر کو اپنی ماں کا یہ رویہ بالکل ناپسند تھا۔ یہ شخص گونا گوں صلاحیتوں کا مالک تھا، وہ پیدا کی جرنیل تھا۔ اتنے بڑے لشکر پر اس کا مکمل کنٹرول رہتا تھا۔ مقدونیہ سے رواگی کے وقت وہ اپنے لشکر کے ہمراہ مختلف فنون کے ماہرین لے کر چلا تھا، ان میں بہترین اطباء اور ماہر معدنیات اور سائنسداں شامل تھے۔ ان کی تحقیق کی رپورٹیں وہ اپنے استاد اور وقت کے عظیم سائنسداں ارسطو کو روانہ کرتا رہتا تھا جس کے لئے اس نے ایک بہت بڑی تجربہ گاہ بنوا رکھی تھی۔

استاد اعظم سے گفتگو کے بعد والی شب میں سکندر کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی تھی میرے دوسری جانب ایمیلش بیٹھا تھا۔ اس کمانڈر سے سکندر کی محبت کی مختلف داستانیں مشہور تھیں یہ ایک دراز قد اور گھٹکھریالے بالوں والا خوب نوجوان تھا۔ جس کی لانی بھوری آنکھوں میں ہمیشہ شوخی چمکتی رہتی، وہ مقدونی نہیں تھا، ہمیشہ خوش و خرم رہتا تھا اور بانسری بڑی اچھی بجاتا تھا۔ سکندر اور ایمیلش دونوں نے ایرانی لباس پہن رکھا تھا، سکندر نے کہا۔

”ایمیلش اور آریل ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے ایرانی لباس کو اپنایا ہے، صرف تم دونوں میرے اس خیال کے حامی ہو کر ہمیں اپنی خواتین کی طرح ایرانی خواتین کا بھی اتنا ہی احترام کرنا چاہیے۔“

”میرے آقا! اگر ایرانیوں کی خواتین کا احترام نہ کیا گیا تو آپ کبھی ان کی حمایت نہ حاصل کر سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اصنا کیہ! اس لئے آج میں نے یہ فرمان بھی جاری کر دیا ہے کہ ایران کی تمام معزز خواتین کا پورا پورا احترام کیا جائے۔“ سکندر نے خوش ہو کر کہا۔ ”اور یہی نہیں ایک مشترک تہذیب کی بنیاد رکھنے کے لئے میں اور بھی اقدامات کر رہا ہوں۔ پہلا سے بہت سے نامور فنکار، شاعر، ماہرین زبان اور دانشور بہت جلد آکر ایشیاء میں آباد ہونے والے ہیں۔“

”آپ ایک عظیم اور دانشور حکمران ہیں میرے آقا۔“

میں پر جوش لہجے میں بولی۔

”ہاں ہاں بے شک جان من تم سچ کہتی ہو۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جب میں ٹرائے کے ساحل پر اترا تو محسوس ہوتا تھا مجھ میں اہلکس کی قوت ہے اور جب زائر فتح کیا تو بازوؤں میں ہر اقل کی توانائی محسوس کی تھی اور اب مجھے

یقین ہے کہ میں دیوتاؤں کے سب سے طاقتور بیٹے ڈیونی سیوس کا اوتار ہوں۔“

”روایت کے مطابق ڈیونی سیوس نے ہندوستان فتح کر لیا تھا میرے آقا۔“ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس عظیم اور دولت سے مالا مال ملک کو فتح نہ کر سکیں۔“

میں نے ہندوستان کے بارے میں اسے وہ تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں جو استاد اعظم نے بیان کی تھیں۔ سکندر اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”تب پھر سکندر کو اس سرزمین پر قدم رکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ وہ جوش و خروش کے ساتھ چلایا۔

”سکندر..... سکندر۔“ ایمیلش ہنستے ہوئے بولا۔ ”خدا نے تم کو جتنی آرزو اور حوصلہ دیا ہے اس کے لحاظ سے پوری دنیا بھی بہت مختصر ہے۔“

”تم مجھے جانتے ہو ایمیلش، میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔“ سکندر مسکرا کر بولا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جیسے ہی برف پچھلے گی ہندوستان پر فوج کشی کروں گا۔“

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے بعد سکندر کے ارادوں کو ہوا دیتی رہی۔ سکندر نے مجھے اپنی بے پناہ محبت کے ساتھ بے انتہا عزت اور وقار بھی عطا کیا تھا۔ میں دربار میں اس کے برابر جگہ پاتی تھی، مجھے معلوم تھا کہ یہ بات اس کے دوسرے کمانڈروں کی بیویوں کو بہت شاق گزرتی تھی۔ لیکن عام طور پر وہ سب مجھ سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آتی تھیں سوائے ہیراس کے، یہ حسین عورت کسی زمانے میں انتھنز کی نامور طوائف تھی، لیکن کمانڈر بطلیموس نے اس کے حسن سے متاثر ہو کر شادی کر لی تھی جس کی وجہ سے ہیراس کو سکندر کے دربار میں جگہ ملنے لگی۔ سکندر نے ایک دن بڑی ضیافت کا اہتمام کیا، میرے اور ایمیلش کے علاوہ کسی کو یہ راز نہیں معلوم تھا کہ اس بہانے وہ مقدونیوں کو ایک سبق دینا چاہتا ہے۔ میں دعوت میں سکندر اور بطلیموس کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ ہیراس اپنے شوہر کے برابر بیٹھی تھی، دعوت کے بعد شراب کا دور چلنے لگا، جب نشہ چھانے لگا تو آداب و احترام کا لحاظ بھی ختم ہونے لگا۔ دعوت میں سکندر کے استاد ارسطو کا بیعتجا نکلیے تھمیز بھی موجود تھا جو نامور فلسفی تھا۔ اس کے گرد بہت سے افراد کا ہجوم ہو گیا تھا لوگ بڑی توجہ سے اس کی عالمانہ گفتگوں رہے تھے موسیقی کی ہلکی دھن بج رہی تھی شراب کے جام پہ جام لٹھکائے جارہے تھے۔ میں نے سکندر کو شاعر اور اگیز کو آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ جس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ سکندر کے جاتے ہی سیلو نے بلند آواز میں کہا۔

”دیوتاؤں کی مہربانی ہے جس نے ہمیں اتنا مہربان اور عظیم شہنشاہ دیا، ذرا سوچو تو سکندر نے ہمیں کیا نہیں دیا۔ دولت عزت اور شہرت عطا کی۔ اس کے جواب میں کیوں نہ ہم اسے دیوتا تسلیم کر لیں اور ایرانیوں کی طرح اس کے سامنے قدم بوس ہو کر تعظیم دیں۔“

اس نے آخری جملہ کیلئے تھمیز کی سمت دیکھ کر کہا۔

”سیلو کا خیال درست ہے۔“ اگیز نے تائید کی۔ ”سکندر زبوس کا بیٹا ہے اور بلاشبہ اس اعزاز کا مستحق ہے، میں آج اس کے سامنے قدم بوس ہو کر تعظیم دوں گا، کیا خیال ہے کیلئے تھمیز۔“

سب کی نگاہیں کیلئے تھمیز پر مرکوز ہو گئیں، اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”سیلو! اگر سکندر نے تمہاری باتیں سن لیں تو سخت برہمی کا اظہار کرے گا۔ سکندر کو دیوتا بنانے کی کوشش مت کرو۔ تم چاہتے ہو کہ سکندر اپنی قومی روایات چھوڑ کر غیروں کی رسمیں اپنالے۔ ہم اپنے بادشاہ کو ایرانیوں کی طرح تعظیم پیش کرنے لگیں، میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔“

مقدونی کمانڈروں نے اس بات پر نعرہ ہائے تحسین بلند کیا کیونکہ کیلئے تھمیز نے ان کے دل کی ترجمانی کی تھی، مجھے

معلوم تھا کہ سکندر پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا یہ سب کچھ سن رہا ہے اور اسے یہ بات ناگوار گزری ہوگی۔ اسی لمحے وہ اچانک باہر آیا اور تمام ایرانی قدم یوس ہو گئے، میں بھی ان میں شامل تھی، ہم اٹھنے والے تھے کہ ایک کمانڈر ایشون نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”دوبارہ سجدہ کرو۔“ سکندر کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی، ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا وہ شیر کی طرح ایشون پر چھینٹا۔

”تم دوسروں کا مذاق اڑاؤ، لیکن خود تعظیم نہ کرو گے۔“ سکندر دھاڑا، کمانڈر نے گھبرا کر صفائی پیش کرنا چاہی لیکن سکندر نے اسے گردن سے پکڑ کر فرش پر چھینک دیا، وہ سر کے بل سکندر کے سامنے گرا۔ ”اب تم خود سجدہ کر رہے ہو اس لئے آئندہ کسی کا مذاق نہ اڑاؤ گے۔“ سکندر نے گرج کر کہا۔ ”گرفتار کر لو اسے۔“ مجلس درخواست کی جاتی ہے۔

سب پر سناٹا طاری ہو گیا تھا، کمانڈروں نے ناگواری کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور اس دن مجھے سکندر کے غیض و غضب کو دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا۔ پھر دس بارہ دن تک سکندر کا مزاج بہت برہم رہا۔ جب میں، بطلیوس یا ایشلس تنہا اس کے پاس ہوتے تو وہ قسمیں کھا کر الزام لگاتا کہ فلسفی کیلکسیٹھینز اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ وہ اپنی چرب زبانی کے ذریعہ لوگوں کو بغاوت پر اکسار رہا ہے، سکندر کو اس بات پر بھی سخت غصہ تھا کہ ایراش اب تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ بانتر کا یہ بہادر شہزادہ اب تک مزاحمت کر رہا تھا اور اپنی مختصر جماعت کے ساتھ چھاپے مار کر سکندر کی فوجوں کو بھاری نقصان پہنچاتا رہتا تھا۔ سکندر نے اس کی فوری گرفتاری کا حکم دے رکھا تھا۔ شاہی خواب گاہ میں جب وہ تھکا ماندہ آکر لیٹتا تو میری عادت تھی کہ اس کی گردن کی ماسح شروع کر دیتی۔

اس نے ایک دن مجھے بتایا کہ ہندوستان پر حملے کے لئے پوری مملکت سے تیس ہزار جنگجو جوانوں کو جمع کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ ”میرے لشکر میں ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ سپاہی اور پندرہ ہزار سوار ہوں گے۔“ اس نے بتایا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تمہارے ہاتھوں میں جانے کیا جادو ہے کہ میری ساری تھکان دور ہو جاتی ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اصنافیکہ! تم تو کسی دیوتا کی بیوی ہونے کی مستحق تھیں، لیکن یہ بتاؤ تم میری نسل سے نہیں ہو پھر بھی کیا میں تمہاری وفا پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ میرے ہر جانب سازشیں ہو رہی ہیں، کیلکسیٹھینز بھی اس میں شریک ہے۔“

”میرے آقا! آپ نے یہ الفاظ کہہ کر میرے دل کو بڑی غصے پہنچائی ہے۔“ میں نے غزدہ لہجے میں شکوہ کیا۔ ”آپ کسی نسل کے بھی ہوں لیکن میرے محبوب شوہر ہیں، آپ میرے لئے صرف بادشاہ نہیں سکندر! میرے محبوب ہیں۔“

”مجھے معاف کر دو اصنافیکہ۔“ سکندر نے والہانہ محبت کے ساتھ کہا۔ ”کیلکسیٹھینز نے مجھے ہر ایک سے مشکوک کر دیا ہے۔ آہ جان من دنیا میں بادشاہ سے زیادہ تنہا شخص کوئی نہیں ہوتا۔“

دوسرے دن ہم دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سکندر اپنے معمول کے مطابق کاروبار سلطنت چلا رہا تھا، مشورے کے لئے ایشلس اس کے برابر بیٹھا تھا، کچھ فاصلے پر مشہور مجسمہ ساز بیٹھا ہوا سکندر کی تصویر کندہ کر رہا تھا، پیلا کے گورنر نے اپنے خط میں سکندر کی ماں کی زیادتیوں کی شکایت کی تھی۔

”یہ گورنر بھی بڑا بے وقوف ہے۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے ایشلس کی سمت دیکھا۔ ”اسے نہیں معلوم کہ اس کی ساری شکایتیں ماں کے ایک آنسو سے دھل جاتی ہیں۔“ سکندر نے کہا۔ اسی لمحہ ایک محافظ نے آکر اطلاع دی کہ ایک ایرانی خاتون باریابی کی اجازت چاہتی ہے۔ سکندر نے فوراً حکم دیا کہ اسے آنے دیا جائے، ذرا دیر بعد ایک دراز قد اور

بے حد خوبصورت ایرانی خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی سیاہ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ گداز جسم شباب کی قندہ سامانیوں کے ساتھ نمایاں تھا۔ سکندر کو تعظیم دے کر اس نے مسکراتی نظروں سے سکندر کو دیکھا۔

”بتاؤ خاتون! تم پر کس نے ظلم کیا ہے، میں اسے عبرتناک سزا دوں گا۔“ سکندر نے کہا۔

”سکندر اعظم جیسے طاقتور اور منصف حکمران کی سلطنت میں کس کی مجال ہے جو کسی پر ظلم کرے۔“ عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تو ایک حقہ لے کر آئی ہوں اور آپ سے انعام کی طالب ہوں۔“

”کیسا حقہ خاتون؟“ سکندر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟“

”میرا نام زورا ہے اور میں آپ کے بدترین دشمن ایراش کی بیوی ہوں۔“ سکندر اچھل پڑا، تمام لوگ اس انکشاف پر حیران رہ گئے تھے۔ زور نے فاتحانہ انداز میں گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

”گزشتہ دو برس سے میں ایراش اور اس کی فوج کے ساتھ جنگوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کی خاک چھانٹی پھر رہی تھی، میں اس خانہ بدوشی سے عاجز آ چکی تھی، میں نے بار بار ایراش سے التجا کی کہ وہ آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دے لیکن وہ بے حس رہا کہ میں کسی غیر قوم کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا۔“ زور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”سکندر اعظم میرا شوہر حاسد تھا اسے یہ ڈر تھا کہ میں اسے چھوڑ کر آپ کے بازوؤں میں آ جاؤں گی۔“ اس نے بے جا جابی کے ساتھ سکندر کو گھورا۔

”اس حسد کی بناء پر اس نے میرا بستر چھوڑ کر بازاری عورتوں کے ساتھ داد و پیش دینا شروع کر دی لیکن وہاں سے وہ لذت نہ لے سکی جو میں دیتی تھی۔ اس لئے وہ پھر خوشامد کرتا ہوا میرے پاس آ گیا، لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ عورت کیسے انتقام لیتی ہے۔“

سکندر نے غصے میں ایک ترجمان سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ کام کی بات کرے ان بیکار باتوں میں وقت کیوں برباد کر رہی ہے؟“

زور نے ترجمان کو غصے سے دیکھا۔ ”میرے خواجہ سرا کو حاضر کرو۔“ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور نوکری کا ڈھکن ایک جھٹکے سے علیحدہ کیا اور ہاتھ ڈال کر اندر سے ایک کٹا ہوا سر نکالا۔ خون آلود سر کو بالوں سے پکڑ کر اسے سکندر کے سامنے کر دیا۔

”اسے پچھانئے سکندر اعظم! یہ ہے آپ کا دشمن..... ایراش۔“

سارے دربار پر سکوت چھا گیا۔ لوگ دہشت زدہ ہو کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ سکندر دہشت زدہ انداز میں چلایا۔ ”زیوس..... زیوس..... یہ کیسی درندہ مفت عورت ہے، کیا یہ واقعی ایراش کا سر ہے؟“

”ہاں میرے آقا.....“ میں نے غصے کے عالم میں کانپتے ہوئے کہا۔ ”میں شہزادہ ایراش کو پہچانتی ہوں، وہ اکثر میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔“ اور پھر میں غیض و غضب کے عالم میں زورا کی سمت مڑی اور اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ ”غدار..... چڑیل..... خدا تجھے جہنم رسید کرے۔ تو نے ایران کے آخری بہادر کو تہ تیغ کر کے پوری قوم کا سر کاٹ لیا ہے۔“

”بے شک ایراش میرا دشمن تھا۔“ اچانک سکندر کی آواز گونجی۔ ”لیکن بہادر دشمن کی موت پر خوش ہونا جو اس مردی نہیں ہے۔ یہ بے حیا عورت اپنے شوہر کی قاتل ہے۔ لے جاؤ اس شیطان مفت فاحشہ کو۔ اس سے پہلے کہ میری تلوار اس کا سر قلم کر دے اسے میری نظروں سے دور کر دو۔“ وہ طیش کے عالم میں دھاڑا۔

میں سکندر کی اس انصاف پسندی پر حیران رہ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک دلیر سپاہی تھا۔ اس واقعہ سے سکندر کی قدر

و منزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ اسی شب ایک اور واقعہ رونما ہوا میں بے خبر سو رہی تھی کہ کسی نے لیپ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی صبا اور میرا بھائی میرے پاس کھڑے تھے۔  
”خیریت تو ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”بہت آہستہ بولو۔“

میرے بھائی نے سرگوشی کی اور صبا کو باہر جانے کا اشارہ کیا پھر آہستہ سے بولا۔ ”ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں اصنا کیہ! تم اس لڑکے شاریس کو جانتی ہو تا جو سکندر کے خدمت گاروں میں شامل ہے۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکوں سے مل کر آج رات سکندر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔“

اس کی بات سن کر میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں میں سخت دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

◆\*◆

کوروتی کا انداز بڑا الوکھا تھا میں اس کی ہر بات کو زعمہ آنکھ سے دیکھ رہا تھا محسوس کر رہا تھا اور ہر واقعہ ہر بات کو زعمہ صدیوں میں من و عن رقم کرنے کے لئے تیار تھا کوروتی نے پھر کہنا شروع کیا۔  
”میں اس وقت اصنا کیہ کی حیثیت سے سکندر کے لئے شدید بے چینی ہو گئی تھی اور میں نے اپنے بھائی سے کہا۔  
”آؤ جلدی کرو ہمیں فوراً سکندر کو اس سازش سے خبردار کرنا چاہئے لیکن ٹھہرو۔ پہلے قسم کھاؤ کہ تم اس میں شریک نہیں ہو۔“

”نہیں میں نے ان لڑکوں کی باتیں اتفاقاً سن لی تھیں۔“ میرے بھائی نے یقین دلایا۔

میں نے لہادہ اوڑھا اور اسی عالم میں بھاگتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں سکندر اپنے کمانداروں کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا دروازے پر پہنچ کر میں رک گئی میرا لباس اس قابل نہ تھا کہ سب کی موجودگی میں جاسکوں میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ سکندر کو بلا لائے سکندر فوراً ہی آ گیا اور مجھے اس عالم میں دیکھ کر بولا۔

”خیریت تو ہے اصنا کیہ کیا بات ہے؟“

”خیریت کہاں ہے میرے آقا“ آپ کو قتل کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔“ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا سکندر غور سے سنا رہا۔

”اب مجھے اندازہ ہوا کہ دیوتاؤں نے تم جیسی شریک حیات مجھے کیوں عطا کی ہے۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور میرے بھائی کی سمت دیکھا۔

”شاباش..... تم یقیناً بہت بڑے انعام کے مستحق ہو۔“ محافلوں کے دستے کو طلب کر کے وہ تیزی کے ساتھ شاہی خواب گاہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ میں صبا کے ساتھ وہیں کھڑی رہی میں ان نوجوان لڑکوں کا انجام اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ لڑکے مقدونی امراء کے تھے ان کو فوجی تعلیم کے لئے بادشاہ کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ اپنی کم عمری کی بناء پر ان کی وفاداری غیر مشکوک ہوتی تھی۔ یہ رات کو شاہی خیمہ گاہ پر پہرہ دینے اسے لباس تبدیل کرانے اس کے جسم پر ہتھیار سجانے اور اس کا گھوڑا تیار کر کے لانے کے فرائض انجام دیتے تھے جب یہ اطلاع مل گئی کہ تمام سازشیوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے تو میں اپنی خواب گاہ میں واپس آ گئی رات کو پچھلے پہر سکندر بستر پر آیا تو میری آنکھ کھل گئی۔  
”یہ سازش کیسی تھیں نے تیار کی تھی۔“ سکندر نے کہا۔

سکندر نے صبح ہوتے ہی کیسی تھیں کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔ میں جب دربار عام میں پہنچی تو تمام کماندار اور دوسرے اہلکار موجود تھے۔ یونانی قوانین کے مطابق ملزمان کے تمام رشتے داروں کو بھی دربار میں حاضر کر دیا گیا تھا۔ میں آریل کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ سازش میں ملوث لڑکوں کی عمریں پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ ہتھکڑیوں اور بیڑوں میں جکڑے ہوئے وہ اور بھی مصوم لگ رہے تھے اچانک سکندر کی آواز دربار میں گونجی۔  
”بولو تم نے میرے قتل کی سازش کیوں کی شامیز؟“

”اس لئے کہ تم نے ہمیں آزاد انسانوں میں شمار کرنا ترک کر دیا تھا۔“ شامیز بڑی دیدہ دلیری اور بے باکی سے بولا۔ ”تم ہمیں غلام تصور کرنے لگے ہو۔“

شامیز کے باپ نے آگے بڑھ کر شامیز کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”نمک حرام اپنی زبان کو لگام دے۔“ اس نے غصے میں کہا۔ ”عالم پناہ میں احتجاج کرتا ہوں کہ اس بیوقوف کو دربار میں گفتگو کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔“

”خاموش رہو وائیس.....“ سکندر گرجا۔ ”اس کو وہ زہر اگلنے دو جو اس کے استاد کیسے تھمیز نے اس کے ذہن میں بھرا ہے۔“

”شکر یہ سکندر اعظم.....“ شامیز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ زہر وقت کے عظیم دانشور کیسے تھمیز نے ہمارے ذہنوں میں نہیں بھرا ہے۔ یہ زہر تو عالم پناہ آپ نے بھرا ہے، ہم سے پہلے بھی آپ اپنے ساتھیوں کو قتل کر چکے ہیں وہ لوگ جنہوں نے آپ کو سکندر اعظم بنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کو عظیم فاتح کہلانے کے قابل بنایا، جن کی ڈھالوں نے دشمن سے آپ کا دفاع کیا، جن کی تلواروں نے آپ کے دشمنوں کو سرنگوں کر دیا، لیکن آپ نے ان سب کو صفائی کا موقع دیئے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیا، انہوں نے آپ کے مجھے فن خطابت نہیں آتا لیکن آپ نے کیسے تھمیز جیسے عظیم فلسفی اور خطیب کو قید کر دیا ہے کیونکہ وہ جو باتیں کرتے ہیں ان سے ذہنوں کو علم کا نور ملتا ہے آپ آزادی اظہار سے کیوں خائف ہیں ہاں ہم نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے شک ہمیں قتل کر دیجئے، لیکن ریوس کی قسم ہمارا استاد بے گناہ ہیں۔“

لیکن سکندر کا فیصلہ واقعی اٹل ہوتا تھا۔

دوسرے دن کیسے تھمیز سمیت ان لڑکوں کو بھی بے دردی سے سنگسار کر کے قتل کر دیا گیا۔ سکندر اس وقت اپنے کمانداروں کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا جب یہ اطلاع آئی کہ سزا پر عمل درآمد ہو گیا ہے۔ سکندر کے چہرے پر اس خبر سے جو طمانیت نظر آئی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دوست فلسفی سے کتنا خائف تھا۔

”اب میں آرام کی نیند سو سکون گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایملش نے جذبات کی پردہ پوشی کے لئے نظریں جمالیں، میر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔“

”کیسے تھمیز کی موت کے ساتھ ہمارا شباب بھی گیا، سکندر اور میں ارسطو کی درسگاہ میں کیسیلیہ تھمیز کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔“

میرے ہمد ڈیشان عالی! سکندر اعظم واقعی اس بات کا عملی نمونہ تھا کہ صرف آگے دیکھو راستے میں آنے والی ہر مزاحمت کو ہٹاتے جاؤ اور آگے بڑھتے جاؤ۔ چنانچہ اب اس کا ارادہ یہ تھا کہ ہندوستان کا رخ کیا جائے۔ موسم بہار شروع ہوتے ہی برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی، سکندر کا عظیم اور پر شکوہ لشکر ہندوستان کی سمت روانہ ہو چکا تھا۔ تاحد نگاہ تلواریں اور نیزے چمک رہے تھے۔ رنگ برنگے پرچم چاندی اور سونے کے پتر چڑھی ہوئی ڈھالیں ہزاروں کی تعداد میں اتانج اور بار برداری کا سامان لئے ہوئے اونٹ موٹی اور پھر سواروں کے دستے ان کے پیچھے بڑی بڑی بلند چھتیاں۔ ان سب نے مل کر سکندر کے لشکر کو اتنا پر شکوہ بنا دیا تھا کہ دیکھنے والوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ میں لشکر کا اگلا سرا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن قدموں سے لرزتی ہوئی دھمک اور آسمان تک چھائے ہوئے گرد و غبار کو دیکھ کر ہی یہ یقین ہو رہا تھا کہ کسی میں سکندر کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوگی۔ سکندر اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے گرد شاہی محافظوں کا ایک خاص دستہ تھا جو شاندار گھوڑوں پر سوار تھا۔ وہ شاہانہ انداز میں تنہا بیٹھا تھا، لشکر ہر روز تمام دن سفر کرتا اور سائے ڈھلتے ہی قیام کرتا۔ خیمے نصب ہو جاتے۔ کھانا پکانے کے لئے جگہ جگہ آگ روشن ہو جاتی اور ہر سرت گہما گہما شروع ہو جاتی۔ سکندر غسل کر کے جسم پر بالش کروانا اور پھر کمانداروں اور ان کی بیویوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا۔ سکندر مجھ سے اتنی والہانہ محبت

کرنے لگا تھا کہ بہت سے کماندار مجھ سے حسد کرنے لگے تھے۔ مجھے اس کا بخوبی علم بھی تھا، لیکن ظاہر ہے میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

کوروٹی کی اس بات پر میں نے عجیب سے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا اور بولا۔

”ہر چند کہ میں اس دور میں نہیں تھا کوروٹی..... لیکن تم یقین کرو کوروٹی اس وقت میں بھی سکندر سے بے پناہ رقابت محسوس کر رہا ہوں۔“

”میرے دوست! میرے محبوب ڈیشان عالی! اس وقت میں اصنا کیہ کے روپ میں سکندر کی بیوی کی حیثیت سے تھی، ظاہر ہے میں اصنا کیہ کی حیثیت سے اپنا کردار نبھا رہی تھی اور میں اگر تاریخ بدل سکتی تو شاید سکندر کی جگہ تمہیں دیکھنا پسند کرتی۔“

”کوروٹی کے یہ الفاظ سن کر ڈیشان عالی! مسرور ہو گیا تھا، تھوڑی دیر تک خاموشی کے بعد کوروٹی نے پھر کہنا شروع کیا۔

اس دن کے انتھک اور دشوار گزار سفر کے بعد ہم ایک سرسبز وادی میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر سکندر نے ٹیکسلا کے راجہ اور دوسرے حکمرانوں کے پاس قاصد بھیجے اور ان کو پیغام دیا کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور آمد پر اس سے ملاقات کریں۔ بیس دن کے بعد ہم نے کوچ کیا اور برف پوش پہاڑوں کی رخ فضاؤں اور دشوار گزار بلند یوں سے گزرتے ہوئے ہم ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔ گئے جنگلوں میں ہم نے پہلی بار بے شمار بندروں کو درختوں پر اچھلتے کودتے دیکھا اور ان درختوں پر سبز رنگ کے سانپ اس کثرت سے تھے کہ ان پر سیویں کا گمان ہوتا تھا۔ جنگل سے گزر کر کابل کے قریب واقع ایک شہر پہنچ گئے۔ سکندر کی شہرت اور ہیبت اس سے آگے سفر کر رہی تھی۔ گرد و پیش کے تمام لوگ اس کی اطاعت قبول کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا لباس وضع قطع اور زبان ہر چیز ہمارے لئے نئی تھی۔ ہمیں قیام کے دوران زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ٹیکسلا کا راجہ سکندر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اپنے خیمہ شاہی کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھ کر سکندر نے راجہ کو باریابی بخشی۔ اس کے مشہور کماندار اس موقع پر اس کے گرد کھڑے تھے اور میں درو جو اہر سے لدی سکندر کے برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ راجہ سے پہلے اس کے درباری سردار زمر د اور موتیوں سے مزین پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بے شمار قیمتی تحائف لے کر آئے تھے۔ اس کے بعد دراز قدر راجہ نمودار ہوا اس کے کانوں میں ہیرے کے بالے تھے جن میں جڑے ہوئے ہیروں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، ہاتھوں میں سونے اور جواہرات کے کنکرن تھے۔

”خوش آمدید راجہ صاحب!“ سکندر نے کہا۔

”زیوس کے بیٹے سکندر!“ میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں، تم سے قبل مختلف لوگوں کے ہندوستان آنے کی بات صرف روایات میں سنی تھی، لیکن تم کو میں خود خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوں۔“

سکندر اس مخاطب پر بہت خوش ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے رواج کے مطابق قربانی کے خون میں تلوار اور بھالے ڈبو کر اپنی دوستی کا عہد کیا، پھر تحائف کا تبادلہ ہوا۔ راجہ نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی، راجہ نے بتایا کہ سکندر کو زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، کیونکہ ہندوستان بے شمار راجاؤں میں بٹا ہوا تھا جو ایک دوسرے کے کٹر دشمن تھے۔

تیس دن کے قیام کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے۔ سکندر نے ایملش کو راجہ کی رہنمائی میں پہلے ہی دریائے سندھ کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ تاکہ وہ دریائے پار کرنے کے لئے جہازوں اور کشتیوں کا بیڑہ اور پل تیار کر لیں، مجھے ایملش کا ساتھ چھوٹ جانے کا دکھ ہوا کیونکہ وہ اپنی خوش مزاجی کی بناء پر مجھے بہت پسند تھا اور تمام کمانداروں میں صرف وہ تھا جو مجھے

عزیز رکھتا تھا۔ ہم اب ایک ایسے پہاڑی درے سے گزر رہے تھے جہاں گاڑیوں اور پاکی کے لئے بار بار راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اس سست رفتاری سے عاجز آ کر سکندر نے فوج کے دو حصے کیے اور ہمیں وہیں چھوڑ کر فوج کے ایک حصے کو لے کر آگے بڑھ گیا۔" وہیں ایک دن مجھے اچانک متلی ہو کر ایک تھے ہوئی میں سمجھی کہ بد بھنکی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے لیکن میری ساتھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہوا خدا کیہ اتم محل سے ہو۔"

اور اس وقت ڈیٹان عالی! اصنا کیہ کی حیثیت سے میری خوشی قابل دیدنی دنیا کے عظیم فاتح نے مجھے یہ اعزاز بخشا تھا کہ میں اس کے بچے کی ماں بنوں گی۔" کوروتی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور ڈیٹان عالی سوچنے لگا کہ کتنی عجیب بات ہے۔ ایک ایسی عورت جس کی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا۔ جو بظاہر انسانی روپ میں اس کی ساتھی ہے، لیکن اس کی اصل حیثیت کیا ہے وہ دنیا کے ہر دور میں اچھے برے لوگوں کی ساتھی رہی ہے اور اب یونانی دور کے سکندر اعظم کی بیوی ہے۔ واہ واہ..... زندہ صدیاں واقعی ایک ایسی ہی الو کی تحریر بن کر لوگوں کے سامنے ہوگی جس کا کردار اپنے ساتھ رہنے والی ایک عورت کے بارے میں لکھے گا ایک ایسی عجیب داستان جس میں ہر دور کی عورت کی داستان وہ اس عورت کوروتی سے سنے گا بلکہ بعض لحاظ خود کو اس کے ساتھ اس دور میں بھی محسوس کرے گا۔

بہر حال کوروتی نے پھر کہنا شروع کیا۔" میں نے اپنی ساتھی عورت سے وعدہ لے لیا تھا کہ میرے حمل کو راز رکھے گی۔ دراصل میں یہ خوشخبری سکندر کو خود سنانا چاہتی تھی اسے ہم سے جدا ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے کیونکہ ہم باقی ماندہ لشکر کے ہمراہ دوسرے راستے سے آگے بڑھ رہے تھے جو نسبتاً زیادہ طویل تھا۔ اس دوران سکندر کے خطوط میرے پاس آتے رہے۔ شروع میں اس کے خطوط محبت اور فراق کے ذکر سے بھرے ہوتے اور ساتھ ہی ان میں تمام فوجی کارروائیوں کی تفصیل بھی ہوتی۔ اس نے ایک فتح کے بعد اپنے ساتھی کو وہیں چھوڑا اور خود آگے بڑھ گیا۔ دوسرے خط میں اس نے گور میں قبائلوں کے مقابلے کا ذکر کیا تھا اور تیسرا خط نیسا سے آیا جس میں اس نے لکھا کہ اس شہر کے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نیسا کی بنیاد یونانی دیوتا نے رکھی تھی۔ شہر کی آبادی ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں پر عشق بچیاں کے پودے بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ اتنی خوب صورت جگہ ہے کہ میں یہاں کچھ عرصے قیام کروں گا، تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ دیونی سوس کی عبادت کے تہوار میں جو جشن طرب ہونے والا ہے وہ میں تمہارے ساتھ جشن مناؤں۔"

میرے ساتھ موجود عورت نے جب یہ سنا کہ خط میں دیونی سوس کے جشن کا ذکر ہے تو کہنے لگی کہ میری معلومات کے مطابق دیونی سوس کے تہوار میں زبردست دعوت ہوتی ہے اور جشن طرب میں شراب پانی کی طرح بھائی جاتی ہے جس کے بعد کسی میں ہوش باقی نہیں رہتا اور مرد عورتیں بلا کسی امتیاز کے سرعام داد پیش دیتے ہیں۔ میں نے اس کی بات مذاق میں ٹال دی کیونکہ سکندر سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسے کسی بیہودہ جشن میں شرکت کر سکتا ہے۔

سات دن کے بعد سورج ڈھلے ہم شہر نیسا پہنچے آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور پہاڑ کی ڈھلوانوں پر ہر سمت مشعلیں روشن تھیں دور سے ہی زبردست شور و غل موسیقی اور طبل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے وادی ہی میں قیام کیا اور خیمے نصب کر لئے گئے، مجھے حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کہ سکندر نہ تو خود میرے استقبال کے لئے آیا تھا اور نہ کسی اور کو بھیجا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی سے شور و غل کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی، بستی کے لوگ بے تحاشا اسی سمت بھاگے چلے جا رہے تھے ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

"جشن طرب شروع ہو گیا، جلدی چلو، جشن طرب شروع ہو گیا۔" وہ ناچتے گاتے پہاڑی کی سمت بھاگے جا رہے

تھے میری ساتھی عورت مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"ایسا لگتا ہے جشن شروع ہو گیا، سب ہمارا انتظار کر کے وہیں چلے گئے، میرا خیال ہے ہم بھی وہیں چلیں، میرا شوہر ایسے جشن میں کبھی شریک نہیں ہوتا، اس لئے مجھے آزادی کے ساتھ تفریح کا موقع مل جائے گا۔"

مجھے سکندر سے ملنے کی بے تابی تھی اور دل میں یہ جلن تھی کہ جانے وہ کس کے ساتھ داد پیش دے رہا ہو، اس لئے ہم اسی حالت میں وہاں سے روانہ ہو گئے دوسرے کمانداروں کی عورتیں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔ ہم سب نے چہرہ پر نقابیں ڈال لی تھیں۔ صبا میرے ساتھ تھی پہاڑی پر جانے والے ہجوم کے ریلے نے ہم کو جلدی اوپر پہنچا دیا۔ چوٹی پر مندر موجود تھا۔ قربان گاہ پر پہلے ہوئے تازہ خون سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ جشن شروع ہو چکا ہے۔ ہر سمت درختوں کے جھنڈ جھاڑیوں اور عشق بچیاں کی نیلیوں سے بنے کچھ تھے۔ ہم جیسے ہی آگے بڑھے ایک سمت سے بہت سے لوگ دف اور جھانچیں بجاتے ہوئے نکلے، ان کے چہروں پر بھینک تھا، ہمیں چڑھی ہوئی تھیں لیکن جسم لباس سے عاری تھا، ان کے ساتھ ہی شراب کا ایک تیز بھپکا آیا میں نے مڑ کر دیکھا میری ساتھی عورت غائب ہو چکی تھی، میرے لئے اس جہنی محفل طرب کو مزید دیکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے صبا کو فوراً ساتھ لے کر فوراً واپس روانہ ہو گئی، ہم بھاگتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے، مقدونی محافظوں نے ہمیں شاہی خیمہ گاہ تک پہنچا دیا، لیکن سکندر خیمے میں موجود نہ تھا۔ میرے بھائی نے ندامت سے جھکی ہوئی نظروں سے بتایا کہ وہ جشن میں شریک ہونے گیا ہے۔

صبا نے مجھے حسل دیا اور اس کے بعد میں لیٹ گئی۔ پہاڑی سے آنے والے شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں ذہن پر ہتھوڑے چلا رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر سکندر واپس آیا تو محافظ اسے سنبالے ہوئے تھے وہ نشے میں اتنا دھت تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا، مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اصنا کیہ..... ادو..... میری اصنا کیہ....." اس نے لڑکھناتی زبان سے کہا اور میرے بازوؤں میں گر کر سو گیا۔

جشن طرب کا سلسلہ تین دن جاری رہا، سکندر اور اس کے ساتھی تمام دن سوتے اور تمام رات رنگ لیاں مناتے۔ میں نے دانستہ یہ دن اپنے خیمے میں گزارے، سکندر کا یہ رویہ مجھے بے حد شاق گزرا تھا اور میں بے حد اداس تھی۔ اسی دن میرے بابا بھی عیسا پہنچ گئے۔ وہاں سے آنے کے بعد میری ان سے اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی اس لئے ان کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے شکوہ کیا کہ سکندر کو اہل نیسا کے اس بے ہودہ جشن میں شرکت نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ فضول اندیشے نہ کروں۔ بادشاہوں کے لئے ایسے مواقع پر شرکت کرنا ضروری ہوتی ہے، مجھے ایک بار پھر اولاش کی یاد ستانے لگی۔

جشن کے خاتمے کے بعد سکندر نے مزید تین دن عیسا میں قیام کیا تاکہ اس کے ساتھی آرام کر کے تازہ دم ہو جائیں۔ روانگی سے ایک دن قبل رات کو میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی کہ پردہ اٹھا اور سکندر اندر داخل ہوا، میں نے سردمہری کا مظاہرہ کیا تو بڑی محبت سے میرے پاس بیٹھ کر بولا۔

"اصنا کیہ! تم سے شرمندہ ہوں، تم نے اپنے حاملہ ہونے کا ذکر کیا تو میں نشے میں تھا، لیکن تم نے یہ خوشخبری مجھے خط میں کیوں نہ تحریر کی۔"

"میں آپ کو خود یہ خبر مسرت سنانا چاہتی تھی، لیکن افسوس کہ جب یہاں پہنچی تو آپ ہوش و خرد سے دور پہنچے ہوئے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے اصنا کیہ! سکندر نے معذرت کی۔" لیکن تھکی ماندی فوج کو کبھی کبھی اپنے جذبات کی تسکین کی بھی ضرورت ہوتی ہے، میں نے اپنے لشکریوں کی خوشنودی کے لئے جشن میں شرکت کی تھی۔"



سکندر کا انداز معذرت آمیز تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی سردھری جاری رکھی۔ دوسرے دن ہم نے نیسا سے کوچ کیا۔ سکندر نے بچے کی پیدائش کا اعلان عام کر دیا تھا۔ اس رات بھی میں سکندر کے پاس نہ گئی۔ تیسری شب کھانے کے بعد سکندر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پانسہ کھیلنے بیٹھ گیا بشر نے کہا۔

”ہم جس طرف پیش قدمی کرتے ہیں لوگ پہلے سے بستیاں خالی کر کے چھپ جاتے ہیں ایسا لگتا ہے انہیں کسی طرح ہماری آمد کی خبر پہلے لگ جاتی ہے۔“

سکندر ایک لمحہ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”ہمیں ایک بار پھر لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ میرا زم مشرق کی سمت سے آگے بڑھو، بطلیموس مغرب کا راستہ اختیار کریں۔ ایلش اور میں باقی دونوں ستوں سے بڑھتے رہیں گے۔ اسی طرح ہم ہر سمت سے انہیں گھیرے میں لے لیں گے۔“ سب نے اس خیال کی تائید کی وہ سب منصوبہ بندی میں لگ گئے تو میری ساتھی عورت جو خود بھی ایک کماندار کی بیوی تھی مجھے علیحدہ لے گئی۔

”تم کو کیا ہو گیا ہے اصنا کیہ اس نے کہا۔“ نیسا جھپٹنے کے بعد سے تم نے جو سردور یہ سکندر کے ساتھ اختیار کیا ہے اس کا ذکر اب عام ہو گیا ہے یہاں تک کہ لوگوں کو بھی یہ معلوم ہے کہ تم ایک رات بھی اس کے پاس نہیں گئیں۔“

”تم کو معلوم نہیں کہ میں حاملہ ہوں۔“ میں نے بے رخی کے ساتھ جواب دیا۔

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”معلوم ہے اس لئے تو سکندر کو خوش رکھنا اور بھی ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ اس کے وقار کو خدشہ پہنچے اور بات قابو سے باہر ہو جائے۔“ اس کی سرزنش نے مجھے خود بھی سوچنے پر مجبور کر دیا، میں واقعی زیادتی کر رہی تھی۔

جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے بڑے پیار سے سکندر کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے آج رات بہت کم کھانا کھایا۔“

سکندر نے چونک کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں تمنائیں بھری ہوئی تھیں۔

”حسین اصنا کیہ تمہیں میں میرے استاد نے فصاحت کی تھی کہ رات کو کھانا کم کھایا کہ رات کو بھوک پر قابو پانا سیکھ لیا ہے، لیکن افسوس کہ استاد نے یہ نہیں سکھایا کہ اصنا کیہ کی محبت کی بھوک پر کیسے قابو پایا جائے۔“

میں خود بھی محبت کی بھوک تھی اس لئے جب سکندر نے ہاڑ پھیلانے تو میں بے ساختہ ان میں ساگنی ہم کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گئے۔

تین دن کے بعد جب سکندر روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا تو اس نے اچانک تمام خدمت گاروں کو باہر بھیج دیا اور مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”شوہر کے جسم پر ہتھیار سجانا بیوی کا فرض ہے۔“

”اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ یہ خدمت مجھے نصیب ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ کا جدائی کا تصور سوہان روح بنا ہوا ہے۔“

”اصنا کیہ! آج تم غیر معمولی پریشان نظر آتی ہو۔“ سکندر نے کہا۔ ”فکر نہ کرو میں تمہیں برابر خط لکھتا رہوں گا۔“ اس نے مجھے بڑی والہانہ محبت سے الوداعی بوسہ دیا۔

ہندوستان میں ہماری پیش قدمی جاری رہی، روانگی کے دو مہینے بعد سکندر کا خط موصول ہوا وہ ہیران میں پیش قدمی کر رہا تھا، وہاں کی رانی شیرازہ شہر کا دفاع کر رہی تھی۔ اس نے دوسرے خط میں ہیران کی فتح کی خوشخبری دی۔ رانی نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی تھی۔ کئی دنوں کی جدائی کے بعد میں پھر سکندر کے پاس پہنچ گئی۔ ہیران میں ہمارا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ میری پاکلی پاس پہنچتے ہی سکندر ایک خیمے کا پردہ ہٹا کر بھاگتا ہوا نکلا اور لوگوں کی پرواہ کئے بغیر مجھے پاکلی سے نکال کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

”کتنے دن ہو گئے میری اصنا کیہ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”چھ ماہ.....“ میں نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ ”خدا کی برکتوں سے نقین ہے کہ بیٹا ہو گا۔“

”زیوں کی دعاؤں سے وہ سکندر کا نام روشن کرے گا۔“ سکندر نے بڑے فخر سے کہا۔ ”لیکن جان من افسوس یہ ہے کہ اس حالت میں اب تم میرے ساتھ سفر نہ کر سکو گی۔“ پھر ہم لوگ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے بعد سکندر چلا گیا اور مجھے نیند آ گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو باہر شور ہو رہا تھا۔ مہانے بتایا کہ ہیران کی رانی سکندر کے لئے تحائف لے کر آئی ہے۔ رانی سالو لے رنگ کی ایک خوب صورت عورت تھی، سکندر نے اس کا استقبال بڑے تپاک سے کیا، بعض کنیزوں نے میرے کان بھرے کے سکندر اس دلفریب عورت پر فریفتہ ہو گیا اور ایک رات اس کے ساتھ گزارا بھی چکا ہے۔ میں عورت تھی اس لئے حد کی چنگاری سینے میں سلگ اٹھی، لیکن پھر سکندر نے دوسرے ہی دن فیصلہ کر لیا کہ وہ شمیر کی مدد کے لئے جائے گا جس کے آس پاس جنگجو قبائل بھی پناہ گزین ہو گئے تھے، قلعہ کی فصیلوں پر چڑھنا دشوار ہو گیا تھا کیونکہ وہ اتنی شدید تیر اندازی کرتے تھے کہ سکندر کے سپاہیوں کے لئے اس قلعے کے قریب پہنچنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔

سکندر نے قلعے کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور قریبی جنگلوں میں سے بڑے بڑے درخت کٹوا کر اس کے اتنے بلند مچان بنوائے کہ فصیلوں تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔ چودہ دن کی مسلسل محنت کے بعد یہ مچان تیار ہو گئے۔ میں اپنے خیمے میں کمانداروں کی بیویوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ اچانک زبردست شور سنائی دیا، ہم سب لوگ بھاگ بھاگ کر دروازے سے باہر بھاگنے لگے۔ سکندر نے قلعے پر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہزاروں سپاہی مچانوں پر چڑھ کر قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ قلعہ کے اندر سے ہندوستانی قبائل ان پر پتھروں اور تیروں کی بارش کر رہے تھے۔ زد میں آنے والے بے شمار سپاہی بلند مچانوں سے گر کر ہلاک اور زخمی ہو رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی ایک گرتا دوسرا اس کی جگہ پہنچ جاتا۔ میری نگاہیں سکندر کے چپکتے ہوئے خود پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر جاتا تھا وہیں اس کا تعاقب کرتیں۔ اب کچھ مقدونی تیر انداز تفصیل پر پہنچ کر اندر مزاحمت کرنے والوں کو نشانہ بنا رہے تھے، لیکن اندر سے بھی تیروں کی بوچھاڑ جاری تھی اور پھر تفصیل پر دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا، اگر سکندر کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا، سارا جسم خوف سے کانپ رہا تھا، اچانک اتنے زور کا درداٹھا کہ میں چیخ پڑی۔

”ارے تم کو کیا ہوا؟“ میری ساتھی عورت نے چونک کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تمہارا وقت آ گیا ہے۔“

”لیکن ابھی تو ساتواں مہینہ ہے۔“ میں نے درد سے کراتے ہوئے کہا۔

”زیوں رحم کرے، ممکن ہے تمہیں ساتویں مہینے ہی ولادت ہونے والی ہو ایسا ہوتا ہے گھبراؤ نہیں، میں شاہی طبیب کو پیغام بھجواتی ہوں کہ اصنا کیہ کی ولادت ہونے والی ہے۔“ میری ساتھی عورت باہر نکل گئی۔

ایک طرف جنگ کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دوسری طرف عورتوں نے چلانا شروع کر دیا، میں نے چیخ کر کہا کہ پہلے ہاروس کو بلاؤ، مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں حمل ضائع نہ ہو جائے۔ لیکن خدا کو میرے خواب شرمندہ تعبیر کرنا منظور تھے۔ میرے بطن میں سکندر کا جانشین وجود میں آ گیا تھا، ہر سمت خوشی کے شادیاں بچنے لگے۔ خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، بالآخر ہاروس کی پیٹھ کوئی پوری ہو گئی تھی۔

آہ میرے محبوب دیشان عالی اس وقت میں کوروتی کی حیثیت سے جس کرب میں تھی اس کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے، بڑی مشکلوں سے اس سے نجات مل سکی تھی اور میں ایسا کرنے کے لئے مجبور تھی ورنہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پتھر کا بن جانا ہوتا۔ بہر حال شام ہونے سے پہلے ہی جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سکندر پردہ ہٹا کر تیزی سے کمرے

میں داخل ہوا۔ وہ اب تک جنگی لباس میں تھا اور خود گرد و خون سے اٹا ہوا تھا۔  
”جان من! فتح ہوتے ہی سب سے پہلے خوشخبری یہ سنی کہ تم ماں بن گئی ہو۔“ اس نے جھک کر بڑی محبت سے مجھے بوسہ دیا۔ اسے شاید میری بے تابی کا علم تھا جو اتنی جلدی آ گیا۔

”لیکن سکندر! یہ صرف سات ماہ کا ہے! اتنا ذرا سا کہ ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال اس وقت سکندر کی خوشی قابل دید تھی۔ بھر وہ چلا گیا مجھ پر جانے کیوں افسردگی طاری تھی حالانکہ سکندر نے بچے کی پیدائش پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا اور خود میری بھی مراد برآئی تھی۔ دوسرے دن ہرست فضا میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی رہی کیونکہ مرنے والوں کی لاشیں جلائی جا رہی تھیں۔ مقدونی اپنے مروں کو جلا کر ان کی قبریں بنایا کرتے تھے۔

سکندر نے فیصلہ کیا کہ جب تک شاہی طبیب مجھے چلنے کی ہدایت نہ دیں شاہی خیمہ پہاڑی کے دامن میں نصب رہے گا اور لشکر کا بڑا حصہ بھی مقیم رہے گا۔ لیکن سکندر نے خود بہت سے کمانداروں کو ساتھ لے کر پیش قدمی جاری رکھی۔

سکندر کی روانگی کے دوسرے دن میری تمام مسرتوں پر اوس پڑ گئی۔ میرے بچے نے اچانک دودھ پینا بند کر دیا۔ شاہی طبیب نے انگلی پر شہد لگا کر اسے چٹانا چاہا لیکن بچے کا حلق بند ہو چکا تھا۔ دو دن شاہی اطباء اور ہاروس بچے کی جان بچانے کی کوشش کرتے رہے لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں کسی دوائے کام نہ کیا اور میرا پھول سا بچہ دم توڑ گیا۔ میں صدمے سے پاگل سی ہو گئی ہاروس کو دیکھ کر میں اس پر برس پڑی۔

”تمہاری پیشگوئی جھوٹی تھی! بتاؤ اب سکندر کا کون جانشین بنے گا؟“ میں غم سے بے تاب ہو کر چلائی ہاروس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”خدا پر بھروسہ رکھو! اصنا کی وہ تمہیں ایک اور بیٹا عطا کرے گا۔“

لیکن تسلیاں کسی ماں کی ممتا کو اولاد کے صدمے سے نجات نہیں دلا سکتی ہیں۔ رورو کے میرا برا حال ہو گیا یہ لوگ مجھے تسلیاں دیتے رہے مجھے مبر دلانے کے لئے دعائیں مانگی گئیں لیکن چار دن تک میں بھوک پیاسی غم سے نڈھال پڑی سسکیاں لیتی رہی اور پھر اسی عالم میں مجھے شدید بخار ہو گیا بے ہوشی کے عالم میں میری جینیں بلند ہوتی رہیں یہاں تک کہ بچے کی طرح میرا حلق بھی بند ہو گیا اور غدا تو کیا پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے اترا ناممکن نہ رہا۔ علاج کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں دعائیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں جب سب کو یقین ہو گیا کہ میرا بچنا محال ہے تب سکندر کو مطلع کرنے کے لئے ایک تیز رفتار قاصد روانہ کیا گیا۔ مجھے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا ذرا بھی ہوش آتا تو میں سکندر کو آواز دیتی اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں تاریکیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں شاید میں مر رہی تھی۔

کوروتی کی حیثیت سے بھی میں پریشان ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے اگر اصنا کی اس عالم میں مر گئی تو ایک بار پھر مجھے میرے دشمن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن شاید ابھی میری بچت قدرت کو منظور تھی۔ ایک شام میں اسی طرح بے سدھ پڑی ہوئی تھی کہ ایک آواز سنائی دی۔

”اصنا کی! اصنا کی!.....“ ایک محبت بھری آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس آواز میں جانے کیا جادو تھا۔ جانے کیسا رس تھا! کیسی مناس تھی! میرا دل بے ساختہ بولنے کو چاہ رہا تھا میں آنکھیں کھول دینا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی۔ وہ آواز مسلسل مجھے بلارہی تھی مجھے پکار رہی تھی میرا رواں رواں لپک کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ میں زندگی کی دعا مانگ رہی تھی یہاں تک کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا محبوب! اولاش مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے اس کا حسین چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں محبت سے چمک رہی تھیں۔ ان سے محبت کا نور پھوٹ کر میری رگ دپے میں سرایت کر رہا تھا اس کی محبت بھری شیریں آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی اچانک

اولاش کا چہرہ دھندلانے لگا ایک بار پھر میں تاریکیوں میں ڈوبنے لگی اولاش نے بے تاب ہو کر آواز دی۔

”اصنا کی!..... اصنا کی!..... آنکھیں کھولو! دیکھو تمہارے پاس بیٹھا ہوں اصنا کی!“

میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی سے کام لے کر آنکھیں کھول دیں اولاش میرے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے جلدی سے ایک پیالہ میرے لبوں سے لگا دیا۔

”اصنا کی! یہ شربت پی لو یہ محبت کی شراب ہے میری محبت کی شراب۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”میں نہیں پی سکتی۔“ میں نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

اولاش نے اپنے بازو کے سہارے مجھے اٹھا کر پیالہ پھر میرے لبوں سے لگا دیا، میرا سر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں مجھے محسوس ہو رہی تھیں۔ ”اس کو پی لو اصنا کی! میری زندگی! میری تمنائیں تمہاری سکتی ہو میری خاطر اپنے اولاش کی خاطر اسے پی لو میں قسم کھاتا ہوں کہ تم پی سکتی ہو تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے تم پی سکتی ہو۔“

اس کے الفاظ میں جانے کون سا جادو تھا وہ کہہ رہا تھا تم پی سکتی ہو اور مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے میں نے لب کھول دیئے۔ شراب میرے حلق سے اتر رہی تھی رگ دپے میں آگ سی دوڑنے لگی۔

”شاباش!..... شاباش جان من! اب تم بالکل ٹھیک ہو! اس سے کھاؤ! اس سے طاقت آئے گی۔“

اور میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اس نے آہستہ سے مجھے پھر لٹا دیا۔ ”اب تم صحت یاب ہو جاؤ گی! خدا عظیم ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اولاش! یہ سب کیا ہے؟ کیا کیا تم زندہ ہو! میں بھی زندہ ہوں؟ کیا ہم دنیا میں ہیں؟“

اس نے سر ہلایا میں نے دیکھا کہ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور تب میری نظر سامنے کھڑے ہوئے ہاروس پر پڑی۔ میرا حلق اب کھل چکا تھا! اولاش نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آرام کرو! اصنا کی! اب تم بالکل ٹھیک ہو۔“ اولاش نے بڑے پیار سے یقین دلایا۔

”مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“ میں نے آہستہ سے کہا! نقاہت سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی ہاروس نے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔

”باتیں بعد میں کر لینا! ابھی تم کو آرام کی ضرورت ہے سو جاؤ! اب ہم برابر والے خیمے میں انتظار کریں گے۔ اولاش کی روحانی قوت نے تمہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔“

میری آنکھ کھلی تو خیمہ میں لیپ جل رہا تھا۔ میرا بخار اتر چکا تھا اور حیرت انگیز طور پر میں خود کو بالکل توانا محسوس کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ کیا میں نے کوئی حسین خواب دیکھا تھا یا واقعی اولاش یہاں آیا تھا۔ اسی لمحے ہاروس اندر داخل ہوا میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”کیا اولاش واقعی یہاں موجود ہے؟“

ہاروس نے سر ہلا کر حامی بھری۔ ”وہ لشکر کے ساتھ ہے اور لوگوں کا روحانی معالج ہے۔“

خوشی سے میرا سارا وجود جھوم اٹھا میرا محبوب زندہ ہے میرا اولاش میرے پاس ہے۔

”محترم ہاروس! اولاش کی موجودگی کا علم آپ کو کب سے تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”کاہن اعظم نے افسردہ نظروں سے مجھے دیکھا تقریباً گیارہ ماہ قبل سے۔“ انہوں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی مجھے اطلاع ملی تھی کہ لشکریوں کے ساتھ ایک ایسا شخص بھی سفر کر رہا ہے جو ہر تکلیف کا علاج روحانی طریقے سے کرتا ہے۔ علاج بالاعتقاد کا یہ ماہر لشکر کے ساتھ چلنے والے خدمت گاروں کے ساتھ

رہتا تھا۔ مجھے تجسس ہوا تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ اولاش ہے۔ میں نے تم کو نہیں بتایا کیونکہ میرا خیال تھا اس خبر سے تم کو اذیت ہوگی تم اب سکندر کی بیوی ہو، لیکن جب تمہاری جان بچانے کی تمام تدبیریں ناکام ہوئیں تو میں نے اسے بلوایا۔ میں نے دانستہ تمہارے کمرے سے سب کو یہ کہہ کر ہٹا دیا تھا کہ روحانی علاج کے لئے مکمل تنہائی اور یکسوئی ضروری ہے۔“ میں نے آہستہ سے التجا کی۔ ”خدا کے لئے مجھے اس سے ذرا دیر کے لئے ملنا دیجئے۔“

ہاروس مجھے سرزلس کی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے، لیکن کچھ دیر کے بعد ہی اولاش خیمے میں داخل ہوا۔ میں سحر زدہ نظروں سے اس کے حسین چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہی سرخ سنہرے بال وہی معصوم چہرہ اور وہی خوب صورت آنکھیں جن میں ہر لمحہ محبت کے چراغ روشن رہتے۔

”اوہ اولاش! اولاش!.....“ میں اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ ”تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟“

اولاش احتیاط سے کام لے رہا تھا کیونکہ کچھ فاصلے پر ہاروس ہماری جانب پشت کئے کھڑے تھے۔

”میں نے واپس باہل پہنچنے کی کوشش کی تم کو پیغام بھیجنا چاہا لیکن افسوس کچھ ممکن نہ ہو سکا۔“ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہارا بہت انتظار کیا اولاش! مجھے تمہارے وعدے پر یقین تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، پھر بھی یقین جانو اولاش! زندگی کی آخری سانس تک میں تم سے اسی طرح محبت کرتی رہوں گی۔“

”میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں! امنا کیہ! مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

میں بے ساختہ رو پڑی۔ ”میں آج بھی تمہاری ہوں اولاش! ہمیشہ تمہاری رہوں گی، لیکن میں سمجھی کہ تم جنگ میں مارے گئے۔“ میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے تسلی دی، ہم زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے کیونکہ قدموں کی چاپ سن کر ہاروس نے خبردار کیا کہ سکندر کا ایک خاص شاہی دستہ باریابی کے لئے اس طرف آ رہا ہے۔ دستہ جب امنا کیہ کی خبر گیری کے لئے اندر داخل ہوا تو اولاش وہاں سے چاچکا تھا۔

شاہی دستے نے امنا کیہ کی خیریت دریافت کی اور اس کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ شاہی دستے کے جانے کے بعد میں نے ضد کر کے ہاروس کو مجبور کیا کہ اولاش کو بلوایا، میں انہوں نے اور صبا نے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ اس طرح بار بار اس کا بلاوا لوگوں کو شہ میں جتلا کر سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں مانی۔ مجبوراً انہوں نے ایک قاصد کو بھیج کر اولاش کو بلوایا، وہ خود تو چلے گئے لیکن صبا اور قاصد کو خیمے میں چھوڑ دیا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اولاش کے بازوؤں میں سا جاؤں، لیکن احتیاط دامن گیر تھی اس لئے دل پر جبر کر کے رہ گئی۔ دیر تک سرگوشیوں میں اظہار محبت کرتے رہے، پھر میں نے پوچھا۔

”تم مجھ سے باہل آ کر کیوں نہیں ملے؟“

وہ چند لمحوں تک مجھے پیاری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میری کہانی ہے شاید میں کبھی نہ ملتا، کیونکہ سکندر جیسے بادشاہ کی بیوی کے حضور میں باریابی کی ہمت مجھ میں نہ تھی، لیکن تمہاری پیاری نے مجھے مجبور کر دیا۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ایس کی جنگ کے بعد میں گرفتار ہو گیا جہاں غلاموں کے ساتھ مجھے بھی ایک نامور طبیب کی غلامی میں دے دیا گیا۔ طبیب نے جب جڑی بوٹیوں میں دلچسپی دیکھی تو آزاد کر کے مجھے اپنا شاگرد بنالیا اور وہیں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مریض کو جب کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا اور اس کی موت یقینی نظر آنے لگی تو میں نے دعاؤں اور روحانی طریقے سے علاج کیا اور اسے شفاء ہو گئی، اس دن مجھے اپنی اس انجانی روحانی قوت کا پہلی بار اندازہ ہوا۔“ اولاش نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”لیکن امنا کیہ! میں تمہارے فراق میں تڑپ رہا تھا، اس لئے موقع ملنے ہی فرار ہو کر یر و خلم پہنچ گیا، لیکن گھر پر بھی جی نہ لگا تو کسی نہ کسی طرح باہل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن افسوس کہ بہت دیر ہو چکی تھی۔“ اس نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ”جس دن میں وہاں پہنچا اس روز تمہاری شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔“

”اوہ اولاش! میں مجبور تھی خدا کی قسم اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔“

”مجھے معلوم ہے امنا کیہ! میں تم کو الزام نہیں دیتا، شاید یہی ہماری قسمت ہے۔“ اولاش نے غمزہ اور مایوس لہجے میں کہا۔ ”میں آج بھی.....“ لیکن ابھی اولاش کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ صبا بھاگ کر قریب آئی اور بتایا کہ مقدونی عورتیں اس طرف آرہی ہیں، اس طرح یہ گفتگو نامکمل رہ گئی تھی۔

ذیشان عالی! امنا کیہ کی حیثیت سے میں ایک عجیب سے موڑ پر تھی ایک طرف دنیا کا عظیم فاتح سکندر اعظم ایک طرف امنا کیہ کا محبوب اولاش! بڑی عجیب صورت حال تھی۔ امنا کیہ سکندر کی بیوی تھی جبکہ اولاش لشکریوں میں ان غریب لوگوں کے ساتھ رہتا تھا جو بن بلائے مہمانوں کی طرح فوج کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور لوگوں کی خدمت کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ میں ہر لمحہ اس سے ملنے کے لئے تڑپتی رہتی تھی، پھر اچانک مجھے ایک ترکیب سوچی، اگر کسی طرح سکندر کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ اولاش کو شاہی مجالس میں شامل کر لے تو ملاقات ہونے کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ کچھ دن بعد ہم سکندر کے پاس پہنچ گئے۔ رات کو جب ہم شاہی خیمے میں کیجا ہوئے تو میں نے اپنے بچے کی موت کا ذکر شروع کر دیا، سکندر نے مجھے فوراً ٹوک دیا اور بولا۔

”اے بھول جاؤ! امنا کیہ! تم موجود ہو تو دیتا ہمیں اس کا ہم البدل بھی ضرور دیں گے، میں تو اس بات پر شکر ادا کرتا ہوں کہ تمہاری جان بچ گئی ہے۔“

مجھے موقع مل گیا تھا اس کے لئے میں نے فوراً کہا۔

”اگر اولاش نہ ہوتا تو میں بھی تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہوتی، کیا تم اس روحانی محتاج کو انعام نہ دو گے؟“

”اوہ کیوں نہیں! اس نے میری امنا کیہ کو شفا یاب کیا ہے، میں خود بھی اس عطائی سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔“

”وہ عطائی نہیں ہے سکندر! جب تمام شاہی اطہاء میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے تب اس نے مجھے صحت یاب کیا۔“

”اوہو تم تو واقعی اس کی بڑی معتقد ہو گئی ہو۔“ سکندر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”لو میں ابھی دیکھے لیتا ہوں کہ اس کے پاس کیا ہے۔“ سکندر نے حکم دیا کہ اولاش کو فوراً حاضر کیا جائے۔

میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا، لیکن جب خادم نے اطلاع دی کہ اولاش حاضر ہو گیا ہے تو اچانک میرا چہرہ زرد پڑ گیا۔ مجھے فوراً خدشہ محسوس ہوا کہ اگر سکندر کو ہماری محبت پر ذرا بھی شہ ہو گیا تو میرا جو حشر ہو گا وہ تو اپنی جگہ اولاش کی موت یقینی تھی، بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا، اسی لمحے اولاش خیمے میں داخل ہوا اس نے زمین بوس ہو کر سکندر کو تعظیم دی۔

”سکندر اعظم کا اقبال بلند ہو غلام حاضر ہے۔“ اولاش نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ سکندر خوش ہو گیا کیونکہ اولاش نے یونانی زبان میں بات کی تھی۔

”اٹھو اولاش! میرے قریب آ کر بیٹھو۔“ سکندر نے اولاش کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارا ممنون ہوں تم نے میری امنا کیہ کی جان بچا کر میری خوشنودی حاصل کر لی ہے اور تم بڑی شستہ یونانی بولتے ہو، کیا تم نے دوسرے مضامین میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔“

دوسرے دن صبح سویرے میں شاہی طبیب اور سکندر بھیس بدل کر خدمت گاروں کے خیموں میں پہنچ گئے، ہمارے چہرے تقریباً جیسے ہوئے تھے۔ اولاش کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ایک جگہ بہت سا مجمع لگا ہوا تھا۔ اولاش ان کے درمیان آنکھیں بند کئے عبادت کے انداز میں بیٹھا دعا پڑھ رہا تھا، سامنے اسٹرپر پر بارہ حیرہ برس کا ایک لڑکا لیٹا ہوا پر امید لگا ہوں سے اولاش کے چہرے کو گھور رہا تھا، شاہی طبیب لڑکے کو دیکھ کر چونک پڑا۔

”عالی جاہ! یہ ناممکن ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”میں اس لڑکے کا معائنہ کر چکا ہوں اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو چکی ہیں اب یہ کبھی نہ چل سکے گا۔“

شاہی طبیب کی اس بات پر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر اولاش ناکام ہو گیا تو سکندر کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے اتر جائے گا۔ ہم سب انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ کئی گھنٹے گزر گئے اور سورج زوال پر آگیا، لیکن اولاش اسی طرح آنکھیں بند کئے دعا کر رہا تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے شاہی طبیب نے کئی بار سکندر سے کہا کہ انتظار فضول ہے لڑکا ہرگز نہیں چل سکے گا، لیکن سکندر اس سے مس نہ ہوا، یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت آ گیا۔ ماپوسی سے میرا دل ڈوبنے لگا کہ اچانک مجمع کے لبوں سے حیرت و استعجاب کا نعرہ بلند ہوا۔ میں نے جلدی سے اس طرف دیکھا، لڑکا خود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اسی لمحہ اس کی ماں مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی، ماں کو دیکھتے ہی لڑکا خوشی سے چیخا ہوا اس کی سمت بھاگا۔

”ماں..... میں چل سکتا ہوں، میں چل پھر سکتا ہوں، میرے پیر ٹھیک ہو گئے۔“

اولاش کو شاہی معالج کا عہدہ مل گیا اور اسے شاہی خیموں کے درمیان جگہ دے دی گئی۔ میرا دل خوشی سے معمور رہا تھا۔ اب میرا محبوب ہر لمحہ میرے قریب رہے گا، لیکن سکندر نے صبح ہوتے ہی لنگر کو کوچ کا حکم دیا۔ ہم چودہ دن مسلسل سفر کرتے رہے۔ اس دوران مجھے اولاش کو صرف دور سے دیکھنے کا موقع مل سکا اور پھر ایک دن جب ہم گرمی سے بدحواس ہو چکے تھے پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے اترتے ہوئے سپاہیوں نے خوشی سے چلانا شروع کر دیا۔

”انڈس..... انڈس۔“ ہم دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گئے۔ فاصلے پر ایملش کا لنگر خیمہ دن نظر آ رہا تھا، ہم جیسے ہی قریب پہنچے کماندار نے آگے بڑھ کر سکندر کا خیر مقدم کیا، یہ انک کا علاقہ تھا، جہاں دریائے سندھ کی چوڑائی نسبتاً کم تھی، گرمی اور پیاس سے نڈھال لنگریوں اور جانوروں نے جی بھر کے دریا کے پانی سے خود کو سیراب کیا۔ پانی دیکھ کر ان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، اس رات سکندر بہت خوش تھا۔ ہم نے وہ سارا علاقہ فتح کر لیا ہے۔ جہاں تک شہر نے قبضہ کیا تھا اس کے آگے براعظم ہند کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جہاں آج تک کسی حملہ آور کے قدم نہیں پہنچے۔ اس علاقے کے حکمرانوں کو زیر کرنا ہی اصل مسئلہ ہے، وہ جنگجو آنے والے ہیں اصل جنگ کا مزہ اب آئے گا۔“ سکندر نے کہا۔

”آپ کے بلند اقبال کے آگے پورا ہندوستان سرگوں ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جان من! یہ بہت جیلے بہادر ہیں آسانی سے شکست قبول نہیں کریں گے۔“ سکندر نے جواب دیا۔

اس رات کھانے پر تمام کماندار اپنی بیویوں کے ساتھ موجود تھے۔ ہر سمت جشن کا سماں تھا۔ سکندر میرے اور ایملش کے درمیان بیٹھا تھا، کھانے کے بعد شراب کا دور چلنے لگا، جیسے جیسے نشہ بڑھتا گیا وہ جیسے یہ بھول گیا تھا کہ میں برابر میں بیٹھی ہوں پھر اچانک لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں حکم دیا۔

”امناکیہ! تم دوسرے خیمہ میں جاؤ۔“

بادشاہ کا حکم تھا اس لئے تعمیل کے علاوہ چارہ کار نہ تھا۔ دوسرے خیمے میں جاتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب میں بھی اولاش کی محبت کو تشنہ نہیں رکھوں گی۔ خیمہ میں پہنچ کر میری ساتھی عورت نے مجھے سمجھایا۔

”شہنشاہ اعظم پہلے میں نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی، پھر ریاضی، یونانی، عبرانی اور پھر موسیقی کی تعلیم حاصل کی، میں بڑا اچھا گلوکار تھا، لیکن زائر کے محاصرے کے دوران ایک تیر نے میرا گلا ایسا زخمی کیا کہ میں نے گانا چھوڑ دیا۔“

”اولاش! میرے استاد نے مجھے طب کی تعلیم دی ہے اس لئے مجھے روحانی علاج پر اعتبار نہیں ہے، لیکن تم مجھے بلا جھجک اس کے بارے میں بتاؤ۔“

اولاش نے مختصر آہٹایا۔ ”میں نے جنگ کے دوران بہت سے زخمیوں کو اس طریقے سے شفا یاب کیا تھا۔“

”تو پھر اپنے گلے کا علاج کیوں نہ کر سکتے؟“ سکندر نے فوراً ٹوکا۔

”اس لئے عالی جاہ کہ جو تسکین دوسروں کو شفا یاب دیکھ کر ہوتی ہے وہ گانے سے کبھی نہ ہوتی تھی۔“ اولاش نے

برجستہ جواب دیا۔ ”خدمت روح کی تسکین کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔“

”تم کہتے ہو تم نے میری امناکیہ کا علاج دعاؤں سے کیا ہے؟“ سکندر نے کہا۔ ”اگر تم نے طب کا مطالعہ کیا ہوتا تو تم کو یہ معلوم ہوتا کہ دوا کے بغیر علاج ناممکن ہے۔“

”میرے آقا! میں نے پانچ سال تک طب کا مطالعہ بھی کیا ہے میرے استاد ایک ماہر طبیب تھے انہوں نے مجھے طب کی مکمل تعلیم دی ہے۔“ اولاش نے جواب دیا۔

”واقعی.....“ سکندر نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور پھر اولاش سے دواؤں اور طریقہ علاج کے بارے میں پوچھتا رہا، اولاش کا ہر جواب سکندر کی حیرت میں اضافہ کر رہا تھا پھر سکندر نے کہا۔

”تم واقعی ایک ماہر طبیب ہو، لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ دواؤں کے بجائے صرف دعا سے علاج کر سکتے ہو؟“ سکندر نے اولاش کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے۔“ اولاش نے یقین دلایا۔ ”آپ نے سنا ہوگا کہ ایک شخص موسیقی سے علاج کیا کرتا تھا، میں نے ان گنت لب دم زخمیوں اور مریضوں کا صرف دعا سے علاج کیا ہے۔“

”اگر تم اس پائے کے معالج ہو تو پھر لنگریوں میں کیوں پڑے ہو؟ تم اپنی اس صلاحیت سے دنیا کی کثیر دولت کما سکتے ہو۔“

”غریب لنگریوں کو میری ضرورت ہے۔ وہ دوا کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اور میری ضروریات بڑی محدود ہیں۔“ اولاش نے جواب دیا۔

”تم فلسفی بھی معلوم دیتے ہو اولاش! میں تمہیں امناکیہ کے علاج کا منہ مانگا انعام دوں گا۔“ سکندر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بولو کیا چاہتے ہو یہ لو سونے کی طشتری تمہاری نذر ہے۔“

”جہاں پناہ! آپ کی اس سخاوت اور زرہ نوازی کا شکریہ، لیکن مجھے دولت نہیں چاہئے۔“

”دولت نہیں چاہئے.....“ سکندر نے حیران ہو کر کہا۔ ”تو پھر خدا کے بندے تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”غریب لنگریوں کے لئے موسیقی، ان کے افلاس زدہ بچوں کو گائے کے دودھ کی ضرورت ہے اور ان کا پیٹ بھرنے کے لئے گوشت کی۔“

”ان احمقوں سے کس نے کہا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر فوج کے پیچھے لگ جائیں۔“ سکندر غصے میں گر جا لیکن فوراً ہی نرم پڑ گیا۔ ”لیکن گھبراؤ نہیں تمہاری خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔“

اولاش شکر یہ ادا کر کے چلا گیا تو سکندر نے مجھ کو مخاطب کیا۔ ”یہ شخص مجھے پسند ہے لیکن اس طریقہ علاج پر مجھے یقین اب بھی نہیں آتا، میں خود مشاہدہ کروں گا۔“

”اصناکیہ اس طرح خود کو ہلاک نہ کرو۔“

دوسرے دن سکندر شام تک شامی خیمے میں سوتا رہا۔ رات جب وہ کھانے پر آیا تو اس کے چہرے پر کسی عداوت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ لیکن مجھے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کراہت محسوس ہو رہی تھی پھر اسی دن دریا کو پار کرنے کا کام شروع ہوا۔ دریا پر کشتیوں کا مضبوط پل بنایا گیا تھا لیکن لشکر کی کثرت تعداد کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کام کو مکمل کرنے میں تین دن لگ گئے۔ اس کے بعد ٹیکسلا کے باہر پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع میدانی علاقے میں ہم خیمہ زن ہو گئے۔ لشکر والے بہت خوش تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سکندر یہاں سے بائبل کی طرف واپسی کا اعلان کرے گا۔ وہ مسلسل سفر اور متواتر جنگوں سے بالکل تھکا ہوا ہو چکے تھے، لیکن سکندر کے ارادوں کا علم نہیں تھا۔

رات کو ٹیکسلا کے راجہ نے ہماری دعوت کی۔ ہمیں محل تک لے جانے کے لئے شامی ہاتھی بھیجے گئے تھے جن کے ہودے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ سارا شہر خوب صورتی سے سجایا گیا تھا ہر سرت جڑواں تھا لوگ جوق در جوق سکندر اعظم کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ ٹیکسلا کا خوب صورت اور وسیع محل جگہ نور بنا ہوا تھا، محل کے باغ میں رنگ برنگی روشنیاں جھلک رہی تھیں سنگ مرمر کا بنا ہوا خوب صورت محل جھلکا رہا تھا، مہادت نے جیسے ہی ہاتھی کو روکا راجہ اپنی رانی کے ساتھ ہمارے استقبال کو آگے بڑھا۔ محل کی سجاوٹ دیکھ کر ہم وہاں کے حسن کو بھول گئے، ضیافت میں شاہانہ اہتمام کیا گیا تھا کھانے کے بعد جب ہم سب بیٹھے تو سکندر نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔ راجہ نے بتایا کہ اس کے دو بڑے دشمن تھے نثرا اور پورس دونوں بہت طاقتور راجہ تھے، لیکن اگر سکندر نے ان کے خلاف جنگ کی تو وہ تمام تر فوجی قوت سکندر کے حوالے کر دے گا۔

”ہم دوستی کا پیمانہ کر چکے ہیں۔ اس لئے تمہارا دشمن ہمارا بھی دشمن ہے، ہم انہیں شکست دیئے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”شارا اور پورس کے جاسوس ان کو آپ کی پیش قدمی کی اطلاعات پہنچاتے رہے ہیں اور ان دونوں نے مقابلے کے لئے ہماری تعداد میں فوجیں جمع کر لی ہیں۔“

سکندر اس اطلاع پر مسکرا دیا۔ اس نے راجہ سے پوچھا۔ ”کیا دریائے جہلم کو پار کرنا دشوار ہوگا؟“

”بہت دشوار..... کیونکہ بعض جگہ یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ اس پر مسندر کا گمان ہوتا ہے اور دوسری جگہوں پر اس کا بہاؤ اتنا تیز ہے کہ ہاتھی کے پیر جتنا بھی مشکل ہوں گے پھر پانی میں ٹوٹنے کی خطرہ کی وجہ سے کشتیوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔“

”راجہ تم نے اس طرح دشوار یوں کا ذکر کر کے میرے ارادے اور مضبوط کر دیئے ہیں۔ ہم نے دریائے جہلم سے زیادہ بڑی مشکلات کو سر کیا ہے۔ کل ہم شارا اور پورس کے پاس قاصد روانہ کر کے ان کو اطلاعات کا پیغام دیں گے اگر وہ نہیں مانے تو پھر ہماری تلواریں انہیں سرنگوں کرنے کے لئے تیار ہیں۔“

سکندر کے کمانداروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ وہ اس جنگ کے لئے تیار نہ تھے، لیکن سکندر کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا تھا۔ دوسرے دن راجہ نے شہر کی سیر کرانے کا اہتمام کیا تھا۔ تمام دن جلوس کی شکل میں ٹیکسلا کے گرد دواڑ میں گھومتے رہے راجہ ہم کو سانپ کے باغ میں لے گیا۔ یہ سب مقدس سانپ تھے۔ ان میں اتنے بڑے اڑدھے بھی تھے کہ پورا آدمی نگل جاتے تھے ایک وچڑے میں بہت سے چمکیلے سانپ تھے راجہ نے بتایا کہ یہ بڑے زہریلے ہیں ان کا کاٹا پلک جھپکتے مر جاتا ہے۔ اس نے خبردار کیا کہ جہلم کے قریب یہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

دوسرے دن میں نے لوگ جانے کا بہانہ کیا اور سکندر کے ساتھ نہیں گئی۔ میرا دل اولاش سے ملنے کے لئے بے قرار تھا، سکندر کو میری ناسازی طبیعت پر یقین آ گیا۔ کیونکہ ہلاکی گری پڑ رہی تھی اس لئے وہ تنہا چلا گیا۔ مطلع صاف ہوتے ہی میں نے صبا کو دوڑایا کہ وہ اولاش کو بلا لائے۔ اس نے خوفزدہ لگا ہوں سے مجھے دیکھا میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ حکم کی تعمیل کرے سکندر شام سے پہلے واپس نہیں آئے گا، کیپ ویران پڑا ہے کیونکہ سارے لوگ شہر گھومنے گئے ہیں، تم میرے غلاموں کو بھی چاندی کے سکے بانٹ کر شہر جانے کی اجازت دے دو۔ سکندر کو معلوم ہے کہ میری طبیعت ناساز ہے اس لئے وہ اولاش کی آمد پر شہ نہ کرے گا۔

شامی معالجوں کا خیمہ بالکل ہی قریب تھا، ذرا دیر بعد صبا نے آکر اولاش کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے کہا کہ اسے اندر لے آؤ اور تم ہمارے خاص آدمی کے ساتھ خیمہ کے دوسرے حصے میں جا کر بیٹھو۔ صبا نے مجھے تشویش کی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں اور اسی لمحہ خیمے کا پردہ اٹھا اور اولاش اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

”اولاش..... اودہ اولاش.....“ میں نے اسے محبت سے بھینچتے ہوئے کہا، لیکن اولاش پتھر کے بت کی طرح جامد کھڑا رہا۔ اس نے مجھے ہاتھ بھی نہ لگایا میں نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے سر پیچھے کر لیا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”نہیں اصناکیہ تم اب سکندر کی شریک حیات ہو۔“

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”لیکن اس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا، میں مجبور تھی اولاش!“

اولاش خاموش رہا۔ اس نے آہستہ سے میرے بازوؤں کو طحیدہ کر دیا، اصناکیہ جیسی حسین و جمیل عورت کو جس کے لئے سکندر جیسا شہنشاہ دیوانہ تھا، اسے اولاش جیسا ایک حقیر سا آدمی یوں ٹھکرا رہا تھا۔ میں مایوسی اور غصے میں کانپنے لگی اور حقارت سے اس پر قہقہہ دیا۔

”جھوٹے مکار..... تو نے تو آخری سانس تک مجھ سے محبت کرنے کی قسم کھائی تھی، کیا وہ سب فریب تھا؟“

اولاش اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ ”میں نے ہمیشہ تمہاری پرستش کی ہے، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا، اتنا محبت اصناکیہ، لیکن اب تم شادی شدہ ہو۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ زبردستی کی شادی تھی اولاش..... اولاش..... میں کتنی بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

”تم کو میرے دل کی تڑپ کا اندازہ نہیں اصناکیہ! اس میں ہر لمحہ تمہارے لئے ٹیس اٹھتی ہے، آہ تم نے صبر و قرار کے بندھن توڑ دیئے اب..... اب میں صبر نہیں کر سکتا۔“

”اولاش..... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی؟“

”جان من! قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔“ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”جو کچھ اس دل پر گزرتی رہی ہے اس کا اندازہ تم بھی نہ کر سکو! اصناکیہ! اب مجھے اجازت دو میرا ٹھہرا مناسب نہ ہوگا۔“

”اس شرط پر کہ کل تم پھر اسی وقت یہاں آؤ گے اور فکر نہ کرو میں نے سکندر سے بہانہ کر دیا تھا کہ میری طبیعت ناساز ہے، میں اسے بتا دوں گی کہ میں نے تمہیں علاج کے لئے طلب کیا تھا۔“

تین دن تک میں اسی طرح اپنے غلاموں کو رقم دے کر بازار بھیج دیتی، چوتھے دن برابر کے خیمے سے اچانک ہی آہٹ سنائی دی اور پھر صبا کی غصیغضب میں ڈوبی آواز ابھری۔

”کینی..... کتیا..... تو جاسوسی کر رہی تھی؟“



میں اور اولاش اچھل کر علیحدہ ہو گئے آواز پھر آئی، لیکن یہ کسی اور عورت کی آواز تھی۔  
”میں نے کچھ نہیں دیکھا میں قسم کھاتی ہوں مجھے چھوڑ دو۔“

صبا نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”پھر تو یہاں بھگی ہوئی کیا دیکھ رہی تھی یقیناً جاسوسی کر رہی تھی۔“  
”نہیں نہیں میری بالکن کا بروج یہاں گر گیا تھا میں اسے تلاش کر رہی تھی۔“

”تو جھوٹی ہے حرافہ..... تیری یہی سزا ہے۔“ اس مرتبہ آواز میرے خاص آدمی کی تھی۔

میں نے اولاش کو فوراً رخصت کر دیا کیونکہ خدشہ تھا کہ میری آواز سن کر سنتری اندر نہ آ جائیں۔ اولاش کے جاتے ہی میں پردہ اٹھا کر برابر والے خیمہ میں داخل ہوں، لیکن نظریں اٹھاتے ہی دم بخود رہ گئی۔ کیونکہ لاش فرش پر پڑی تھی۔ میرے آدمی کے بچنے کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ خوف و دہشت سے میں کانپ گئی، لیکن میرے آدمی نے مجھے تسلی دی۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں ملکہ عالیہ!..... اس کی لاش کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا، شہنشاہ کی واپسی سے قبل میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔“

صبا اور میرے وفادار ساتھی نے مل کر ایک بڑے صندوق سے کپڑے نکال کر لاش اس میں ڈال کر کپڑوں سے ڈھانک دی خدا نے مجھے ہال بال بچا لیا تھا۔ اس کینز کے واقعے کے بعد میں اتنی ڈر گئی تھی کہ پھر اولاش سے ملاقات کی ہمت نہ کر سکی۔ چودہ دن تک میں ہر لمحہ سکندر کے ساتھ رہی۔ انہی دنوں سکندر نے ہندو اور بدھ سادھوؤں کے متعلق بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ٹیکسلا کے قریب ایک یوگی تاتسٹرک کی بڑی دھوم تھی سکندر نے اسے بلوا بھیجا۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ اگر سکندر کو ملنے کی خواہش ہے تو خود آئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سکندر غصہ ہونے کے بجائے بلا تامل اس یوگی سے ملنے روانہ ہو گیا۔ اس نے ساتھ میں اپنے اطباء کو بھی لے لیا جن میں اولاش بھی شامل تھا۔ یہ برہمن تمام سادھوؤں سے برتر تصور کیا جاتا تھا اور اس کے بہت سے چیلے تھے سکندر نے اس سے پوچھا۔

”موت کے متعلق تمہارا کیا نظریہ ہے؟“

”ہم اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہم یونانیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے آپ کے خیال میں بہترین فلسفہ حیات کیا ہے؟“

”وہ جو ذہن کو غم اور خوشی سے بے نیاز کر دے۔“ ایک شاہی طبیب نے پوچھا کہ وہ بیماری کا علاج کیسے کرتے ہیں تو اس کے شاگرد فورسین نے جواب دیا۔

سکندر ان باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فورسین کو اپنے دانشوروں میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ ہم نے تیس روز تک ٹیکسلا میں قیام کیا اس دوران راجہ شارما نے سکندر کی اطلاعات قبول کر لی جس سے سپاہیوں کے حوصلے کچھ اور بلند ہو گئے، لیکن راجہ پورس نے نہ صرف اطاعت سے انکار کیا بلکہ سکندر کو جنگ کے لئے لاکار بھی۔

عین انہی ایام میں مجھے احساس ہوا کہ اولاش کا بچہ میرے بطن میں پروش پارا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوا میں یہ خوشخبری اولاش کو سنانے کے لئے بے تاب ہو گئی لیکن سکندر نے اچانک جنگ کی تیاریاں اس زور و شور سے شروع کر دیں کہ موقع ہی نہ مل سکا۔

”ہم جیسے ہی پورس کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے بارشیں شروع ہو گئیں۔ اکیس دن تک ہم بارش کے دوران سفر کرتے رہے سفر کی تکالیف سے سپاہیوں میں بڑی بددی پیدا ہونے لگی کیونکہ کچھ اور راستے میں موسلا دھار بارش کے دوران چلنا انتہائی دشوار ہو رہا تھا اور پھر مقدونی اور ایرانی سپاہی اس موسم کے عادی نہ تھے، لیکن سکندر نے پھر بھی سفر

جاری رکھا۔ میں نے اس دوران سکندر کو اپنے حاملہ ہونے کی خوشخبری سنائی، لیکن وہ اتنا مصروف تھا کہ زیادہ خوشی کا اظہار نہ کر سکا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے کچھ زدہ زمین ختم ہوتی جا رہی تھی اور راستہ پتھر پلا ہوتا جا رہا تھا۔ بجز اور بھورے رنگ کے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آنے لگا۔ جب ہم پہاڑی علاقہ میں چڑھائی پر پہنچے تو سڑکیں تیز پانی کے ریلے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جن سے گزرتا دشوار ہو جاتا لیکن جہلم کی ترائی میں داخل ہوتے ہی بارشیں ختم کئیں اور ہرست سبزہ نظر آنے لگا اس تبدیلی نے سپاہیوں میں تازہ حوصلہ پیدا کر دیا۔ لیکن جہلم کے کنارے پہنچتے ہی سب کو ایک دھچکا سا لگا۔ دریا کے پار کنارے پر راجہ پورس اتنے بڑے لشکر کے ساتھ قیام پذیر تھا کہ حد نگاہ تک آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آ رہا تھا۔ ان میں سپاہی پیدل، سوار، تیر انداز، نیزہ بردار سپاہیوں کے علاوہ ہاتھیوں اور رتھوں کی ایک بھاری تعداد بھی شامل تھی۔ سکندر نے بھی دریا کے کنارے خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اب دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں اور درمیان میں صرف دریا، جہلم حائل تھا، جس کا طغیانی زدہ پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

رات کو سکندر نے تمام کمانداروں کی مجلس بلائی اور ان سے کہا۔ ”پورس کی فوجوں کی موجودگی میں دریا کو عبور کرنا ناممکن ہے ہمارے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گے اور کنارے پر جانے کے بجائے دریا میں پھنس کر رہ جائیں گے اس لئے دریا پار کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے، ہمیں کوئی خفیہ راستہ تلاش کرنا ہو گا۔“  
تمام کمانداروں نے اس بات سے اتفاق کیا، سکندر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پورس کو دھوکے میں رکھیں۔ ہم لمحہ بہ لمحہ اپنے دستوں کو گھاٹ کی مختلف سمتوں میں اس طرح حرکت دیتے رہیں جیسے پار کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور جب مقابل کنارے پر پورس کو فوج جمع ہو جائے تو پھر کسی اور سمت رخ تبدیل کر دیں اس کے لئے ہمیں لشکر کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، مختلف ٹکڑیاں دریا پار کرنے کا تاثر دے کر پورس کو مصروف رکھیں اور اس دوران ہم دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لئے کوئی محفوظ اور خفیہ راستہ تلاش کر لیں۔“

”اسی کے ساتھ ہم اپنی کشتیوں کو بھی دریا میں اتار دیں اور انہیں بھی اسی مقصد کے لئے حرکت دیتے رہیں۔“ ایملش نے رائے پیش کی۔

”بالکل مناسب رائے ہے۔“ سکندر نے جواب دیا۔ بارش پھر اچانک شروع ہو گئی اور دو دن تک دریا کی سطح بہت بلند ہو گئی تھی اس دوران سکندر کی حکمت عملی نے پورس کو پریشان اور حیران کر دیا تھا۔ کبھی وہ دیکھتا کہ کشتیاں دریا پار کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، کبھی وہ دیکھتا کہ سپاہی مسلح ہو کر سوار ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی فوج کو جمع کرتا تو کچھ دیر کے بعد دور سی اور کنارے پر سکندر کی فوجیں جمع ہو کر نعرہ زنی شروع کر دیتیں۔ وہ دفاع کے لئے ادھر تیاریاں کرتا تو کسی اور جگہ فوجی نقل و حرکت شروع ہو جاتی، سکندر کی اس حکمت عملی سے پورس ہاتھیوں کو نقل و حرکت دینے دیتے اس قدر عاجز آ گیا کہ ایک جگہ دفاع کے لئے جم کر بیٹھ گیا، اسے یقین آ گیا کہ بارشیں رکنے سے قبل سکندر حملے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس دوران سکندر نے دریا پار کرنے کے لئے ایک مناسب جگہ کی تلاش کر لی تھی۔ فوجوں کے اجتماع سے کچھ فاصلے پر ایک گھٹا جنگل تھا جہاں خشکی کا ایک حصہ اندر کی سمت بڑھا ہوا تھا اور درمیان میں ایک جزیرہ تھا جس کا ایک کنارہ پار والے گھاٹ سے جا کر مل گیا تھا یہ جگہ یکپ سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھی اور گھٹے جنگل نے آڑ کر لی تھی۔ یہاں دریا میں تھوڑا سا موڑ بھی تھا جس کی بنا پر پورس کی فوجوں کو یہ حصہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ موسلا دھار بارش اور بادلوں کی زبردست گھن گرج میں سکندر کی فوجوں کی نقل و حرکت کا شور دب کر رہ گیا۔ بجلی کی کڑک سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، لیکن سکندر نے موسم کی خرابی کی پرواہ کئے بغیر اپنے منصوبے پر عمل درآمد جاری رکھا اور اس کی فوجوں نے دریا پار کر



لیا اور اس کے کچھڑ میں نقل و حرکت مشکل ہو گئی تھی، صبح کا اجالا پھیلنے لگا اور بارش قسم پچلی تھی اس لئے سکندر اپنی فوج کی ترتیب مکمل کر سکتا تھا لیکن دشمن کے پہرے داروں کو علم ہو گیا اور پورس نے فوراً ہی ایک سو رتھوں اور دو ہزار سواروں اور پیدل سپاہیوں کے ساتھ سکندر پر حملہ کر دیا، سکندر کے سپاہی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھے۔

پہلے حملے میں یونانیوں کی ایک بڑی تعداد کام آئی، لیکن آگے بڑھتے ہی پورس کے رتھ اور گھوڑے دلدل میں پھنس گئے اور اس طرح یونانیوں کو سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ سکندر اپنے محبوب گھوڑے پر سوار ہو کر جنگی نعرے بلند کرتا ہوا دشمن پر جھپٹ پڑا۔ ایسا رن پڑا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ سکندر نے صرف سواروں کے دستوں کو ساتھ لے کر حملہ کیا تھا، لیکن یہ ایسے ماہر شمشیر زن تھے کہ ذرا دیر میں دشمن کے پرے الٹ گئے۔ پورس کے رتھ دلدلی زمین میں دھنس گئے اور بیکار ہو گئے، صورتحال سے گھبرا کر اس نے اپنے سواروں کو پیچھے ہٹایا اور مسلسل پیچھے ہٹتا ہوا ہاتھیوں کے پیچھے چار کا، اب ہاتھیوں کا دستہ ایک دفاعی دیوار کی طرح درمیان میں حائل تھا۔ پورس نے ہاتھیوں کے حملے کا حکم دیا۔ بکتر بند ہاتھیوں کی تعداد دو سو تھی اور ہر ہاتھی کے درمیان سو فٹ کا فاصلہ تھا جس میں تیر انداز کھڑے تھے۔ لیکن ان کی کمائیں اتنی بڑی اور بھاری تھیں کہ ان کو زمین پر رکھ کر نشانہ لگانا پڑا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے تیس ہزار سوار تھے اور تین سو رتھ تھے جن پر دو تیر انداز اور دو ڈھال بردار ان کے دفاع کے لئے موجود تھے۔ پورس کی اصل قوت ہاتھیوں اور رتھوں پر منحصر تھی، ہاتھیوں نے سکندر کے فلامنگ کو اپنی سونڈوں اور پیروں سے رو دنا شروع کر دیا، مقابلہ اتنا نازک تھا لیکن سکندر نے فلامنگ کو آگے بڑھنے سے روک کر اتنی پھرتی کے ساتھ ایک ہزار تیر اندازوں سے دشمن کے بائیں حصے پر حملے کا حکم دیا کہ پورس کی فوج بدحواس ہو گئی۔

اسی دوران ایک اور کماندار تازہ دم فوج لے کر پہنچ گیا۔ سکندر نے خود دائیں جانب سے حملہ کیا اور تیر کی طرح اندر گھستا چلا گیا، اس کا حملہ اتنا شدید تھا کہ پورس کے سپاہی اس پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ ادھر فلامنگ نے بھاری جانی نقصان کے باوجود ہاتھیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا اور بھاگ بھاگ کر تیروں اور کھانڈوں سے ہاتھیوں کی سونڈوں اور پیروں کو زخمی کرتے رہے۔ اسی دوران سکندر کا ایک اور کماندار چکر کاٹ کر پورس کی فوج کے عقب میں پہنچ گیا۔ سکندر اتنی شدت اور غیض و غضب میں لڑ رہا تھا کہ اس کا گھوڑا تھک کر گر ا اور مر گیا لیکن اس نے فوراً ہی ایک تازہ دم گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور پھر لڑائی شروع کر دی۔ پورس اپنے ہاتھی پر ڈٹا ہوا فوج کو بار بار مختلف ترتیب سے حملے کا حکم دے رہا تھا حالانکہ وہ ہر سمت سے تیروں کی زد میں تھا۔

اس دوران پورس کی ساری فوج سکندر کے محاصرے میں آ چکی تھی۔ ایسی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی کہ انجام کا اندازہ دشوار تھا، لیکن اچانک پورس کے زخمی ہاتھی بدحواس ہو کر پلٹے اور انہوں نے اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ پورس کے سپاہی اس غیر متوقع آفت سے گھبرا کر تتر بتر ہو گئے اور مقدونیوں نے ایک بھر پور حملے سے جنگ کو انجام تک پہنچا دیا، لیکن پورس آخر دم تک ڈٹا رہا، اس کی شکست خوردہ فوج نے راہ فرار اختیار کی لیکن پھر بھی اس نے جان بچانے کی فکر نہیں کی۔

جنگ ختم ہو گئی، کچھ دیر بعد جب پورس کو گرفتار کر کے لایا گیا تو سکندر خود اس کے پاس پہنچا۔ دراز قد اور باوقار پورس کی دلیری نے سکندر کو بہت متاثر کیا۔ اس نے پورس سے پوچھا۔

”پورس تم خود بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے؟“

پورس نے سر بلند کر کے دلیری کے ساتھ جواب دیا۔ ”ویسا ہی سلوک جیسا بادشاہوں کے ساتھ کیا جانا چاہئے؟“

سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ ”ایسا ہی ہوگا راجہ پورس! لیکن بتاؤ تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے جو جواب پہلے دیا اس میں سب کچھ شامل ہے۔“

سکندر نے فوری جنگ بندی کا حکم دیا، پورس کی رعایا کو عام معافی دی اور اس طرح دریائے جہلم کے کنارے پر واقع میدان میں ایک اور جنگ میں سکندر نے فتح و نصرت کا پرچم لہرا دیا۔

لشکر میں جشن و شہ شروع ہو چکا تھا، میرادل اولاش کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا جو سکندر کے ساتھ ہی دریا پار کر کے میدان جنگ میں زخمیوں کے علاج کے لئے گیا تھا۔ اچانک شاہی خیمے کا پردہ ہٹا اور سکندر اپنے محبوب کماندار ایملش کے ساتھ انداز داخل ہوا، دونوں کے لباس خون اور کچھڑ میں لت پت تھے، لیکن دونوں فتح کی خوشی سے سرشار تھے۔

”اصنا کیہ! میری جان! آؤ تم بھی ہمارے ساتھ جام نصرت پیو۔ ہم نے ہندوستان میں فتح کے دروازے کھول دیئے ہیں۔“

تمام کمانداروں اور دوسرے سرداروں نے خوشی کے نعرے بلند کئے ہر ایک مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ عورتوں نے اپنے اپنے شوہروں کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ میں نے آگے بڑھ کر سکندر کی زرہ بکتر اتاری اور اس کے جسم سے خون صاف کرنے لگی، خیمہ فہتہوں سے گونج رہا تھا۔ سکندر نے ایک عام ضیافت کا اعلان کیا۔ اس ضیافت میں اس نے کمانداروں کو خوش کرنے کے لئے ہر ایک کو سونے اور جواہرات کے بھاری انعام و اکرام دیئے۔ کئی دن تک فتح کا جشن جاری رہا اس کے بعد سکندر نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا، ہم مسلسل فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہندوستان کے زرد جواہر کے خزانے سمیٹتے ہوئے دریائے چناب اور راوی کے علاقوں پر سکندر اعظم کی عظمت و کامرانی کے پرچم لہراتے بالا آخر ہم دریائے بیاس کے کنارے خیمہ زن ہو گئے، یہاں پورس اور دوسرے ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر عام کر دیا کہ اگر سکندر نے اس سے ٹکرائی تو تباہ ہو جائے گا۔ یونانی سپاہی مسلسل جنگ و جدل اور طویل عرصہ تک گھر سے دوری کی بناء پر پہلے ہی بددل ہو چکے تھے ان خبروں نے ان کے حوصلے اور بھی پست کر دیئے۔

سکندر اس صورت حال سے سخت برہم اور دل برداشتہ ہوا۔ اس نے تمام کمانداروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

”تم سب نے اپنی شجاعت اور دلیری سے ایشیا میں اپنی فتح و نصرت کے پرچم گاڑ دیئے ہیں اب اگر ہم اس طرح واپس چلے گئے تو سارے مفتوح علاقے ہاتھ سے نکل جائیں گے مجھے معلوم ہے کہ تم سب تھک چکے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع دریائے گنگا تک کا علاقہ فتح کرنے کے بعد مشرق میں سمندر بہتا ہے، ہم وہاں سے جہاز پر آرام کے ساتھ واپسی کا سفر شروع کریں گے۔“

سب خاموش سنتے رہے لیکن ایک کماندار بلیسوس نے ہمت کر کے سکندر سے کہا۔ ”سکندر ہم پر تاب نگہ کی قوت سے خائف نہیں ہیں لیکن یونانی سپاہی جنگ کرتے کرتے نڈھال ہو چکے ہیں ان کے لباس پھٹ چکے ہیں ہتھیار کند ہو چکے ہیں اور کوئی جواب دے چکے ہیں اور اب وہ اس سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“

”بلیسوس سچ کہہ رہا ہے ہمارے بہادروں نے بہت زر و جواہر حاصل کر لیا ہے اب انہیں کسی چیز کی تمنا نہیں ہے۔“

”کیا تم سب یہ چاہتے ہو کہ اتنی عظیم الشان فتوحات کے بعد فاتح عالم اپنے کا سنہری موقع چھوڑ دیا جائے۔“

اچانک ایملش کھڑا ہو گیا اور اس نے سکندر سے کہا۔ ”ہمیں اعتدال پسندی کا ثبوت دینا چاہئے ہم میں سے بیشتر اپنے والدین اور بیوی بچوں کی شکل کو ترس گئے ہیں، ہم سب اب واپس جانا چاہتے ہیں۔“

”میں فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے سپاہیوں سے خطاب کروں گا۔“ سکندر گرجا۔ ”مجھے امید ہے کہ وہ میرا ساتھ دیں

گے۔

بگل بچتے ہی لشکر کے ہزاروں سپاہی شاہی خیمہ کے سامنے جمع ہو گئے، سکندر نے بڑے اعتماد اور جوش کے ساتھ ان سے خطاب کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سپاہ اس کی تقریر کا ہر جوش جواب دے گی، لیکن سناٹا طاری رہا۔ اس نے پھر غصے میں اپنے دلبروں کے جوش حمیت کو لٹکا کر، لیکن سناٹا نہ ٹوٹ سکا، ایک اور کماندار نے سپاہیوں کی ترجائی کرتے ہوئے کہا۔

”سکندر اعظم! تمہارا اقبال بلند ہے۔ ہم نے ہمیشہ تم سے وفا کی ہے اور ہمیشہ تمہارے وفادار رہیں گے، لیکن اس سے پہلے کہ اقبال سکندری کو ٹھیس پہنچے اپنے دلبروں کی بات مان لو اور واپس چلنے کا اعلان کر دو۔ یہی تمہارے جان نثاروں کی خواہش ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ہزاروں آوازیں ایک ساتھ تائید میں بلند ہوئیں۔

”نہیں..... اگر کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں تنہا پیش قدمی کروں گا۔“ سکندر گر جا اور پیر پٹختا ہوا اپنے خیمہ میں چلا گیا۔

تین دن تک وہ تنہائی میں پڑا رہا۔ نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیاسا رہا۔ فاتح اعظم شہنشاہ سکندر جس نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی، اپنی ضد سے مجبور تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ سکندر کو پہلی بار اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں شکست قبول کرنا ہوگی، میرا دل اولاش کے لئے بے تاب تھا۔ سکندر اپنے خیمہ میں بند پڑا تھا، وہاں جانے کی مجھے بھی اجازت نہ تھی۔ اس دن میں نے ہمت کر کے اولاش کو اپنے خیمے میں طلب کیا، احتیاط کے پیش نظر میں نے صبا کو خیمے میں ہی روک لیا تھا۔ وہ فاصلے پر پشت کئے کھڑی تھی۔ میں بیمار بنی لیٹی تھی۔ اولاش میرے بستر کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

”میرے سیمیا میرے محبوب! تم جانتے ہو میرا مرض کیا ہے اور اس کا علاج صرف اور صرف تمہاری محبت ہے۔“

”میں جانتا ہوں اصنا کیہ۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن درمیان میں دیوار شاہی کو میری محبت بھی نہیں توڑ سکتی۔“

”ہم نے وہ دیوار بھی توڑ دی ہے اولاش! میرے بطن میں تمہاری محبت کی نشانی پرورش پا رہی ہے۔“

میرا خیال تھا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑے گا، لیکن اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”اصنا کیہ کیا واقعی..... کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں اولاش! یہ سچ ہے، لیکن میرا خیال تھا کہ تم میری طرح خوشی سے دیوانے ہو جاؤ گے۔ کیا تم کو یہ سن کر مسرت نہیں ہوئی؟“

وہ چند لمحے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”اصنا کیہ مجھے معاف کر دو، میری زعمی!“ اس نے آبدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”لیکن یہ کسی مسرت ہوگی کہ میں اسے دیکھ سکوں گا اس سے محبت کر سکوں گا، لیکن آہ میں اسے بیٹا نہ کہہ سکوں گا۔ کبھی نہیں۔“ وہ اپنی سسکیاں دباتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے شرمندہ ہوں اولاش! میرے پاس تمہارے اس درد کا کوئی علاج نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم بے قصور ہو اصنا کیہ..... بے شک ہم دونوں مجبور ہیں بے شک ہماری قسمت میں فرقت ہی فرقت ہے، لیکن یاد رکھنا میری تمنا محبت نہ دوری سے کم ہوتی ہے اور نہ قربت کی محتاج۔ ہم کہیں بھی ہوں کسی حال میں ہوں، ہمارے دل اپنی محبت کی روشنی سے منور رہیں گے، دکھ درد جدائی یہ سب کچھ محبت کے آگے حقیر ہیں، خدا حافظ، میری دعا ہے کہ ہماری محبت سے روشن ہونے والا چراغ ہمیشہ جگمگاتا رہے۔“

کوروتی بڑے تاثر انگیز لہجے میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اور میرے دوستو! مجھے پڑھنے والو! ذیشان عالی! پورے

اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہے کہ تم لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور سمجھتے ہو۔ میں متاثر ہو رہا تھا، ایک انسان کی حیثیت سے کوئی غیر انسانی بات کر کے میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا کوروتی نے اب تک جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ اس لحاظ سے میرے لئے باعث تکلیف تھا کہ میں اس کے ساتھ بہت ہی خوب صورت وقت گزار رہا تھا اور یہ وقت میرے لئے ایک حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے منہ سے یہ محبت بھری داستان سن کر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کوروتی نے میرا چہرہ دیکھا اور دیکھ کر ایک دم چونک پڑی۔

”ارے..... تمہاری آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں ذیشان عالی؟“

اس کے ان الفاظ سے میں چونک پڑا اور میں نے ایک مضحکہ منہ پر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میری آنکھیں۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک دلاویز مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے بڑے پر محبت لہجے میں کہا۔ ”ہاں تمہاری آنکھیں! اب یہ تو نہ کہو کہ میرا صدیوں کا حجبہ جھوٹا ہے، میں اتنا تو پہچان ہی سکتی ہوں اور میں سچ بتاؤں بے پناہ خوشی ہوگی ہے مجھے تمہاری آنکھوں کا یہ رنگ دیکھ کر۔“

”ارے بابا، مگر کیا کہہ رہی ہیں میری آنکھیں؟“

”جھوٹ تو نہیں بولو گے مجھ سے؟“

”بولوں گا بھی تو تم بولنے کب دوگی، میرا جھوٹ پکڑ لو گی؟“

”ہاں مجھ میں یہ صلاحیت ہے۔“

”تو پھر بولو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”کیا میری کہانی سے تمہیں رقابت کا احساس ہو رہا ہے؟“ اس نے سوال کیا اور مجھے ہنسی آگئی، میں نے کہا۔

”ہاں ہو رہا ہے۔“

”بالکل فطری بات ہے۔ لیکن خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ میں جس نے پہلی بار تمہیں صحیح معنوں میں اپنے محبوب کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ اس بات سے آشنا ہو رہی ہوں کہ میرا محبوب مجھے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا کہ میں خواہش مند تھی۔ میرے لئے یہ بڑے سرور کی بات ہے، تم نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ وہ انسان نما جانور میرا مطلب فیسکس سے ہے، میرے جسم کو نوچتا تھا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ماضی کی عورت تھی۔ میں نہیں، میں تو اس وقت تمہیں صرف ایک کردار کی حیثیت سے اس عورت کی کہانی سن رہی تھی۔ فیسکس سے نہ میرا کوئی رشتہ تھا، نہ وہ میری قربت میں تھا، بس ہم ماضی کی سیر کر رہے تھے اور یہی کیفیت اس وقت بھی ہے، وہ عورت اصنا کیہ تھی جس کا میں نے روپ دھارا تھا، لیکن میری روح میرا جسم تو الگ ہی تھا۔ میں تو صرف ایک کردار ادا کر رہی تھی اور نہ میری اس سے کوئی جسمانی قربت ہوئی، نہ میرے دل میں اس کو کوئی مقام حاصل ہوا، وہ اصنا کیہ کے کھیل تھے جو تاریخ کا ایک حصہ تھی۔ یہ ساری باتیں تمہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ اس کی تاویل میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی، چلو پچھلی بار تو اس نے فیسکس کے معاملے میں ایک روپ دھار لیا تھا اور وہ اصل عورت تھی، بقول کوروتی کے وہ خود نہیں، لیکن اس بار تو کوروتی نے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ جان بچانے کے لئے بھاگ رہی تھی اور وہاں سے اصنا کیہ کا رنگ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی، میں نے سوال اس سے کر ڈالا تو وہ ہنس کر بولی۔

”ہاں، مگر یہ بات تمہارے علم میں ہے کہ وہ ایک بچپن تھا اور جو وجود بچپن سے لے کر جوانی تک رہا وہ صرف ایک خیال تھا، میں خود نہیں۔“

مجھے ایک دم ہنسی آگئی۔ کوروتی جو کچھ کہہ رہی تھی حقیقی نگاہ سے دیکھنے سے مجھے وہ تسلیم نہیں ہو رہا تھا۔ ہبڑی الوکی بات تھی، ناقابل فہم اور ناقابل یقین، البتہ میں نے ذیشان عالی کو سمجھایا کہ بیٹے اپنی توجہ اپنی کتاب پر رکھو جسے تمہیں بڑی محنت سے ترتیب دینا ہے۔ اگر اس طرح تم متاثر ہوئے تو یہ تو غلط ہو جائے گا، تم کیوں اپنے نقصان پر تلے ہوئے ہو وہ زمانہ قدیم کی ایک پراسرار شخصیت ہے ایک دلکشی کی حامل۔ تم ایک ایسی عورت کی معیت میں زندگی گزار رہے ہو جو آب حیات ہے ہوئے ہے۔ آپ حیات کی کہانیاں بے شمار لکھی گئی ہیں، میں نے خود ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو صرف مفروضات پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن میری زندگی میں ایسا کوئی کردار آجائے گا جو آب حیات پیئے ہوئے ہو وہ میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا، چنانچہ میں نے خود کو سنبھال لیا اور ہنس کر بولا۔

”ہاں میں یہ اعتراف کر چکا ہوں کہ جب تم کسی کے بارے میں اپنی محبت کا اظہار کرتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اس کے چہرے پر مسرت کے نقوش منجمد ہو گئے تھے اس نے پیار بھری آواز میں کہا۔ ”تم میرے محبوب ہو ذیشان عالی! میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں، جو کہانیاں میں تمہیں سناتی رہی ہوں وہ ماضی کی کہانیاں تھیں اور ماضی گزر چکا ہے۔ بس یہ میرا علم اور میرا انداز ہے کہ میں تمہیں ماضی کا ایک کردار بنا کر وہاں لے جاتی ہوں لیکن وہ کردار ہم نہیں ہوتے، تم خود بھی کبھی محسوس کرنا وہ تو صرف ایک تصور ہوتا ہے جو ماضی میں کھو چکا ہے، میں تو تمہارے سامنے صرف صدیاں زندہ کر دیتی ہوں اور کچھ نہیں۔“

ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں یہ حال جو ہے نا یہ ماضی سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے اس حال میں جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں اسے دیکھ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہوں، انسان کیا بن چکا ہے زمانہ قدیم میں جادو ہوا کرتا تھا اور جادو گر مردہ مشکلیں لئے اس دنیا کو مشکلات کا شکار کرتے رہتے تھے، خود میرا واسطہ بھی اس طرح کے جادو گروں سے پڑ چکا ہے، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے جو علوم سیکھے ہیں ایسے ہی لوگوں سے سیکھے ہیں جو مافوق الفطرت تھے، سمجھ گئے ہو گے نا میری بات، تو میں اس حال کی بات کر رہی ہوں بلکہ تم نے پہلی بار مجھے شمن کہتی اور اس کے محبوب سے روشناس کرایا تو میں ہل کر رہ گئی، حسن و عشق کی لاتعداد داستانیں ماضی میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزر چکی ہیں، نجانے کیا کیا ہوا ہے ماضی میں، لیکن آج جو کچھ ہوا ہے اور جو ہو رہا ہے اس نے مجھے دنگ کر دیا ہے، چلو چھوڑو.....

ہم یوں کرتے ہیں ذیشان عالی کہ کچھ عرصے کے لئے سب کچھ بھول جاتے ہیں، بقول تمہارے تم جو کتاب ترتیب دے رہے ہو اس کی ترتیب بھی کچھ عرصے کے لئے تم روک دو وہ سب بعد میں کر لینا مجھے اپنی محبوب کی حیثیت سے تم اپنی قربت میں زیادہ سے زیادہ جگہ دو، حقیقت جو لحاظ میں اب گزار رہی ہوں وہ میری صدیوں کی زندگی کے سب سے دلکش لحاظ ہیں، کیونکہ اس میں میرا محبوب میرے ساتھ ہے وہ جسے زندگی میں سب سے پہلے میں نے چاہا، تم سے پہلے میں نے کسی کو دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا، بلکہ ایسے ہی حالات کا شکار رہی جس نے میرے سامنے کوئی نہ کوئی داستان بیان کر دی، تو میں شمن کہتی اور اس کے محبوب کے بارے میں جو کہہ رہی تھی دل ہلا ڈالا تھا، میرا اس داستان نے اور جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ صحیح معنوں میں مجھے پاگل کرنے کا باعث بن گیا تھا، میں اکتا گئی ہوں اپنے ماضی سے..... تمہاری دنیا بہت دلکش ہے، چلو گھر سے نکلے ہیں باہر نکلتے ہیں اس دنیا کو قریب سے دیکھیں گے، پلیز پلیز.....

”وہ لاجت بھرے انداز میں بولی تو میں بھی آمادہ ہو گیا۔“

لیکن میں آپ کو دل کی بات بتاؤں، میرے قریبی عزیز اور دوستو! یعنی میرے پڑھنے والوں کے دل میں یہی سوچا تھا کہ زندہ صدیاں لکھ رہا ہوں اور ایک کردار میری کتاب کا مرکزی کردار ہے، بلکہ اگر دوبھی کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا، کیونکہ ہمسالی میرے لئے ایک کردار بے شک تھا، لیکن اس سے میرا زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا، اور وہ مجھ سے دور ہی

رہتا تھا، مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ میں اپنے اس کردار کو کسی بھی طرح بد دل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اگر یہ کہہ رہی تھی کہ یہاں سے چلا جائے اور دیکھا جائے کہ میری دنیا کتنی دلکش ہے تو جب زندہ صدیوں کا یہ باب تکمیل پا رہا ہو گا تو میں اس کی خواہش کے بارے میں بھی لکھوں گا اور تحریر کروں گا کہ اس کی خواہش کے مطابق تیاریاں کیں۔ سب سے پہلے ہمیں اپنا گھر چھوڑنا تھا تو ہم دونوں باہر نکل آئے اور اس کے بعد میں نے ایک انتہائی خوب صورت فائبر اسٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ اس سے پہلے بھی ہوٹلوں میں قیام کر چکا تھا، لیکن اس وقت ایک حسین عورت میری محبوب کی حیثیت سے میرے ساتھ تھی جس پر میرا پورا تصرف تھا۔

کوروتی یہاں آ کر مکمل طور پر یہاں کے پروگراموں میں حصہ لے رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ بارہا اس نے ہوٹل کے خوب صورت ہال میں بیٹھ کر مجھ سے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ میری یہ دنیا ماضی کی دنیا سے کہیں زیادہ حسین ہے اس کے مشاغل اور یہاں کی زندگی میں بڑی دلکشی ہے۔ وہ سب کچھ ہے یہاں جو ماضی کے راج محلوں یا عظیم ترین شہروں میں نہیں ہوتا تھا۔ موجودہ دور شاید صدیوں کی تاریخ میں سب سے خوبصورت دور تھا اس کا یہی کہنا تھا۔

مجھے بھی اس کے ساتھ لطف آ رہا تھا، ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ ”ابھی وہ یہیں قیام کرے گی یا ہم باہر کی سیاحت کا آغاز کریں؟“

جب اس نے جواب دیا کہ ”نہیں، تھوڑا وقت یہیں گزاریں گے، یہ تبدیلی مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں اپنے مسودے کے کاغذات یہیں اٹھا لاتا ہوں، تھوڑا سا وقت میں اپنی کتاب لکھنے میں بھی صرف کروں گا۔“ اس نے اس کی اجازت دے دی اور میں اپنے گھر آ گیا۔

یہاں میں نے خاصا وقت گزارا، تھوڑا سا بیٹھ کر لکھ لیا تھا، اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب میں واپس ہوئے پہنچا میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اندر داخل ہو گیا، حالانکہ ابھی شام ہی ہوئی تھی لیکن کمرے میں مدہم بلب روشن تھا مجھے حیرت ہوئی بڑے صوفے پر کوئی ہوٹل کے بیڈروم کا کبل اوڑھے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اس کبل نے اس کا چہرہ تک ڈھک رکھا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر میرے منہ سے نکلا۔

”کوروتی.....“ جواب میں مجھے بے اختیار رونے کی آواز سنائی دی تھی، ایک عجیب سی آواز جسے سن کر میں سخت حیران رہ گیا۔



نے جس کی لازمی طور پر اس نے زبردست ریہرسل کی ہوگی۔“  
”اچھا پھر۔“

”واش روم کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ میں نے ضرورت ہی نہیں تھی بس مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اس طرح اندر آ جائے گا۔ وہ آگیا دروازہ کھول کر اندر آیا میں ہاتھ لے رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بھی تمہارے انداز میں مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا میں نے کہا۔“

”یہ کیا حرکت ہے باہر جاؤ میں نہا رہی ہوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا غالباً وہ تمہاری آواز نہیں اختیار کر سکتا تھا البتہ اس نے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی بڑی خوبصورت شیشی تھی جس طرح تمہارے پاس سینٹ کی شیشیاں ہوتی ہیں میں بھی سمجھی کہ وہ کوئی شرارت کر رہا ہے اور ہاتھنگ ٹب میں کوئی سینٹ ڈالنا چاہتا ہے میں نے ہنس کر تمہیں دیکھا تو اس نے سینٹ کی پوری شیشی ہاتھنگ ٹب میں الٹ دی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے ہنس کر پوچھا تو وہ بول پڑا اس نے کہا۔

”یہ ایک ایسی حرکت ہے کوروتی جو میں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں کی ہے۔“ اور میں نے اس کی آواز پہچان لی میں نے کہا۔

”گوتم بھنسا لی..... تم.....“

”ہاں شاید مجھے اپنے اس کئے پر دکھ ہوتا لیکن اب نہیں ہے۔ وہ تمہارے غسل کے دوران بھی اس طرح تمہارے پاس آ سکتا ہے جبکہ تم بے لباس ہو۔ اس سے اس کی تم تک پہنچ کا مجھے اندازہ ہو رہا ہے اور اس چیز نے مجھے بالکل مطمئن کر دیا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔“ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی اور اسی وقت مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ ہاتھنگ ٹب کا پانی آہستہ آہستہ سنناٹ پیدا کر رہا ہے وہ اگلنے لگا ہے۔ میں دہشت زدہ ہو گئی میں نے ٹب کے کنارے پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن میرے ہاتھ پھسل گئے اور میں ٹب میں ڈوب گئی چہرے سمیت۔ گوتم نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔

”ہاں کوروتی، مختلف ادوار میں میں تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کرتا رہا اور تم نے مجھے دھتکار کر خود سے دور ہٹا دیا۔ بے شک میں خوبصورت نہیں تھا۔ بے شک میں تمہارے قابل نہیں تھا، لیکن میں تم سے محبت کرتا تھا۔ میں نے صدیاں تمہیں چاہتے ہوئے گزاری ہیں۔ لیکن یہ کل کے لوگ جو تمہارے قریب آتے ہیں اور تمہاری قربت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ میرے لئے اتنے بڑے دکھ کا باعث ہوتے ہیں کہ میں تمہیں الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ کتنے کرداروں کا نام لوں میں تم محبتیں بدلتی رہتی ہو تم نے ہر ایک کو اپنی قربت بخشی ہے، تم نے سیون، ایپوس، ڈیملن اور نمجانے کس کس کو دل سے چاہا ہے اور وہ تمہارے حسین وجود سے سرشار ہوئے ہیں اور میں مایہ بے آب کی طرح تڑپتا رہا ہوں۔ میں نے بہت سے موقعوں پر تمہاری حفاظت بھی کی ہے ورنہ تمہارے رقیب تمہیں مختلف طریقوں سے تکلیف دینا چاہتے تھے میں ایک خدمت گار کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہا ہوں، لیکن میں نے اپنی ان بدنصیب آنکھوں سے ان سے تمہاری رغبت اور محبت دیکھی ہے اور خون کے آنسو روتا رہا ہوں۔ اولاش، سکندر اور نمجانے کون کون صرف میں ایک ایسا بدنصیب تھا جسے کبھی تمہاری ایک محبت بھری نگاہ بھی نہ مل سکی، بتاؤ مجھ جیسے شخص کے دل میں کیا ہونا چاہئے تھا، اور اب اس دنیا کے اس شخص سے جس کا نام ڈیشان عالی ہے تم اس طرح بے تکلف ہو جیسے ماضی میں تم اپنے دوسرے من پسند لوگوں سے رہی ہو۔“

تو آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تمہاری طرح جیتا جاگتا انسان ہوں یہ الگ بات ہے

میں نے رونے کی آواز پہچان لی وہ کوروتی ہی تھی میں حیرانی سے دو قدم آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔  
”کوروتی کیا ہوا کیا ہو گیا؟“ میں نے سوال کیا وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ اتنے عرصے کی رفاقت میں پہلی بار میں نے اسے اس طرح روتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھائے تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اور بولی۔

”نہیں مجھے مت دیکھو مجھے مت دیکھو میرے ساتھ بہت برا ہو گیا۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد بھا ہوا تھا۔

”مجھے اپنا چہرہ تو دکھاؤ آخر ہوا کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ کجخت وہ کجخت جل دے گیا مجھے آخر وہ میرے خلاف اپنی سازش میں کامیاب ہو ہی گیا۔“

”کون؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”گوتم بھنسا لی..... مار گیا وہ مجھے مار دیا اس نے مجھے تم ذرا واش روم میں جاؤ ہاتھنگ ٹب دیکھو اور اس کے آس پاس آہ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کیا ہو رہا ہے؟“

”واش روم..... ہاتھنگ ٹب۔“ میری عقل میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ تاہم میں واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ فانیو اسٹار ہوٹل کا شاندار واش روم جس قدر شاندار ہو سکتا تھا یہاں تو کسی قسم کی بدبو وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، لیکن جسے ہی ایئر ٹائٹ دروازہ کھلا مجھے یوں لگا جیسے شدید بدبو کا طوفان امنڈ پڑا ہو اور یہ بدبو بھی انتہائی عجیب اور حیرت انگیز قسم کی تیزابی بدبو تھی مجھے ایک دم سے ابکائی سی آنے لگی۔ لیکن حیرت اور تجسس نے مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر واش روم میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے ہاتھنگ ٹب کے نزدیک فرش پر ایک عجیب سی چیز دیکھی براؤن رنگ کا ایسا مخلول سا تھا جو جگہ جگہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ واش بیسن تک گیا تھا اور ایک لکیری بٹی چلی گئی تھی۔ گاڑھی براؤن رنگ کی لکیر جو کسی سیال کی تھی واش بیسن میں بھی ویسا ہی گاڑھا براؤن سیال پڑا ہوا تھا، میری حیرانی شدت کو پہنچی ہوئی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ بدبو اس قدر شدید تھی کہ میں زیادہ دیر نہ رک سکا اور باہر نکل آیا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

”خدا کے لئے مجھے بتاؤ تو سہی کوروتی ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ۔ یہ کھل بٹاؤ چہرے سے اور اپنے بدن سے یہ سب

کیا ہے؟“

”میرا بدن بے لباس ہے اس پر کچھ نہیں ہے۔“

”ارے..... کیوں؟“

”وہ جل کر خاکستر ہو گیا ہے اب میں بے لباس ہوں مکمل طور پر۔“

”کیسے؟“ میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوچھا۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ہوا کیا ہے۔

”گوتم بھنسا لی، گوتم بھنسا لی آیا تھا۔ لیکن کینہ تمہارے روپ میں تھا۔ بالکل تمہارا ہی انداز اختیار کیا ہوا تھا اس

ہڈیوں والے ہوتے ہیں لیکن ایسا ڈھانچہ جس سے وہ گاڑھا بدواریاں اب بھی بہہ رہا تھا اس کا تھوڑا تھوڑا گوشت اب بھی اس کے جسم سے چمٹا ہوا تھا لیکن اس طرح کہ وہ اس کاڑھے سیال کی شکل میں ایک لکیر بناتا ہوا ڈرینگ ٹیبل تک گیا تھا۔ بدبو تھی کہ انتہاء سے زیادہ۔ ذہن کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

اچانک ہی مجھے اس کی ہولناک چیخ سنائی دی ڈرینگ آئینے میں شاید پہلی بار اس نے اپنے پورے حلقے کو دیکھا تھا اور اس کے بعد تو وہ چیخنے کی مشین بن گئی وہ بری طرح دھاڑ رہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔

اچانک ہی وہ دروازے کی جانب بھاگی بدحواسی کے عالم میں اس نے یہ کیا تھا دروازہ کھولا اور اسی طرح چیختی ہوئی باہر نکل گئی میں اب بھی گم صم کھڑا ہوا تھا لیکن اس کے بعد باہر سے جو چیخیں سنائی دیں انہوں نے مجھ سے میرے ہوش دحواس بالکل چھین لئے۔ ان چیخوں میں مردوں کی چیخیں بھی تھیں عورتوں کی چیخیں بھی تھیں۔ سب چیخ رہے تھے اور بری طرح جھگڑ رہے تھے اٹھا شیخ کی آوازیں آ رہی تھیں نجانے کیا کیا ہو رہا تھا۔ میں نے ایک جمر جمری سی لی اور اس ہولناک صورت حال سے نمٹنے کے لئے میں خود بھی دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں اس سیال مادے سے بچ کر نکل رہا تھا جو زمین پر کافی حد تک پھیلا ہوا تھا اور اس کی بدبو ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔

باہر تو قیامت مچی ہوئی تھی کڑوں کی گیلری میں لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے اس کے بعد یہ آوازیں نیچے سے آنے لگیں غالباً وہ لفٹ میں جانے کے بجائے سیزھیماں اترنے لگی تھی۔ لفٹ وغیرہ کا تو خیر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور جس منزل سے بھی وہ گزرتی وہاں خوف ناک تاثرات چھوڑ جاتی پورے ہوٹل میں افراتفری پھیل گئی۔ انتظامیہ کے افراد بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ وہ خوفناک بلا کہاں سے نمودار ہوئی ہے۔ وہ انسانی ڈھانچہ کون سے کمرے سے نکلا ہے میرے کمرے کی خصوصاً نشاندہی ہو گئی تھی میں سیزھیماں ہی سے اترتا ہوا نیچے آ گیا۔

ہر طرف ایک ہولناک جھگڑا مچی ہوئی تھی۔ لوگ چیخ چلا رہے تھے کچھ عورتیں دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھیں کچھ بچے بھی تھے جو بھاگ بھاگ کر پتہ نہیں کہاں کہاں چڑھ گئے تھے۔ یہی حال گراؤنڈ فلور کا بھی ہو اس گراؤنڈ فلور پر آ گیا لیکن وہ اب ہال میں بھی نہیں رکی تھی اور دروازے سے باہر نکل گئی تھی مختصر یہ کہ اس وقت جو کچھ ہوا تھا وہ ایک ناقابل یقین ساعلم معلوم ہوتا تھا جس کی صحیح تشریح میں بھی نہیں کر سکتا حقیقت مجھے معلوم تھی لیکن اس کے بعد مجھے غور کرنا تھا کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ ہوتا وہ میرے لئے بڑا عذاب ناک ہوتا۔

یقینی طور پر ہوٹل میں جو افراتفری پھیلی تھی اس سے اس شاندار ہوٹل کے نقصانات بھی ہونے تھے۔ اگر میں ساری صورتحال بتا دیتا تو میری گردن گرفت میں آسکتی تھی اور یہ معاملہ پولیس کی تحویل میں بھی جاسکتا تھا۔ اس لئے عقل سے کام لینا تھا میں جھکے جھکے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ باہر کی باتیں اندر ہو رہی تھیں وہ باہر نکلی تھی یقینی طور پر سڑک پر بھی کچھ حادثات ہوئے ہوں گے۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کچھ لوگ باہر بھی دوڑ گئے تھے اور اس کے بعد جب وہ اندر آئے تو ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ پتہ یہ چلا کہ اچھل کر ایک ٹرک پر چڑھ گئی تھی جو سیزھیماں سے لدا ہوا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کو نہیں معلوم تھا کہ پیچھے اس طرح کا کوئی فرد آ گیا ہے بہر حال اس طرح باہر زیادہ ہنگامہ نہیں ہو سکا تھا چونکہ وہ گم ہو گئی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ہوٹل کے منیجر اور دو سپرداڑز میرے پاس پہنچ گئے۔

”سر.....! آپ روم نمبر چار سو تیرہ کے مکین ہیں؟“ بھلا انکار کی کیا گنجائش تھی میں نے گردن ہلا دی تو منیجر کا موڈ بگڑ گیا وہ بولا۔

”آئیے آپ میرے آفس میں آئیے۔“

کہ میری بد نصیبی نے مجھے موت سے دور کر دیا ہے۔ آہ کاش میں آب حیات نہ پیتا۔ کاش امرت جل مجھے نزل پاتا تو اب تک کب کا مر کھپ گیا ہوتا اور مجھے رقابت کے یہ صدمے برداشت نہ کرنے پڑتے لیکن نصیب اسی کا نام ہے تم بھی زندہ ہو اور میں بھی زندہ ہوں۔ میں تمہیں چاہتا رہوں گا اور تم دوسروں کو چاہتی رہو گی۔ میں نے آخر کار ایک حل سوچ لیا جو چیز میں نے تمہارے اس نہانے کے پانی میں ڈالی ہے وہ تمہیں ایک ایسا لطف دے گی کہ یاد رکھو گی۔ تمہیں چاہئے والا کوئی بھی نہ ہو گا سوائے میرے اور پھر کوروتی جب تم نفرتوں سے تھک جاؤ اور یہ محسوس کر لو کہ تمہاری نفرت نے گوتم بھنسا لی کو کس طرح درد و کرب دیا ہو گا تو مجھے آواز دینا میں آ جاؤں گا میں تمہیں اس وقت بھی چاہوں گا تمہیں جب بھی آواز دو گی اور ایسا ہوا ہے کہ تم نے جب بھی مجھے پکارا ہے میں تم سے دور نہیں رہا۔ یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔

لیکن اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے ٹپ کا وہ کھولتا ہوا پانی اچانک ہی سرد ہو گیا ہو برف کی طرح سر پہلے گرم اور پھر سرد۔ میں نے اس بار پوری قوت سے ٹپ کے کنارے پکڑے اور باہر نکلنے کی کوشش کی اور اس بار میں کامیاب ہو گئی لیکن میرے بدن کو سخت سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب میں نے باہر پاؤں رکھا تو اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا گوشت ایک براؤن مادے کی شکل میں زمین پر بہنے لگا ہو۔ میں حیران ہو گئی بڑی مشکل سے میں چند قدم آگے بڑھی اور شفاف آئینے کے سامنے سے گزری آہ جو ہو رہا تھا تم نہیں سوچ سکتے ڈیٹان عالی! تم نہیں سوچ سکتے مجھے اپنا چہرہ اس طرح لگا جیسے کوئی کسی تصویر کو کھرج دیتا ہے۔ میرے چہرے پر جگہ جگہ دھبے پڑ رہے تھے اور آہستہ آہستہ میرا چہرہ بدلتا ہوتا جا رہا تھا میرے بال گچھوں کی شکل میں میرے سر پر سے اترنے لگے تھے بمشکل تمام میں نے اپنا تھوڑا سا چہرہ دیکھا اور میرے حلق سے ہمایا نک چیخ نکل گئی۔ میں نجانے کس طرح ہاتھ روم سے باہر آئی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے کبل اوڑھا اور یہاں بیٹھ گئی۔ یہ تمہارے آنے سے کچھ لمحے پہلے کی بات ہے گوتم بھنسا لی یہاں سے جا چکا ہے۔“

”اوہ میرے خدا! ذرا کبل نہ ہٹاؤ؟“ میں نے کہا۔

”نہیں نہیں میں اپنی صورت نہیں دیکھ سکتی نجانے کیا ہوا ہے نجانے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بولی لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کے بدن سے اس کا کبل گھسیٹ لیا۔

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں ایک ایسے حسین وجود کا جو کچھ لمحے پہلے اس قدر دلکش ہو کہ میرے ہوٹل کے قیام کے دوران بہت سے لوگوں نے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی صرف کوروتی کی وجہ سے۔ وہ انتہائی دلکش تھی اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے لیکن اس وقت میرے سامنے ایک ایسا وجود تھا جس کے چہرے پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی ناک غائب ہو گئی تھی آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھے تھے سر پر بالوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس قدر ہمایا نک وجود کہ انسان اسے دیکھ کر موت کی آغوش تک میں جاسکتا تھا پھر میری نگاہ اس کے جسم پر پڑی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جھوٹ بولوں تو ڈرامہ بازی ہوگی مشکل ہی سے یقین کیا جائے گا میرے بدن میں بھی سرولہریں دوڑنے لگی تھیں خوف کی سرولہریں اس کا چہرہ میری جانب اٹھا ہوا تھا اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”ڈیٹان عالی اوہ کھنٹ چال چل گیا۔ میں نہیں جانتی کہ اس نے کس دیوانگی کے عالم میں یہ کیا کیونکہ وہ تو دل سے میرا پرستار تھا میرے حسن کا دیوانہ لیکن میرا خیال ہے صدیوں کی تپسیا کے بعد بھی اسے کچھ نہیں مل سکا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ آہ یہ تو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کے پاس بھی علم تھا بڑے بڑے گمانیوں سے اس نے بہت کچھ دیکھا تھا اور اسے استعمال کر گیا لیکن دیکھو دیکھو کیا ہو گیا میرا دیکھو میرا کیا ہو گیا اس نے کہا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈرینگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئی میرے ہوش دحواس گم تھے میں اپنے سامنے ایک انسانی ڈھانچہ کو چلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ڈھانچے سوکھی

میں نے اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر لی تھی، میں جانتا تھا کہ فیجر میرے ساتھ سختی سے پیش آئے گا اور اس بارے میں سوالات کرے گا۔ چنانچہ میں اس کے شاندار آفس میں پہنچ کر تھکے تھکے سے اعزاز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا تمنا ہے لگایا ہے آپ نے یہ سب وہ انسانی ڈھانچہ کون تھا؟“

تب میں نے اپنے چہرے پر شدید غصے کے آثار پیدا کئے اور کہا۔ ”فیجر! میں پولیس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں؟“

”وہ تو ہم خود کر لیں گے، لیکن آپ بتائیے کیا ہوا تھا وہ آپ کے کمرے سے برآمد ہوا تھا؟ کون تھا وہ؟“

”یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”ایک آسیب زدہ کمرے میں آپ نے کسی مسافر کو ٹھہرانے کی جسارت کیسے کی؟ مجھے جانی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”بتاتا ہوں مطلب آپ کو، میں اس کمرے میں مسلسل خوف ناک کیفیتیں محسوس کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں مجھے یوں لگتا تھا جیسے کچھ پراسرار رو میں ادھر سے ادھر آ جا رہی ہوں۔ پہلے میں نے اسے ایک وہم قرار دیا اور اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ اگر میں یہ بات کسی کو بتاتا ہوں تو لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“

”وہ ایک آسیب زدہ کمرہ ہے فیجر صاحب اور وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کی مکمل ذمہ داری آپ پر ہے۔ جائیے اس کمرے میں جا کر دیکھئے وہاں ایک عجیب و غریب کیفیت ہے۔“

”کک..... کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب اندر جا کر دیکھئے، اٹھیے، چلئے میرے ساتھ۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

فیجر ان دونوں سپردانزروں کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ گیا، پھر وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتا ہوا اس کمرے میں آیا، لیکن وہ سیال مادہ جو شدید بدبودار تھا پڑے ہوئے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دونوں سپردانزروں میں سے ایک تو اپنا سینہ پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا، وہ غالباً دل کا مریض تھا۔ فیجر نے ادھر ادھر دیکھا پھر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”یہ..... یہ..... یہ..... یہ سب کچھ کیا اور کیسے ہوا؟“

”میں نے کہا تھا آپ یہ سوال مجھ سے کر رہے ہیں اپنے ہوٹل کے ذمہ دار آپ ہیں آپ کو پتہ ہے کہ یہاں لوگ اعتماد کے ساتھ آ کر ٹھہرتے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ پہلی بار ہوا ہو آپ کو علم ہو گا کہ آپ کے ہوٹل کا یہ کمرہ یا پورا ہوٹل ہی آسیب زدہ ہو۔“

”خ..... خدا کے لئے ایسی بات نہ کہیے یہ یہ..... سب کچھ کیا ہے یہ سب کچھ کیا ہے اے تو کیوں مر رہا ہے میری مدد کر رہا ہے یا دل پکڑ کر بیٹھ گیا ہے اپنا چل واپس جا۔“ فیجر سپردانز پر بگڑ گیا، لیکن سپردانز سے اٹھا نہیں جا رہا تھا اس نے دوسرے سپردانز سے کہا۔

”دوسروں کو بلا کر اس کو اٹھا کر کمرے میں پہنچاؤ، کیا مصیبت آگئی ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیے سر! میرے ساتھ آئیے۔“ فیجر کا لہجہ ایک دم سے نرم ہو گیا، غالباً وہ خوف زدہ ہو گیا تھا، پھر وہ اپنے آفس میں جانے کے بجائے برابر کے ایک خالی کمرے میں داخل ہو گیا۔

”م..... مجھے بتائیے، پلیز بتائیے۔“

”فیجر میں یہاں آیا تھا آنے کے بعد ظاہر ہے میرا یہاں قیام رہا، میری ایک دوست بیرون ملک سے آئی تھی اصل میں اسی کے لئے میں نے یہ کمرہ لیا تھا اور مجھے اس کے ساتھ ٹھہرنا بھی پڑا۔ وہ چلی گئی، لیکن میں یہ محسوس کرتا رہا کہ اس کمرے میں کوئی پراسراری کیفیت ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میرا مذاق اڑایا جائے گا، مجھے وہی سمجھا جائے گا اس لئے میں خاموش رہا۔ اب سے کچھ دیر پہلے جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہاں شدید بدبودار محسوس کی، مجھے یوں لگا جیسے غسل خانے میں کوئی نہار رہا ہے مجھے حیرت ہوئی، پھر جب میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو میرے خدا، میرے خدا..... میں نے اداکاری شروع کر دی۔“

”کک..... کیا..... کک..... کیا ہوا وہاں کوئی تھا؟“

”آپ وہاں جا کر دیکھ لیجئے۔“

”نن..... نہیں، م..... مجھے بتائیے آپ۔“

”وہاں واشنگ ٹب میں ایک عجیب سا مادہ پڑا ہوا ہے اور پورا غسل خانے اس مادے سے بھرا ہوا ہے۔“

”اودہ مائی گاڈ!“ فیجر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”میں باہر آیا تو میں نے اس انسانی ڈھانچے کو دیکھا اور میرے حواس گم ہو گئے، میں پتھرا سا گیا تھا، تبھی وہ ڈھانچہ دروازہ کھول کر باہر بھاگا اور اس کے بعد یہ سارا واقعہ پیش آیا۔“

”مائی گاڈ مائی گاڈ! آپ یقین کریں سر! یہ بالکل پہلی بار ہوا ہے اس ہوٹل کی زندگی میں پہلی بار ہوا ہے۔ لیکن لیکن یہ سب..... سر میں آپ سے ایک درخواست کروں۔“

”جی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کا رویہ بہت سخت تھا.....؟“

”اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری ایک درخواست ہے اس بات کو نہیں رہنے دیجئے، یہ بات منظر عام پر نہیں آنی چاہیے کہ وہ ڈھانچہ اس کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ سر ہمارا ہوٹل بدنام ہو جائے گا ہمارے ہوٹل میں پھر کوئی مسافر قیام نہیں کرے گا، ہم برباد ہو جائیں گے، لٹ جائیں گے ہم۔“

”مگر ابھی تو.....“

”م..... معافی چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ معافی چاہتا ہوں۔ خدا کے لئے آپ خاموشی اختیار کیجئے، خدا کے لئے بلکہ ایسا کریں آپ اب اس کمرے میں جائیں ہی نہیں یہاں جس کمرے میں چاہیں آپ قیام کر لیں۔“

”تھوکتا ہوں میں اس ہوٹل کے کمروں پر۔“

”ایسا نہ کہیے، پلیز! آپ کسی کو بھی یہ صورت حال نہ بتائیے گا، ہم ہر جانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ کا جو سامان اس کمرے میں موجود ہے اس کے لئے اطمینان رکھئے گا پوری احتیاط کے ساتھ آپ تک پہنچا دیا جائے گا۔“

”مگر میرے ساتھ جو ہوا ہے۔“

”خدا کے لئے آپ ہمیں معاف کر دیجئے، ہم پوری تحقیقات کرائیں گے کہ آخر یہ ایسا ہوا کیسے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی اتفاقیہ امر ہی ہو۔ کوئی ایسی پراسرار روح یہاں داخل ہوگئی ہو جس نے یہ تمام حرکتیں کی ہوں، لیکن اگر یہ بات منظر عام پر آگئی تو ہمارا ہوٹل دو کوڑی کا ہو کر رہ جائے گا۔“

میں نے آہستہ آہستہ اپنا رویہ نرم کیا، ظاہر ہے میں بھی بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا جبکہ میرے اپنے حواس بھی ٹھیک نہیں تھے۔ میری طبیعت متلا رہی تھی جو بدبودار سیال میں نے دیکھا تھا اس نے میرے ہوش و حواس خراب کر رکھے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا۔



بہر طور منبر میری خوشامدیں کرتا رہا، باہر ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ کہنا تھا، میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ منبر پہلے ہی باہر نکل گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے ہوٹل بھی چھوڑ دیا۔

مجھے کوئی پرسکون گوشہ درکار تھا جہاں بیٹھ کر میں کوروتی کے بارے میں سوچ سکتا اور یہ پرسکون گوشہ میرے گھر کے علاوہ کون سا ہو سکتا تھا، میں گھر واپس آ گیا۔ غیر متوقع طور پر ہوٹل کے ہنگامے سے جان چھوٹ گئی تھی، ورنہ نجانے کہاں کہاں گھسینا پڑتا خود کو۔ منبر تو ہوٹل کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا، پتہ نہیں بعد میں وہاں کیا ہوا، لیکن یہ ان کا معاملہ تھا، میں تو اپنے حواس قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت زیادہ بہادر بننا نہ تو ممکن ہے اور نہ آپ اس پر یقین کریں گے۔

جو واقعات گزرے تھے وہ بے حد بھیاں تک تھے، یہ الگ بات ہے کہ صدیوں پرانی ایسی شخصیتوں سے میرا واسطہ تھا جو کوئی اردو اخ خیبر نہیں تھیں، بلکہ جیتے جاگتے انسان تھے، دونوں کے دونوں اور انوکھی روایت جو صرف کہانیوں کی شکل میں آتی رہتی تھی، یعنی آب حیات، امرت، جل، چشمہ حیوان۔ اس سے متعلق سینکڑوں داستانیں میں نے پڑھی تھیں، بلکہ کچھ لکھی بھی تھیں، لیکن وہ صرف کہانیاں ہوتی تھیں۔ میری اپنی گھڑی ہوئی کہانیاں میں تو حیران رہ گیا تھا اس وقت جب میری ملاقات ایسے دو انسانوں سے ہوئی تھی جو چشمہ حیوان سے فیض یاب ہو چکے تھے اور زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے ان کے تاثرات بھی سنے تھے، خاص طور سے کوروتی کے، وہ کہتی تھی کہ امر رہنے کے فیصلے ٹھیک نہیں ہوتے اور نہ وہ خواہش اچھی ہوتی ہے کیونکہ قدرت نے ہر چیز فانی پیدا کی ہے اور یہ چشمہ حیوان وغیرہ اس کے معجزات ہیں۔

یقینی طور پر ہم قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس وقت جو کوئی بھی ہوگا فنا کے بعد زندگی کی منزل میں آئے گا۔ اپنے حساب کتاب کے لئے۔ اس سے تو کسی طرح انکار کیا ہی نہیں جاسکتا، اس وقت ایسے کسی وجود کا کیا ہوگا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن بہر حال یہ جو کچھ واقعات ہو رہے تھے، یہ ناقابل یقین تھے اور ہوش و حواس چھین لینے کے لئے کافی۔ میرے سارے بدن میں سناٹے دوڑ رہے تھے پھر میرے ذہن میں اپنی کتاب کا خیال آیا اور میرے دل کو ایک دکھ کا سا احساس ہوا۔

زندہ صدیاں تو نامکمل رہ گئی۔ کوروتی مجھے کہاں تک لے جاتی ہے، میری یہ کتاب کتنی طویل ہو سکتی ہے اس کا میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن کتاب یہاں پر ختم ہو جائے گی اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب کیا کروں، کیا ہونا چاہیے۔ گوتم بھنساالی بد معاش اپنا کام دکھا گیا تھا۔ اس نے کوروتی سے انتقام لے لیا تھا۔ سارے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ رات ہو گئی تھی طبیعت پر ایک بوجھ سا طاری تھا اور دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسی طرح بستر پر دراز ہو گیا۔ میری اولین کوشش تھی کہ مجھے نیند آجائے تاکہ اس ذہنی انتشار میں کچھ کی ہو جائے۔ نیند نے مہربانی کی اور آہستہ آہستہ میری پلکیں جڑ گئیں۔

پتہ نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ مجھے کچھ تحریک سی محسوس ہوئی، ایک لمحے تک تو نیم غنودہ ذہن کوئی کام نہ کر سکا، لیکن دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس لیٹا ہوا ہے، اس احساس کے تحت میں نے ہاتھ اپنے برابر رکھا تو ایک دم سے پورا بدن جھنجھٹا کر رہ گیا۔ وہ ہڈیاں تھیں، سوچی ہوئی انسانی پسلیاں جو میرے ہاتھ کی گرفت میں آئی تھیں اور ایک دم سے میرا ذہن جاگ گیا۔ مجھے کوروتی یاد آ گئی، میرے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک استخوانی پنجہ میرے سینے پر آ کر جم گیا۔ اتنا مضبوط اور زنی دباؤ تھا کہ میں اٹھ نہ سکا، تبھی کوروتی کی آواز سنائی دی۔

”مجھے دیوانگی کا شکار مت کرو، ڈیٹان عالی! لیٹے رہو اسی طرح میرے پاس جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے

سننے رہو، اگر تم نے مجھ سے اضطراب برتنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے میرا ذہن منتشر ہو جائے اور میں کچھ کر بیٹھوں۔“ اس کے الفاظ بڑے سخت تھے۔ ایسا لہجہ اس نے آج تک اختیار نہیں کیا تھا۔ پھر میرے سینے پر جو دباؤ تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے طاقت لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو شاید کامیاب نہ ہو سکوں۔ بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا، لیکن لیٹا رہا۔

”خود کو وہ مت ظاہر کرو جو مجھے دیوانہ کر دے، تم میرے محبوب ہو۔ میرے بہت اچھے دوست ہو۔ مجھ سے تعاون کرو۔ مجھ پر جو پتا پڑی ہے تمہاری وجہ سے پڑی ہے، تم اس طرح مجھ سے اجتناب کرو گے تو پھر میں کس کے سہارے آگے کا سفر طے کروں گی۔ تم ہی سے تو ساری باتیں کرنی ہیں۔“

میں نے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا کہ کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ اگر میں اس سے اجتناب برتوں گا تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور میں جانتا تھا کہ وہ جس روپ میں بھی ہے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گی اور اب جو کچھ ہو گا وہ میری کہانی میں نئے اضافے کا باعث ہوگا، یقینی طور پر اس کی قربت کا ایک ایک لمحہ میری کتاب کے صفحات میں اضافہ کرے گا چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے اس کے استخوانی پہنچے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے معاف کرنا کوروتی! میں صرف ایک انسان ہوں کوئی سپر ہیرو نہیں۔ واقعی تم سے اجتناب ممکن نہیں ہے، تم میری بہترین دوست ہو، میری ساتھی۔“ میں نے کہا اور اس نے میرے سینے پر سے ہاتھ اٹھا کر میری گردن میں حائل کر لیا، پھر اپنا رخ میری جانب کر کے اپنا چہرہ میرے چہرے سے منسلک کر دیا۔ زندہ صدیاں پڑھنے والے ساتھیو! مجھ پر ہنسو، دل ہی دل میں میرا مذاق اڑاؤ، ایک دوسرے سے میرے بارے میں باتیں کرو، کیونکہ تمہارا محبوب مصنف ڈیٹان عالی ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔

ایک سوکھے ہوئے ڈھانچے کا منہ میرے منہ سے مس ہو رہا تھا، اس کے ہونٹوں پر گوشت کا کوئی نشان نہیں تھا، لیکن اس کا دباؤ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہو رہا تھا، انسانی جذبات کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ میں نہیں تو تم اس کا اندازہ ضرور کر سکتے ہو، لیکن جو فیصلہ میں نے کیا تھا میں اس پر قائم تھا، میں نے اس سے اجتناب نہیں کیا اور ایک خوف ناک ڈھانچہ بری طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

وہ بڑی گرم جوشی کا اظہار کر رہی تھی، مجھ سے لپٹی ہوئی تھی، مجھے سمجھ رہی تھی اور میری ہوائی جارہی تھی، آہ، کبھی کبھی انسان کو غیر متوقع طور پر کیسے کیسے حالات سے گزرنا ہوتا ہے، بہر طور میں اس کی طرح پر جوش تو نہ ہو سکا، لیکن اس کے بعد میں نے اسے احساس نہ ہونے دیا کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی برا تصور ہے۔ وہ دیر تک اپنے جذبات کا مظاہرہ کرتی رہی اور اس کے بعد پرسکون ہو گئی۔

”آہ میں تمہاری شکر گزار ہوں، کوئی بھی اس کیفیت کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا، ڈیٹان عالی تم نے مجھے ایک سچے دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ باتیں کرو گے مجھ سے؟“

”ہاں کیوں نہیں کوروتی؟“

”وہ آیا تمہارے روپ میں آیا۔ اس لئے میں نے اس پر غور نہیں کیا کہ تمہیں تو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ کچھ غلطیاں میری بھی تھیں، لیکن تم خود سوچو کہ وہ غلطیاں غلطیاں نہیں تھیں، میں ہوٹل کے کمرے میں تھی ویڈیو زیادہ سے زیادہ اندر آ سکتا تھا۔ مجھے غسل خانے میں پا کر واپس چلا جاتا، اس لئے میں نے غسل خانے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا اور اگر بند بھی کر لیتی اور وہ بدبخت آنا چاہتا تو اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس نے بے شمار علوم سکھے ہیں۔ ہم نے اپنی طویل ترین صدیوں کی زندگی میں اور کیا ہی کیا ہے؟ تو وہ بند دروازے کھول سکتا

تھا، تمہارے روپ میں اندر آیا اور میں مسکرا دی کیونکہ تم تو میرے رو میں کے راز دار ہو پھر اس نے وہ شیشی کھول کر ہاتھ تک میں ڈالی تو میں نے یہی سمجھا کہ تم اس میں خوشبو ڈال کر محبت کا اظہار کر رہے ہو، لیکن وہ کچھ اور ہی کر کے آیا تھا، اس نے ایسا کس لئے کیا کہ میں تمہاری قربت میں تھی۔“

”یہاں ایک عتراض پیدا ہوتا ہے میری قربت میں تو تم تھیں، لیکن یہ لحاظ تو تمہاری زندگی میں صدیوں میں گزر چکے ہیں جیسا کہ بقول تمہارے اولاش، سکندر یا پھر نیوکی جیسے دوسرے۔“

”پاکل پن کی باتیں کر رہے ہو، بتا چکی ہوں تمہیں کہ وہ میں نہیں تھی بلکہ صدیوں کے گزرے کردار تھے۔ میں تو صرف ایک دیدہ ورتھی جو دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی اور وہی ساری باتیں میں نے تمہیں بتائیں، لیکن اب میں مجسم کوروتی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ تھی۔ وہ کوروتی جو گوتم بھنسا کی آرزو تھی۔ اس کی امید تھی یہ امید کوشاید کبھی کوئی ایسا لمحہ آجائے جب میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ پیدا ہو جائے وہ اسی لمحے کے انتظار میں تھا، لیکن تم نے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے بعد وہ مایوس ہو گیا۔“

”کوروتی مجھے ایک بات بتاؤ.....“ میں نے اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ بے شک ایک انسانی ڈھانچہ میرے نزدیک لینا ہوا تھا، لیکن وہ کوروتی تھی، کوئی اور نہیں تھا اور اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا، یہ بھی ایک انوکھا تجربہ تھا جو ایک مصنف کو ہی ہو سکتا ہے، سمجھ رہے ہیں نا آپ، بہت دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر کوروتی نے کہا۔

”آہ مجھے کبھی ایسی امید نہیں ہو سکتی تھی اس سے۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتا ہے، دیوانہ ہے میرا، میرے ساتھ وہ کوئی ایسا سلوک کرے گا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن ذیشان عالی میرا ساتھ دو مجھے پیار کرتے رہو، میں اسے ناکام بنانا چاہتی ہوں۔ میں اسے یہاں بھی تڑپانا چاہتی ہوں، ضبط سے کام لو، پلیز ضبط سے کام لو، مجھے ناکام نہ کر دو، میں نے یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا ہے ورنہ وہ کبھی میرے ساتھ ایسا نہ کرتا۔“

میرے ذہن میں بہت سے برے خیالات آئے تھے، لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا، خواہواہ اپنی مصیبت نہیں بلانا چاہتا تھا، البتہ میں نے اتنا ضرور کہا۔

”مگر مجھے ایک بات پر حیرت ہے کوروتی۔“

”کوئی بات پر؟“

”یہ سلوک وہ میرے ساتھ بھی تو کر سکتا تھا۔“

”نہیں کر سکتا تھا۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میں نے تمہیں اس کی کسی بھی گرفت سے محفوظ کر دیا ہے۔“

”کیسے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ایک عمل کے ذریعے ایک منتر کے ذریعے جو مجھے معلوم تھا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں نے تم سے پہلے بھی یہ بات کہی تھی جو شاید تمہارے ذہن سے نکل گئی۔“

”ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا۔“

”میں نے تمہیں محفوظ کر دیا تھا، لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ جھنجھلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

میں خاموش ہی رہا۔ ظاہر ہے میں خود اپنی کیا رائے دے سکتا تھا، لیکن یہ سن کر مجھے ذرا اسطینان ہوا تھا کہ گوتم بھنسا کی مجھ پر اس طرح کا کوئی وار نہیں کر سکتا۔ یہ بھی کوروتی کی مہربانی تھی۔ ورنہ میں بھلا اس کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے تو

یہ سب کچھ آتا ہی نہیں تھا، میں نے اس سے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ افتاد اس پر بھی پڑی تھی اور مجھ پر بھی، حالانکہ کبھی بات میں آپ کو بتاؤں، کوروتی مجھ سے بہت قریب آگئی تھی اور ایک ایسا کردار تھی جو میرے لئے بڑا انوکھا اور کافی سنسنی خیز تھا، اس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ ایک ایسی کہانی تھا جس پر اپنے آپ کو بھی یقین نہ آئے، جبکہ کہانی اپنے ساتھ چل رہی تھی، لیکن جو تھا وہ تھا، اب مجھے بھی سوچنا تھا اور کوروتی کو بھی۔

صبح تک وہ میرے ساتھ رہی اور جاگتی رہی، وہ بار بار یہ محسوس کرنا چاہتی تھی کہ میں اس سے منحرف تو نہیں ہو رہا۔ یہاں میرے دوستوں میں عورت کی اس فطرت کا تذکرہ کروں، کتنی ہی آگے بڑھ جائے کچھ بھی ہو جائے، لیکن عورت پن اس سے دور نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سارے وجود میں صرف عورت ہی رہتی ہے اور کوروتی بھی اس وقت دہشت کا شکار تھی۔ ظاہر ہے اس کی سوچیں کیسی عجیب عجیب ہوں گی، اسے صدیوں جینا تھا، وہ اپنی انتہا نہیں جانتی تھی، لیکن جس انداز میں وہ جینا چاہتی تھی وہ بالکل اس کی پسند کے مطابق ہونا چاہئے تھا اور اب جو کچھ ہو گیا تھا وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

دوسری صبح میں نیند کی وجہ سے چکرایا ہوا تھا۔ بھلا اس طرح کسی کو نیند آ سکتی ہے کہ اس کے برابر ایک استخوانی ڈھانچہ لینا ہوا ہو۔ اسے مخاطب کر رہا ہوں بار بار وہ مجھے اپنے آپ میں سمیٹ لیتی تھی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، بہت سی سوچیں دامن گیر ہو جاتی تھیں، قبر میں انسان کے جسم کا سارا گوشت گل جاتا ہے، ڈھانچے رہ جاتے ہیں جیسے کہ میں نے بہت سے دیکھے تھے، لیکن وہ قبر کی بات ہے، ایک زندہ انسان کسی ڈھانچے کے ساتھ کیسے گزارہ کر سکتا ہے، شکر ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا علم نہیں تھا جس سے وہ دل کے اندر کی بات جان لے اور اسے پڑھ لے۔ سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا، ابھی جھنپٹا پھیلا ہوا تھا کہ اس نے مجھے آواز دی۔

”عالی.....“

”ہاں کوروتی.....“ میں نے اپنے لہجے میں پیار گھولتے ہوئے کہا۔

”کیا سوچ رہے ہو میرے بارے میں؟“

”دکھی ہوں اور پریشان ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش میرے پاس ایسی قوتیں ہوتیں جو تمہیں تمہاری اصل شکل واپس لادیتیں۔“

”یہ سوچ رہے ہو تم؟“ اس کے لہجے میں خوشی کا عنصر تھا۔

”ہاں۔“

”آہ عالی! ہم پر یہ افتاد پڑی ہے، لیکن تم فکر مند نہ ہو، میں نے بھی اس سنسار میں بہت کچھ سیکھا ہے، کبھی سوچا نہیں تھا اس بارے میں کہ ایسا کوئی وقت آجائے تو کیا کروں گی۔ اصناکیہ کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے تاریخ کے ان بڑے کرداروں کی خواہش پر اصناکیہ کا وجود حاصل کیا تھا اور جو کچھ بھی ہوا تھا اصناکیہ کی تاریخ کے مطابق ہوا تھا۔ لیکن وہ طریقہ کار میں اب بھی اختیار کر سکتی ہوں اور عارضی طور پر بہت کچھ کر سکتی ہوں، لیکن میں کوروتی ہوں اور کوروتی ہی رہنا چاہتی ہوں، میں گوتم بھنسا کی کوستا بنانا چاہتی ہوں، اس کے ہر عمل کو ناکام کرنا میرے جیون کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ مجھے سوچنا پڑے گا۔ یہ غور کرنا پڑے گا کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ جو ہوا ہے اسے ختم کرنے کے لئے کیا کروں، یہ سوچنا پڑے گا مجھے اور تم مجھے اس کا سے دو۔“

”میں ہر طرح تمہارے لئے حاضر ہوں کوروتی..... فکر مند نہ ہو۔“

وہ چند لحاظ سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”مجھے ایسے کپڑے دو جو میں اپنے اس شریر پر پہن سکوں۔“

”میرے پاس مردانہ کپڑوں کے ایسے انبار ہیں۔“ میں نے کہا۔  
”نہیں مجھے ایک بڑی چادر دے دو۔“

”ہاں وہ ہے۔“ میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا، میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ نظر بھر کر اسے دیکھوں۔ الماری سے میں نے ایک چادر نکالی اور اس کی جانب بڑھادی۔ اس نے وہ چادر میرے ہاتھ سے لے کر اسے اوڑھ لیا، چہرہ تک ڈھک لیا پھر اس نے کہا۔

”میں آئینے کے سامنے نہیں جانا چاہتی انسان ہوں، زندہ ہوں، اپنی یہ حالت برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ابھی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میری دوسری کیفیات میں کیا فرق پڑے گا۔ جیسے کھانا پینا، ویسے میرے اندر کی خواہشات تو بالکل اسی طرح ہیں جس طرح میری پہلی شکل میں تھیں۔“

”تم زندہ ہو کوروتی اور میں جانتا ہوں کہ تم جتنی ذہن ہو بہت جلد تم اپنی اصل حیثیت میں واپس آ جاؤ گی۔“  
”بھگوان تمہارا کہا درست کرے۔ تمہارا یہ کہنا پورا ہو جائے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی، میں سمہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔

میرے خدا مجھے اب کیا کرنا ہوگا، اتنا اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ کوروتی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی بلکہ اب تو اور بھی بہت سے خیالات میرے دل میں آنے لگے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ زندہ صدیاں میری آخری کتاب ہو، اس کے بعد لکھنے لکھانے کا سلسلہ مجھے ترک کرنا پڑے کیونکہ کوروتی کی جان بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

اس وقت نجانے کیا کیا سوچیں دامن گیر تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آدھا گھنٹہ پوتا گھنٹہ گزر گیا کوروتی دروازے سے باہر نکل گئی تھی واپس نہیں آئی تو میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ پھر میں پورے گھر میں اسے تلاش کرتا رہا، لیکن وہ پراسرار طور پر چلی گئی تھی۔ وہ میرے گھر میں موجود نہیں تھی، ایک پریشانی سی ذہن میں پیدا ہو گئی تھی، مہر حال غسل خانے میں جا کر میں بہت اچھی طرح نہایا، بلکہ میں نے اپنے آپ کو خصوصی طور پر اتار گڑا کہ بعض جگہ بدن کے کچھ حصوں میں جلن ہونے لگی، پھر لباس پہن کر میں بیٹھ گیا۔

کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ حالانکہ بھوک لگ رہی تھی، لیکن طبیعت میں ایک کراہیت سی تھی۔ البتہ مجھے یہ کراہیت چھپانی تھی۔ کوروتی کو اس کا احساس نہیں ہونا چاہیے باقی تو اور کوئی بات نہیں تھی، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بد دل ہو کر میرا ہی تیا پانچہ کرنے پر تیار ہو جائے۔ آدھا دن چڑھ گیا۔ بھوک شدت اختیار کرنے لگی تو جگن میں جا کر کھانے پینے کی تیاریاں کیں۔ طبیعت پر ایک عجیب سی دہشت سوار تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، پورا دن گھر میں پڑے پڑے ہی گزرا، مجھے رات کا خوف تھا کہ کہیں رات میں اس کی واپسی نہ ہو جائے جو رات گزری تھی وہ تو بڑی عجیب گزری تھی اس کے اثرات ابھی تک ذہن پر طاری تھے۔ دن میں سونے کی کوشش نہیں کی تھی، لیکن بس سرشام ہی نیند سی آرہی تھی۔ تھوڑا بہت کھایا پیا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بہت دیر تک اس وحشت کا شکار رہا کہ دیکھیں کب اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، پھر نجانے کب نیند آگئی اور پھر صبح ہی کو جاگا تھا۔

ایک خوشی کا سا احساس ہوا وہ رات کو بھی واپس نہیں آئی تھی اور یہ بات ذرا عجیب سی تھی۔ خدا کرے اب اس کی واپسی نہ ہو، زندہ صدیاں کا واسطہ اب تو میں کر ہی لوں گا، لیکن وہ بھیا تک وجود کہیں میرے اوپر مسلط ہی نہ ہو جائے وہ دن بھی گزر گیا، رات بھی چلی گئی، پھر اس طرح تقریباً تین یا چار دن گزر گئے تو مجھے ذہنی سکون نصیب ہوا، وہ کہیں چلی گئی تھی اور ہو سکتا ہے اب وہ واپس نہ آئے، آہ کاش ایسا ہی ہو، لیکن ابھی اور کچھ دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اس دن بھی وہ مجھے بتائے بغیر چلی گئی تھی، پھر شاید ساتواں یا آٹھواں دن تھا کہ میرے اپنے ہی دل میں کچھ خیال

آیا۔ میں نے سوچا کہ ذرا اس پراسرار عمارت میں جا کر تو دیکھوں جہاں وہ پراسرار کتاب موجود ہے، اندازہ لگاؤں کہ اب وہاں کی کیا کیفیت ہے، ویسے بھی ایک اور خیال دل میں تھا۔ اگر وہ وہاں ہے تو یہ ضرور سوچے گی کہ میں نے اس طرف رخ نہیں کیا، کیا میں اس سے منحرف ہو رہا ہوں جب تک کہ اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ مجھ سے کہیں بہت دور چلی گئی ہے۔ مجھے آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے کہ کہیں میرے لئے مصیبت ہی نہ بن جائے، ویسے اس دوران گوتم بھنسا لی کا بھی نام نشان نہیں تھا۔

آخر کار اپنے پروگرام کے مطابق میں اس کوٹھی کی جانب چل پڑا جہاں وہ کتاب موجود تھی اور جو پراسرار عمارت کوروتی کی ملکیت تھی۔ عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ انتہائی ہولناک ویرانی برس رہی تھی اس پر حالانکہ پہلے بھی یہ عمارت ویران ہی ہوتی تھی، لیکن اس وقت کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا، ہو سکتا ہے یہ احساس میرے دل کے اندر ہو، آہستہ آہستہ چلتا ہوا انداز داخل ہو گیا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ پراسرار نگاہیں میرا جائزہ لے رہی ہوں، ہو سکتا ہے کوروتی نے اپنے آپ کو یہاں پوشیدہ کر لیا ہو سکتا ہے وہ یہ جائزہ لے رہی ہو کہ میں یہاں کس مقصد کے تحت آیا ہوں۔ میں کوٹھی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا اور آخر کار وہاں پہنچ گیا جہاں وہ کتاب موجود تھی، پتھر کی کتاب جس میں صدیاں زندہ تھیں، نجانے کتنی صدیاں، لیکن میں نے ان سیزھیوں کو عبور کر کے کتاب تک جانے کی کوشش نہیں کی۔ اب اس قدر بھی احمق نہیں تھا۔ پہلے تو کوروتی صحیح سالم حالت میں موجود تھی، اگر میں کسی دور میں چلا جاتا اور وہاں کسی بڑی مشکل کا شکار ہو جاتا تو کوروتی مجھے اس مشکل سے نکال سکتی تھی، لیکن اب اگر میں نے یہ احمقانہ کوشش کی اور کتاب تک گیا تو کہیں یوں نہ ہو کہ میں تاریخ کے کسی ورق میں قید ہو کر رہ جاؤں اور وہیں فنا ہو جاؤں۔ نا بابا نا، اتنا بڑا مصنف نہیں بننا چاہتا تھا چنانچہ وہاں سے واپس پلٹ پڑا، کوروتی اپنی کوٹھی میں بھی موجود نہیں تھی۔ ظاہر ہے اعصابی کیفیت بہتر نہیں تھی۔

پھر چھ سات دن مزید گزرے۔ غالباً آٹھواں دن تھا جب بالکل ہی اتفاقی طور پر ایک تین چاروں پہلے کے اخبار پر نظر پڑ گئی، مجھے اخبارات پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن بس وہ اخبار مل گیا تھا اور اس میں ایک الومگی کہانی درج تھی۔ یہ کہانی ایک ڈاکٹر احسان علی کی کہانی تھی اور بڑے بڑے جلی الفاظ میں چھپی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنے کلینک میں موجود تھا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور موسم بہتر نہیں تھا، آخری مریض اس سے معائنہ کرا کے گیا تھا کہ اس کے اردلی نے بتایا کہ ایک خاتون اس سے ملنا چاہتی ہے۔

”ہوں بھیج دو۔“ ڈاکٹر نے حسب عادت کہا اور اس کا اردلی ذرا جھجکتا ہوا سا کھڑا رہ گیا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“

”کچھ پراسرار سی عورت ہے جناب آواز بہت خوبصورت ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو ایک موٹے ٹھیکس میں ڈھک رکھا ہے، کہیں جزام کی مریض نہ ہو۔“

”تم اس کا چہرہ کھلو کر دیکھو۔ اس سے کہو کہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ مریض کو دیکھنے کے بعد اندر بھیجا جائے۔“

”کہا تھا صاحب میں نے نہیں مانی۔“ اردلی نے کہا۔

”خیر چلو بھیجو۔“ ڈاکٹر نے کہا اور وہ پراسرار وجود اس کے کمرے میں داخل ہو گیا، ڈاکٹر کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بی بی اپنا چہرہ کھولو اس طرح کیوں ڈھک رکھا ہے، کیا تکلیف ہے تمہیں؟“

”ڈاکٹر اگر اجازت ہو تو میں دروازہ بند کر دوں۔“

”کک..... کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ دروازہ کیوں بند کرنا چاہتی ہو؟“

”ڈاکٹر صاحب میں اپنا معائنہ کرانا چاہتی ہوں۔“

”تو اس کے لئے دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تکلیف ہے تمہیں اور یہ تم نے اس طرح اپنے آپ کو ڈھک رکھا ہے آخر تم ہو کون اور کیا چاہتی ہو؟“ ڈاکٹر نے کہا۔

عورت کچھ لمحے خاموش رہی پھر اس نے اپنے چہرے پر سے کھس ہٹا دیا اور ڈاکٹر اچھل پڑا وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا جو بول رہا تھا باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کچھ لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا اسے کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ احساس ہوتا کہ یہ سب کچھ نظر کا فریب ہے جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ اصلیت نہیں ہے وہ اصلیت ہی دیکھ رہا تھا یہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا۔

”مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر میں تو خود زندگی کے بدترین عذاب سے گزر رہی ہوں۔ ڈاکٹر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم کا سارا گوشت گل کر بدن سے جدا ہو گیا ہے، لیکن میں مردہ نہیں ہوں۔ میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ تم میرا علاج کرو میں تم سے دروازہ بند کرنے کے لئے اس لئے کہہ رہی تھی کہ کہیں کوئی آنہ جائے۔“

ڈاکٹر کے منہ سے شروع میں تو کوئی آواز نہ نکلی، لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”ت..... تم..... کیا تم..... کیا کوئی ارواح بد ہو؟“

”میں نے تم سے کہا تھا ڈاکٹر قصور تمہارا نہیں ہے ورنہ ان الفاظ کا جواب دیتی جو تمہاری طبیعت خوش کر دیتا میں نہ ارواح بد ہوں نہ ارواح نیک۔ میں ایک زندہ حقیقت ہوں زندہ وجود ہوں ایک ایسے کیمیکل کی وجہ سے میری یہ کیفیت ہو گئی ہے جو جسم کو گھلا دیتا ہے ڈاکٹر میرا ٹھیک سے معائنہ کرو مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے مجھے میری اصلیت وائس دلا دی تو میں تمہیں اتنی دولت دوں گی کہ تم اپنا ایک ہسپتال بنا سکتے ہو۔ ایک ایسا اعلیٰ ہسپتال جسے دنیا دیکھتی رہ جائے۔“

ڈاکٹر بے شکل تمام خود کو سنبھالے ہوئے تھا اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ ایسا کون سا عمل ہو سکتا ہے جس سے تمہاری یہ کیفیت ہو گئی ہو، لیکن اگر تم کہتی ہو تو میں تمہارا معائنہ کر لیتا ہوں جاؤ اس ٹیبل پر لیٹ جاؤ۔“ ڈاکٹر نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کسی بھی طرح اپنے اردلی کو یا کسی اور کو بلانا چاہتا تھا تا کہ اس کی کچھ مدد ہو جائے، لیکن عورت نے اس کی نیت کو بھانپ لیا اور بولی۔

”سنو ڈاکٹر! میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے دیوانگی پر آمادہ مت کرو میرا معائنہ کرو۔“ یہ کہہ کر وہ ٹیبل پر جا لیٹی وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا سو فیصدی انسانی ڈھانچہ ڈاکٹر ٹیبل کے پاس پہنچ گیا۔ اسے موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کسی کو بلانے کے لئے ٹیبل ہی بجادے۔ بس اس کے دل میں یہ آرزو تھی کہ اردلی اندر آ جائے اور یہ صورت حال دیکھ لے چنانچہ وہ میز کے پاس پہنچ گیا، انسانی ڈھانچہ مکمل تھا حیرت کی بات تھی کہ اس کے تمام گوشت کے اعضا پگھل چکے تھے اندرونی نظام میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو نظام کو متحرک رکھتی ہیں لیکن صرف جھلی اور رگوں کی شکل میں۔ یہ دنیا کا سب سے حیرت انگیز وجود تھا جسے دیکھ کر یقین نہ آئے کہ اس میں زندگی کی کوئی رقی باقی ہوگی، لیکن وہ ایک زندہ وجود ہی لگ رہی تھی صرف آواز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ باقی اس کی شناخت دوسرے طریقوں سے ذرا مشکل ہی سے ہو سکتی تھی یہ ایک ڈاکٹر ہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ ایک عورت کا ڈھانچہ ہے۔ ڈاکٹر نے اب خود کو سنبھال لیا تھا اس نے کہا۔

”لیکن تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟“

”میں اپنے کمرے میں واش روم میں باہر تک ٹب میں لیٹی نہا رہی تھی کہ میرے ڈمن نے کوئی کیمیکل اس پانی میں

ڈال دیا جس میں میں نہا رہی تھی بس اس سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ میرے جسم کا سارا گوشت گل کر گاڑھے سیال مادے کی شکل میں زمین پر بہہ گیا، ایک بدبودار مادہ اور میں ایک ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔ ڈاکٹر مجھے ٹھیک کر دو، میرے لیے وہ سب کچھ کرو جو تم اپنی ماہرانہ مہارت سے کر سکتے ہو تم جانتے ہو کہ میرا علاج کس طرح سے ہو سکتا ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”دیکھو میں تو ایسے افراد کا علاج جانتا ہوں جو گوشت پوست رکھتے ہیں ایسا کوئی پر اسرار عمل میرے لئے ممکن نہیں ہے، البتہ میں تمہیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا پتہ بتاتا ہوں جو بڑی مہارت رکھتے ہیں اور تمہارے کام آ سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اسے ایک پتہ بتایا۔ اس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس کی میز پر پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی یعنی پانچ لاکھ روپے رکھ دیئے اور وہ چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر سخت دہشت زدہ تھا اس کے بعد اس نے پولیس سے رابطہ قائم کیا اور پولیس کو تمام تر رپورٹ دی۔

یہ کہانی دوسروں کے لئے ممکن ہے کوئی کہانی ہو، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کوئی جھوٹی کہانی نہیں ہے۔ یہ اخبار جس میں یہ واقعہ چھپا تھا کئی دن پہلے کا تھا، میں نے اس کے بعد بازار جا کر دوسرے اخبارات تلاش کئے جو اس کے بعد کے تھے اور ان میں بھی مجھے اس کہانی کا بقیہ حاصل کیا، پولیس نے اس ہوٹل کے اسٹاف سے چھان بین کی تھی جس میں تھوڑے ہی عرصے پہلے ایک ایسا حادثہ ہوا تھا، ایک کمرے سے ایک ڈھانچہ نکل کر باہر آیا تھا اور ہوٹل میں کافی افراتفری مچ گئی تھی۔ انہی میں کچھ لوگوں نے پولیس کو اس سلسلے میں اطلاعات دی تھیں اور پولیس نے تحقیقات شروع کر دی تھی۔ بعد کے اخبارات میں کوئی خبر نہیں تھی لیکن مجھے ایک دم سے خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں میری شامت نہ آ جائے، میری تلاش نہ شروع ہو جائے کیونکہ ہوٹل میں میں ہی ٹھہرا تھا اور وہاں کے ریکارڈ میں میرا نام لازمی طور پر ہوگا۔

مجھے تو اب تک یہ حیرت تھی کہ ہوٹل والوں نے میرے بارے میں پولیس کو معلومات کیوں نہیں فراہم کی تھیں، میں نے آج تک کے اخبارات دیکھے بعد میں اس بارے میں اور کوئی کہانی نہیں تھی، صرف اخبار میں ایک جھوٹی سی خبر لگی تھی کہ ڈاکٹر نے جس بڑے ڈاکٹر کا پتہ بتایا تھا وہ ڈاکٹر غائب ہو گیا تھا۔ غالباً اس خبر کے بعد وہ خوف زدہ ہو کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ بے شک یہ ایک دلچسپ خبر تھی لیکن میرے لئے سخت باعث تشویش۔ میں نے دل میں سوچا کہ پولیس بہر طور واقعہ کو نظر انداز نہیں کرے گی اور اس کی چھان بین کرتی ہوئی آخر کار میرے پاس پہنچ جائے گی، میں اسے کیا بتاؤں گا کتنی انوکھی کہانی ہوگی یہ۔ یہ کہانی وقت سے پہلے منظر عام پر نہیں آئی چاہئے۔

مجھے حالات کا انتظار کرنا چاہیے کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، میری اپنی کتاب بے حد قیمتی تھی چنانچہ میں نے مصلحت سے کام لیا، فوراً ہی میں نے اپنے کچھ لباس اور ایسی دوسری چیزیں جو میری ضرورت کی چیزیں تھیں ساتھ لیں اور اس کے بعد زندہ صدیوں کا مسودہ جو میرے لئے انتہائی اہمیت کا حامل تھا اپنے پاس محفوظ کیا اور اپنی رہائش گاہ سے باہر نکل آیا، مجھے اپنے لئے ایک ٹھکانہ درکار تھا، یہ ٹھکانہ کوروتی کی وہ دیران کوشی بھی ہو سکتی تھی، لیکن سچی بات یہ ہے کہ تھا تو میں بھی انسان ہی، خوف کا بے پیرا میرے اندر بھی تھا۔

میں تو یہ بھی سوچ رہا تھا کہ گوتم بھنسا لی کوروتی کو نقصان پہنچانے کے بعد ضرور میرے بارے میں کچھ سوچے گا۔ بے شک کوروتی نے جیسا کہ اس نے مجھے بتایا میرے گرد منتروں کا حصار قائم کر دیا تھا، لیکن گوتم بھنسا لی وہ تھا جس نے کوروتی کے منتروں کو ٹیل کر کے آخر کار اسے ایک ایسے عذاب میں گرفتار کر دیا تھا جس سے پتہ نہیں اسے کبھی نجات ملے گی بھی یا نہیں، چنانچہ وہاں جانا بالکل مناسب نہیں تھا۔ شہر میں ہوٹلوں کی کمی نہیں تھی، میں ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں محدود ہو گیا تھا۔ بس تھوڑے وقت کے لئے باہر نکلتا تھا اخبارات وغیرہ خریدتا اور ان کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور پھر ہوٹل

میں منتقل ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنی کتاب کا مسودہ بھی لکھنا بند کر دیا تھا، کہانی کس طرح آگے بڑھاؤں بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی، بس انتظار کر رہا تھا کہ وقت اپنے راستے تبدیل کرے تو ہوسکتا ہے مجھے کچھ مل جائے۔

پھر ایک صبح اخبارات نے ایک بھیا تک انکشاف کیا، یہ شہر کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل کی کہانی تھی، لیکن اس کہانی نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ کے اسٹنٹ نے ساری تفصیل بتائی تھی اس نے کہا کہ ایک دن پہلے ڈاکٹر قیصر شاہ سے کسی نے ٹیلی فون پر اپائنٹمنٹ لیا اور اس کو بتایا کہ وہ ایک ایسی مریضہ ہے جو ایک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ ڈاکٹر قیصر شاہ سے معائنہ کرانا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ نے اسے ٹائم دے دیا، مقررہ وقت پر جو شخصیت ڈاکٹر قیصر شاہ کے پاس آئی تھی وہ ایک انتہائی فیشن ایبل برقعے میں لبوس تھی، لیکن اس نے اپنا چہرہ ڈھکا ہوا تھا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اسے مقررہ وقت پر طلب کر لیا۔ قیصر شاہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے کلینک کے ٹیسٹ میں مریضوں کا معائنہ کرتا ہے اس وقت مکمل خاموشی ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کا صرف ایک اسٹنٹ جس کا نام فرید بیگ ہے ہوتا ہے ڈاکٹر قیصر شاہ کی نرس کو اپنے ساتھ نہیں رکھتا فرید بیگ ہی اس کو اسٹنٹ کرتا ہے۔

برقعہ پوش خاتون کو ٹیسٹ میں پہنچا دیا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ برقعہ اتار دے لیکن اس نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ آجائیں تب وہ برقعہ اتارے گی۔ بہر حال اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر قیصر شاہ اندر آئے تو اسٹنٹ فرید بیگ نے دروازہ بند کر دیا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اس سے کہا کہ میڈم آپ کوئی دقیقہ تو معلوم ہوتی ہیں مجھے بتائیے کہ برقعے میں آپ کا معائنہ کیسے کر سکوں گا اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کو تکلیف کیا ہے جواب میں برقعہ پوش خاتون نے کہا کہ ڈاکٹر میرے بدن کا سارا گوشت گل گیا ہے اسے کسی کیمیکل کے ذریعے گلا دیا گیا ہے آپ کو میرا علاج کرنا ہے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ نے ہنس کر کہا اگر آپ کا گوشت گل گیا ہے تو اس کا مقصد ہے کہ آپ کو ڈھانچے کی شکل میں ہونا چاہئے تو خاتون نے اپنا برقعہ اتار دیا تو اسٹنٹ اور ڈاکٹر قیصر شاہ یہ دیکھ کر دوگ رہ گئے کہ وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا۔ مکمل انسانی ڈھانچہ اسٹنٹ نے تو یہی سمجھا تھا کہ کوئی بدروح انہیں تنگ کرنے کے لئے آگئی ہے، لیکن ڈاکٹر قیصر شاہ عورت کو بغور دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

”آپ اس بیڈ پر لیٹ جائیے۔“

عورت لیٹ گئی تو ڈاکٹر قیصر شاہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ البتہ فرید بیگ کی حالت کچھ بگڑی گئی تھی وہ اس عجیب و غریب وجود کو دیکھ رہا تھا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اس سے کہا۔

”آپ کا کہنا ہے کہ آپ ایک زندہ وجود ہیں؟“

”جی ڈاکٹر، ایک لوکھا وجود جس کے بارے میں تفصیل جاننا آپ کے لئے ضروری نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ کچھ عرصہ قبل میں ایک گوشت پوست کی عورت تھی لوگوں کا خیال ہے کہ میں شکل و صورت کی بھی اچھی تھی۔ میرے ایک دشمن نے جو مجھ سے محبت کرتا تھا اور مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا رقابت میں آ کر مجھے اس وقت جبکہ میں غسل کر رہی تھی کسی ایسے کیمیکل سے نہلا دیا جس کی وجہ سے میرے جسم کا سارا گوشت ایک سیال مادے کی شکل میں بہہ گیا اور میں صرف ایک ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔ ڈاکٹر میرے کھانے پینے کا سارا سسٹم ختم ہو چکا ہے میں باقی تمام حیات سے آشنا ہوں، لیکن میرا بدن مجھ سے جدا ہو گیا ہے مجھے بھوک نہیں لگتی لیکن میرے جسم کی توانائی برقرار ہے میرے اس ڈھانچے میں مکمل طور پر طاقت ہے اور میں وزنی سے وزنی چیز اٹھا بھی سکتی ہوں چل پھر بھی سکتی ہوں دوڑ بھی سکتی ہوں ڈاکٹر مجھے ٹھیک کر دیجئے، آپ یوں سمجھ لیجئے میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے آپ جو مانگیں گے میں دوں گی۔“

ڈاکٹر قیصر شاہ کی اندرونی کیفیات کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا، لیکن اسٹنٹ نے بتایا کہ اس کی حالت

بے پناہ خراب تھی اور وہ وہاں سے ہر قیمت پر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ بالکل اتفاقیہ امر ہے کہ ہمارے اس ٹیسٹ میں جو واش روم بنایا گیا تھا اس کے دو دروازے تھے ایک اس طرف سے اور دوسرا ایک راہداری میں کھلتا تھا راہداری کے اختتام پر زینہ تھا جہاں سے اوپر جایا جاسکتا تھا۔ فرید بیگ کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی، ڈاکٹر اس عورت کا معائنہ کر رہا تھا کہ فرید بیگ نے کہا۔

”سر میں ابھی حاضر ہوا۔“ یہ کہہ کر وہ واش روم کی جانب چل پڑا اور اس کے بعد دوسرے دروازے سے باہر نکل کر اس نے راہداری میں دوڑ لگائی اور اوپر پہنچ گیا، اوپر چند افراد موجود تھے اس نے ریسپنڈنٹ کو صورتحال بتائی اور کہا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ خطرے میں ہے، ایک انوکھا وجود ان کے پاس ایک انوکھی کہانی لے کر آیا ہے۔ ریسپنڈنٹ کو اس برقع پوش عورت کے بارے میں علم تھا جو وہاں گئی تھی اس نے اسٹاف کے چند افراد کو جمع کیا اور وہ اصل راستے سے جہاں سے ڈاکٹر قیصر شاہ اندر داخل ہوا تھا ڈاکٹر قیصر شاہ کے اس معائنہ والے کمرے میں داخل ہوئے جس کا دروازہ بے شک اندر سے بند کر دیا گیا تھا لیکن وہ باہر سے کھولا جاسکتا تھا وہ اندر پہنچے تو آپریشن روم میں معمول کے مطابق تیز روشنی ہو رہی تھی، لیکن اس بیڈ کے قریب ڈاکٹر قیصر شاہ مردہ پڑا ہوا تھا اور عورت غائب تھی اس کا برقع بھی موجود نہیں تھا جو اس نے معائنہ کے وقت اتار کر رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ دوڑتے ہوئے ڈاکٹر قیصر شاہ کے پاس پہنچے۔ اسٹنٹ فرید بیگ کا خیال تھا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ بے ہوش ہو گیا ہے، لیکن جب انہوں نے جھک کر دیکھا تو ڈاکٹر قیصر شاہ ہلاک ہو چکا تھا اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا گیا تھا، وہ لوگ واش روم کی جانب دوڑے تو واش روم کا دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا اس کا مقصد ہے کہ اس انسانی ڈھانچے نے اسی واش روم کے ذریعے راہ فرار اختیار کی تھی۔ ایک ہلچل مچ گئی تھی۔

بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس طرح کے ایک انسانی ڈھانچے نے ایک اور ڈاکٹر سے رابطہ کیا تھا جنہوں نے ڈاکٹر قیصر شاہ کا پتہ بتایا تھا۔ ان سے معلومات حاصل کی جا رہی ہے میں یہ روح فرسا داستان پڑھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ میری شناخت نے مجھے آواز دی ہے اب میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے اور میرا اندازہ زبردست لگلا۔

دوسرے ہی دن کے اخبارات میں میرے بارے میں تفصیل شائع ہوئی تھی۔ چونکہ بات ایک بہت نامور اور بڑے ڈاکٹر کے قتل کی تھی۔ اس لئے پولیس نے باقاعدہ اس سلسلے میں تحقیقات کا آغاز کیا تھا اور چونکہ ایک ایسے انسانی ڈھانچے کو سب سے پہلی بار ایک فائبراسٹار ہوٹل میں دیکھا گیا تھا جو ایک کمرے سے نکل کر بھاگا تھا اور اس کے بعد سبزی کے ایک ٹرک پر چڑھ کر وہاں سے رفوچکر ہو گیا تھا۔

جس کمرے سے نکل کر وہ بھاگا تھا وہ ڈیٹان عالی نامی ایک مشہور مصنف نے حاصل کیا تھا جو عام طور سے تاریخی داستانیں لکھتا کرتا تھا۔ اس کے کچھ پر اسرار ناول بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔ ڈیٹان عالی کے بارے میں تحقیقات کر کے پولیس ان پبلشرز تک پہنچی جو اس کی کتابیں وغیرہ چھاپتے تھے۔ وہاں سے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوا وہ اپنے گھر میں موجود نہیں ہے۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ اس دن سے گھر واپس ہی نہیں آیا۔ پولیس کو ڈیٹان عالی کی تلاش ہے تاکہ وہ اس پر اسرار انسانی ڈھانچے پر کچھ روشنی ڈال سکے۔ میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا، مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں ایک بہت بڑے جھجھال میں پھنس گیا ہوں جو مجھے پتہ نہیں کہاں سے کہاں تک لے جائے گا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور میں بری طرح سہم گیا تھا۔ اب کیا کروں، ظاہر ہے میری بے شمار تصاویر میری کتابوں وغیرہ پر شائع ہو چکی تھیں اور پھر اگر پولیس میرے گھر تک پہنچ گئی ہے تو وہاں پر بھی اسے ایسے کئی الم پلیس گے جن میں میری تصویریں موجود ہیں۔ گویا مجھے اشتہاری قرار دے دیا جائے گا۔ کیا کروں ایک ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود کو باقاعدہ پولیس اسٹیشن میں



پیش کردوں اور سارا واقعہ ان کے گوش گزار کردوں۔ لیکن کیا اس پر یقین کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ کوشی اور اس میں موجود پتھر کی کتاب میرے بیان کی تصدیق کرے گی میں دل ہی دل میں ہنس پڑا اگر تصدیق کنندگان کو میں اس کتاب کے ذریعے ماضی کے کسی دور میں لے جاؤں تو مزہ ہی آجائے گا وہ بھی کیا یاد کرے گا۔

چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دی۔ ساری باتیں مذاق میں سوچنا اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صورت حال بے حد سنگین ہو گئی تھی اور مجھے اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا، لیکن ابھی کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ پہلا قدم کیا اٹھاؤں؟ آیا پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے آپ کو ظاہر کردوں یا پھر روپوش ہونے کی کوشش کروں؟ میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہا حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں تھی میں باقاعدہ کمرے سے باہر نکل کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بھی پہنچ جاتا تھا کھانا وغیرہ وہاں کھاتا تھا، لیکن اب میں ایک دم محتاط ہو گیا تھا۔ رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں طلب کیا اور اس وقت رات کے تقریباً پونے گیارہ بجے تھے جب میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میں ایک دم سہم کر رہ گیا۔ ویٹر تھوڑی دیر پہلے ہی برتن وغیرہ لے کر گیا تھا اور میں نے اس سے کوئی چیز طلب نہیں کی تھی۔ یہ دستک یقینی طور پر کوئی پراسرار حیثیت رکھتی تھی دروازہ کھلا ہی ہوا تھا دوسری بار دستک دی گئی اور اس کے بعد کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں مدہم روشنی ہو رہی تھی، لیکن اتنی کہ میں آنے والے کو دیکھ سکوں وہ کوروتی ہی تھی۔ ایک بڑی چادر میں لپیٹی ہوئی پراسرار انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ میں دہشت زدہ ہو کر اٹھ بیٹھا وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تب اس کی آواز ابھری۔

”ذیشان عالی!“

”کوروتی.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں کرو گے؟“

”ہاں کیوں نہیں.....“ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

اس نے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی کس قدر بھیانک لگ رہی تھی اسے دیکھ کر میرے بدن میں سرد لرزیں دوڑ رہی تھیں وہ خاموشی سے اسی طرح بیٹھی رہی پھر اس نے کہا۔

”ذیشان عالی! انسان ابتداء ہی سے خود غرض اور بے رحم رہا ہے۔ اس نے کبھی کسی اقدار کی پرواہ نہیں کی میں اس وقت تمہارے بارے میں بات کر رہی ہوں کتنا خوبصورت وقت گزارا ہے ہم دونوں نے ایک ساتھ ذیشان عالی! میری زندگی کو تو صدیاں گزر چکی ہیں اور یہ گوتم بھنساں ہمیشہ ہی میرا تعاقب کرتا رہا ہے وہ اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ ہو سکتا ہے کسی دور میں آکر میرے دل میں اس کے لئے محبت پیدا ہو جائے۔ اس نے کبھی میرے لئے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو میرے وجود کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ دیے بھی میں نے تمہیں بتایا کہ اس نے بے شمار علوم ضرور سیکھے ہیں، لیکن وہ مجھ سے زیادہ ذہین نہیں ہے اپنے پراسرار علوم میں اس سے کہیں آگے رہی، لیکن جاننے ہو چکی بار اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟“ وہ سوالیہ انداز میں خاموش رہی اور جب میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگی۔

”صرف اس لئے کہ پہلی بار میرے دل میں کسی کے لئے پریم پیدا ہوا ہے اور جس کے لئے میرے دل میں پریم پیدا ہوا ہے وہ تم ہو ذیشان عالی! میں تمہیں بالکل سچ بتا رہی ہوں تم کئی جگہ رقابت کا شکار ہوئے تمہیں یہ احساس ہوا کہ میرا بدن کسی اور کے تصرف میں آیا ہے میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے، لیکن میں نے پورے اعتماد سے تمہیں سمجھایا کہ وہ میں نہیں تھی وہ تاریخ کا ایک کردار تھا اور جو کچھ ہوا اس کے ساتھ ہی ہوا میں تو صرف ایک راہ گزر تھی۔ ایک سڑک تھی میں

جس پر سے تاریخ گزرتی چلی گئی اور تم بھی تو وہ نہیں تھے جو تم تھے مجھے بتاؤ ماضی کے کسی دور میں تم نے کسی کو اتنی قربت میں پایا کہ تم محسوس کر سکو کہ تم تاریخ میں اصل حیثیت سے ہو؟“

وہ پھر سوالیہ انداز میں خاموش ہوئی سوال بہت پراثر تھا واقعی ایسا نہیں ہوا تھا میں تو صرف ایک دیدہ در رہا تھا بہت سے احساسات سے عاری سو میں نے گردن ہلائی۔

”نہیں کوروتی! ایسا نہیں ہوا۔“

”گو یا تمہیں میری بات پر یقین ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“

”لیکن یہی کیفیت گوتم بھنساں کی رہی وہ مختلف روپ دھار کر میرے پاس آیا لیکن تاریخ کے کرداروں میں الجھ کر رہ گیا اور بے بسی کا شکار ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ میں اس دور کے ایک نوجوان سے متاثر ہو گئی اور میں نے اپنا وجود اس کے حوالے کر دیا۔ ہاں میں تمہیں بالکل سچ بتا رہی ہوں ذیشان عالی! کہ میں نے اپنی جذباتی زندگی کا پہلا دور تمہارے ساتھ شروع کیا پہلی بار میں ان تمام حقیقتوں سے آشنا ہوئی جو کسی مرد کی محبت دل میں پیدا کرتی ہیں۔ پہلی بار صدیوں کی عمر پانے کے باوجود میں نے ایک ایسے انسان کو اپنی قربت میں محسوس کیا جو میرے دل میں تھا۔ ذیشان عالی میں نے پہلی بار محبت کی ہے میں نے پہلی بار اپنا وجود کسی کو دیا ہے اور وہ تم ہو میں نے اپنی جسمانی قربتوں سے پہلی بار آشنائی حاصل کی ہے اس طرح تم سوچو کہ تم میرے لئے کتنا بڑا مقام رکھتے ہو۔ مگر ذیشان عالی مجھے دکھ ہے کہ میرے بارے میں سوچنے کے بجائے تم اپنی زندگی بچانے کے لئے سرگرداں ہو۔“ اس کی آواز ایک سسکی میں ڈھل گئی۔

صاحبو! ذرا غور کرو ذرا غور کرو مجھ پر کہ کیا بیت رہی ہوگی اُسے بابا میں تو ایک معمولی سا انسان تھا۔ بس زندگی کی گاڑی دھکیل رہا تھا میں اس صدیوں پرانے وجود کے لئے کیا کر سکتا تھا اس سے انحراف مجھے خوف زدہ بھی کرتا تھا اور بہت سے احساسات میرے دل میں جا گزیں بھی تھے اس نے کہا۔

”ذیشان عالی! میرا ساتھ دو تم اس دور کے نوجوان ہو اور مجھے اس بات کا علم ہے کہ یہ سائنس نگری ہے۔ قدیم دور کا سارا جادو اس دور کی سائنس کے سامنے بے اثر ہے اس دور میں سب کچھ ہو سکتا ہے تم ایک معصوف ہو کہانی کا آغاز کرتے ہو اپنی ہی کہانیوں کے پھیلائے ہوئے جال میں الجھ جاتے ہو پھر اس جال کو سلجھاتے ہو اس میں راستے نکالتے ہو میں تمہاری چاہنے والی کوروتی میں تمہاری محبوب نہ سہی لیکن تم میرے محبوب ہو اور میں اتنا تو حق رکھتی ہوں کہ تم سے کہوں کہ میرے محبوب مجھے اس مشکل سے نجات دلا دو۔ مجھے اس جال سے نکالنے کی کوشش کرو اپنی بے پناہ ذہانت صرف کرو اور مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں میں اپنی زندگی واپس چاہتی ہوں مجھے میری زندگی واپس دے دو۔“ وہ رونے لگی اس کا ڈھانچہ نما جسم بل رہا تھا اور میں منہ پھاڑے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا، لیکن بہر طور کچھ بولنا تو ضروری تھا میں نے اس سے کہا۔

”کوروتی! خود کو سنبھالو بات اصل میں یہ ہے کہ تم پراسرار قوتوں کی مالک ہو تم اپنے اس ڈھانچے نما جسم کو لے کر کہیں بھی روپوش ہو سکتی ہو۔ میرے لئے تو موت ہی موت ہے اخبارات میں میں نے پڑھ لیا ہے کہ پولیس کو اب میری تلاش ہے اور میں یہاں آچھا ہوں۔ کوروتی اگر پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو مار مار کر میرا حلیہ خراب کر دے گی۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ وہ عورت کون ہے جس نے ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل کر دیا، قتل کا الزام مجھ پر بھی آ سکتا ہے اور اس کے بعد..... ارے..... باپ رنے میں نے اپنی کہانیوں میں بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ انہیں پھانسی کے



پھندے تک پہنچایا ہے، لیکن اپنی گردن میں پھانسی کے پھندے کی سرسراہٹ محسوس کر کے میرا دم ٹکلا جا رہا ہے کوروتی حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے لئے افسردہ ہوں اور تم بالکل سچ کہہ رہی ہو گوتم بھنساں کی پہلی بار صبح رقابت کا شکار ہوا ہے۔ اس سے پہلے کی صدیاں جو گزری ہیں ان میں تم ایک کردار تھیں اور وہ بھی ایک کردار ہی تھا، لیکن اس بار تم اصل میں میری قربت سے سرشار ہوئی اور جسے وہ برداشت نہیں کر سکا۔ ایک سوال میں کروں تم سے کوروتی؟“ میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔

”کیا گوتم بھنساں کے دل سے تمہارا پیار ختم ہو گیا؟“

”کبھی نہیں ہوگا، کبھی بھی نہیں۔“ اس نے بڑے وثوق اور اعتماد سے کہا۔

”تو پھر اس نے جو یہ عمل کیا ہے کیا اس کے پاس اس کا کوئی تدارک ہوگا؟“ میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گئی، پھر کچھ دیر کے بعد بولی۔

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ مجھے اس مشکل سے نکال سکے گا؟“

”ہاں، تم نے انسانی ذہن کی سوچ کا ذکر کیا تھا، تم نے ابھی کہا تھا کہ میں اپنی کہانیوں میں جال بناتا ہوں اور پھر اس جال میں پھنس جانے والوں کو جال سے نکالتا ہوں۔ تو یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہے کہ کیوں نہ تم گوتم بھنساں سے لگاؤ کا اظہار کرو اور اپنی شکست کا اعتراف کر ڈالو اس سے کہو کہ تم اپنے کئے پر شرمندہ ہو اور اس سے رجوع کرنا چاہتی ہو وہ تمہیں اس مشکل سے نکال دے، ممکن ہے وہ ایسا کر لے؟“

جواب میں اس کی پیمکی ہنسی کی آواز سنائی دی اور اس نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا علم گیان اس سے کہیں آگے ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا اور اس پر بہت غور کیا تھا، وہ ایسا نہیں کر سکے گا اس نے جو کچھ کیا ہے آخری عمل کے طور پر کیا ہے، گویا اس نے میرا شریر کھودیا میرے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔“

”اور اگر کبھی تم سچے دل سے اس کی جانب راغب ہو جاؤ تو پھر تمہارا یہ ڈھانچہ نما وجود اس کے کس کام آئے گا؟“ مجھے کوروتی کی گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی پھر اس نے کہا۔

”بس..... منٹل کا اپنا خیال ہوتا ہے ذیشان عالی! ہم پریم بھادونا میں شریر کو سب سے بڑی حیثیت دیتے ہیں۔ بے شک ایک مرد کے لئے عورت کا شریر اور عورت کے لئے مرد کا شریر بنیادی حیثیت رکھتا ہے، دونوں ایک دوسرے کی طلب ہوتے ہیں، لیکن کہیں کہیں صدیوں کی آگ بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اسے کسی جانور کی شکل میں بھی مل جاؤں تو وہ مجھ سے پریم کرتا رہے گا اور ہر حیثیت میں مجھے سونپا کر کر لے گا۔“

میں کوروتی کے ان الفاظ سے متاثر ہوا تھا، ایک لمحے کے لئے میرے دل میں گوتم بھنساں کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا، غلط تو وہ بھی نہیں تھا۔ شکل و صورت کبھی بنیاد نہیں ہوتی اس کا وجود تو کہیں اور سے ہی ہوتا ہے، لیکن کجنت دل اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے، جدھر بھی راغب ہو جائے، گوتم بھنساں بھی دل ہی کا مریض تھا، میں نے کہا۔

”لیکن کوروتی، تم نے ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل کر دیا۔“

”بتایا نا تمہیں کہ مجھ پر دیوانگی سوار ہوتی جا رہی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ سب کو اپنے جیسا کر دوں۔ قیصر شاہ کو میں نے کہا کہ وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ہے، سائنسدان ہے میرے لئے کچھ کرے تو اس نے جلی سے کہا کہ میں جہنم میں جاؤں مرکب کر اپنے وجود کو فنا کر دوں، کچھ ایسا انداز اختیار کیا اس نے کہ مجھ پر وحشت سوار ہو گئی اور میں نے اس کی گردن دبا دی۔“

”لیکن میرے لئے یہ کتنا خطرناک ثابت ہوا؟“

”ذیشان عالی! سنو میری بات سنو میں تم سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ میرے لئے کچھ کر، تھوڑے عرصے پہلے

ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، میرا مطلب ہے وہ لڑکی جس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے تھے اور اسے کسی بنیادی علم والے نے بتایا تھا کہ کس طرح وہ ایسا تیل تیار کرے جس سے لڑکی کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہو جائیں۔ وہ کہانی ایک دردناک انجام رکھتی ہے، لیکن اس تیل کی اہمیت برقرار ہے اس نے بہر طور اپنا کام کر دکھایا تھا۔ وہ بے چاری تو بس پریم کے جال میں پھنس کر ماری گئی، تم میرا ساتھ دو گے ذیشان عالی! میرے لئے کوئی ایسا حل تلاش کرو گے جس سے میرے بدن کا گوشت واپس آ جائے، میں یہ نہیں کہتی کہ تمہارے سامنے ایسا کوئی وجود ہے جو مجھے میری اس مشکل کا حل بتا دے، لیکن یہ میں جانتی ہوں کہ تمہاری اس دنیا میں بھی بڑے بڑے گیان والے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے میرا کام بن جائے گا۔“

میں سوچ میں ڈوب گیا، ایک طویل عمل تھا یہ اور اس کے لئے مجھے غور کرنا تھا کہ کیا کیا جاسکتا ہے درحقیقت وہ میرا پیار نہیں تھی، ایک کردار میرے سامنے آ گیا تھا اور مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جس کے تحت میں کام کر رہا تھا، لیکن یہ سب کچھ اس قدر اہمیت کا حامل ہوگا یہ میں نے نہیں سوچا تھا اور اب جو اخبارات میں نے دیکھے انہوں نے میری جان نکال دی۔ میں تو باقاعدہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا، پولیس میرے راستے پر لگ گئی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں، میری تلاش ہو رہی ہے اس کی اس پیشکش پر میں غور ہی کر رہی تھا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی، میرے ساتھ وہ بھی چونک پڑی اور اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، دستک ذرا مختلف قسم کی تھی، یعنی اگر ویٹر کبھی آ کر دروازہ بجاتا تھا تو بڑے نرم اور شریف انداز میں، لیکن یہ دستک ایک دھڑ دھڑاہٹ سی تھی، وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی اور میں بھی وحشت سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا، پھر میرے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

”کک..... کون..... کون ہے اندر آ جاؤ۔“ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا، جو لوگ اندر داخل ہوئے انہیں اس مدہم روشنی کے باوجود میں نے پہچان لیا، پولیس کی وردی تھی اور سب سے آگے جو دو افسران تھے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پستول سیدھے کئے ہوئے تھے، ان میں سے ایک کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ لہجہ بہت ہی بگڑا ہوا تھا، یعنی ایسا کہ اگر میں ہاتھ اوپر نہ اٹھاؤں گا تو مجھ پر گولی بھی چلائی جاسکتی ہے، اپنی کیفیت کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا، میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے، کوروتی میرے پیچھے تھی، میں دو قدم آگے بڑھا۔

”جی جناب۔“

”تم ذیشان عالی ہو؟“ آگے والے انسپٹر نے سوال کیا۔

”جی سر۔“

”گرفتار کر لو اسے، ہتھکڑیاں ڈال دو اس کے ہاتھوں میں.....“ انسپٹر نے کہا اور اس کے برابر کھڑا ہوا، اس آئی ہتھکڑی کا جوڑا لئے ہوئے میری طرف بڑھا، میرے ہاتھ پاؤں کا نب رہے تھے اس نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی، بمشکل تمام میں نے کہا۔

”دل..... لیکن..... جناب..... مم..... مجھے..... کک..... کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟“

”معلوم ہو جائے گا۔“ انسپٹر نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے آگے کو دکھا دیا اور میں نے سہی ہوئیں نگاہوں سے کوروتی کی طرف دیکھا، لیکن کوروتی وہاں نہیں تھی۔ میں نے چور نگاہوں سے کمرے کے دوسرے گوشوں میں دیکھا، لیکن کوروتی نظر نہیں آئی، یہ اچھا ہوا میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”چلو اور تم کمرہ سیل کرو، سپروائزر! اس کمرے کو بالکل نہ چھوا جائے، ہم بعد میں اس کی تلاشی لیں گے۔“ انسپٹر نے غالباً ہوٹل کے سپروائزر کو ہدایت دی تھی جو اس کے ساتھ ہی پیچھے موجود تھا۔ بہر طور مجھے ایک مجرم کی طرح کمرے سے

ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئی۔ تھانے کے گیٹ سے باہر پہنچنے کے بعد اس نے ایک طرف کا رخ اختیار کیا اور سڑک عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئی۔

یہاں ایک درخت کی جڑ میں ایک موٹا سا کھیس رکھا ہوا تھا یہ وہی کھیس تھا جسے اوڑھے ہوئے اسے دیکھا جاتا تھا اس نے وہ کھیس اٹھا کر اپنے بدن میں لپیٹا چہرہ بھی ڈھکا اور مجھ سے بولی۔

”آؤ ڈیشان عالی آ جاؤ تیز رفتاری سے۔“

یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں جو کچھ وہ کہہ رہی تھی میں اسی پر عمل کر رہا تھا ہم تھانے کی عمارت سے کافی دور نکل آئے۔

اس دوران تھانے کے اندر پولیس والوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی پتہ نہیں اب وہ کس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ کوروتی مجھے لئے ہوئے ایسی جگہوں پر جانے لگی جہاں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت دور نکل آئے تو اس نے کہا۔

”ہمیں اپنی کوشی کی جانب چلنا ہے میرا مطلب ہے میری کوشی کی طرف۔ اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”نہیں۔“

”پیدل چل سکو ہے؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”ہاں۔“

”چلو رفتار ڈرا تیز کرو۔“

میں نے رفتار تیز کر دی وہ تو کسی چھلاوے کی طرح کافی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی اور میں حتی الامکان اس کا ساتھ دے رہا تھا کافی طویل فاصلہ طے کرنا پڑا اور آخر کار میں اس کے ساتھ اس پر اسرار کوشی میں داخل ہو گیا جہاں ایک انوکھی کائنات موجود تھی۔ وہ اندر آگئی اور مجھے لے کر ایک کمرے میں پہنچ گئی۔

”ڈیشان! میرے بارے میں تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ میری زندگی میں صدیوں کا تجربہ ہے۔ میں نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ کیا ہے، لیکن جن حالات سے اس وقت میں دو چار ہوئی ہوں ایسے پہلے کسی نہیں تھے ہمیں سوچنا پڑے گا غور کرنا پڑے گا، تم نے جو تجویز دی تھی کہ میں گوتم بھنسا کی کو دھوکہ دوں اور اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کروں تو میں تمہیں بتاؤں کہ ایسا ممکن نہیں ہے کچھ بھی ہے لیکن وہ مجھے اور میں اسے بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ میرے جال میں نہیں آئے گا۔“

میں تھوڑا سا وقت سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ میرے اندر کی جو کیفیت ہے میرا دل ہی جانتا ہے حالانکہ اب تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میرا دل کہاں گیا۔ بکسل کر بہہ گیا یا کیا ہوا لیکن میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے وجود کا ایک ایک انگ اسی انداز میں کام کر رہا ہے جیسے میری صحیح جسمانی کیفیت میں اس کا مقصد ہے کہ ان چیزوں کا وجود ہے۔ میں سوچ بھی سکتی ہوں دیکھ بھی سکتی ہوں سن بھی سکتی ہوں چل بھی سکتی ہوں میرا ہر احساس زندہ ہے لیکن جو گل گیا ہے میں اس کی واپسی چاہتی ہوں۔“

میں نے دہی انداز میں کوروتی کو دیکھا اور کہا۔ ”لیکن میرا جو کچھ ضائع ہوا ہے میں ساری زندگی اسے نہیں حاصل کر سکتا۔“

”کیا؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”آہ میری کتاب زندہ صدیاں میں وہ سب کچھ اپنے ساتھ ہوٹل لے گیا تھا اور اب وہ پولیس کے قبضے میں ہوں

نکالا گیا رات کا وقت تھا، لیکن پولیس کی آمد کی اطلاع آس پاس کے مکینوں کو بھی مل چکی تھی اور لوگ دروازے کھول کھول کر میری گرفتاری کا منظر دیکھ رہے تھے۔ میرے روٹنے کھڑے ہو چکے تھے۔ نجانے کیا کیا خیالات دل میں آرہے تھے ایسے مناظر بے شمار میں نے اپنی کہانیوں میں لکھے تھے، لیکن حقیقت میں کسی ایسے شخص کو جو پولیس کے چنگل میں آیا ہوا ہو اور اسے ہتھکڑیاں لگا کر لے جایا جا رہا ہو کسی کسی کیفیتوں سے گزرتا ہوتا ہوگا اس کا مجھے اب احساس ہو رہا تھا مجھے نیچے لایا گیا اور پھر پولیس کی دین میں بٹھا دیا گیا۔

پولیس دین مجھے لے کر چل پڑی اور میں دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن لا کر مجھے نیچے اتارا گیا اور پھر لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ غالباً رات کی وجہ سے وہ مجھ سے ابھی تک کوئی گفتیش نہیں کرنا چاہتے تھے میں نے پہلی بار لاک اپ کے ماحول کا جائزہ لیا اور ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی میں نے اپنی کسی بھی کہانی میں جب لاک اپ کے بارے میں لکھا تھا تو اس کا ماحول یہی ہوتا تھا اور اس میں موجود شخص کے احساسات بھی بالکل میرے ہی جیسے تھے اتفاق سے اس لاک اپ میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

پولیس والے دروازہ بند کر کے چلے گئے اور میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا لاک اپ کے باہر سنتری کے بوٹ کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی وہ لاک اپ کے سامنے سے گزرتا تھا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ اب کیا ہوگا میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا میرے اپنے حساب سے قیصر شاہ کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی جائے گی مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ہوٹل میں جہاں میں نے قیام کیا تھا پہلی بار اور جہاں سے ایک انسانی ڈھانچہ نکل کر باہر بھاگا تھا اور اس نے افراتفری پھیلانی تھی پھر اس ڈھانچے نے قیصر شاہ کو قتل کیا تھا وہ کون تھا اور یہ سارا قصہ کیا ہے۔

یہ کون سی سنسنی خیز کہانی لکھنے کے بجائے عمل میں لائی جا رہی تھی مار بھی لگائیں گے وہ لوگ مجھے اپنی ہڈیوں میں دھن محسوس ہو رہی تھی بس ایک عجیب سا احساس تھا ہار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لاک اپ کی دیواروں کو دیکھ لیتا تھا تو یہ ہوتی ہے لاک اپ کی زندگی ان لوگوں نے رات کی وجہ سے مجھے صرف گرفتار کر کے لاک اپ کر دینے کی ضرورت محسوس کی تھی صبح کو میرے خلاف عمل کیا جائے گا۔ آنکھیں جھپکنے لگتیں نیند بھی آرہی تھی اور ذہن پر بوجھ بھی سوار تھا کہ اچانک ہی مجھے باہر سے چیخوں کی آواز سنائی دی لوگ چیخ رہے تھے میں چونک پڑا پتہ نہیں کیا ہوا تھا پھر بھاگ دوڑ کی آوازیں بھی ابھرنے لگیں اور ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لاک اپ کے سامنے موجود سنتری بھی حیرت سے منہ پھاڑے ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے ایک انسانی ڈھانچہ دیکھا ہڈیوں کا وجود متحرک تھا بس آنکھیں چمک رہی تھیں گہری سرخ آنکھیں جو بجلی کے بلب کی طرح روشن تھیں ڈھانچے کو دیکھ میرے ذہن میں کوروتی کا تصور ابھر آیا۔

اسی وقت انسانی ڈھانچے نے لاک اپ کے باہر پہرہ دینے والے سنتری کی گردن پکڑ لی اور اسے دیوار سے دے مارا سنتری کی چیخ ابھری ڈھانچے نے اس کی کمر میں لگی ہوئی بیلٹ سے لاک اپ کی چابی نکالی اور پھر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا گیا میں اچھل کر کھڑا ہو گیا تبھی مجھے کوروتی کی آواز سنائی دی۔

”عالی! باہر آ جاؤ۔“

میرے بدن میں جیسے بجلی سی بھر گئی تھی سوچے سمجھے بغیر بے اختیار لاک اپ کے دروازے کی جانب دوڑا اور تیزی سے باہر نکل آیا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب بھاگی میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ باہر پولیس والے موجود تھے وہ لوگ چیخ رہے تھے اور اندر کی جانب اشارہ کر رہے تھے جیسے ہی کوروتی ڈھانچے کی شکل میں مجھے لے کر باہر نکلے وہ چیخیں مارتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگ پڑے کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ہم پر گولی ہی چلا دیتا۔ کوروتی مجھے

گئی، بس میں کیا بتاؤں میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔“ میں نے غم آلود لہجے میں کہا تو اس نے اپنا استخوانی ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔

”نہیں..... دوست ہوں میں تمہاری۔ ایسے تمہاری محنت کو کیسے رائیگاں جانے دیتی۔“

”کیا مطلب؟“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں جب پولیس آئی تھی اور اس نے تمہیں گرفتار کیا تھا تو میں تمہارے پیچھے موجود تھی، لیکن میں چھپ گئی تھی، ان لوگوں کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہاں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی ہوگا چنانچہ وہ تمہیں لے کر باہر نکل گئے تو میں نے تمہارے وہ تمام کاغذات تمہاری اس کتاب کا مسودہ اور چیزیں جو تمہارے لئے اہمیت کی حامل ہو سکتی تھیں، سنبھالیں اور انہیں لے کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ تمام چیزیں لے کر میں یہاں اپنی اس کوٹھی میں پہنچی اور میں نے انہیں محفوظ کر دیا۔ پھر اس کے بعد میں تمہیں پولیس کے قبضے سے نکالنے کے لئے چل پڑی اور وہاں جو واقعات پیش آئے وہ تمہارے علم میں ہیں۔“ میں خوشی سے اچھل پڑا تھا، ساری باتیں اپنی جگہ اس کا یہ احسان میرے اوپر احسانِ عظیم تھا، میری کتاب بچ گئی تھی، میری زندہ صدیاں.....

میرا دل خوشی سے سرشار تھا اور یہ خوشی میرے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ میرے سامنے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے اس کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم نہ ہوتیں تو ایسے کسی ڈھانچے کو دیکھ کر میں بھی چہنچا ہوا فرار ہو جاتا۔ پراسرار کہانیوں میں جن بھوت پریاں اور نجانے کیا کیا آسانی سے لکھا جا سکتا ہے، ان کا ایک تصوراتی خاکہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے اس طرح کہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ بھیرو کے دو سینگ ہوتے ہیں اور کالی کے بارہ ہاتھ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی انسانی ڈھانچے کو ایک دلاویز انداز میں صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھے دیکھ کر کسی کی جو حالت ہو سکتی ہے میری بھی وہی حالت تھی۔

البتہ احساسات جاگ رہے تھے اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت غم زدہ ہے، زندہ صدیاں مل گئی تھی، اس کا مسودہ مل گیا تھا، میرے لئے خوشی کی بات تھی، لیکن اب اتنا بھی مناسب نہیں تھا کہ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہوں اور وہ جو اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے خاموش بیٹھی مجھے دیکھتی رہے۔ بمشکل تمام میں نے اپنے چہرے پر دکھ کے آثار پیدا کئے اور ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”آہ کوروتی“ کاش میں تمہیں اپنا بدن دے سکتا، کاش میں اپنی روح تمہاری روح میں ڈال سکتا، کاش۔“

”ایک منٹ ایک منٹ ایک منٹ۔“ اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا دیا اور میں خاموش ہو گیا۔ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھائے دیر تک بیٹھی رہی پھر بولی۔

”بات تو تم نے بہت عجیب کر دی ہے، بہت ہی عجیب۔“ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا کچھ لمحوں کے بعد وہ بولی۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ کاش میں اپنا وجود تمہیں پیش کر سکتا، یعنی یہ کہ میں تمہارے وجود میں پھر سے ایک انسان کی حیثیت پا جاتی۔“ اس نے سرسراہٹ بھرے لہجے میں یہ بات کہی لیکن اس کے لہجے کی سرسراہٹ میرے پورے وجود میں سرسراہٹ بن گئی۔ یہ میں کیا کہہ بیٹھا، ارے باپ رے تو کیا وہ میرے بدن میں آنے کے بارے میں سوچ رہی ہے، تب اس کی آواز ابھری۔

”میں نے تمہیں اصناکیہ کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔ سقراط، افلاطون، بطلمیوس اور دوسرے لوگوں نے سکندر اعظم کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اصناکیہ کے وجود میں آ جاؤں اور سکندر کو اصناکیہ کی تخلیق پیش کروں اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کسی دوسرے وجود میں آنے کے لئے کیا کرنا پڑا تھا، میں کسی دوسرے وجود میں آ سکتی ہوں

ذیشان عالی، میں دوسرے وجود میں آ سکتی ہوں۔“

میرے تو ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی تھی تو کیا وہ میرے وجود میں آنے کے بارے میں سوچ رہی ہے، میرے ہکا بکا اس کی صورت دیکھتا رہا، لیکن پھر وہ خود ہی مایوس لہجے میں بولی۔

”لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتی، ماضی کی بات اور ہے، ماضی میں صرف ایک خیال کی حیثیت اختیار کر لیتی تھی، ایک خیال ہوتی تھی میں کسی بھی کردار کو اپنے اوپر مسلط کر لیتی تھی، لیکن آزاد ہوتی تھی اور میں اس خیال کے لئے ایک دیدہ ور ہی کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اب صورت حال دوسری ہے۔ اب مجھے اپنا یہ وجود کسی اور کے وجود میں منتقل کر کے اپنے آپ کو صرف ایک ڈمی کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہوگا، یہ ممکن نہیں ہے، ذیشان عالی یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ گوتم بھنساالی مجھے ہر روپ میں پہچان لے گا، یہ الگ بات ہے کہ تھوڑے بہت وقت کے لئے میں کسی جسم کو اپنا لوں، صرف اس خیال سے کہ میری اس ہولناک بیماری کا علاج ہو سکے۔

وہ اپنی دھن میں بولے جاری تھی اور ذیشان عالی دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ کوروتی کے ذہن سے اس کا جسم حاصل کرنے کا خیال نل گیا تھا۔



میں جس کیفیت کا شکار تھا میرا دل ہی جانتا تھا۔ پراسرار کہانیوں کا خالق تاریخ کی تحقیق کا تیس مارخاں اس وقت چوہا بن گیا تھا۔ بالکل ہی بے عقل نہیں ہو گیا تھا۔ کوروتی مجھے پولیس لاک اپ سے نکال لائی تھی۔ لیکن اب میں باقاعدہ مجرم بن گیا تھا۔ ایک اہم شخصیت کے قتل کی تفتیش کے لئے مجھے پکڑا گیا تھا۔ اس قتل کا تعلق ایک انسانی ڈھانچے سے بتایا جا رہا تھا جس کا تعلق مجھ سے تھا۔ ممکن ہے پولیس کو کوئی اور پراسرار کہانی سنا کر اپنی پوزیشن صاف کر لیتا لیکن اب تو وہی قاتل ڈھانچہ مجھے لاک اپ سے نکال لایا تھا اور اس سے میرا سو فیصدی تعلق ثابت ہو گیا تھا۔ پولیس اس ڈھانچے کو کم مجھے زیادہ تلاش کرے گی۔

کوروتی پراسرار علوم کی ماہر تھی کسی بھی مشکل سے بچ سکتی تھی لیکن میرا کیرئیر تباہ ہو گیا تھا۔ میرے پبلشرز بھی بے چارے میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔

”بہت پریشان ہو عالی؟“ کوروتی نے کہا۔

”ہاں کوروتی۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”مجھے بہت افسوس ہے لیکن.....“ اس کی آواز سسکی میں بدل گئی۔ کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”لیکن..... میرا صدیوں کا تجربہ ہے کہ مشکلات کتنی ہی اہم اور بظاہر ناقابل حل محسوس ہوتی ہوں۔ لیکن ان کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ ان مشکلات کا حل بھی آخر کار نکل ہی آئے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔“

”کیا عمدہ بات کہی ہے کوروتی۔“ میرے لہجے میں طنز پیدا ہو گیا۔

”کیوں.....؟“ وہ بولی۔

”تم صدیوں سے جی رہی ہو۔“ اور صدیوں جیو گی۔ لیکن مجھ غریب کو تو تھوڑی سی زندگی ملی ہے۔ وہی کہ عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن جو کہ اب پولیس سے آنکھ مچولی میں گزریں گے۔

وہ خاموش ہو گئی۔ جیسے میرے الفاظ سے اسے دکھ پہنچا ہو۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”اب آگے کی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل بنانا ہو گا ہمیں اور سنو اب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے کہ تم بھنسا لی صدیوں سے میرے عشق میں گرفتار ہے۔ لیکن اسے سکون تھا کہ میں کسی سے پیار نہیں کرتی۔ میں نے کسی کو اپنا قرب نہیں بخشا۔ اب وہ دیوانہ اسی لئے ہوا ہے کہ..... میں نے اپنا سب کچھ تمہیں دے دیا۔ اور اس نے اس رقابت میں میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔“

”تو پھر.....؟“ میں نے کہا۔

”تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

اس کے یہ الفاظ میرا دم نکالنے کے لئے کافی تھے۔ آپ خود غور کریں۔ ایک خوفناک انسانی ڈھانچہ جسے دیکھ کر ہی جان نکل آئے۔ آپ کو اس کی پذیرائی کرنی ہے اسے اپنی خلوتوں میں جگہ دینی ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس کی آواز ابھری۔

”تم نے اس ڈاکٹر کو کیوں قتل کیا۔“ میں نے کہا۔

”میرا دل تو چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو فنا کر دوں۔“ وہ غرا کر بولی۔

”وہ تو بے قصور تھا۔“

”میرے درد کا درماں کون کرے گا۔“

”کوئی اگر نہ کر سکے تو اس کا کیا قصور ہے۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”اگر یہ نہ ہوتا تو مجھے مجرم نہ گردانا جاتا اور ہم دونوں مل کر اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرتے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک یہ خاموش طاری رہی پھر اس نے کہا۔ ”اسی لئے میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں ایک لائحہ عمل بنانا ہو گا۔ کوئی تدبیر کرنی ہو گی۔ تم اپنی دنیا کے ایک ذہین انسان ہو۔ جو تم سوچ سکتے ہو میں نہیں سوچ سکتی۔ مجھے اپنا اصل وجود چاہئے اور یہ بھی ہر قیمت پر حاصل کرنا ہو گا۔ چلو چھوڑو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“

”تم.....؟“ میں نے کہا۔

”ہاں دیکھتی ہوں تم آرام کرو اور سنو یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا، تمہیں تلاش کرنا میرے لئے مشکل نہ ہو گا۔“

”اپنے ساتھ پولیس لے کر مت آ جانا۔“ میں نے کہا اور اس کی ہنسی سنائی دی۔ پھر اس نے وہ موٹا کھیس اوڑھا اور باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں مہینوں کا بیمار ہوں۔ شدید تھکات محسوس ہو رہی تھی جیسے بدن کی جان نکل گئی ہو۔ یہ کیا ہو گیا کتنی سبک روی سے زندہ صدیاں چل رہی تھیں۔ کوروتی مجھے صدیوں کی تاریخ سے روشناس کر رہی تھی۔ تاریخ کے وہ پراسرار نام جن کی سحر انگیز داستانوں کی آؤٹ لائنز ہی سنی تھیں ان سے متعلق مستند کتابوں کا فقدان ہے۔ جیسے مصر کی حسین ساحرہ کلہوپیڑہ، فرائے کی ہیلن، نینوا کی ہم جنس پرست، جرمنی کی ایوا براؤن، یونان کی سائیکی، یولیو کی جین آرک اور نہ جانے کون کون کس وقت ساتھ نہ دے سکا۔

اور اب بے چارہ ذیشان عالی اس پراسرار کوشی کا قیدی ہے۔ اور باہر پولیس ڈنڈے لئے دندناتی پھر رہی ہے۔ کوروتی جلد ہی واپس آ گئی۔ کافی سامان ساتھ لائی تھی جو اس نے جین میں رکھ دیا۔ پھر بولی۔ ”میں تمہارے لئے کھانا بناتی ہوں۔“

”تمہیں آتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر.....؟“ میں ہنس پڑا۔

”آؤ تم میرا ساتھ دو۔“ میں واقعی بھوکا تھا۔ جو کچھ الٹا سیدھا بن سکا بنایا اور نہ ہر مار کیا۔ اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں لگی۔ میرا معدہ بھی گل کر پانی بن چکا ہے۔“

کھانے کے لئے اتنا لے آئی تھی جو کئی دن تک چل گیا۔ ویسے اس کوشی میں استعمال کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ ایک بات مسلسل میرے ذہن میں چل رہی تھی۔ میں نے کہا ڈالی۔

”مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی۔“

”پوچھو۔“

”کیا تمہارے ذہن میں تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہے جس میں کوئی ایسا سادھو حکیم یا کوئی جادوگر ہو جو تمہاری مشکل حل کر سکے اگر ایسا ہے تو کیوں نہ ہم تاریخ کے اس دور میں چلیں۔“

”یہاں میں اپنی کمزوری کا اعتراف کروں گی۔“

”کیا مطلب۔“

”ایسے کئی کردار میرے ذہن میں ہیں۔ لیکن وہ ٹھیک نہیں کر سکیں گے۔“

”کیوں۔“

”تم ابھی تک یہ سب کچھ کیوں نہیں سمجھ سکے۔ ہم جب ماضی میں داخل ہوتے ہیں تو صرف اس دور کے دیدہ ور ہوتے ہیں۔ ہم کسی کردار کو منتخب کر کے اس کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ ہوتے نہیں ہیں۔ ہم ہم ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر میں اسی حالت میں وہاں جاتی ہوں تو تاریخ میں داخل تو نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو ماضی ہوتا ہے جو گزر چکا ہوتا ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ جب بھی وہ مجھے ایسی باتیں بتاتی تھی میرے دماغ کی چولیس بل جاتی تھیں۔ وہ اکثر باہر چلی جاتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی مجھے باہر جانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ وہ میرے لئے خطرہ نہیں مول لینا چاہتی تھی۔

پھر ایک دن وہ بہت سے اخبارات لے آئی۔

”میں نے ان میں سے ایک میں تمہاری تصویر دیکھی تو یہ سب لے آئی۔“

میں نے خوفزدہ لگا ہوں سے اخبار کے پہلے صفحے پر اپنی تصویر دیکھی۔ یہ تصویر میرے کسی ناول سے لے لی گئی تھی۔ نیچے میرا بایو ڈیٹا تھا۔ کہاں پیدا ہوا، کیا کیا لکھا، اس خوفناک وجود سے میرا کیا تعلق ہے۔ ڈاکٹر قیصر پولیس کمشنر کا کزن تھا اور اس کے بارے میں کمشنر صاحب کا بیان تھا کہ یہ لڑکی پوری پولیس کی نوکری کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ بہت مختصر وقت میں وہ ڈاکٹر قیصر شاہ کے قاتل کو پکڑ کر عوام کے سامنے پیش کر دیں گے۔

دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس قتل کے پس منظر میں صرف ڈیٹا بنی ہوئی ہے۔ وہ ہاتھ آ جائے تو سارے عقدے حل ہو سکتے ہیں۔

میرے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ میں گردن گردن دلدل میں دھنس گیا تھا۔ کوروتی تو ایک پراسرار وجود تھا۔ خود کو کسی بھی طرح دنیا کی نظروں سے اوجھل کر سکتا تھا۔ لیکن میں اپنے ملک کی پولیس سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک ہی جرم کے دس بیس اقبالی مجرم تلاش کر لینا پولیس کے بائیس ہاتھ کا کام تھا جبکہ دائیں ہاتھ کی کارکردگی الگ مقام رکھتی تھی۔

”اب کیا ہو گا کوروتی۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ سکون سے بولی۔

”یہ اخبارات پڑھے ہیں تم نے۔“

”میں یہ زبان پڑھنا نہیں جانتی۔“

”ان سب میں میری موت کی کہانی لکھی ہے۔“

”وہ کہانی صرف کہانی رہے گی۔“

”تم یہ زبان پڑھنا نہیں سکتیں اور مجھے بچانے کا دعویٰ کر رہی ہو۔“ میں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہیں تھوڑی ہی دیر میں پولیس کے چنگل سے نکال لائی یہ بھول گئے۔“

”تمہارے اس عمل نے میرے مجرم ہونے کی تصدیق کر دی۔“

”دیکھو ڈیٹا بنی ہوئی! مجھے جو نقصان پہنچا ہے تمہاری وجہ سے پہنچا ہے۔ گوتم بھنساہی نے صرف رقابت کا شکار ہو کر میرا یہ حال کیا ہے۔ مجھ سے نفرت یا بیزاری کا اظہار مت کرو۔ مجھے اپنے نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھ سے کنارہ کشی کی تو..... میں کیا کروں گی۔ یہ سوچ کر ہی تمہارا سانس تبدیل ہو سکتا ہے۔“

مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے واقعی ایسا ہی کر سکتی ہے۔

”تم جب بھی باہر جاؤ اخبار لے آیا کرو۔ کم از کم مجھے پتہ تو چلتا رہے کہ میرے خلاف کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن تم ذہین ہو اپنی دنیا سے واقفیت رکھتے ہو۔ اور سوچو میں کس طرح ٹھیک ہو سکتی ہوں۔“ میں

ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

کیا درگت بنی تھی۔ سوچتا تو خود پر ترس آنے لگتا تھا۔ میرا تو کوئی تصور نہیں تھا۔ سوچتا بھی رہتا تھا پر کیا کروں۔ میرے کون سے وسائل تھے کہ کوروتی کو باہر کی دنیا میں لے جاؤں۔ یا اس کے بارے میں کوئی مضمون لکھوں۔ اگر وہ ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل نہ کرتی تو شاید جدوجہد کی جاسکتی تھی۔ مثلاً میں اپنے وسائل سے کام لے کر اخبارات کا سہارا لیتا یہ مضمون شائع کراتا کہ ایک مظلوم عورت سائنس کی دنیا کے لئے چیلنج بن گئی ہے۔ کسی انوکھے زہر کے ذریعہ اس کے بدن کا گوشت پانی بن کر بہہ گیا ہے۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور دوسرے ممالک اسے کسی انوکھے تجربے کے لئے حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

کوروتی باہر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ مجھے اخبارات لا کر دیتی رہتی تھی اور دوسری چیزیں بھی لے کر آتی تھی۔ البتہ میں

باہر جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک دلچسپ عمل کیا۔ ایک بڑا بیکٹ لے کر بازار سے واپس آئی تھی۔

”اس میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا اور اس نے بیکٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ یہ بہت ہی خوب صورت برقع

تھا۔ ”یہ کیا ہے۔“

”اس کا نام تم ہی جانتے ہو گے۔“

”ہاں..... یہ برقع کہلاتا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں لائی ہو۔“

”تمہارے لئے لائی ہوں۔“

”کیا بکواس ہے۔“ میں جیسے چلایا۔

”اور یہ بھی لائی ہوں۔“ اس نے چوڑیوں کا ایک بیکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔

”کوروتی ہمارے ہاں یہ مردوں کے لئے گالی کہلاتی ہیں۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”ارے کیوں؟“ اس کی حیران کن آواز ابھری۔

”مگر تم میرے لئے کیوں لائی ہو؟“

”میں نے باہر ایسے کچھ لوگوں کو دیکھا جنہوں نے ایسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے جسم اور چہرے نظر نہیں آ رہے تھے البتہ کھلے ہاتھوں میں یہ چیز تھی۔ بس میں نے سوچا تم اتنے دن سے گھر میں قید ہو یہ چیزیں پہن کر ہم باہر گھومنے جاسکتے ہیں۔“

میرا موڈ خراب ہوا تھا لیکن کوروتی کا موقف سن کر میرے حلق سے بے اختیار ہتھکھل گیا۔ میں دیر تک ہنستا رہا اور

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ پھر بولی۔

”تمہیں اچھا لگا۔“

”بہت اچھا، بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔“

”یہ بہن کرہم ہر جگہ جاسکتے ہیں نا۔“

”ہاں۔“

”تو پھر چلو تیار ہو جاؤ۔“

پڑھ رہے ہیں نا آپ ڈیٹان عالی کی پتا، ایسا منصف کبھی دیکھا ہے آپ نے۔ غالب فقیروں کا ہمیں بنا کر تماشا اے اہل کرم دیکھتے تھے۔ اپنے شعر کے مطابق۔

بنا کر فقیروں کا ہم ہمیں غالب

تماشا اے اہل کرم دیکھتے ہیں

عالی جی ادیکھیں آگے کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ باہر نکل آئے سب سے پہلے کچھ خریداری کی جو کھیں کوروتی اوڑھے ہوئے تھی وہ کافی گندا ہو گیا تھا۔ اس دکان سے جہاں سے اس نے میرے لئے برقع خریدا تھا، کوروتی کے لئے بھی ایک برقع خریدا، پھر ایک دکان سے زنانے جوئے خریدے اور میں ڈیٹان عالی سے شانی بن گیا۔

کافی دن کے بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ شہر اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ اس لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا۔ اپنے گھر کے سامنے سے بھی گزرنا۔ دروازے پر پولیس کی سیل لگی ہوئی تھی اور دو پولیس والے کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔

شام کے سات بجے کا وقت تھا جب ہم گھر واپس لوٹے، آٹو رکشہ میں آئے تھے۔ لیکن دوسرے گھر پر نظر پڑی تو اوسان خطا ہو گئے۔ کوروتی کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے چار پانچ پولیس موہاں کھڑی ہوئی تھیں اور پولیس کے جوان خوب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

”رکشہ والے روکو روکو۔“ میں نے زنانہ آواز بنا کر کہا اور رکشہ رک گیا۔ ہم دونوں نیچے اتر گئے، کوروتی بھی صورتحال سمجھ گئی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟“ اس نے کہا۔

”پولیس پہنچ گئی۔“ میں خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”اب کیا کریں۔“

”پہلے یہاں سے بھاگو پھر سوچیں گے کہ کیا کریں۔“ میں نے کہا۔ رکشہ والا اس دوران پیسے لے کر چلا گیا تھا۔ ہم دونوں کچھ جگہوں کی آڑ لے کر وہاں سے چل پڑے۔ کافی دیر تک پیدل چلتے رہے، کوئی بات ذہن میں نہیں آ رہی تھی کہ کہاں جائیں۔

نہ جانے کتنی دور پیدل چلے تھے۔ پھر ایک بار وقف جگہ رک گئے۔ سامنے ہی ہسپتال نظر آ رہا تھا۔ بہت بڑا اور مشہور ہسپتال تھا، میں اس کے بارے میں جانتا تھا۔

”آؤ.....!“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور کوروتی میرے ساتھ چل پڑی۔ اس وقت یہ بہترین پناہ گاہ تھی جہاں ہم کچھ دیر قیام کر کے کوئی موثر بات سوچ سکتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک نئی ہی زندگی تھی۔ افراتفری کے شکار لوگ اپنی اپنی پریشانیوں میں لپٹے ہوئے، ہم لابی میں جا بیٹھے ہماری جیسی بہت سی برقع پوش خواتین بھی نظر آ رہی تھیں اس لئے کسی نے ہمیں مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر ہم لابی میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے اچانک کوروتی سے کہا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“

”کہاں۔“

”تم بیٹھو۔“ میں نے کہا۔ اور پھر میں اسے چھوڑ کر وہاں سے چل پڑا۔ بس ایک خیال دل میں آیا تھا۔ میں ہسپتال کا جائزہ لیتا رہا۔ بہت سے کمروں سے گزر کر آخر کار میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو غالباً ہسپتال کا اسٹور تھا۔ یہاں بہت سی اونین الماریاں تھیں جن میں بستروں کی چادریں، وارڈ بوائز کی وردیاں وغیرہ چنی ہوئی تھیں۔ میری بانٹھیں خوشی سے کھل گئیں۔ مجھے ایسی ہی کوئی چیز درکار تھی اس سے پہلے کہ کوئی اس طرف نکل آتا میں نے پھرتی سے اپنے سائز کا ایک وارڈ بوائے کا لباس نکالا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے وہ جنرل واش روم بھی دیکھ لئے تھے جو مریضوں کے ساتھ آنے والوں کے لئے تھے۔ ایک واش روم میں داخل ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا اور مکمل طور پر وارڈ بوائے نظر آنے لگا۔

عظیم الشان ہسپتال میں سینکڑوں وارڈ بوائے تھے ان پر کون توجہ دیتا۔ پھر بھی خود کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے ایک اسٹریچر لیا اور چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی قدم چلا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر نے مجھے آواز دی۔

”ادھر آؤ..... جلدی آؤ۔“ میں اسٹریچر دھکیلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔ ہم کوریڈور عبور کر رہے تھے۔ راستے سے لیڈی ڈاکٹر نے دونوں کو ساتھ لے لیا۔ اس طرح وہ مجھے لے کر ایک کمرے کے سامنے رکی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ نرسیں بھی اس کے ساتھ اندر چلی گئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اس لئے میں اندر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کئی افراد موجود تھے جن میں دو عورتیں اور تین مرد تھے۔ عورتیں اور مرد اپنی حیثیت سے بہت شاعرانہ نظر آ رہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ مرد بھی افسردہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے پاس بستر پر ایک مریضہ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک اور لیڈی ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہی تھی۔ پھر اس نے آنے والی لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کہا۔

”چلو..... اسٹریچر لائی ہو۔“

”یس میڈم.....“ دوسری ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”لے چلو۔“

”آؤ..... اندر آؤ، مجھے ساتھ لانے والی ڈاکٹر نے مجھے بلایا اور میں اسٹریچر لے کر اندر داخل ہو گیا۔ بستر پر لیٹی مریضہ ایک بے حد خوبصورت نوجوان لڑکی تھی اس کی عمر تیس چوبیس سال ہو گئی۔ چہرہ بے حد پرکشش تھا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیا منہ پھاڑے کھڑے ہو۔ اسے اٹھاؤ۔“ بڑی ڈاکٹر نے مجھے ڈانٹا اور میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ حسین لڑکی کو اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ تو بڑی ڈاکٹر نے کہا۔ ”سٹی اسکین سینٹر لے آؤ۔“

”یس میڈم۔“ چھوٹی ڈاکٹر نے کہا اور میں اسٹریچر دھکیلنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے میری ہوا کھسکی کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سٹی اسکین سینٹر کہاں ہے۔ لیکن شکر ہے کہ اس وقت پورا قافلہ ساتھ تھا۔ دونوں نرسیں چھوٹی ڈاکٹر اور پھر لڑکی کے لواحقین۔

چھوٹی ڈاکٹر آگے آگے جا رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہم ایک بڑی لفٹ کے پاس رکے اور دیوہیکل لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ اور ہم اسٹریچر سمیت لفٹ میں داخل ہو گئے۔ سٹی اسکین سینٹر تیسری منزل پر تھا دور ہی سے مجھے وہ بورڈ نظر آ گیا جس پر سٹی اسکین لکھا ہوا تھا۔



بڑی ڈاکٹر نہ جانے کون سے راستے سے یہاں پہنچ گئی تھی۔ خیر لڑکی کو اندر اتارا گیا۔ اور ہمیں باہر نکال دیا گیا۔ چھوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

”کیا نام ہے تمہارا۔“

”انور.....“ میں نے ایک لمحہ بھی نہ سوچا اور پھٹ سے بول پڑا۔

”انور تمہیں یہیں رکنا ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحبہ.....“ میں نے کہا۔ لڑکی کے لواحقین باہر کھڑے تھے۔ عورتیں مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ مردوں میں ایک بزرگ تھے جو بری طرح نڈھال نظر آ رہے تھے۔ سب بدحواس تھے ڈاکٹر اندر معروف تھیں میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں کوروتی کو کافی دور چھوڑ آیا ہوں۔ جس مصیبت میں پھنسا ہوں اس کی وجہ وہی ہے اور پھر اپنے منحوس ڈھانچے کو وہ مجھ پر مسلط کئے ہوئے ہے۔ خاص طور پر وہ اپنی غلطیوں میں میری قربت چاہتی ہے۔ نہ صرف قربت بلکہ پوری توجہ بھی۔ خدا کی پناہ! آپ خود سوچیں کسی کی حس لطافت کا کیا حال ہو۔

اب تک اس سے تعاون کرتا آیا تھا۔ لیکن خوف کی وجہ سے۔ جب تک سب ٹھیک چل رہا تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی تھی وہ مجھے صدیوں سے روشناس کرا رہی تھی اور میں اپنی کتاب لکھ رہا تھا۔ لیکن اب تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ میں باقاعدہ مجرم بن چکا تھا۔ ایک بڑے ڈاکٹر کی قاتلہ کا معاون اور لاک اپ کا مفرور! رے باپ رے۔ پھانسی کا پھندا میری گردن میں بھی فٹ ہو سکتا ہے۔

کوروتی وہاں لابی میں میرا انتظار کر رہی ہے اور اب تو کافی وقت گزر چکا ہے۔ نیز یہ کہ میں وارڈ بوائے بنا ہوا ہوں۔ وہ اگر مجھے دیکھ بھی لے گی تو پہچان نہیں سکے گی۔ کیوں نہ گول ہو جاؤں۔ وارڈ بوائے کی حیثیت سے اس ہسپتال میں روپوش رہوں۔ یہیں کہیں اپنا ٹھکانہ بنالوں۔ اور وقت کا انتظار کروں۔ کوروتی اگر کہیں نظر بھی آئے تو اس سے پوشیدہ ہو جاؤں۔

اسی وقت ایک عورت کی چیخ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ اس فیملی کی ایک نوجوان عورت چیختی تھی۔ وہ بزرگ جو نڈھال نظر آ رہے تھے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور عورت انہی کے گرنے پر چیختی تھی۔

میرے اندر بھی ہمدردی کی لہر اٹھی۔ یہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی میں نے جلدی سے انہیں دوسروں کے ساتھ مل کر اسٹریچر پر لٹایا۔ ایک مرد نے کہا۔

”انور بھائی! پانی مل جائے گا۔“ غالباً اس نے میرا نام اس وقت سن لیا تھا جب چھوٹی ڈاکٹر نے میرا نام پوچھا تھا۔

”ابھی لایا۔“ میں نے کہا اور تیزی سے ایک طرف دوڑ گیا۔ کینٹین یہاں سے فاصلے پر نہیں تھی۔ میں نے اس وقت دیکھی تھی جب میں اپنے لئے جگہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے منزل وائر کی بڑی بوتل خریدی اور دوڑتا ہوان کے پاس واپس آ گیا۔

ایک عورت نے جلدی سے بوتل میرے ہاتھ سے لے لی اور بخ پانی بزرگ کے چہرے پر چھڑکنے لگی۔ بزرگ کو ہوش آ گیا تو اس نے انہیں پانی پلایا۔ ایک مرد نے کہا۔

”ابا میاں..... حوصلے سے کام لیں۔ خود کو سنبھالیں۔ آپ ہی ہمت چھوڑ بیٹھیں گے تو ہمارا کیا ہوگا۔“

”اب میں ٹھیک ہوں۔“ بزرگ نے کہا۔ پھر بولے۔ ”اندر سے کوئی خبر ملی۔“

”ابھی نہیں۔“

”ہوں.....“ بزرگ بولے۔ مرد نے مجھے آواز دی۔

”انور بھائی۔“

”جی سر جی۔“ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

”پانی کی بوتل کتنے کی آئی تھی۔“

”کیوں سر جی۔“

”پیسے لے لو! تم نے ہم پر احسان کیا ہے۔“

”ہم غریبوں کو کبھی کبھی کبھی احسان کے مزے لینے دیا کرو سر جی! ہم بھی انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہماری اس چھوٹی سی خدمت کے پیسے ہمارے منہ پر مار کر ہماری خوشی ضائع کر دو گے۔“

”ارے.....“ جوان عورتوں میں سے ایک بولی۔

”پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں انور بھائی۔“ دوسری نے کہا۔ مرد کہنے لگا۔

”معافی چاہتا ہوں انور بھائی، غلطی ہو گئی۔“ بزرگ مجھے دیکھ کر مسکرائے پھر بولے۔

”کتنا پڑھا ہے۔“

”بس اتنا کہ خود کو انسان سمجھنا آ جائے دوسرا کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔“

”واہ۔“ بزرگ بولے وہ لوگ مجھ سے کافی متاثر نظر آ رہے تھے۔

اس وقت چھوٹی ڈاکٹر باہر نکلی اس کے چہرے سے افسوس نکلتی تھی۔ سب اس کی طرف لپکے۔ تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سوری صبر کیجئے۔“

ایک کھرام بچ گیا۔ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں مرد کسمسانے لگے۔ اندر سے بڑی ڈاکٹر اور نرسیں بھی باہر نکل آئیں۔ چھوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

”انور!“

”جی ڈاکٹر صاحبہ۔“

”ڈیڈ باڈی کمرے میں پہنچا دو۔“

”جی.....“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اسٹریچر کی طرف بڑھ گیا۔ بزرگ کو سہارا دے کر اسٹریچر سے نیچے اتار لیا گیا۔ میں اسٹریچر لے کر اندر چلا گیا اور میں نے نرسوں کی مدد سے نوجوان لڑکی کے مردہ جسم کو اسٹریچر پر لٹایا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے بھی دکھ کا احساس تھا۔ بہت خوبصورت اور چھوٹی سی عمر کی لڑکی تھی۔ پتہ نہیں بے چاری کو کیا ہوا تھا۔

اس کے جسم کو کمرے میں مقفل کر دیا گیا اور مرد اس کی ڈیڈ باڈی کو گھر لے جانے کے لئے انتظار کرنے لگے۔ میرے اب یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن اسی وقت اس نوجوان عورت نے مجھ سے بات کی تھی کہا۔

”انور بھائی! آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں آپ کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ ہم پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ورنہ ہم آپ سے کہتے کہ ہم سے دوبارہ بھی ملیں۔“

”آپ لوگ خود بھی اچھے ہیں ورنہ اس دور میں کوئی کسی کو کچھ نہیں مانتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے کیا بھی کیا ہے۔“

”نہیں مجھے آپ کے الفاظ بہت اچھے لگے تھے۔ ایک بات بتائیے۔“

”جی.....؟“

”کیا ثنا کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔“  
”میں نہیں جانتا۔ اگر آپ کے گھر والے بڑے ڈاکٹر صاحب سے بات کر لیں گے تو شاید نہ ہو۔ ثنا اس بی بی کا نام ہے۔“

”ہاں بہت اچھی لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئی۔“  
”آپ کی کون تھی۔“  
”نندھی میری۔ لیکن مجھے بہنوں کی طرح پیاری تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اکل تو اس پر جان چھڑکتے تھے دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔“  
”اکل وہ بزرگ۔“  
”ہاں میرے سر ہیں۔“  
”مگر اسے ہوا کیا تھا۔“

”اس پر سایہ ہو گیا تھا۔ ویرانوں میں ماری ماری پھرتی تھی۔ کہیں سے روگ لگا لائی۔ مگر یہ لوگ بڑے ماڈرن ہیں۔ سائے والے کو نہیں مانتے ہر تیسرے دن ڈاکٹر بدلتے رہے اور اس کو اس حال پر پہنچا دیا۔ مار دیا بے چاری کو۔“  
”ویرانوں میں کیوں پھرتی تھیں۔“ میں نے پوچھا۔  
”آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی تھی اسے، کھنڈرات میں گھومتی پھرتی تھی۔ کسی سہیل سے کرتی تھی جب دورہ پڑتا تھا سہیل کو پکارتی تھی۔“

”سہیل کون ہے۔“  
”کوئی بھی نہیں۔“  
”کیا مطلب؟“  
”ہوش میں ہوتی تو اپنے آپ پر لعنت بھیجتی اور کہتی کہ سہیل کوئی نہیں ہے۔ ضرور اس پر سہیل نامی کسی آسیب کا سایہ تھا۔“

”اور بھی کچھ سنا دے بھئی کیسے کم بخت ہوتے ہو تم لوگ۔ مرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں چھوڑتے اور الزامات لگاؤ میری مرحوم بیٹی پر۔“ بزرگ جو کمرے میں موجود تھے اور یہ باتیں سن رہے تھے۔ روتے ہوئے بولے اور مجھے یہ کہانی سنانے والی عورت نے دانتوں میں زبان دبالی۔ اسے شاید بزرگ کی موجودگی کا خیال نہیں رہا تھا۔  
اسی وقت اچانک مردہ لڑکی کے بدن میں جنبش ہوئی اور اس کی آواز سنائی دی۔ ”سہیل“ یہ آواز سن کر نہ صرف کمرے میں موجود لوگ ہلکے میں بھی اچھل پڑا۔ بزرگ بڑی حیرت سے اٹھے اور لڑکی کے پاس پہنچ گئے۔  
”ثنا..... میری بیٹی۔ ثنا میری جان۔“ انہوں نے لڑکی کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر روتے ہوئے کہا۔  
”ابو..... وہ سہیل۔“ لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا اور میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ ”سہیل میرے پاس آؤ۔“ لڑکی نے پھر کہا اور اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

مجھ سے ہاتس کرنے والی لڑکی بدحواسی سے اٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ شاید مردوں کو اس بارے میں خبر کرنے گئی تھی کہ ثنا زندہ ہے۔ بزرگ نے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ میں احمقوں کی طرح چلتا ہوا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی نے ہاتھ پکڑ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔  
”میں اب کبھی تمہیں نہیں جانے دوں گی سہیل، کبھی نہیں۔“

”مم..... میرا نام.....“ میں نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بزرگ جلدی سے بول پڑے۔  
”ہاں بیٹی! سہیل اب کبھی کہیں نہیں جائے گا۔ وہ ہمارے پاس رہے گا۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے آنکھ سے مجھے اشارہ کیا کہ میں خاموش رہوں۔ ان کے انداز میں عاجزی تھی۔

اتنی دیر میں وہ سارے لوگ فوراً گھس آئے جو ڈیڑھاڑی کو لے جانے کے انتظامات کرنے گئے تھے۔ سب لڑکی کے گرد جمع ہو گئے اور اسے ٹٹولنے لگے۔ بزرگ سرکشی کے انداز میں ان لوگوں کو ساری تفصیل بتا رہے تھے۔ پھر ایک مرد جا کر چھوٹی ڈاکٹر کو بلا لایا۔ وہ بھی ثنا کو زندہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اس نے اٹیٹھکوپ سے لڑکی کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ پھر موبائل فون نکال کر شاید بڑی ڈاکٹر کو صورت حال بتانے لگی۔  
کچھ ہی دیر میں بڑی ڈاکٹر آگئی۔ دو تین مرد ڈاکٹر بھی ساتھ تھے۔ سب نے اچھی طرح اس کا جائزہ لیا۔ پھر ایک ڈاکٹر نے کہا۔

”یہ حیرت انگیز طور پر بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ لوگ بتائیے انہیں لے جانا چاہتے ہیں یا دو تین دن انہیں یہاں آبزرویشن میں رکھا جائے۔“  
”نہیں ڈاکٹر! ہم اسے لے جائیں گے۔“ بزرگ نے کہا۔  
”ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی! رابعہ ان کے پیپر بنا دو۔“  
”سہیل! میرے پاس آ جاؤ۔“ ثنا نے پھر کہا، اور میں گہرائی ہوئی نظروں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا، ایک بزرگ نے کہا۔

”ایک منٹ ٹھائیے۔“ بزرگ نے کہا اور پھر میری طرف رخ کر کے بولے۔  
”انور ذرا میری ایک بات سنو۔“ یہ کہہ کر وہ تھوڑے سے پیچھے چلے گئے، میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا۔  
”انور میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، لیکن جس قدر شریف انسان ہو بس میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ بیٹے میرا نام عبدالکحیم ہے، کاروباری آبادی ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو تین فیکٹریاں چلتی ہیں میری۔ یہ میرا خاندان ہے اور یہ بیٹی اس خاندان کی روح ہے۔ ہم سب اس پر جان دیتے ہیں اور اس کی بیماری نے ہماری جان لے لی ہے۔ بیٹے یہ بالکل ٹھیک تھی، لیکن بس قدرت کی مرضی! اچانک ہی بیمار ہو گئی اور اس کا ذہن متاثر ہو گیا، اس پر دورے پڑتے ہیں اور یہ عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ خیر میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تم نے ہماری اتنی مدد کی ہے تھوڑی سی مدد اور کرو، یہ تمہیں سہیل کہہ کر پکار رہی ہے، اگر تم اس کے قریب نہ رہے تو اس کا ذہنی توازن پھر بری طرح بگڑ جائے گا۔ کچھ عرصے کے لئے اپنی اس ملازمت سے چھٹی لے لو، ہمارے ساتھ رہو، ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے بلکہ اگر تم اس ملازمت کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہی رہنا پسند کرو گے تو ہم تمہیں موجودہ تنخواہ سے چار گناہ زیادہ تنخواہ دیں گے، یہ میرا وعدہ ہے تم سے تمہاری ادھر ڈیوٹی بھی ہے تو جس سے کہو میں اس سے بات کر لوں، تم ہمارے ساتھ چلو یہ ثناء کے ذہنی توازن کی بہتری کے لئے بہت ضروری ہے۔“

میرا تو دل خوشی سے کھل اٹھا تھا، کیا شاندار موقع عطا کیا تھا قدرت نے۔ ادھر کوروتی برفے میں لمبوس میری تلاش میں سرگرداں ہوگی کہ اتنے لمبے وقت کے لئے میں کہاں چلا گیا۔ میں بے فکر اس کے ساتھ تھا اور گزارہ کر رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ اب یہ ایک عذاب بن کر مجھ پر مسلط رہے گی اور مجھے وہ کچھ کرنا پڑے گا جو خودکشی کے مترادف ہوگا۔ آخر میں انسان تھا نفاست پسند تھا، میرے اندر کچھ لطافتیں بھی تھیں، لیکن اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں کوروتی کی قربت مجبوری بن گئی تھی۔ اگر اس طرح سے میں اس خاندان میں کچھ عرصے پوشیدہ رہ سکوں تو ہو سکتا ہے آگے چل کر

دُشمن بن جاؤں گا۔“

میں نے پر ادب لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! یہ تو آپ پر منحصر ہے، مجھے تو میری نوکری ختم کرا کے یہاں لایا گیا ہے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ میں یہاں رہوں۔ آپ بے شک اپنے معاملات خود دیکھئے گا اگر عزت سے مجھے یہاں رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھی قطعی اس بات میں دلچسپی نہیں رکھتا کہ آپ مجھے ثناء کے ساتھ رکھیں۔ میں غریب آدمی ہوں لیکن آپ سے درخواست کرتا ہوں ہاتھ جوڑ کر کہ میری توہین نہ کریں۔“

”نہیں بیٹے نہیں، میں تمہاری توہین نہیں کر رہا بس خدشے کا اظہار کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے جوان بیٹی کا باپ ہوں تم خیال رکھنا۔“

”جی.....“ میں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا اور ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ میں تو صرف کوروتی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے اس عالیشان کوٹھی میں رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن وہی ہوا مجھے پہننے کے لئے میرے ہی سائز کے لباس دیئے گئے تھے، یقینی طور پر کسی کے ہوں گے وہ لباس تبدیل کر کے میں نے ثناء کے پاس سے جانا چاہا لیکن اس نے مجھے پھر پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہے ہو سہیل؟“

”رات بہت زیادہ ہو چکی ہے ثناء میں سونے جا رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ تم کہیں اور جا کر سوؤ گے؟“

”ہاں ثناء میرا آپ کے کمرے میں سونا مناسب نہیں ہے۔“

”ہرگز نہیں، میں پاگل ہو جاؤں گی سہیل، تمہیں یہیں رہنا ہے۔“ بزرگ نے فوراً میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹے کوئی بات نہیں ہے، ہم تمہارے لئے بستر لگوائے دیتے ہیں۔“

سارا انتظام کیا گیا۔ میرے لئے یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا اور حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن میں واقعی کوئی کھوٹ نہیں تھی، لیکن جب کوٹھی میں سناٹا چھا گیا اور ہر طرف خاموش ہو گئی تو ثناء اپنی جگہ سے اٹھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

”سو گئے سہیل؟“

”نہیں..... نہیں۔“

”میں تمہارے پاس آ جاؤں۔“

”کک..... کیوں؟“ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور وہ ہنستی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس پہنچ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے اوسان خطا ہو گئے تھے، لیکن ثناء کی لگاؤٹ مجھے عجیب و غریب راستے دکھا رہی تھی اور پھر یہ لگاؤٹ میری مجبوری بن گئی۔ جو کچھ بھی تھا مجھے اپنی زندگی عزیز تھی۔ ایک بپارے مصنف پر جو بیت رہی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔

دوسری صبح میرے لئے بڑی سحر انگیز تھی۔ دلکش ثناء میرے وجود میں سا چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش اس کا ذہنی توازن ایسا ہی رہے۔ میری اچھی خاصی پذیرائی ہو رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کسی نے مجھے مشکوک لگا ہوں سے نہیں دیکھا حالانکہ یہاں کسی کو یہ پتہ چل جاتا کہ مجھ غریب نے نہ چاہنے کے باوجود کیسی رات گزاری ہے تو میری تو کوئی نہ سنا اور یہی کہا جاتا کہ آخر میں سچ تھا ایک گھٹیا سا وارڈ بوائے جبکہ ایسی بات نہیں تھی۔ میں وارڈ بوائے تھا ہی نہیں بلکہ ایک

کوئی ایسا موقع نکل آئے کہ میری زندگی بچ جائے۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لئے اب تھوڑا سا توقف ضروری تھا، چنانچہ میں نے گردن جھکا لی اور سوچنے لگا پھر میں نے کہا۔

”حیران کن بات یہ ہے محترم بزرگ کہ میں بھی اس کائنات میں تنہا ہوں، کوئی بھی نہیں ہے میرا۔ یہیں اسی ہسپتال کے کسی گوشے میں پڑا رہتا ہوں اور زندگی یہیں تک محدود ہے۔ میں نے بے لوث اپنا فرض پورا کیا ہے چونکہ ایک وارڈ بوائے کی حیثیت سے یہ میری ڈیوٹی تھی، لیکن اگر تقدیر مجھے آپ کی خدمت میں لے جانا چاہتی ہے تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ مجھے ایک خاندان مل جائے آپ کی خدمت کر کے جو وقت گزرے گا وہ میرے لئے باعث فخر ہوگا۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے، میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں گلے لگا لوں، لیکن میں ذرا مختلف فطرت کا مالک ہوں جبکہ یہ لوگ اپنے آپ کو لئے دیئے رکھتے ہیں۔ یہ بچی بے شک میری اولاد کی اولاد ہے لیکن مجھے اتنی عزیز ہے کہ یوں سمجھ لو جس طرح کسی جادوگر کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح میری جان ثناء میں ہے۔ چلو بس ٹھیک ہے جاؤ ذرا دیکھو وہ کیا کہہ رہی ہے۔“

میں خوشی سے قدم اٹھاتا ہوا ثناء کے پاس پہنچ گیا، وہ پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ بزرگ ان مردوں کو میرے بارے میں سمجھا رہے تھے۔ میں ثناء کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولی۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گے سہیل! میرے پاس رہو گے، سمجھ رہے ہو نا؟“

”ہاں ٹھیک ہے، میں تمہارے پاس ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر باقی کارروائیاں ہوئیں، مجھے صرف یہ خوف تھا کہ کہیں کوروتی مجھے تلاش کرتی ہوئی میرے پاس نہ پہنچ جائے، میں بس اسی خوف کا شکار تھا اور اس وقت تک رہا جب تک میں ثناء کے ساتھ ایک شاندار لینڈ کروزر میں بیٹھ کر نہ چل پڑا۔ کوروتی مجھے پانے میں ناکام رہی تھی۔ ثناء میرے شانے سے سر لکائے بیٹھی کافی مطمئن نظر آ رہی تھی، میں نے مردوں کے چہروں پر ہلکی سی ناگواری بھی محسوس کی، لیکن مجھے کیا پروا تھی۔ مجھے تو لے کر آیا گیا تھا، اگر یہ لوگ میری اس کیفیت کو نا پسند کریں گے تو آرام سے وہاں سے نکل آؤں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا، اگر ان کے درمیان کچھ عرصے کے لئے جگہ مل جائے تو کم از کم حالات قابو میں آ سکتے ہیں، غرضیکہ جس کوٹھی میں گاڑیاں داخل ہوئیں وہ بھی قابل دید تھی۔

سب لوگ اندر چلے گئے۔ میں بھی ساتھ ہی تھا اور مجھے ثناء کے ساتھ جس بیڈروم میں پہنچایا گیا وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، بہترین ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم جہاں اعلیٰ ترین فرنیچر پڑا ہوا تھا، پھر مردوں میں سے ایک شخص نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولا۔

”انور ہے نا تمہارا نام؟“

”جی سر!“

دیکھو انور ہم اپنے والد صاحب کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔ میں ثناء کا باپ ہوں، میرا نام عبدالسعید ہے، میرے والد ثناء سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ اس وقت ذہنی عدم توازن کا شکار ہے اور پتہ نہیں تم اس کے ذہن میں سہیل کی حیثیت سے کیوں آ گئے ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کرے لیکن اگر تم ایک شریف نوجوان ہو تو ہماری عزت آبرو کا خیال رکھنا، میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا کیونکہ تم ازراہ انسانیت یہاں آئے ہو جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں، لیکن انور اپنی حدود میں رہنا۔ ہماری مجبوری سے نا جائز فائدہ نہ اٹھانا۔ ورنہ تم یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری زندگی کا

نامور مصنف تھا، ایک اور شکر کی بات یہ تھی کہ یہاں شاید ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جو ادب سے دلچسپی رکھتا ہو یا ناول یا کہانیاں اور افسانے پڑھتا ہو ورنہ میرے ناول پر میری تصویر بھی ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس شکل میں با آسانی پہچانا جاسکتا تھا۔

خیر جناب بہترین ناشتہ ملائد لے ہوئے لباس میں میری شخصیت پھر گھر آئی تھی اور میں نے دیکھا کہ کئی نگاہوں نے مجھے غور سے دیکھا ہے۔ ایسے وقت میں میرا دل لرز جاتا تھا لیکن وہی بات جس پر میں خدا کا شکر ادا کر چکا ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی ناول افسانے اور کہانیاں پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور مجھے نہیں پہچانا گیا تھا۔ دن بھر خاطر مدارات ہوئی اور پھر دوسری رات آگئی۔ مجھے اپنے آپ پر ہنسی آرہی تھی کہ ذیشان عالی وہ جو کہتے ہیں ناکہ شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے۔ تو باقاعدہ مجھے شکر کا استعمال کرایا جا رہا تھا اور یہ شکر ثناء کی شکل میں تھی۔ لیکن دوسرے دن تھوڑے خوف کا احساس ہوا ایک اخبار میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا جو پچھلے دن کا تھا۔

میں نے اسے پڑھا تو اس میں خدا کے فضل سے میری تصویر تو نہیں چھپی تھی۔ لیکن میرے بارے میں بڑی گورہ افشائیاں کی گئی تھیں۔ پولیس نے اس عمارت پر چھاپہ مارا تھا جس کے بارے میں پڑوسیوں نے بتایا تھا کہ یہاں ایک انوکھا وجود آتا ہے جو ایک خاص قسم کا کہیں اوڑھے ہوتا ہے۔ یہ عمارت بالکل ویران ہے اور یہاں بھی کبھی بس ایک عورت نظر آتی ہے جو کافی دن سے نظر نہیں آئی، البتہ کوئی اور عورت کہیں اوڑھے اپنا چہرہ پورا ڈھکے ہوئے آتی جاتی نظر آتی ہے۔ یہ اطلاع پولیس کو دی گئی تھی اور پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تھا۔

چوتھے دن کے اخبار میں بڑی ہنگامہ خیزی تھی اور اس دن جو کچھ ہوا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ پولیس کمشنر نے عمارت کی بھرپور تلاشی لی تھی اور انہیں ایک پراسرار کمرے میں ایک انوکھی کتاب ملی تھی۔ وہ پتھر کی کتاب تھی جو بہت بڑی تھی اور کمرے کی دستوں میں پھیلی ہوئی تھی اس کے اوپر تک جانے کے لئے سیزدیاں بنی ہوئی تھیں۔ پولیس کمشنر اس حیرت انگیز کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے اوپر گئے ان کے ساتھ دو اور اعلیٰ افسران تھے کتاب میں عجیب قسم کی تختیاں سی ابروی ہوئی تھیں۔ پولیس کمشنر نے ان میں سے ایک تختی پر پاؤں رکھا تو اچانک ہی کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح کھل گئی اور پولیس کمشنر اس میں غروب ہو گئے یہی کیفیت ان دو اعلیٰ افسران میں سے ایک کی ہوئی تھی۔ وہ بھی کتاب کے تعویذ جیسے پتھر پر چڑھا اور اس میں گم ہو گیا۔ تیسرا آفیسر بھاگ کر باہر آ گیا تھا اور اس نے یہ سنسنی خیز خبر سب کو سنائی تھی۔ چنانچہ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔

ماہرین کے پورے گروپ نے سارا دن اس کتاب کی چھان بین کی لیکن اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس کے نیچے کیا تھا، یہی سوچا گیا تھا کہ شاید کوئی عظیم الشان تہہ خانہ ہے۔ چنانچہ یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ وہاں پر کھدائی کی جائے اور دیکھا جائے کہ پولیس کمشنر اور دوسرا افسر اعلیٰ کہاں گم ہو گیا اس کے لئے حکومتی کاروائیاں جاری تھیں۔ میں دہشت بھرے انداز میں یہ خبر پڑھ رہا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ پولیس کمشنر اور اس کا ساتھی لازمی طور پر تاریخ کے کسی دور میں پہنچ گیا ہوگا۔

گیا بد بخت زندگی سے پتہ نہیں اب اس کی اس دور سے واپسی ہوگی یا نہیں بظاہر تو اس کے کچھ امکانات نہیں تھے دوسری بات اس کتاب کی تھی۔ پتہ نہیں اس کے سلسلے میں کیا کیا کارروائی ہوئی کہ بہت ہی قیمتی چیز خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ کتاب کے نیچے کوئی تہہ خانہ تلاش کریں گے، لیکن تاریخ کہیں تہہ خانے میں قید تو نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کتاب کے نیچے سے کیا برآمد ہو کچھ ہو بھی یا نہیں یہ تو کوروتی کی جادوگری تھی کہ اس نے ایک ایسی کتاب قائم کر لی تھی۔ بڑی افسوسناک کیفیت تھی۔ انتہائی قیمتی چیزیں ضائع ہو رہی تھیں اور ان کے تحفظ کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، کوروتی

یقینی طور پر مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ ورنہ اب تک وہ مجھ تک پہنچ گئی ہوتی، لیکن میں ان تمام تہہ خانوں کے باوجود الجھن میں تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ عبدالحکیم صاحب کے ہاں کچھ مہمان آئے ان میں عورتیں اور مرد بھی تھے، ایک شخص بہت ہی اسارت اور بڑی اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا اس کی آنکھوں سے ذہانت نکلتی تھی۔ چہرے کی بناوٹ بھی ذرا خاص ہی قسم کی تھی۔ میں کسی کام سے سامنے آیا تو وہ شخص مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور پھر اس نے کہا۔

”سنو سنو سنو میری بات سنو۔“

میں جھجکا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“

”سہیل۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے عبدالحکیم صاحب کے دوسرے بیٹے سے جو اس وقت میرے قریب ہی موجود تھا پوچھا۔

”سہیل صاحب سے تعارف نہ ہو سکا۔“

اس شخص نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے عزیز ہیں، کچھ دن سے ہمارے ساتھ ہی مقیم ہیں۔“ وہ ساری حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا۔

”اچھا اچھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر سہیل صاحب! اصل میں آپ کا چہرہ بڑا شائسا سا لگا، نجانے کہاں آپ کو دیکھا ہے؟“

میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں، اسی وقت عبدالحکیم صاحب کے دوسرے بیٹے نے اس کا تعارف کرایا۔

”یہ سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے بہت بڑے افسر ہیں، میرے ماموں زاد بھائی ہیں، اشتیاق احمد ہے ان کا نام؟“

اس آدمی نے مسکرا کر گردن ہلائی تھی۔ لیکن میرے پاؤں بے جان ہو رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں زمین میں گر پڑوں گا۔ سی آئی ڈی آفیسر میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور کہا تھا کہ اسے میرا چہرہ شائسا معلوم ہوتا ہے۔ میری جان نکل گئی تھی۔ اور لازمی امر تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ پولیس بلکہ سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ ایسے ہی نہیں بن گیا ہوگا۔ اب وہ میرے بارے میں چھان بین کرے گا۔ اب کیا کروں یہاں سے فرار ہو جاؤں یا تقدیر کے فیصلے کا انتظار کروں۔ ویسے بھی میں جانتا تھا کہ یہ قیام گاہ میرے لئے مستقل نہیں ہے۔ بیچاری لڑکی ٹھیک ہوگی تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گی یہ رات میرے لئے بڑی بھیاں تک تھی۔ اب تک ثناء کے ساتھ جو پیش کئے تھے وہ ناقابل فراموش تھے بڑی دلکش لڑکی تھی۔ حالانکہ ذہنی مرینہ تھی لیکن اب آپ کو کیا بتاؤں شرم آتی ہے۔

آخر کار فیصلہ کیا کہ یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن رات کے کوئی تین بجے ہوں گے۔ ثناء کے ساتھ آخری دلکش لمحات گزر رہے تھے۔ اس نے بھی اپنی محبت کا ثبوت حسب معمول دیا تھا۔

تو میں بتا رہا تھا کہ رات کے تین بجے کا وقت تھا میں ثناء کے گداز بدن پر ہاتھ رکھے نیم غنودگی کے عالم میں تھا کہ اچانک ایک عجیب سے احساس نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے ثناء کا بدن کچھ عجیب عجیب سا لگا، یوں جیسے ثناء کے گداز بدن کی گداز یوں میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوئی ہو، ایسا لگا جیسے اس میں ہڈیاں ابھر رہی ہوں، نہ سمجھ میں آنے والی ہڈیاں۔ میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں نے آنکھیں میٹھا میٹھا کر ثناء کو دیکھا، یہ دیکھ کر میری دہشت کی انتہا نہ رہی کہ ثناء کے پورے بدن سے گوشت غائب ہوتا جا رہا تھا اور سوچی ہڈیاں ابھرتی جا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بے حد بھیاں تک تھا اور بدن کی کیفیت بھی عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ بدن چونکہ لباس میں ڈھکا ہوا تھا اس لئے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن چہرہ بالکل

نمایاں تھا۔

ایک استخوانی ڈھانچہ۔ میرے حلق سے ہلکی سی آواز نکل گئی تو ثناء نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، کچھ لمحے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی اچھل پڑی وہ اچھل کر بیٹھ گئی تھی اور ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ مجھے صاف سنائی دی تھی۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں خوف سے قریب المرگ ہو گیا تھا، ثناء نے اپنے ہاتھوں کی کلاٹیاں ٹٹولیں پھروں پر سے کپڑا ہٹا کر انہیں دیکھا، پھر اس کی آواز ابھری۔

”ذیشان عالی۔“ اور یہ آواز میرے خدا میرے خدا، یہ آواز کوروتی کی تھی۔ میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ کوروتی نے کہا۔

”ذیشان عالی!“

”سک..... سک..... کور..... کوروتی۔“

”ہاں میرا کوروتی ہی ہوں۔“

”لل..... لیکن لیکن.....“

”تم نے بیوفائی کی ذیشان عالی، تم بے وفا لکے۔“

”سک..... کیوں؟“

”ہسپتال میں اپنی دانت میں تم نے مجھ سے جان چھڑائی تھی۔ مجھے وہاں چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتی پھری، بڑے خطرناک حالات سے گزرتا پڑا مجھے میں تمہیں بتاؤں ذیشان عالی، میں کوئی روح نہیں ہوں ایک زندہ وجود ہوں جسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ مجھ پر گولیاں چلائی جائیں تو میری ہڈیاں ٹوٹ سکتی ہیں مجھے اگر کہیں بلندی سے نیچے گرنا پڑے تو میرا وجود چور چور ہو سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ میں اس وجود کو سمیٹ کر پھر وہاں سے چل پڑوں کیونکہ موت مجھ سے گریزاں ہے۔ ذیشان عالی آخر کار میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی جہاں تم ایک واڈبوائے کی حیثیت سے ان لوگوں کے درمیان اپنی جگہ بنا رہے تھے۔

وہ لڑکی جس کا نام ثناء تھا بیچاری مرچکی تھی اور جب انہوں نے اسے مردہ قرار دے دیا اور اس کی ڈیڈ باڈی کو اس کے عزیز واقارب کے حوالے کرنے لگے تو میں نے غنیمت سمجھا کہ میں اس کے وجود کو اپنالوں۔ میں بتا چکی ہوں کہ میرا علم اتنا ہے کہ میں یہ عمل کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں ثناء کے جسم میں داخل ہو گئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی تمہارے علم میں ہے۔ بس تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکی ثناء نہیں بلکہ میں ہوں وہ بیچاری تو اسی وقت مرچکی تھی۔ تم نے چالاکی سے کام لیا اور یہاں تک آ گئے۔

میں دم بخود تھا، میرے ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے اچانک ہی اس نے کروٹ بدلی اور میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا کہ ثناء کے اندر سے کوروتی باہر نکل آئی ایک سکھا سڑا استخوانی ڈھانچہ جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا، وہ کوروتی کا ڈھانچہ تھا، لیکن بستر پر بھی مجھے ایک خوفناک شکل نظر آئی تھی۔ یہ ثناء تھی جس کا بدن گل چکا تھا اور جگہ جگہ سے اس کی ہڈیاں جھانکنے لگی تھیں۔ یہ اس کا اصل وجود تھا جو اتنے دنوں کے اندر اندر گلنے لگا تھا۔ اس سے شدید لعفن اٹھ رہا تھا، اتنا کہ انسانی ذہن پاگل ہو جائے میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کوروتی یہاں سے تو نکلو ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں نکلو..... پھر موقع ملے تو مجھے چھوڑ کر کہیں چلے جانا۔“

”طنزنہ کرو کوروتی طنزنہ کرو براہ کرم اس کمرے سے تو باہر نکلو۔“ کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے

دروازے کی جانب بڑھ گئی، میں درحقیقت اس وقت غم کا شکار تھا، آخر انسان ہوں کئی دن ثناء کے ساتھ رہا تھا اور وہ میری قربت میں بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ لیکن ثناء نہیں بلکہ کوروتی اور یہ کوروتی کا عجیب و غریب انداز تھا، وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور میرے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔

”آؤ آگے آؤ..... یہاں ایک محفوظ جگہ ہے۔ جہاں ہم عارضی طور پر چھپ سکتے ہیں آؤ میں تمہیں بتاؤں وہ کون سی جگہ ہے۔“

اس کوشی کے گیٹ کے پاس ایک انگیسی بنی ہوئی تھی۔ انگیسی خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس کا اوپری حصہ کسی خاص ڈیزائن پر بنایا گیا تھا جہاں ایک انتہائی کشادہ برج جیسی جگہ تھی۔ اس برج تک پہنچا جاسکتا تھا، بڑی محفوظ جگہ تھی۔ ہم اسی باڑھ کے ساتھ ساتھ انگیسی تک آئے تھے۔ خالی انگیسی کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور مجھے لئے ہوئے برج پر پہنچ گئی۔

”کیسی جگہ ہے؟“ اس کی آواز ابھری جس میں مسکراہٹ کا انداز تھا، میں اوپری سائیس لینے لگا، جگہ کے بارے میں میں کیا تبصرہ کرتا، مجھے کوروتی کی ہنسی سنائی دی تھی پھر اس نے کہا۔

”پوری زندگی کا تجربہ ہے میرا اور میں جس زندگی کی بات کرتی ہوں وہ ایک قدیم تاریخ ہے۔ تو میں اپنے تجربے کے بارے میں بتا رہی تھی کہ مرد کبھی عورت سے غفلت نہیں ہوتا، اسے صرف اپنی پسند سے دلچسپی ہوتی ہے اور انہی میں تم بھی ہو۔“

خیر وقت گزرا اور پھر ہم نے برج کے روشن دانوں سے دیکھا کہ پوری کوشی میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ ملازم اور دوسرے لوگ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ مزید یہ ہوا کہ دن کے دس بجے کے قریب پولیس کی کئی گاڑیاں دھمکانی ہوئی کوشی میں گھس آئیں اور کوشی کی ناکہ بندی ہونے لگی۔ پھر کچھ اور ہوا کوروتی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ لیکن میرے اوسان خطا تھے میں نے کہا۔

”کیا کہتی ہو؟“

”ارے کیسے ادیب ہو تم، صورت حال سے حالات کا جائزہ نہیں لے سکتے اور اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کیا ہو رہا ہے؟“

”مطلب؟“

”پہلی بھاگ دوڑ جو تھی وہ اس سلسلے میں تھی کہ ثناء کے کمرے سے لعفن پھیلا ہو گا، سڑے ہوئے گوشت کا لعفن کیونکہ بہر حال وہ مکمل طور پر ڈھانچہ نہیں بنی ہے بلکہ اس کا گوشت آہستہ آہستہ گل رہا ہے اور اس سے بدبو پھیل رہی ہے۔ تو جب یہ بدبو پھیلی ہوگی تو لوگوں نے وہاں پہنچ کر دیکھا ہو گا کہ کیا صورت حال ہے اور اس کے بعد جو بھگدڑ مچی ہے وہ اس کا نتیجہ تھی اور اب جو یہ پولیس کی گاڑیاں آئی ہیں وہ سو فیصدی تمہاری تلاش میں آئی ہیں۔

”یار ذیشان عالی! تمہارا تجربہ صرف چند سالوں کا ہے۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے اور میری زندگی کتنی ہے تمہیں اس کا علم ہے۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا بے فکر ہو، اور اگر انگیسی میں کوئی آ بھی جائے تو اس برج کے بارے میں تو سوچے گا بھی نہیں اور پھر ذیشان عالی تم فکر مند کیوں ہو، میں ہوں نا، اگر سی آئی ڈی والوں نے تم پر قابو پا بھی لیا تو میں تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گی۔“

مجھے ایک دم غصہ آیا اور میں نے کہا۔ ”اور اگر انہوں نے تم پر بھی قابو پا لیا تو۔“

میرے اس جھلائے ہوئے انداز پر وہ خوب ہنسی پھر بولی۔ ”تو کیا کریں گے مجھے سزائے موت دے دیں گے نا، میری ہڈیوں کو کلہاڑیوں سے کوئیں گے، جب وہ کوٹ چکیں گے تو میں اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں گی اور ان کی ہوا خراب ہو

جائے گی۔“

”مگر میں تو کھڑا نہیں ہو سکوں گا، تمہیں نہیں معلوم پولیس کتنی رحم دل ہوتی ہے اور کیا سلوک کرے گی ایک مفرد مجرم کے ساتھ۔“

”اب یہ تو غلط بات ہے ویسے بھی تم نے اپنی جان بچانے کے لئے مجھے دھوکہ دیا تھا، چلو خیر تم میرے محبوب ہو میں نے یہ سب کچھ اس حساب میں ڈال دیا ہے۔“

ہم روشن دان سے دیکھتے رہے۔ ایسویٹس آئی ڈاکٹر آئے، نرسین آئیں، پولیس بھاگ دوڑ کرتی رہی، اندر رونے پٹنے کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ عہد اکہم صاحب پتہ نہیں کیا کیا کرتے رہے۔ پورا دن یہ ہنگامہ جاری رہا۔ غالباً شام کی تدفین کے لئے کوششیں کی جاتی رہیں اور اس کے بعد شام کو مغرب کے وقت اس کا جنازہ آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ لے جایا گیا، پولیس بھی شریک تھی۔ فوٹو گرافر بھی آئے تھے، پریس بھی موجود تھا، عجیب ہی ہنگامہ رہا تھا۔ پوری کوٹھی لوگوں سے بھری پڑی تھی اور یہ حیرانی کی بات تھی کہ انکیسی کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی تھی غالباً وہ لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ دو خطرناک مجرم اسی کوٹھی میں چھپے ہوئے ہیں، ان کا تو خیال ہو گا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکا ہو گا وہ یہاں سے بھاگ گئے ہوں گے لیکن انہوں نے کیا سوچا ہو گا، میں نے کوروتی سے کہا۔

”کوروتی مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔“

”تھوڑا سا انتظار کر لو، تھوڑا سا ذرا اندھیرا بھیل جائے اور یہ لوگ ذرا پرسکون ہو جائیں میں تمہارے لئے کھانے پیئے بغیر گزر گیا تھا اور یہ بڑی افسوسناک بات تھی۔ لیکن صبر کے سوا اور چارہ کا کیا تھا۔

بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں دماغ کی جو حالت تھی خدا ہی جانتا ہے۔ کوروتی اس وقت ایک دیوار سے کمر لگائے بیٹھی تھی۔ ابھی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اس لئے کوروتی کا ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ میرے خدا میں خود اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے کوروتی کی اصلیت نہ معلوم ہوتی اور میں ایسے کسی ڈھانچے کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیتا تو خوف سے میری سانس بند ہو سکتی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ تبھی کوروتی کی آواز ابھری۔

”عالی۔“

”ہوں؟“

”نیند آ رہی ہے۔“

”ہاں دل چاہ رہا ہے داغی نیند سو جاؤں۔“

”آہ..... کیا دلکش بات کہی ہے۔“

”اس میں کیا دلکشی ہے؟“ میں نے جلتے جلتے لہجے میں کہا۔

”ہوں کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا“

”ہاں موت کتنی دلکش چیز ہے۔ زندگی سے تھکے ہوئے کسی انسان سے پوچھو۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں

کہا۔

”تم مرنا چاہتی ہو۔“

”چھوڑو انہیں باتیں مت کرو کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ خاموش ہو گئی، مجھ پر واقعی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ ”اچانک

اس نے کہا۔

”عالی۔“

میں چونک پڑا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”یار اس مشکل کا کوئی حل نکالنا پڑے گا۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔ اس شخص نے ہمیں اس لڑکی کی کہانی سنائی تھی جس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ اور ایک درویش نے اس کے باپ کو ایک نسخہ بتایا تھا۔“

”ہاں۔“

”ایسا کوئی درویش ہمیں نہیں مل سکتا۔“

”کہاں ملے گا۔“ میں نے کہا۔

”تلاش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی مل جائے۔“

”ہوں.....“ میں نے مختصراً کہا۔ اصل میں پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کوروتی خاموش ہو گئی۔ میری پلکیں پھر جڑنے لگیں اور پھر میں سو گیا۔ پتہ نہیں یہ نیند تھی یا بھوک پیاس کی غشی۔ خیر اس وقت ماحول پر گہرا سناٹا مسلط تھا جب کسی نے میرے بدن کو ہلایا اور میرے کانوں میں آواز ابھری۔

”عالی۔“

”کیا ہے؟“ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ نینتوں میں ایک عجیب سی خوشبو آئی تھی۔ عمدہ قسم کے قورے کی خوشبو۔

”ارے ارے پریشان مت ہو۔ کھانا لائی ہوں تمہارے لئے پانی بھی ہے۔ ویسے انکیسی میں کوئی نہیں ہے۔ تم چاہو تو نیچے جا سکتے ہو کوئی ضرورت ہو تو۔“

”اس وقت سب سے بڑی ضرورت کھانا ہے۔ کہاں ہے۔ کیا کچھ روشنی ہو سکتی ہے۔“

”نہیں روشنی خطرناک ہو گی ایک کام کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اور ایک طرف بڑھ گئی۔ انکیسی میں کئی روشن دان تھے جن میں سے بعض میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ لیکن گرد مٹی سے یہ شیشے دھندلائے گئے تھے۔ اس نے ایک روشن دان کھول دیا اور حیرت انگیز روشنی اندر گھس آئی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند کھلا ہوا تھا۔ کوروتی نے وہ سارے برتن میرے سامنے رکھ دیئے۔

عمدہ قسم کا قورمہ، روغنی نان وغیرہ تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ کھانا ہے جو رشتے دار کسی کی موت پر دیتے ہیں۔ اس وقت اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کوروتی کو کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے پیٹ بھر کر کھایا بلکہ ضرورت سے زیادہ کھایا۔ کوروتی کچھ کپڑے وغیرہ بھی لائی تھی۔ میں نے شکر گزاری سے کہا۔

”تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے کوروتی۔“

”کاش میں کہہ سکتی کہ میری جان بھی تمہارے لئے حاضر ہے۔ لیکن میں ایک بات کہوں۔ تم نے مجھے خود سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میرے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ کوروتی خاموش رہی پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ”میں نے تم سے کسی درویش یا جادوگر کے بارے میں کہا تھا۔“

”ہاں۔“

”تلاش کرو کوئی سنیا سی یا بزرگ ایسا مل جائے جو میرا علاج کر دے۔“

”ہم کوشش کریں گے ویسے ایک بات بتاؤ۔ اچانک تمہاری ہیبت کیسے بدل گئی، شام کا بدن تبدیل کیسے ہو گیا؟“

”یہ میرے لئے بھی ایک نیا تجربہ تھا عالی۔“ وہ بولی۔



”وہ کیا۔“  
”یہ کہ اگر میں کسی کے مردہ بدن پر قبضہ کر لوں تو بس ایک مخصوص وقت تک ہی یہ قبضہ قائم رہ سکتا ہے اس کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

”پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”کبھی نہیں۔“ پہلے میں نے یہ عمل کیا ہی نہیں۔

”پھر تم نے ثناء کے بدن پر یہ عمل کیسے کیا۔“

”اس علم کا مجھے پتہ تھا۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تمہارے گم ہو جانے کے بعد میں ہسپتال میں تمہیں تلاش کرنے لگی اور آخر میں میں نے تمہیں وارڈ بوائے کے روپ میں دیکھ لیا۔ بس پھر میں تمہارے پیچھے لگ گئی اور میں نے پہلی بار ثناء کے بدن پر قبضہ جمایا۔ میرا خیال تھا کہ میں طویل عرصہ تک ثنائی رہوں گی لیکن پھر گزری رات کو اچانک مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میں ثناء کے بدن سے نکل رہی ہوں۔ میں خود چونک پڑی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کے بدن سے نکل گئی۔ اور اس کا سزا ہوا تعفن زدہ بدن نمایاں ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ عمل زیادہ طویل نہیں ہوتا۔“

”ہوں۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ اس وقت تمام لوگ تھک ہار کر سو گئے ہیں۔ میں مہیا کر سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں۔ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”میری بھی نہیں۔“ اس کی آواز میں محبوبیت تھی۔ میرا دم نکل گیا۔ اس کے لہجے کا مفہوم ظاہر تھا۔ میں کچھ نہ بول سکا

تو اس نے دوبارہ کہا۔

”بولو۔“

”کیوں نہیں۔“

”ایک بات کہوں تم سے۔“

”ہاں کہو۔“

”میں جانتی ہوں میری قربت تمہارے لئے ایک مشکل کام ہے لیکن یہ میری اصل ہے۔ اور اگر میری اصل تمہارے لئے قابل قبول نہیں ہے تو معاف کرنا۔ میرے لئے اس سے دردناک بات اور کوئی نہیں۔ ہاں ایک وعدہ تم سے کر سکتی ہوں۔“ وہ رکی پھر بولی۔ ”پوچھو گے نہیں کیا۔“

”نہیں پوچھوں گا۔“

”کیوں۔“

”اس لئے کہ میں نے تمہاری اصل قبول کرنے سے انکار کب کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور وہ وارفتہ ہو گئی۔ سوکھی ہڈیاں کی بالا میرے گلے کی زینت بن گئی۔ اس نے بڑی محبوبیت سے میری گردن میں بائیں نما چیز ڈال دی تھی۔ میری گردن میں کھلبلی ہونے لگی۔

دوسری صبح نہ جانے کب آنکھ کھلی تھی۔ بھیا نک رات کی نڈھال صبح کی حیثیت سے کوروتی بہت پیاری تھی۔ لیکن..... میں نے اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد نیچے کی سن گن لی۔ لیکن کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ پھر روشن دان سے باہر کا نظارہ کیا۔ پورا لان کا روں سے بھرا ہوا تھا۔ ثناء کے قل ہو رہے تھے۔ ایک سے ایک قیمتی کار موجود تھی۔ فانیو اسٹار قل تھے۔ مجھے ہنسی آگئی۔

ابھی روشندان سے باہر کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا کہ پیچھے سے آہٹ سنائی دی اور میں اچھل پڑا۔ بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کوروتی کی آواز سنائی دی۔

”میں ہوں عالی۔“

”اوہ۔“

”ناشتہ لائی ہوں تمہارے لئے۔“ اس نے کہا۔ اور میرے سامنے ایک ٹرے لگا دی۔ ٹرے میں حلوہ پوریاں اور سالن وغیرہ تھا۔ ”نیچے کوئی نہیں ہے جلدی سے واش روم ہو آؤ۔“ اس کے لہجے میں کسی محبت کرنے والی بیوی کا سا پیار تھا۔ جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

نیچے آکر میں نے ضروریات سے فراغت کی۔ یہ انیکسی ہمارے لئے پرسکون پناہ گاہ تھی میں واپس پہنچا تو وہ میری منظر تھی۔

”میں کیسے تمہارا شکر یہ ادا کروں کوروتی۔“ میں نے پوریاں چباتے ہوئے کہا۔

”بتاؤں۔“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔

”ہاں بتاؤ۔“

”جیسے کرتے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی اور کھکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ ہنس رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ بس آگے کیا کہوں۔

”پوریاں کافی تھیں۔“ بچ گئیں اس نے ایک سلیقہ مند بیوی کی طرح انہیں دوپہر کے لئے مخصوص کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے جو پیش کیا واقعی متاثر کن تھا۔ یہ آج کے اخبارات تھے۔

”ارے اوہ کوروتی یہ؟ یہ تم نے کیسے حاصل کئے۔“

”بتاؤں؟“

”بتاؤ۔“

”جھمکت لگا ہوا تھا پوریوں والے کی دکان پر میں چادر اوڑھ کر گئی تھی۔ وہاں جا کر میں نے چادر اتار دی اور اس کے بعد کوروتی قہقہے لگانے لگی ہنسنے ہوئے اس نے کہا۔“ اور اس کے بعد گاہک تو بھاگے سو بھاگے ہی تھے پوریوں والا بھی اٹھ کر ایسا بھاگا کہ سب کچھ ہی بھول گیا۔“ بس میں نے ضرورت کے مطابق پوریاں لیں اور چادر اوڑھ کر وہاں سے واپس چل پڑی۔ اس دوران میں نے اخبار والے کو بھی دیکھا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا اخبار بیچ رہا تھا۔ میں نے یہاں آنے کے بعد پوریاں وغیرہ رکھیں مجھے اندازہ تھا کہ تم اخبارات میں اپنے بارے میں پڑھنے کا شوق رکھتے ہو۔ بس میں نے اخبار بھی اسی طرح حاصل کئے اور وہاں سے آگئی۔“

”ارے واہ کہاں ہیں اخبار؟“ میں نے دلچسپی سے کہا اور کوروتی نے تین چار اخبار لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں بے صبری سے ان اخبارات پر جھک گیا۔ پہلے ہی صفحے پر جلی سرنی کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

”شہر پر بلاؤں کا حملہ کچھ خوفناک بلائیں شہر میں گردش کر رہی ہیں۔“ اس کے بعد باقی خبر تھی جسے اس طرح لکھا گیا تھا۔ ”ہم عوام کو ہراساں نہیں کرنا چاہتے ہم خوف و دہشت نہیں پھیلا رہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اس سنگین صورت حال سے آگاہ کریں جو اس وقت شہر کو درپیش ہے۔“ ذیشان عالی نامی ایک فکشن رائٹر جو پراسرار کہانیاں لکھتا تھا اور تاریخی ناول بھی پتہ نہیں اس کی کہانیوں کا کوئی کردار کیسے زندہ ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ اور کچھ سوچا نہیں جاسکتا کہ یا تو وہ کردار ذیشان عالی کے قبضے میں ہے۔ یا پھر ذیشان عالی اس کردار کے قبضے میں ہے۔ یہ کردار ایک

خونفک وجود ہے جو انسانی ڈھانچے کی شکل میں متعدد کارروائیاں کرتا پھر رہا ہے اور اسے خونفک جناتی قوتیں حاصل ہیں۔

تفصیل یوں ہے کہ کچھ عرصے پہلے ایک عورت ایک بڑے ڈاکٹر صاحب سے ملی اس کا انداز بے حد پراسرار تھا ڈاکٹر نے اس سے اس کی بیماری کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنا ڈھکا ہوا چہرہ کھول دیا وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا مکمل ڈھانچہ جو بول رہا تھا باتیں کر رہا تھا اس نے کہا کہ وہ حادثے کا شکار ہو کر یہ شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کی آواز نسوانی تھی۔ ایک دلکش اور جوان عورت کی آواز اس نے ڈاکٹر احسان سے درخواست کی کہ وہ اپنی مہارتوں سے کام لے کر اس کا علاج کریں اور اس جس طرح بھی بن پڑے اس کے بدن کا گوشت واپس لے آیا جائے اس نے بتایا کہ کسی زہریلے مخلول کے ذریعے اس کے ایک دشمن نے اس وقت جب وہ ایک ہوٹل میں غسل کر رہی تھی وہ مخلول پانی میں ملایا اور اس کا یہ حال کر دیا اس کے بدن کا گوشت گل کر بہہ گیا اور وہ ایک ڈھانچے کی شکل اختیار کر گئی۔

ڈاکٹر نے اسے ہمارے ملک کے ایک عظیم الشان ڈاکٹر ڈاکٹر قیصر پاشا کے پاس بھیج دیا اور اس سے کہا کہ وہی اس کا صحیح علاج دریافت کر سکیں گے اب اس کے بعد صورت حال کا پتہ نہیں چل سکا کہ ڈاکٹر قیصر پاشا سے اس کے کیا مذاکرات ہوئے لیکن اس نے ڈاکٹر قیصر پاشا کو قتل کر دیا۔ لازمی امر ہے کہ وہ اس کے جنون کا نتیجہ تھا اس سے پہلے کی ایک کہانی اس کہانی سے یوں منسلک ہو جاتی ہے کہ ہوٹل تاج محل میں ڈیٹان عالی ایک کمرے میں مقیم ہو گیا اسی کمرے میں اس کے ساتھ کوئی اور وجود بھی تھا جس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا البتہ پولیس نے گہری تحقیق کے بعد یہ ضرور معلوم کر لیا کہ ڈیٹان عالی ایک انتہائی خوب صورت عورت کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں مقیم ہوا تھا۔ بعد میں ایک دن اس کمرے سے ایک انسانی ڈھانچہ نمودار ہوا اور دوڑتا چلا گیا۔ ہوٹل میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور بہت بری کیفیت ہو گئی تھی۔ تفصیلی معلومات پر ڈیٹان عالی کو گرفتار کر لیا گیا لیکن پھر لاک اپ کے پاس ایک ڈھانچہ نمودار ہوا اور اس نے لاک اپ کھول کر ڈیٹان عالی کو رہا کر لیا اس دن کے بعد سے ڈیٹان عالی لاپتہ ہے۔

پھر یوں ہوا کہ اس انسانی ڈھانچے کو مختلف جگہوں پر دیکھا گیا اس پر ڈاکٹر قیصر پاشا کے قتل کا الزام تھا اور اس کا معاون کار ڈیٹان عالی تھا ڈیٹان عالی کا ماضی برا نہیں تھا وہ بس سیدھا سادہ کہانی کا تھا۔ لیکن کہانیاں اس طرح بھی زندہ ہو جاتی ہیں یہ ہر بار راسخ کوٹ کر لینا چاہیے کبھی کبھی اس کے کردار زندہ ہو کر اس کی گردن پکڑ لیتے ہیں۔ اندازہ یہی ہے کہ ڈیٹان عالی اس پراسرار وجود کے شکنجے میں آ چکا ہے اور اس کے ساتھ جرائم میں ملوث ہونے کے لئے مجبور ہے۔

ہم خاص طور سے پراسرار کہانیاں کے ان لکھنے والوں سے مخاطب ہیں جن کی انتہائی خوب صورت کہانیاں عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ جیسے محترمہ طاہرہ آصف جو تماشا فطرت کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ انسان اس کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ جائے یا پھر جناب ساحل ابڑو جو ماؤس کی رات کی بھیاں کہانی پیش کرتے ہیں اور پھر رضوان علی سومرو جو گل حیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ جائے۔ البتہ یہ گل کبھی کبھی وہ گل کھلاتا ہے کہ انسان گلگلہ بن کر رہ جائے اور پھر جناب ضرعام محمود جو نہلے پر دہلا ہیں کمال کے راسخ ہیں اور ایس امتیاز احمد بس ان کے بارے میں کیا کہا جائے یوں سمجھ لیجئے کہ وہ بہت سی زندہ روحوں کے خالق ہی نہیں بلکہ خود بھی انتہائی ماہر روحانیت معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی ہر تحریر بے مثال ہوتی ہے اور ہم اسے وحید صاحب کا تذکرہ ضرور کریں گے جنہوں نے پتہ نہیں کہاں سے رولو کا دریافت کیا جس نے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ وہاں ملک فہیم ارشاد بڑی خوبصورتی سے ظالم آتما لے کر آئے ہیں اور یہ ظالم آتما کوئی کی شکل میں آپ کے شہر میں دندناتی پھر رہی ہے۔ بات احسان سحر صاحب کی بھی کمال کی ہے کہ انہوں نے جو آنکھیں روشن کی ہیں انہوں نے پراسرار تحریروں کی دنیا میں بڑی روشنی پھیلانی ہے۔ لیکن ملک این اے

کاوش جس مورکھ کو پکڑ کر لائے ہیں وہ سچ سچ مورکھ ہی ہے کیونکہ ساجد راجہ کی سفید موت خوف و دہشت سے خون کو رگوں میں منجمد کر دیتی ہے۔ ہاں عامر ملک صاحب نے ایک بڑی جدت اختیار کی ہے کہ انہوں نے روحوں کا ملن کرا دیا ہے۔ لیکن نعیم بخاری آکااش کی بے بس روح کی کہانی بھی بڑی دور تک ہوتی ہے اور پھر ہم آ جاتے ہیں ایم الیاس پر جنہوں نے ایک ناگن کو بھی عشق کی لعنت میں گرفتار کر دیا ہے۔ منعم اصغر صاحب نے موت کا بدلہ لے لیا ہے اور وجیہہ سحر نے تو چلے لیا ہی ڈیوڈی ہے یعنی انہوں نے خناس کو قبضے میں کر لیا ہے۔ ضروریات شیطان میں خناس کی جو اہمیت ہے اس سے سبھی واقف ہیں لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ بیچارہ ڈیٹان عالی انہی خونفک تحریروں کے جال میں پھنس کر کوروتی کا شکار ہو گیا اور یہ اور کوروتی اپنی کھوئی ہوئی حیثیت پانے کے لئے دہشت گردی کرتی پھر رہی ہے۔

تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم بتا رہے تھے کہ وہ ڈیٹان عالی کو لاک اپ سے نکال لائی اور اس کے بعد دونوں لاپتہ ہو گئے لیکن پراسرار روحوں یا پھر جیسا کہ ڈیٹان عالی بیان کرتا ہے کہ صدیوں پرانی زندہ عورت جو نہ جانے کیسی کسی پراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ اپنی دہشت ناک پھیلاتی پھر رہی ہے اور تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک بہت ہی مقتدر شخصیت عہد اکہم صاحب کی پوتی ثناء ایک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو گئی اور بد نصیب بچی کا ایک ہسپتال میں انتقال ہو گیا لیکن پھر وہ زندہ حالت میں ملی اور ڈیٹان عالی اس کی وارڈ بوائے کی حیثیت سے ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور یہ بیچارے خوشی خوشی ثناء کو گھر لے آئے اور یہاں خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد یہ خوشیاں اچانک ہی درد و غم میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ ثناء ثناء نہیں تھی بلکہ وہ کوروتی کی روح تھی جو اس کے بدن سے آزاد ہو کر فرار ہو گئی اور ثناء کا بدن ایک مردہ بدن رہ گیا۔

یہ ہولناک کہانی بذات خود ایک گلشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس کا ایک ایک لفظ میرے لئے بڑا خونفک تھا اخبار نے آخر میں وہی الفاظ لکھے تھے جو یہ ہولناک کہانی صرف کہانی نہ سمجھی جائے یہ حقیقت ہے کہ اس وقت شہر ایک ایسی روح کی دست ستم کا شکار ہے جو کہیں بھی کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے شہریوں کو سرکاری طور پر ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے کسی انسانی ڈھانچے سے محتاط رہیں جو انہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ حکومت نے یہ اجازت دی ہے کہ اس ڈھانچے کے خلاف کوئی بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ اسے جرم تصور نہیں کیا جائے گا البتہ ڈیٹان عالی اگر ہاتھ آ جائے تو اسے گرفتار کر کے پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے اور اسے کوئی جسمانی نقصان نہ پہنچایا جائے کیونکہ پولیس اس سے اس ہولناک روح کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

پوری خبر پڑھنے کے بعد میں نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا تھا کوروتی شاید میری ہی طرف متوجہ تھی کہنے لگی۔

”عالی!“

”ہوں۔“ میں نے بے شکل کہا۔

”کیا لکھا ہے؟“

”ہمارا کچا چٹھہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”مجھے بھی سناؤ۔“

”کیا کرو گی؟“

”سناؤ نا۔“ اس نے بڑے لاڈلے انداز میں کہا اور میں نے اسے تمام تفصیل پڑھ کر سنائی اور اسے سن کر خوب

نہی۔

”تم نہں رہی ہو؟“ میں نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”بڑی مزے کی باتیں ہیں۔“ اس نے کہا اور میں نے برا سامنہ بنا کر دوسرا اخبار پڑھا۔ اس میں آگے کی کہانی تھی۔ پہلے اخبار کی طرح مختصر تفصیل بتا کر اس نے انکشاف کیا کہ اس ڈھانچے نما پراسرار وجود کی تفتیش کے لئے ہر عمل کیا گیا تھا، ادھر ایک ہونہار پولیس افسر کی پراسرار گمشدگی نے بھی ماحول بڑا سنسنی خیز بنا دیا تھا اس سے زیادہ سنسنی خیز کیفیت اس وقت ہوئی جب اس کتاب کی گہرائیوں کو ٹٹولا گیا، سرکاری ذرائع نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ اس کتاب کو توڑ کر اس کے نیچے کوئی پیسمنٹ تلاش کیا جائے ایسی کوئی جگہ جہاں سے پولیس کمشنر اور ان کے ایک ساتھی کو بازیاب کیا جاسکے۔ لیکن ہر ممکن کوشش کر لی گئی کتاب توڑی نہیں جاسکی، پھر دوسرے ذرائع اختیار کئے گئے اور کتاب کے نیچے کوئی دور سے ایک سرنگ بنائی گئی جو بڑی شدید محنت کے بعد کتاب تک پہنچی لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ کتاب کے نیچے زمین میں کچھ نہیں ہے۔ بس وہ کتاب زمین پر گئی ہوئی تھی۔ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، چنانچہ اب اس کو بھی کو سل کر دیا گیا ہے اور بڑے بڑے ماہر تعمیرات یہ مشورہ کر رہے ہیں کہ کتاب کو زیادہ طاقتور مشینوں کے ذریعے توڑا جائے اس کی اصلیت کا پتہ لگایا جائے۔

میں نے یہ تفصیل بھی کوروتی کو پڑھ کر سنائی اور وہ پھر ہنس پڑی، مجھے اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ مجھ پر جو بیت رہی تھی وہ تو میں جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ہاں کی ذہن پولیس لازمی طور پر کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لے گی۔ کوروتی تو کم بخت غائب ہو جاتی تھی لیکن تیرا کیا ہوگا کالیا، میرے ذہن میں یہی سوچیں تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

”تمہیں ایک بات بتاؤں عالی وہ لوگ کسی طور پر کتاب نہیں توڑ سکیں گے کیونکہ وہ تاریخ کا سرمایہ ہے۔ پراسرار قوتیں اسے ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیں گی، لیکن وہ پراسرار قوتیں بھی اسے فنا نہیں کر سکیں اور چونکہ وہ میرے علم کی کتاب ہے۔ میرا سارا تاریخ کا علم اس میں قید ہے اور میں نے اس طرح محفوظ طریقے سے اسے بنایا ہے کہ تم سوچ نہیں سکتے، چودہ انسانی جانیں ضائع کی ہیں میں نے اس کتاب کی تعمیر کے لئے، کبھی تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتاؤں گی۔“

”کک..... کیا مطلب؟“ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں ذیشان عالی! چودہ افراد ہلاک ہوئے ہیں اس کتاب کی تعمیر میں؟“

میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ”کوروتی! کبھی کبھی تو بگھی بات ہے میری دماغی قوتیں ذائل ہونے لگتی ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ اس نے کہا۔

”بات اصل میں یہ ہے کہ تم اس قدر پراسرار قوتوں کی مالک ہو، لیکن تم اپنے بدن کے گوشت کے حصول کے لئے خود کچھ نہیں کر پاتیں۔“

”ذیشان عالی! بڑی معصوم سی بات کر رہے ہو تم۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں کوئی مافوق الفطرت وجود نہیں ہوں، میں ایک زندہ عورت ہوں، زندہ کردار ہوں جو بس ایک طریقے سے جس کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں اور جس میں بگھی بات یہ ہے کہ میری جدوجہد شامل نہیں تھی حیات ابدی حاصل کر چکی ہوں، بہت سی ایسی کہانیاں منظر عام پر آتی ہیں جنہیں ہم صرف اختراع سمجھتے ہیں لیکن ذیشان عالی! جب اس طرح کے واقعات انسان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تب وہ ان اختراعات پر غور کرنے لگتے ہیں کیا وہ سچ ہے۔ جیسے تم رائیڈر، میگزین کی ”شی“ کو لے لو، وہ شخص بھی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اس نے ایسے کردار کو تخلیق کیا جو کہیں دور پہاڑوں میں رہتا ہے یا رہتی ہے اور غسل آتش کر کے نئی زندگی پا جاتی ہے۔ لوگ اسے فلکشن سمجھتے ہیں کہانی سمجھتے ہیں اس کہانی کو پتہ نہیں کس کس نے کیا کیا نام دیے ہیں، لیکن جو کچھ بھی

ہے۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی خاکہ ملتا ہے اس کا۔ خیر مسئلہ کہنے کا یہ ہے کہ وہ کتاب نہیں توڑی جاسکتی اور توڑ کر بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا انہیں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ کمشنر اور اس کا ساتھی تاریخ کے کسی دور میں چلے گئے ہیں اور شاید واپس نہ آ سکیں۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کوروتی کو اب ہم کیا کریں؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ جس طرح اس لڑکی کے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں سیدھے ہو گئے اسی طرح تم بھی ایسا کوئی درویش تلاش کرو جو میرے بدن کے اس ضائع شدہ گوشت کو بحال کر دے اور پتہ نہیں کیوں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس دور کی سائنس یا اگر سائنس نہ سہی تو وہ علمیت جو بہتر ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے جو بگھی ہوتی ہے اور جس کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے کسی نہ کسی طرح میرے وجود کی واپسی کر دے گی۔“

میں خاموشی سے سوچنے لگا پھر میں نے کہا۔ ”اور مجھے تو صرف یہ خطرہ ہے کہ جو ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے اور جس طرح وہ پولیس آفیسر جس کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے ہماری تلاش کر رہا ہے کہیں وہ اس انٹیکسی کا رخ نہ کر لے کیونکہ بہر حال تم دو تین بار یہاں سے نکلی بھی ہو اور تمہیں لگتا پڑے گا۔“ میں نے کہا اور شاید وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی کیونکہ دیر تک کچھ نہیں بولی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”اس کا بھی کوئی حل تلاش کریں گے ظاہر ہے ہم ایک طویل زندگی تو یہاں نہیں گزار سکتے۔ کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے گا اور پھر ایک بات کہوں ذیشان عالی؟“

”جی فرمائیے۔“ میں نے کہا تو وہ کسی قدر تنک کر بولی۔

”دیکھو مجھ سے طنزیہ لہجے میں گفتگو مت کیا کرؤ میں خود بھی تو مشکل کا شکار ہو گئی ہوں اور تم سے بار بار یہ بات کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس مشکل کا شکار میں تمہاری وجہ سے ہوئی ہوں۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بات تو اس کی سچ ہی تھی ایک طرح سے، لیکن بابا میں نے کب کہا تھا میں تو اس برے وقت کو کوستا تھا جب میں نے گوتم بھنساالی اور اس بھیناک عورت کا انٹرویو لینے کے بارے میں سوچا تھا اور اس کے حصول سے یہ سمجھا تھا کہ میں تاریخ کی کائنات میں دل ہلا دینے والے راز افشا کروں گا، لیکن میرا سارا وجود خود ہی مل کر رہ گیا تھا، اچانک ہی میرے ذہن میں اپنی کتاب کا خیال آیا، میں نے کہا۔

”ایک بات کہوں کوروتی۔“

”جی فرمائیے۔“ اس نے بھی میرے ہی انداز میں کہا اور ہنس پڑی۔

”نہیں سنجیدگی سے سنو۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔“

”تم نے زندہ صدیوں کا مسودہ کہاں چھپایا تھا؟“ وہ چند لمبے ساکت رہی پھر بولی۔ ”ارے ہاں! یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں۔“

”کیا؟“

”جو خبریں تم نے مجھے سنائی ہیں ان میں تمہارے مسودے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔“

”یہی خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا؟“ میں نے کہا اور بولی۔

”میں نے اسے بہت ہی خفیہ جگہ پر رکھا ہے۔ جہاں سے وہ آسانی سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔“

”کاش میرا مسودہ مجھے واپس مل جائے۔“

وہ پھر خاموش ہو گئی اور چند لمحات کے بعد بولی۔

”میں اسے جا کر تلاش کروں گی۔“

”تم تنہا نہیں کوروتی! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا“ خبروں میں سنا گیا ہے کہ وہ عمارت سیل کر دی گئی ہے۔ آگے کی کسی کارروائی کے لئے۔“

”ہاں۔“

”اس کا مقصد ہے کہ ہم اگر کسی طریقے سے اس عمارت میں داخل ہو جائیں تو زندہ صدیوں کا مسودہ ہمیں مل سکتا ہے۔“

”کیوں نہ آج رات کو کوشش کی جائے۔“

”خدا کرے میرا مسودہ مجھے مل جائے۔“

”ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ اس عمارت میں داخل ہونے کا ایک خفیہ راستہ بھی ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کوروتی! آج ہم ہر طرح کا خطرہ مول لیں گے۔ وہ مسودہ میرے لئے زندگی کی طرح ہے۔ میں اسے ضرور حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا اور کوروتی نے گردن ہلا دی۔

باقی وقت جیسے بھی گزرا میرے لئے بڑا بے مبری کا وقت تھا اور پھر جب رات کے سناٹے گہرے ہو گئے اور کوروتی نے مجھے ہلکا سا کھانا کھلا دیا جسے وہ آسانی اس کوٹھی کے کچن سے لے آتی تھی اور کوٹھی چونکہ رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تھی اس لئے کوئی خاص تحریک نہیں ہوتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ انیسویں سے باہر نکلے اور باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑے۔

ہمیں باہر نکلنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ شہر کی سڑکوں پر پولیس بچرونگ جاری تھا اس لئے ہم تاریک راستوں کا سفر اختیار کر رہے تھے۔ کوروتی کی کوٹھی یہاں سے کافی دور تھی اس لئے وہاں تک پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ راستے میں کوروتی نے کہا۔

”ڈیٹان..... میری بھگوان سے ارتقا ہے کہ تمہاری کتاب کا مسودہ تمہیں مل جائے۔ اسے لے کر یہیں واپس آؤ گے۔“

”تم بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ویسے اتنا سے ہم نے یہاں بتایا ہے۔ اس سے میں ہم نے کسی کو اس انیسویں کی طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ان کے کسی کام کی نہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ہمارے کام کی تو ہے۔ ہم نے اتنا سے یہاں کتنے سکون سے گزرا ہے۔ یہاں سے پوری کوٹھی پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے ہم یہیں واپس آ جائیں۔“

”کیا جرم ہے۔“

”نہیں کوئی جرم نہیں ہے۔“

”دور سے ہم نے کوٹھی پر نظر دوڑائی۔ گیٹ کا بلب روشن تھا، مین گیٹ پر پولیس کی سیل لگی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک پولیس کانسٹیبل بیٹھا ادھر رہا تھا۔“

”یہاں تو سب ٹھیک ہے۔“

کوروتی بولی۔

”ہاں..... پولیس والا موجود تھا۔“

میں نے کہا۔

”اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں خفیہ راستے سے اندر لے جاؤں گی۔ ہم خاموشی سے مسودہ وہاں سے حاصل کریں گے اور اسی راستے سے واپس نکل آئیں گے۔“ وہ بولی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، کوروتی عمارت کی پشت پر آئی، عمارت کے کچھ فاصلے پر اس نے ایک گٹر کے دھکنے کو ہٹایا اور بڑے آرام سے اس سے نیچے اتر گئی۔

”ارے یہ۔“ میں نے کہا۔

”برسوں سے سوکھا پڑا ہے۔ استعمال نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن کیڑے مکوڑے؟“

”میں نے سب ختم کر دیئے تھے، آؤ نیچے آ کر دیکھو، کتنا صاف شفاف ہے۔“ تقریباً سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں ذرا برابر بدبو نہیں تھی۔ میں اس کا سہارا لے کر نیچے اتر گیا، کمال کی جگہ تھی۔ گہرائی چند فٹ سے زیادہ نہیں تھی لیکن کشادگی خوب تھی۔ البتہ گہرا اندھیرا تھا۔

”کاش..... ہم ایک ٹارچ ساتھ لے آتے۔“

میں نے اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر کہا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے کہا۔ اور نہ جانے کہاں سے گٹر لائن میں روشنی پھیل گئی۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ روشنی اس کے ہاتھوں کی اگلیوں سے نکل رہی تھی۔

”یہ کیا؟“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”آ جاؤ۔ اب نظر آ رہا ہے۔“

کوروتی کی چمکتی آواز سنائی دی۔

”ہاں، مگر.....؟“

”بتا چکی ہوں میں نے بہت سے گیان حاصل کئے ہیں۔ میں اتنی بے بس نہیں ہوں! بس میرے ساتھ گوتم بھنساہی نے جو کچھ کیا اس کی مجھے امید نہیں تھی۔ اور پھر اگر وہ یہ سب اپنے روپ میں کرتا تو بھگوان کی سوگند میرے بجائے اس کا یہ حال ہوتا۔ میں اس کا داؤ اسی پر الٹ دیتی۔ میری اگلیوں سے جو روشنی نکل رہی ہے یہ میرا گیان ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میں اس کے پر اسرار علوم کا قائل تھا۔ کشادہ گٹر لائن میں ہم کچھ دور آگے بڑھے۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس نے روشن اگلیوں کا رخ اوپر کیا اور مجھے دوسرا مین ہول نظر آ گیا۔ کوروتی نے ہاتھ اوپر کر کے مین ہول کے دھکن کو اوپر اٹھایا اور دھکن اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ صاف ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے، کچھ لمحے رک کر ہم نے باہر کی آہٹیں سنیں اور پھر کوروتی اوپر ہاتھ جما کر اپنے استخوانی بدن کو اٹھانے لگی اور اطمینان سے باہر نکل گئی، میرے لئے بھی یہ عمل مشکل نہیں تھا۔

کھلی ہوا میں کھڑے ہو کر ہم نے گہری گہری سانسیں لیں، کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

”کتاب کا جائزہ لیں۔“  
کوروتی نے کہا۔

”چلو.....“ میں نے کہا۔ اور ہم اس پر اسرار کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کی حالت بہت خراب تھی۔ کتاب اپنی جگہ موجود تھی۔ اس کے آس پاس جو کچھ کہا گیا تھا وہ بیشک بہت کچھ تھا لیکن کتاب کی آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

”یہ محفوظ ہے۔ اگر انہوں نے اس عمارت کو ہم سے اڑانے کی کوشش کی تو اس کتاب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ویسے ذیشان عالی میں اسے کہیں اور منتقل کر دوں گی۔“  
”منتقل کر دوں گی۔“

”ہاں۔“  
”کیسے۔“

”آرام سے“ میں نے اسے تیار کیا ہے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔  
ہم دیر تک اس کے آس پاس کا جائزہ لیتے رہے۔ کوروتی اس دوران خاموش رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”آؤ.....“  
”میں اسے کے پیچھے چل پڑا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔“ آہ کاش زندہ صدیوں کا مسودہ مل جائے۔“  
”وہ بہت سے راستے طے کر کے ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئی ہال کی ایک الماری کھول کر اس نے کچھ کیا تو الماری میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اس نے اس خلا میں ہاتھ ڈالا اور چند لمبے کچھ تلاش کرتی رہی پھر اس کی رنج ہوئی آواز سنائی دی۔“  
”نہیں ہے۔“

میرے پورے بدن میں ایک قہقہہ سا پیدا ہو گیا۔ دل جیسے رکنے لگا۔ اور اسی وقت انتہائی تیز مرکزی روشنی سے ہال منور ہو گیا۔ ہم دونوں اس روشنی میں نہا گئے تھے۔



میری آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں۔ ایک لمحے میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن دوسرے لمحے بہت کچھ سمجھ میں آ گیا۔ ناکوں کی انتہائی مضبوط دسی سے بنا ایک جال میرے اوپر گرا۔ کوروتی کی بھی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔  
پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ”تم دونوں پولیس کے رنخے میں ہو، کوئی حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، آنکھوں میں ابھی تک سرخ دائرے ناچ رہے تھے۔ پھر بہت سے بوٹوں کی آواز سنائی دی اور پھر مجھے بری طرح دبوچ لیا گیا۔ بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے کسی جنگلی درندے کو پکڑا جا رہا ہو۔  
”لے چلو..... باہر لے چلو۔ اسی بھاری آواز نے کہا۔ اور مجھے دبوچنے والے مجھے جال سمیت باہر کھینچنے لگے۔ روشنی مدھم کر دی گئی تو میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ میں نے چند حیاتی آنکھوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ پولیس کی وردی میں بے شمار افراد آس پاس نظر آ رہے تھے۔ یہ سب بھاری اسلحہ سے لیس تھے لیکن اور بھی کچھ نظر آیا۔ یہ کوروتی تھی ایک خوف ناک ڈھانچے کی شکل میں۔ اسے بھی میرے جیسے مضبوط جال میں جکڑ لیا گیا تھا اس بار پولیس والے اس سے خوف زدہ نہیں تھے اور اسے دبوچے ہوئے تھے۔

ہم دونوں کو باہر لایا گیا۔ باہر بھی پولیس کی گاڑیوں سے روشنی کر دی گئی تھی۔ بھاری آواز والا ایک اعلیٰ افسر تھا بے حد شاندار شخصیت کا مالک۔ وہ ہماری طرف سے بہت محتاط تھے۔ ”انہیں الگ الگ گاڑیوں میں بیٹھاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔ مجھے جال سمیت ایک پولیس موہائل میں بیٹھایا اور کوروتی کو دوسری موہائل میں لے جایا گیا۔ لیکن پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک ہال نما کمرے میں ہم دونوں کو ایک ساتھ لے جایا گیا تھا۔

اس بار یہ ڈبوئی بہت بڑی پولیس والوں کے سپرد کی گئی تھی کیونکہ وہ کوروتی سے خوف زدہ نہیں نظر آ رہے تھے۔ جبکہ کوروتی اس وقت بھی جال میں لپٹی بے حد خوف ناک نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اس لئے آپس میں کوئی بات نہیں کر پا رہے تھے۔

پھر کچھ دیر کے بعد ایک اور عمل ہوا۔ پولیس والوں کا ایک اور دستہ آیا اور کوروتی کو جال سمیت لے کر اس ہال سے باہر نکل گیا۔ چار پولیس والے اب بھی اس ہال نما کمرے میں میری نگرانی پر مامور تھے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک اور پولیس کانسٹیبل اندر آیا۔ اور اس نے ان چاروں سے کچھ کہا اور ان میں سے دو افراد اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔

”آپ کو ابھی اسی ہال میں رہنا پڑے گا مسٹر ذیشان عالی۔“

”جی.....!“ میں نے کہا۔

”اس ہال سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی یہ سامنے والا دروازہ، دروازے کے دوسری طرف ساری رات ایک مسلح اسکوڈ ڈبوئی دے گا۔ اسے ہدایت ہے کہ آپ کی طرف سے ذرا بھی کوئی تحریک ہو تو آپ کو گولیوں چھلنی کر دیا جائے۔“

”شکریہ“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”امید ہے آپ عقل سے کام لیں گے۔“

”ضرور..... بس ایک بات بتادیں۔“

”جی..... فرمائیے؟“

”میری ساتھی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔“

”اسے غسل دے کر دفن دیا جائے گا۔“ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایک پولیس والے نے پر مزاح لہجے میں کہا۔

”برا کریں گے آپ.....“ میں نے کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ اسی شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

”وہ ہندو ہے۔ آپ اسے جلادیں۔“ میں نے کہا اسی وقت دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

”بس کر رحمت خان! چل سمجھا دیا اسے باقی اس کی تقدیر۔“

وہ سب باہر نکل گئے۔ اور میں نے اس عجیب و غریب جال کا جائزہ لیا۔ موٹی مضبوط ٹائلوں کی رسیوں سے بنا ہوا تھا بمشکل تمام میں لیٹ سکا تھا لیکن رسیاں بدن میں چبھ رہی تھیں۔ پھر میں نے اس نئی افتاد کے بارے میں سوچا۔ بہت برا ہوا تھا میرے ساتھ۔ بہت ہی محسوس ساعت تھی جب مجھے یہ دونوں یعنی گوتھ بھنسا لی اور کوروتی ملے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس سے مجھے کیا حاصل ہوا تھا۔ صدیوں کی تاریخ کچھ نہ دیکھ کر بھی لکھی جاسکتی تھی۔ سارے کام اس طرح ہوتے ہیں۔ پوری دنیا کے سفر نامے ایک چائے خانے میں لکھے جاتے ہیں۔ تاریخ کے کسی بھی گوشے میں ٹانگ اڑا دو۔ تاریخ کے کسی بھی دور یا کسی بھی کردار کے ساتھ کوئی بھی رومان انگیز اور رنگین داستان تھی کر دو۔ سب چلتا ہے۔ زندہ صدیاں کوروتی کے بغیر بھی لکھی جاسکتی تھی۔ اور اب سب کچھ ختم پیسہ ہضم۔ لیکن پولیس نے بڑا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ ارے باپ رے ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل کی مجرم گرفتار ہوئی ہے اور مجھے اس کا معاون قرار دیا گیا ہے۔ پھانسی یا عرقید۔

ساری رات انہیں سوچوں میں گزری تھی۔ نیند بھلا کہاں آتی۔ لیٹتا تو رسیاں بدن میں چبھنے لگتیں خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ دن کو دس بجے کے قریب چھ پولیس والے اندر آئے مجھے جال سے نکالا گیا۔ ہاتھوں میں جھٹکریاں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائی گئیں پھر ہال سے باہر لایا گیا میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تختہ وار پر جا رہا ہوں۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک شاندار کمرے میں مجھے پہنچایا گیا۔ اس دوران میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پولیس کو اپنی بے قصوری کی داستان سنا کر رحم کی درخواست کروں گا۔ کمرے میں ایک جگہ مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد ایڑیاں بچنے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر بڑی بارعب شکلوں والے پانچ اعلیٰ پولیس افسران اندر داخل ہو گئے انہوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ وہ بری طرح مجھے گھور رہے تھے۔

آخر کار مجھ سے سوالات کی کارروائی شروع ہو گئی۔ ایک شخص نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔

”تمہارا نام ڈیٹان عالی ہے۔“

”جی سر.....“

”تم تو بہت عرصے سے لکھنے لکھانے کا کاروبار کر رہے ہو۔“

”جی سر.....“

”یہ انسانی ڈھانچہ کوروتی کا ہے.....؟“ دوسرے اعلیٰ افسران نے کہا۔

”جی سر.....“ میں نے جواب دیا لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ لوگ کوروتی کا نام کیسے جانتے ہیں۔

”کیا یہ جادوگر تھی بھی ہے۔“

”نہیں سر۔“

”ڈیٹان عالی! ہم مکمل تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ اصل میں اس کوشی سے زندہ صدیاں نامی کتاب کا مسودہ ہمیں حاصل ہو گیا تھا جسے پڑھنے کے بعد ہمیں کوروتی کے بارے میں معلوم ہوا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ تم جہاں بھی ہو گے اپنے مسودے کی تلاش میں ضرور آؤ گے۔ چنانچہ ہم نے تمہارے پکڑنے کا بہترین انتظام کیا۔“

”ڈیٹان عالی! مسودے میں جو کچھ لکھا ہے کیا وہ سچ ہے؟“ دوسرے افسر نے کہا۔

”جی سر! میں صدیوں پر محیط ایک سچی داستان لکھتا چاہتا تھا ایسی داستان جو دنیا بھر میں تھلکہ مچا دے۔“

”لیکن.....؟“

”ہاں! لیکن کیا؟“

”پھر میں بدترین حالات کا شکار ہو گیا۔“

”کوروتی ڈھانچے کی شکل میں تمہیں ملی تھی۔“

”نہیں ایک پروقا عورت کی شکل میں۔ میں نے اپنی کتاب میں اس کے بارے میں لکھا ہے۔“

”پھر وہ ڈھانچے میں کیسے بدل گئی۔“ ایک اور افسر نے کہا۔

”میں بتاتا ہوں۔ میں نے کہا اور انہیں گوتھ بھنسا لی کی کہانی سنائی۔ وہ بے اعتباری کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پوری کہانی سننے کے بعد ایک اور افسر نے کہا۔

”لاک اپ سے نکلنے کے بعد تم لوگوں نے کیا کیا۔“

”ہم پولیس سے پوشیدہ رہنے کے لئے چھپتے رہے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل سے میرا ذرا بھر تعلق نہیں ہے سر! مجھے کیا

ضرورت پڑی تھی۔ وہ کج نیت خود اپنے بدن کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہے اور جنونی ہو رہی ہے۔“ میں نے ہسپتال کی کہانی

پھر بے چاری شاہ کے بدن کی تفصیل اور پھر وہاں کی پوری کہانی بے کم و کاست سنا دی پھر فریادی لہجے میں کہا۔ ”میں تو خود

اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا سر! اسی لئے میں وارڈ بوائے کے لباس میں آکر وہاں سے بھاگا“ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ شام

کے وجود میں ہے۔“

”پھر کی اس کتاب کی کیا کہانی ہے۔“

”اس میں صدیاں پوشیدہ ہیں۔“

”تم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ تم اس پتھر کی کتاب میں داخل ہو کر ماضی کی سیر کر چکے ہو ماضی سے واپسی کا کیا

طریقہ ہوتا تھا۔“

”وہ خود مجھے ماضی سے حال میں لاتی تھی۔“

”مسٹر علی نواز..... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے رہائی کا وعدہ کر کے مجبور کریں کہ وہ کمشنر صاحب اور ان کے ساتھی کو

واپس لے آئے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ وہ اس کے لئے کیوں تیار ہوگی۔ فرض کریں وہ تیار ہو جاتی ہے اور اپنی کتاب کے



ذریعے ماضی میں چلی جاتی ہے پھر کیا وہ پاگل ہے کہ واپس آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دے۔“  
”اس کی ایک ترکیب ہے سر۔“ دوسرے افسر نے کہا۔  
”کیا.....“

”وہ ذیشان عالی! ہے محبت کرتی ہے۔ ہم اسے ایک وقت دیتے ہیں وہ کشنر صاحب کو لے کر واپس آ جائے ورنہ اس کی جگہ ذیشان عالی کو سزائے موت دے دی جائے گی۔ دوسری صورت میں ان دونوں کو رہائی دی جاسکتی ہے۔“  
خدا غارت کرے اس بد بخت کو جس نے یہ تجویز پیش کی تھی میں نے دل ہی دل میں اس افسر کو کوسا دوسرے اس پر غور کرنے لگے تھے۔ پھر سب سے بڑے افسر نے کہا۔

”کیوں مسٹر ذیشان عالی! آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔“  
”بات یہ ہے جناب کہ میں ایک ناگہانی مصیبت کا شکار ہوا ہوں، مجھے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ آپ کے پاس ہے آپ جیسے چاہیں اسے مجبور کریں اگر کوئی خدمت میرے سپرد کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ لیکن یہ تسلیم کریں کہ میں بے قصور ہوں۔“

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں.....؟“  
”موت کے گھنچے میں جکڑ گیا ہوں۔ اب بھی جھوٹ بولوں گا۔“  
”ویسے مسٹر ذیشان عالی! کیا واقعی وہ آپ حیات پئے ہوئے ہے کیا اس جدید سائنس کے دور میں ایسی کسی کہانی پر غور کیا جاسکتا ہے۔“ ایک اور افسر نے کہا۔

”واقعی یہ کوئی طلسمی داستان معلوم ہوتی ہے۔“ دوسرا بولا۔  
”آپ ایک ترکیب کر کے دیکھ لیں سر۔“ میں نے کہا۔  
”کیا.....“

”وہ ایک مجرم ہے۔ ایک قاتل ہے۔ ڈاکٹر قیصر شاہ جیسی قیمتی شخصیت کو قتل کرنے کے نتیجے میں اسے سزائے موت تو ملنی ہی چاہیے۔ آپ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنی سچی ہے اگر وہ مر جاتی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اپنے گمراہوں کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ ویسے میں آپ سے عرض کر دوں کہ اگر وہ آپ کے چنگل سے نکل گئی تو بہت نقصان کرے گی۔“

میری اس تجویز سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر ایک افسر نے کہا۔ ”ہم اس بارے میں مشورہ کریں گے۔ آپ مطمئن رہیں آپ سے تعاون کیا جائے گا ہمیں کشنر صاحب کے بارے میں تشویش ہے۔ کسی طرح وہ بازیاب ہو جائیں۔ اس کے لئے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہوگا۔“  
”میں حاضر ہوں۔“

”آپ کو ابھی سخت گمرانی میں رکھا جائے گا۔ لیکن آپ کو ہر سہولت مہیا کی جائے گی۔ ہم مشورے کے بعد آپ کو بتائیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ویسے ایک بات بتائیں، کیا آپ کو اور اسے ایک لاک اپ میں رکھا جائے۔“

”ہرگز نہیں سر..... میں ہر قیمت پر اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔“  
”خیر آپ آرام کریں۔“

مجھے واپس لاک اپ میں لے آیا گیا۔ تھوڑا سا اطمینان ہوا ان لوگوں کے دل میں میرے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کوروتی بھی اس بار پھنس گئی تھی اس کی پراسرار قوتیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ویسے مجھے اپنی حماقت کا احساس

تھا! اخبارات کی خبروں میں کئی جگہ اس بات کی نشاندہی ہوئی تھی کہ ان لوگوں کو میری کتاب کا مسودہ مل گیا ہے اور وہ میرے لئے جال تیار کر رہے ہیں لیکن میں اس پر غور نہیں کر سکا تھا۔

کوئی بھی عقل کل نہیں ہوتا، میں بھی نہیں تھا۔ کوروتی سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بیشک زندہ صدیاں میری شاہکار کتاب ہوتی لیکن ایسے کسی شاہکار کا کیا فائدہ جو زندگی ہی چھین لے۔

نئے لاک اپ میں مجھے واقعی بہترین سہولتیں دی گئی تھیں عمدہ کھانا، آرام دہ بستر، لیکن میرا اضطراب بے پناہ تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا اعلیٰ حکام بھی انجمن میں تھے وہ دن بھی گزر گیا، رات کو پھر مجھے اس جگہ طلب کر لیا گیا جہاں پہلے بلایا گیا تھا وہاں وہی افسران موجود تھے جن سے پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔

مجھے بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا گیا۔ ”ہم نے پہلے تمہارے بارے میں غور کیا ہے ذیشان عالی ہمارے خیال میں تم ایک شریف آدمی ہو اور ناگہانی مشکلات میں گرفتار ہو گئے ہو۔ اس تحقیقات کے بعد تمہارے بارے میں کچھ فیصلے کئے گئے ہیں جو تمہارے حق میں ہیں۔ لیکن ایک خطرناک وجود تم سے منسلک ہے جب تک اس کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوتا ہم تمہیں آزاد نہیں کر سکتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے ایک خطرناک مجرم ہے جس نے کئی پولیس والوں کو زخمی کیا ہے۔ ایک مایہ ناز ڈاکٹر کو قتل کیا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے کشنر صاحب اور ایک اور افسر لاپتہ ہوئے ہیں ہم اسے فوری موت کی سزا دے سکتے ہیں لیکن تم نے کچھ دہم پیدا کر دیئے ہیں اس لئے ہم نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔“

”جی سر.....؟ میں نے کہا۔“

”تمہیں مجبوراً ہی اسی لاک اپ میں پہنچایا جا رہا ہے جہاں وہ ہے۔“

”کیوں سر.....“

”سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے جو تاریخ میں پہنچ جاتا ہے اسے واپس کیسے لایا جاسکتا ہے۔ کوئی تو ترکیب ہوگی۔“

”جی.....“

”دوسرے تمہیں چالاکی سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہو سکتی ہے ہم اسے لاک اپ میں جلا سکتے ہیں تیزاب ڈال کر اس کی ہڈیاں گلا سکتے ہیں۔ اس کی ہڈیاں میں ہائی وولٹیج کرنٹ دوڑا سکتے ہیں وغیرہ۔ مائی ڈیئر ذیشان عالی تمہارے اس تعاون کے عوض نہ صرف تمہیں باعزت رہا کر دیا جائے گا بلکہ بہت بڑا انعام بھی دیا جائے گا۔“

”جی.....!“ میں نے تشویش سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ بڑے سطحی انداز سے اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ بہت آگے کی چیز ہے۔ انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن مجھے اپنی زندگی بھی عزیز تھی میں جانتا تھا کہ کوروتی مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گی کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے جبکہ یہ لوگ عدم تعاون پر میری کھال اتار دیں گے۔“

”کیا سوچ رہے ہو مسٹر عالی۔“

”سر..... میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح قابو میں آئے گی؟“

”گڈ..... ہم آپ کو اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔“

”جی سر.....! میں نے گردن ہلا دی۔“

کوروتی کو میں نے اس حال میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ لاک اپ کے اندر ایک دیوار سے ٹک لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی اور بولی۔ ”اوہ عالی! میری جان پاگل ہو گئی ہوں میں تمہارے لئے مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ بس

تمہارے لئے میں دیوانی ہو رہی تھی۔“

وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی لاک اپ کے باہر پولیس والے حیران نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک انسانی ڈھانچہ گوشت پوست کے ایک انسان سے لپٹ کر اسے چوم رہا تھا۔ اور زندہ انسان اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”انہوں نے تمہیں اذیت تو نہیں دی۔“

”نہیں، لیکن غلط ہو گیا ہے۔“

”کیا.....؟“

”میری کتاب کا مسودہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں سب معلوم ہو گیا ہے۔ اور اب وہ ہمارے لئے سزا تجویز کر رہے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ گے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔“

”ان کا بہت بڑا افسر کتاب کے ذریعے ماضی میں کہیں پہنچ گیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اسے واپس لانے میں مدد کرو۔“

”اس کے بعد وہ کیا کریں گے۔“

”انہیں اس بات کا یقین نہیں کہ تم امر ہو چکی ہو۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ تمہیں موت نہیں آئے گی اس کے بعد وہ تمہیں موت کا سزا دینا چاہتے ہیں۔“

”ہوں..... ا“ وہ سوچ میں ڈوب گئی، پھر مجھے اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا۔

”کیا ہوا تم کیوں ہنسی ہو؟“

”مجھے تمہاری دنیا کی ہوا لگ گئی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ سازشیں اور چالاکیاں آگئی ہیں جو تمہاری اس دنیا کا حصہ ہیں۔“

”اب بھی نہیں سمجھا۔“ میں نے کہا۔

”کچھ وقت میرے ساتھ گزارو۔ اور پھر انہیں اطلاع دو کہ تم نے مجھے اس افسر کی واپسی کے لئے راضی کر لیا ہے۔ پھر مجھے ان سے ملا دو۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”بس دیکھتے جاؤ، کیا ہوگا۔“ اس نے خطرناک لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

عجیب سے احساسات تھے میرے وہ بھی خاموش بیٹھی تھی۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں پولیس کے اعلیٰ افسران تذبذب میں تھے۔ ایک ایسی مخلوق کے بارے میں وہ یقین نہیں کر سکتے تھے جو صدیوں سے زندہ ہو۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کوروتی ایسی ہی ہے جیسا بتاتی ہے اس نے مجھے مہابھارت کا دور دکھایا۔ یونان کے قدیم کردار دکھائے تھے جو میں نے ہوش و حواس میں دیکھے تھے۔ کم از کم میں اس بات پر یقین رکھتا تھا۔ پھر کافی وقت کے بعد اس نے کہا۔

”عالی.....! اب تم ان سے مل لو۔“

”مجھے ان سے کیا لینا ہے۔“

”یہی کہ تم نے مجھے تیار کر لیا ہے کہ میں اس افسر اعلیٰ کو ماضی سے واپس لے آؤں۔ اس کے بدلے وہ تمہیں رہا کر

دیں گے۔“

”اور تمہیں۔“

”میں خود ان سے بات کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے کہا۔ لاک اپ کے جھگے کے پاس آ کر میں نے پہرے پر موجود کانسٹیبل سے کہا۔ ”افسران کو اطلاع دو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا فوری بندوبست کیا جائے۔“

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مجھے لاک اپ سے نکال لیا گیا اور وہ لوگ مجھے لے کر چل پڑے۔ مجھے اسی جگہ لے جایا گیا جہاں پہلے ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی اس معاملے سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ سب کے سب موجود تھے۔

مجھے خوش آمدید کہا گیا اور پوچھا گیا کہ کوئی کام کی بات ہوئی؟ ”جی سر.....“ مجھے بڑی شرمندگی سے کہنا پڑا ہے کہ وہ بدبخت مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔“

”ہمیں رپورٹ مل چکی ہے۔“ ایک افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کو چکر دیا ہے اگر کمشنر صاحب کو ماضی سے نکال لایا جائے تو ہمیں خفیہ طور پر رہائی دی جاسکتی ہے۔ ورنہ اسے قید اور مجھے سزائے موت دے دی جائے گی۔ وہ اس کام کے لئے تیار ہو گئی ہے۔“

”زندہ باقی یعنی وہ کمشنر صاحب کو زندہ نکال لائے گی۔“ خوشی سے کہا گیا۔

”کیا وہ سچ کہہ رہی ہے؟“

”ہاں..... یہ وعدہ اس نے مجھ سے کیا ہے۔“ اعلیٰ افسران ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوروتی کی بات مان لی جائے۔ ایک افسر نے کہا۔

”ہر چند کہ وہ قاتلہ ہے اور تم جو کچھ بھی ہے اس کے شریک کار ہو، لیکن ہم ایک انتہائی قیمتی افسر کی بازیابی کی خوشی میں تم دونوں کو رہا کر دیں گے نہ صرف رہا کر دیں گے بلکہ اس بدروح کے علاج کے لئے بھی کوشش کریں گے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں انہیں کی دنیا کا باشندہ تھا ان کی رگ رگ سے واقف تھا۔ قانون ان کی ملکیت نہیں تھا کہ وہ کسی قاتل کو معاف کر دیتے۔ لیکن صورت حال ہی ایسی آ پڑی تھی کہ جان بوجھ کر بے وقوف بننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

”تم اسے اطمینان دلاؤ کہ ہم تم دونوں کو رہا کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب!“ میں نے کہا۔ انتظامات کئے جانے لگے۔ میں خود بھی شدید تجسس کا شکار تھا کہ آخر کوروتی کیا کرے گی۔ اس نے بات تو بڑے اعتماد سے کی ہے۔ لیکن پتہ نہیں اس کا عمل کیا ہوگا وہ کامیاب ہو سکے گی یا نہیں۔“

مجھے اس کے پاس بھیجا گیا اور کہا گیا کہ اسے لے کر آ جاؤں۔ پولیس والے اس سے بری طرح خوف زدہ تھے۔ اے افسران کے پاس لانے کے لئے جو جتن کئے گئے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھے۔ پولیس کے جوانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح کا خطرہ محسوس کریں تو بند و قوتوں کے دہانے کھول دیں اور ہم دونوں کا قیہ بنا دیں۔ اس کے بارے میں مجھے بتا دیا تھا۔

میں نے کوروتی سے کہا کہ افسران ہم سے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ اور اسے طلب کیا گیا ہے۔

”میں ان کے آدمی کو ان کے حوالے کر دوں گی اور اگر انہوں نے بدتمیزی کی تو میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ بات انہیں بتا دی جائے۔“ میں نے یہ بات انہیں بتا دی۔ وہ سب عجیب نظروں سے کوروتی کو دیکھ رہے تھے۔

”میڈم کوروتی، کیا آپ دل سے ہمارے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔“  
”میں بڑی آسانی سے آپ لوگوں کے چنگل سے نکل سکتی ہوں۔ لیکن میرا محبوب کسی مشکل میں گرفتار ہوئیں نہیں چاہتی۔ میں جو کچھ کروں گی اس کے لئے کروں گی۔“

”ہم نے وعدہ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔“

”آپ کیا کریں گی؟“

”میں ڈیٹان عالی کے ساتھ کتاب کے ذریعے تاریخ میں جاؤں گی اور آپ کے دونوں آدمیوں کو تلاش کروں گی اور انہیں واپس لے آؤں گی۔“

”ڈیٹان عالی کے ساتھ۔“

”ہاں۔“

”سوری میڈم ہم یہ رسک نہیں لے سکتے، معاف کیجئے ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ اپنے محبوب کے ساتھ تاریخ میں گم ہو جائیں گی اور ہم آپ کا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔“ سب سے بڑے افسر شاہ میر صاحب نے کہا۔

”پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔“

”آپ تنہا جائیں اور اپنا کام کر کے واپس آئیں ڈیٹان عالی ضمانت کے طور پر ہمارے پاس رہیں گے۔“

”مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کسی کی ضرورت ہوگی۔“ کوروتی نے کہا۔

”ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ جاسکتا ہے۔“

”مجھے اعتراض نہیں، کیونکہ میں خلوص سے آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”اس کے لئے میں تیار ہوں۔“ شاہ میر صاحب نے دلیری سے کہا۔

”سر..... آپ ہم میں سے کسی کو حکم دیں۔“ چند افسران نے کہا۔

”نہیں، یہ میری زندگی کا سب سے دلچسپ تجربہ ہوگا۔“ شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی سی رد و قدح کے بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ ایک ناقابل یقین تجربہ تھا جس کے لئے بڑی سنسنی محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ کام فوری طور پر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ پھر ایک بند گاڑی تمام افسروں کے ساتھ مجھے اور کوروتی کو لے کر کوروتی کی کوشی کی طرف چل پڑی۔

میں خود بھی ان میں تھا۔ نہ جانے کوروتی کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے کر تاریخ کے کسی دور میں چلی جائے گی اور یہ لوگ انتظار کرتے رہ جائیں گے۔ لیکن وہ شاہ میر کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔ اب موقع بھی نہیں تھا کہ میں کوروتی سے اس کے منصوبے کے بارے میں پوچھ سکتا۔

ہم کوروتی کی کوشی پہنچ گئے۔ شدید سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ پولیس کے افسران شدید ہيجان کا شکار تھے۔ انہوں نے کوروتی سے پوچھا۔ ”آپ کو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کاشنر صاحب اور ہمارا دوسرا ساتھی کس دور میں ہیں۔“

”آپ سب لوگ میرے ساتھ چلیں اور سب مل کر انہیں تلاش کریں ورنہ میرا کام مجھے ہی کرنے دیں تو بہتر ہے۔“ کوروتی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد سب خاموش ہو گئے تھے۔ کوروتی نے تیاریاں کیں پھر شاہ میر کو اشارہ

کیا اور کتاب کی سینڑھیاں ملنے لگی سب کے چہرے پر شدید سنسنی پھیلی ہوئی تھی کوروتی ایک ابھار پر چڑھ گئی اس نے شاہ میر کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے سب کی طرف ہاتھ ہلایا اور شاہ میر سمیت کتاب کے تعویذ میں غرق ہو گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھی کوروتی کے منصوبے کا علم نہیں تھا کہ وہ کیا کرے گی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ زیادہ چالاک نہیں ہے۔ بیشک وہ پراسرار علوم کی ماہر تھی۔ لیکن جدید دور کے علوم اس سے زیادہ پراسرار تھے اور وہ ان سے ہار سکتی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے پر غمال بنا کر رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوروتی میری دیوانی تھی لیکن میں اس کی وجہ سے بڑے عذاب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ ایک افسر نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے عالی صاحب۔ اس کی واپسی کب تک ہو جائے گی۔“

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟“

”کیا مطلب.....“

”آپ کو اس سے پوچھنا چاہے۔ ویسے میں ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔“

”جی فرمائے۔“

”زندہ صدیوں کا مسودہ میری زندگی کا بہت بڑا کام تھا۔ میری کتاب ساری دنیا میں تھلکہ مچا دیتی پتہ نہیں تین الاقوامی طور پر میری کتنی پذیرائی ہوتی۔ جتنی تاریخ لکھی گئی ہے وہ سب میری اس کتاب کے سامنے بچ ہوتی کیونکہ میں ان ادوار کا دیدہ ور ہوتا۔ اور تاریخ کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا لیکن میں دوسری شکل میں گرفتار ہو گیا مجھے اپنے مسودے کی گمشدگی کا بے حد دکھ ہوا تھا لیکن اب میں اس سے خوش ہوں۔“

”وہ کیوں.....“ ایک نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کیونکہ آپ لوگوں نے اس مسودہ کو پڑھ لیا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑا۔“

”آپ اس کے ذریعہ بہت سی حقیقتوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ اس کا آپ کو بھی یقین ہو گا کہ وہ میں نے آپ کے لئے نہیں لکھا تھا اس کی رو سے میں ایک ناگہانی کا شکار ہوں اور اس کے جرم میں میں براہ راست ملوث نہیں ہوں نہ ہی وہ جرم میری وجہ سے کیا گیا ہے۔“

”ہم نے آپ کے ساتھ نرم رویہ رکھا ہے۔“ افسر نے کہا۔

”میری دلی دعا ہے کہ کاشنر صاحب اور دوسرے ساتھی بازیاب ہو جائیں، لیکن اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ کوروتی کے کسی جرم میں میں شریک نہیں ہوں۔“

وقت بہت گزر گیا۔ کافی رات ہو گئی کوروتی کی کوشی میں باقاعدہ آپریشن اسٹیشن بنا لیا گیا۔ ان لوگوں کے وہیں کھانے پینے کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ مجھے بھی اس میں شریک کیا تھا ساری رات گزر گئی سب جاگتے رہے تھے۔

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے جب کتاب کے تعویذ سے کچھ آٹھیں ابھریں اور سب لوگ ہوشیار ہو گئے خود میری نظر بھی اس طرف جمی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے تعویذ سے شاہ میر صاحب برآمد ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھ کر میزبھیوں کے پاس پہنچے سب لوگوں نے ان کی طرف دوڑ لگا دی۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شاہ میر صاحب بڑے جھٹکے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے تحیف آواز میں کہا۔

”میں جن عجیب و غریب حالات سے گزرا انہوں نے میرے دماغ کی چولیس ہلا دی ہیں۔ لیکن میں آپ لوگوں کو مختصر صورت حال ضرور بتاؤں گا۔ اس کے بعد براہ کرم مجھے آرام کا موقع دیا جائے۔“

”ضرور سر..... کیا کمشنر صاحب کا کچھ پتہ چلا۔“

”نہیں..... لیکن امید ہے کہ وہ انہیں تلاش کر کے ضرور لے آئے گی۔ کیونکہ اس کی مجبوری ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یعنی ذیشان عالی۔“

”ہمیں کچھ تفصیل بتائے سر۔“

”ہاں..... ایک عجیب طلسمی ماحول میں وہ مجھے لے گئی۔ یہ راجہ بکرماجیت کا دور تھا، دارشاہی لگا تھا، قدیم ماحول تھا، وہاں کمشنر صاحب کو تلاش کیا گیا بہت کوششیں کی گئیں لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا، پھر ہم دوسرے ادوار میں گئے۔ کوروتی ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہی تھی۔ وہ خود بھی پریشان تھی۔ وہاں کی فضا میری زندگی کے لئے بہت خطرناک تھی میں بھرپور سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی اس نے کہا وہ کمشنر کے بازیابی کے لئے مخلص ہے۔ لیکن میں خود دیکھ لوں یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ شاید میں وہاں زیادہ دیر نہ رہ سکوں۔ تب اس نے پریشانی سے کہا کہ کمشنر صاحب کے بارے میں یہ تعین نہیں ہو سکا کہ وہ کون سے دور میں ہیں انہیں تلاش کرنے میں وقت لگے گا تب میں نے تجویز پیش کی کہ اگر وہ رک کر انہیں تلاش کرے تو وہ مل سکتے ہیں وہ مجھے واپس پہنچا دے۔ وہ مان گئی اور مجھے واپس پہنچا گئی۔“

”اوہ..... اس نے کوئی وعدہ کیا ہے؟“

”ہاں..... اس نے کہا ہے کہ وہ یہ کام جلد سے جلد کرے گی، لیکن اس کی شرط ہے کہ ذیشان عالی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ورنہ وہ کمشنر صاحب کو ہلاک کر دے گی۔“

شاہ میر صاحب کو ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ مجھے بھی کوشی سے لے آیا گیا انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور مجھے ایک افسر صاحب کے گھر لے جایا گیا جہاں میرے لئے ایک بیڈروم کا بندوبست کیا گیا لیکن مجھے بتا دیا گیا کہ میں سخت پہرے میں ہوں اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کروں ورنہ بنا ہوا کام بگڑ جائے گا۔

دن نکل آیا تھا۔ لیکن مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ مجھے بہترین ناشتہ دیا گیا اور ناشتے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔ دو پہر کو دو بجے آنکھ کھلی تو شاید بخار ہو گیا تھا۔ جن صاحب کے گھر میں تھا وہ بھی بہت بڑے پولیس افسر تھے۔ میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کو بلا کر مجھے چیک کرایا گیا انجکشن دیا گیا پھر کھانا دیا گیا۔ رات بھر جاگا تھا اس لئے طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن دل بھی پریشان تھا اب ہو گا کیا، کیا کوروتی کمشنر کو تلاش کر لے گی، کیا کمشنر زندہ ہو گا۔ اگر وہ نہ ملتا تو کیا کوروتی خود کو ان کے حوالے کر دے گی۔ یا پھر کوئی اور کھیل شروع ہو جائے گا؟

کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ طبیعت پر شدید جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ میں زندہ صدیوں کو کوس رہا تھا جس نے مجھے عذاب میں گرفتار کر دیا تھا۔ بلکہ مجھے اس سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ خواہ مخواہ مجرم بن کر رہ گیا تھا۔

یہ رات دوسرا دن پھر تیسرا دن مجھ سے کسی طرح کا رابطہ نہیں کیا گیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے اوپر سخت پہرہ رکھا جاتا ہے۔ اور یہاں سے کسی طور فرار کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر میری ان افسر صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا میں مہمان تھا۔ وہ خود ہی میرے کمرے میں آئے تھے۔ ”جی ذیشان عالی۔ لگتا ہے کوروتی ہمیں دھوکا دے گئی۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”آپ سے بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔“

”ہاں اس کی روح خواب میں آئی تھی۔ میرا مذاق اڑا رہی تھی۔“

”حواس قائم رکھ کر بات کریں جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ افسر نے بگڑ کر کہا۔

”ٹھیک ہے آپ مجھے ڈاکٹر قیصر شاہ کا قاتل قرار دے کر سزائے موت دلوادیں۔ ایسے کام آپ لوگوں کے لئے کون سے مشکل ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا اور افسر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ بمشکل تمام انہوں نے خود پر قابو پایا اور بولے۔

”لگتا ہے آپ کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ آپ نے جو بکواس کی ہے اس کا جواب میں ایسا دے سکتا ہوں کہ آپ مرنے کے بعد میں یاد رکھتے۔“

”بڑی عمدہ بات کہی ہے آپ نے۔ یعنی مرنے کے بعد ظاہر ہے آپ کی ناراضگی کے بعد زندہ رہنے کا تو تصور ہی مٹ جاتا ہے۔ لیکن محترم اتفاق سے قدرت نے میری بے گناہی کا ثبوت میرے مسودے کی شکل میں آپ تک پہنچا دیا ہے آپ نے اس میں پڑھ لیا ہے کہ وہ بلا مجھ پر کس طرح نازل ہوئی۔ وہ سب کچھ میں نے آپ کے لئے نہیں لکھا تھا۔“ افسر صاحب خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بولے۔ ”خیر آپ سے تفصیل سے بات ہوگی۔ فی الحال آپ کو یہ بتانا ہے کہ شاہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”شاہ میر صاحب۔“

”جی۔“

”مجھے اب کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا جائے۔ میں نے بیزار سے کہا۔“

”یہ فیصلہ بھی وہ خود ہی سنا دیں گے۔ آپ تیاری کریں۔“

”مجھے کیا تیاری کرنی ہوگی؟“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”آپ کے لباس وغیرہ آپ کے گھر سے منگوائے گئے ہیں آپ اپنا حلیہ ٹھیک کر لیں آپ کو شاہ میر صاحب کی کوشی جانا ہوگا۔“

”اوہ! اس کا مطلب ہے کہ پولیس میرے گھر پر قبضہ کر چکی ہے۔ دیری گڈ۔“

”تم ضرورت سے زیادہ بکواس کر رہے ہو۔ اگر شاہ میر صاحب اس وقت تمہارا انتظار نہ کر رہے ہوتے تو میں تیر کی طرح سیدھا کر دیتا۔“ افسر صاحب نے کہا۔ وہ آپ سے تم پر آگئے۔ اور شاید میں اس کے بعد کچھ کہتا تو۔۔۔۔۔

میں غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ وہاں میرے کپڑے موجود تھے۔ شیو وغیرہ کرنے کا سامان بھی چٹانچہ میں نے تیاری کر لی۔ باہر نکلا تو ایک ایسی آئی میرا انتظار کر رہا تھا۔

”چلیں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”جی.....!“ میں نے جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ باہر ایک پولیس موہل کھڑی ہوئی تھی جو مجھے لے کر چل پڑی۔ راستے بھر میں سوچ میں ڈوبا رہا تھا کیا ہو گا شاہ میر نے مجھے کیوں طلب کیا ہے۔ پھر ہم ایک شاندار کوشی پر پہنچ گئے۔ عالی شان کوشی میں چاروں طرف پولیس والے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مختلف کام سرانجام دے رہے تھے مجھے کوشی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔

مجھے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پردوار شخصیت کے مالک شاہ میر صاحب اندر داخل ہو گئے۔ میں ان

کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھے ڈیٹان عالی!“ انہوں نے کہا۔ اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ”مجھے کچھ عجیب شواہد ملے ہیں۔ میں آپ سے ان کی تصدیق چاہتا ہوں۔“

”جی..... فرمائیے۔“

”ایک سوال کروں آپ سے۔“

”میں حاضر ہوں۔“

”جیسا کہ آپ کی کتاب سے ظاہر ہے کہ کوروتی آپ کو بے پناہ چاہتی ہے۔ دیکھئے میں آپ سے کچھ کھلے سوالات کر رہا ہوں۔ آپ محسوس نہ کریں مجھے ان کے صحیح جواب دیں۔“

”جی..... میں نے مختصر اُکھا۔“

”وہ آپ کو بے پناہ چاہتی ہے۔ کیا ایسا ہے؟“

”جی..... ایسا ہے۔“

”کیا اس کے اور آپ کے درمیان ہر طرح کے تعلقات قائم تھے آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔“

”جی ہاں.....“

”تعلقات تھے۔“

”جی۔“

”جب تک اس کی جسمانی کیفیت بہتر تھی آپ بھی اسے پسند کرتے ہوں گے۔“

”جی۔“

”اس کے بعد میرا مطلب ہے جب وہ ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔“

”آپ یہ سوال خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں اور مجھے اس کا جواب دیں۔“

”نہیں..... یہ جواب آپ کو دینا ہے۔“ شاہ میر صاحب نے سنجیدگی سے کہا ان کے لہجے میں ایک حکم کی سی کیفیت تھی۔

”میں ان لمحات میں سخت اذیت کا شکار رہتا تھا۔“

”کن لمحات میں۔“

”جب ایک انسانی ڈھانچے کو مجھے اپنی قربت میں برداشت کرنا پڑتا تھا آپ خود سوچئے ان لمحات میں کسی انسان کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔“

”وہ آپ سے مطمئن ہوئی تھی۔“

”جی۔“

”گویا اسے اپنی اس کیفیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔“

”شاید نہیں۔“

”ہوں!“ شاہ میر صاحب گہری سنجیدگی سے ہنکارہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ ”جہاں آپ کو رکھا گیا ہے وہاں آپ کو کوئی تکلیف ہوئی؟“

”نہیں۔“

”وہاں آپ سے کچھ سوالات کئے گئے تھے۔“

”نہیں۔“

”کچھ کھانا پینا پسند کریں گے۔“

”شکریہ سر..... آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”بتائیے.....؟“

”یہ سوالات جو آپ نے مجھ سے کئے ہیں میرے لئے بالکل غیر متوقع ہیں۔ ان کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں آپ کی مکمل تسلی کروں گا۔ تھوڑا تو قف کریں۔“ شاہ میر نے کہا۔ اور میں خاموش ہو کر گہری سانسیں لینے لگا۔

شاہ میر کے سوالات نے مجھے چکا کر رکھ دیا تھا۔ اور میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اچانک انہوں نے

سوال کیا۔

”کارڈ رائیو کر سکتے ہو۔“

”جی..... میں نے جواب دیا۔“

”ہمیں تھوڑا سا سفر کرنا ہو گا“ آؤ بیٹھو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھے تو میں بھی اٹھ گیا۔ پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا تو وہ دوڑتا ہوا پاس آ گیا۔ اس نے ادب سے سلوٹ کیا۔

”نفل سے کہو گاڑی لائے۔“ شاہ میر صاحب نے پر رعب لہجے میں کہا۔ اور پولیس والا دوڑ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں ایک ہنڈا سٹی پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے اترنے والے باوردی کانسٹیبل نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ شاہ میر اندر بیٹھ گئے اور ڈرائیور سے کہا۔

”چابی انہیں دے دو۔ گاڑی یہ چلائیں گے۔“ ڈرائیور نے جلدی سے چابی مجھے دے دی اور میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چابی سنہال لی۔ ”چلو ڈیٹان“ کارڈ رائیو کرو۔“

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اور میں نے اسٹیرنگ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ پھر میں گاڑی کو عمارت سے باہر نکال لایا۔ ”بائیں سمت چلو۔“ شاہ میر نے پر رعب لہجے میں کہا۔ اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میری عقل چکرائی ہوئی تھی یہ سب مجھے بے حد پراسرار لگ رہا تھا۔ لیکن میں کار دوڑا رہا تھا۔ اس بات پر حیران تھا کہ شاہ میر نے ایک گرفتار شدہ شخص پر اتنا بھروسہ کیوں کر لیا۔ میں فرار ہونے کے لئے انہیں کوئی بھی ڈانچ دے سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی سوچا

میں نے کہ وہ ایک بڑے پولیس آفیسر ہیں بلاوجہ تو اتنے بڑے عہدے تک نہیں پہنچے ہوں گے۔ یقیناً وہ مسلح ہوں گے اور میری کوئی بھی غلط حرکت محسوس کر کے میری کھوپڑی اڑا سکتے ہیں۔

وہ مجھے راستے بتاتے رہے۔ پھر ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ اب میری حیرت عروج پر پہنچتی جا رہی تھی۔ کیا چاہتا ہے یہ شخص اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ ہم شہر سے کوئی ساٹھ کلومیٹر دور نکل آئے۔ پھر ایک جگہ شاہ میر صاحب نے کہا۔ ”رفتار ست کر دو۔ آگے بائیں ہاتھ پر ایک گھنڈی ہے اس پر اتر جانا۔“

”جی سر، لیکن۔“ میں نے کہا۔

”چلتے رہو..... سب بتا دوں گا۔“ انہوں نے میری ہچکچاہٹ کے جواب میں کہا۔ گھنڈی کوئی آدھے کلومیٹر تھی۔ اچھی خاصی چوڑی گھنڈی تھی میں نے احتیاط سے کار پیچھے اتاری اور دست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر بہت قدیم کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ یہ گنالہ کے کھنڈرات کہلاتے تھے اور سکندر اعظم سے منسوب کہلاتے

”چلتے رہو..... سب بتا دوں گا۔“ انہوں نے میری ہچکچاہٹ کے جواب میں کہا۔ گھنڈی کوئی آدھے کلومیٹر تھی۔ اچھی خاصی چوڑی گھنڈی تھی میں نے احتیاط سے کار پیچھے اتاری اور دست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر بہت قدیم کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ یہ گنالہ کے کھنڈرات کہلاتے تھے اور سکندر اعظم سے منسوب کہلاتے

”جی سر، لیکن۔“ میں نے کہا۔

”چلتے رہو..... سب بتا دوں گا۔“ انہوں نے میری ہچکچاہٹ کے جواب میں کہا۔ گھنڈی کوئی آدھے کلومیٹر تھی۔ اچھی خاصی چوڑی گھنڈی تھی میں نے احتیاط سے کار پیچھے اتاری اور دست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر بہت قدیم کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ یہ گنالہ کے کھنڈرات کہلاتے تھے اور سکندر اعظم سے منسوب کہلاتے

”چلتے رہو..... سب بتا دوں گا۔“ انہوں نے میری ہچکچاہٹ کے جواب میں کہا۔ گھنڈی کوئی آدھے کلومیٹر تھی۔ اچھی خاصی چوڑی گھنڈی تھی میں نے احتیاط سے کار پیچھے اتاری اور دست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے فاصلے پر بہت قدیم کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ یہ گنالہ کے کھنڈرات کہلاتے تھے اور سکندر اعظم سے منسوب کہلاتے

”جی سر، لیکن۔“ میں نے کہا۔

تھے۔ میں نے صرف ان کے بارے میں سنا تھا کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اکثر سر پھرے یہاں پلنگ منانے آ جاتے تھے۔ کار ان کھنڈرات کے پاس پہنچ گئی۔ بڑی خوف ناک جگہ تھی۔ شاہ میر نے ان کے دوسری طرف جانے کے لئے کہا۔ اور میں نے ان کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا، لیکن میرا سر چکرا رہا تھا۔ شاہ میر مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ وہ کار سے اترے اور کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں ان کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ بڑی خوفناک جگہ تھی۔ لیکن عمارت کے کچھ کمرے اس قابل تھے کہ ان میں کچھ وقت گزارا جاسکے۔ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں پتھر کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی پاٹ دار آواز ابھری۔

”بیٹھو ڈیٹان عالی۔“ یہ کہہ کر وہ پتھر کی ایک سل پر بیٹھ گئے۔ میں ان سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے سراٹھایا اور بولے۔ ”ڈیٹان عالی! میں کوروتی ہوں۔“

میں سل پر سر گر پڑا۔ کنارے پر ہی لگا ہوا تھا۔ بدن کو اتنی زور کا جھٹکا لگا تھا کہ توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس بات پر کبھی یقین نہ کرتا اگر کوروتی کی آواز نہ سن لیتا۔ اس کا انداز نہ پہچان لیتا۔ کھسپائے ہوئے سے انداز میں اٹھا اور دوبارہ سل پر بیٹھ گیا۔

”تمہیں بہت حیرت ہوئی ہے۔“ آواز دوبارہ سنائی دی۔ اور میں گہری گہری سانس لینے لگا۔ آواز دوبارہ ابھری۔ ”بہی میرا منصوبہ تھا۔ ان لوگوں پر اسی طرح قابو پایا جاسکتا تھا۔ پولیس کمشنر کس دور میں گیا ہے۔ وہاں اس پر کیا گزری؟ میں بھی نہیں جانتی۔ وہ ماضی میں چلا گیا وہ نہیں جانتا ہوگا کہ ماضی میں خود کس ادوار میں ضم کیا جاسکتا ہے وہ زندہ نہ رہ سکا ہوگا میں بھلا اسے کیا لاتی۔ مگر ان سے گلو غلامی کا یہی ایک طریقہ تھا جو میں نے اختیار کیا۔ تم خاموش کیوں ہو۔ کیا ابھی یقین نہیں آ رہا۔“

”تم واقعی کوروتی ہو؟“

”میری آواز تک بھول گئے۔“

”نہیں..... آواز تمہاری ہی ہے۔“ میں نے مری مری آواز میں کہا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر بکراجیت کے دور میں گئی۔ کچھ وقت وہاں گزارا پھر میں نے اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا۔ مجبوری تھی میں کسی مردہ بدن میں ہی داخل ہو سکتی ہوں۔ اسے مارنے کے بعد میں نے اس کا بدن حاصل کیا اور واپس آ گئی۔“

”تب سے اس بدن میں ہو۔“

”ہاں..... یہ بھی مجبوری ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”میں اس کا بدن چھوڑوں گی تو یہ اپنے اصلی جسم کے ساتھ نمایاں ہوگا۔ تمہیں شاید بے بدودار بدن یاد ہوگا۔ سڑا ہوا گوشت ہڈیوں سے جدا ہوتا ہوا۔“

”ہاں..... میں نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔

”اس کا گوشت بھی اب گلنا شروع ہو گیا ہوگا۔ بس یہی میری پلاننگ تھی۔ میں اسے لے کر گئی اور پھر اسے ختم کر کے اس کے روپ میں واپس آ گئی۔“

”گو یا تم نے ایک اور انسانی زندگی لے لی۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ اور اچانک اس کے چہرے پر خشونت کے

آٹھار پھیل گئے۔ اس کی پوری کیفیت کا اظہار شاہ میر کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔ اس نے کسی قدر کرحت لہجے میں کہا۔ ”ہاں، ایک اور کیا۔ اب میں ضرورت کے مطابق انسانی زندگیاں لیتی رہوں گی۔ مجبوری ہے ڈیٹان عالی! میں نے ہر دور کے انسان کا تجربہ کیا ہے۔ خصوصاً مرد ڈیٹان تم لوگ بے حد خود غرض ہوتے ہو۔ صرف اپنے لئے جیتے ہو، کوئی تمہارے لئے کچھ بھی کرے لیکن تم اسے اپنے دل میں کوئی مقام نہیں دیتے۔ تم اپنی پسند مقدم رکھتے ہو۔“

”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔

”تم نے میرا دل لکھ لکھ کرے کر دیا۔“

”میں نے.....“ میں حیرت سے بولا۔ اور وہ شاہ میر کی حیثیت سے مجھے گھورنے لگی۔ پھر اس نے زہریلے لہجے میں

کہا۔ ”آپ کے اور اس کے درمیان ہر طرح کے تعلقات تھے۔“

”جب تک اس کی جسمانی کیفیت بہتر تھی آپ بھی اسے پسند کرتے ہوں گے۔“

”اس کے بعد جب میں ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی۔“

”یہ سوالات میں نے اپنے اور آپ کے درمیان کی آخری حد متعین کرنے کے لئے کئے تھے اور آپ کو اپنے جواب ضرور یاد ہوں گے۔“

میرے مسامات نے پسینہ اگل دیا۔ کم بخت نے شاہ میر کی حیثیت سے یہ سوالات کئے تھے اور میں نے ان کے سچے جواب دیئے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہ میر کے روپ میں کوروتی ہے۔ جو میرے دل میں تھا وہ میں نے کہہ دیا تھا۔ اب کیا کروں؟ ڈھٹائی کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”یہی کہ اب میں خود کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی۔“

”مطلب۔“

”تمہارے دل کی بات جان چکی ہوں اور اب اپنے دل کی بات تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔“

”بتاؤ۔“

”میں نے ان صدیوں میں ایک سے ایک حسین مرد دیکھا ہے۔ بے شمار میری طرف جھکے بھی ہیں لیکن میں نے ان پر تھوکا بھی نہیں۔ میری بد نصیبی کے اس دور میں آ کر میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی اور میری شخصیت پارہ پارہ ہو گئی۔ میں نے اپنا وجود اپنی محبت کو سونپ دیا۔ مجھے ان لمحات کی چاہت نہیں تھی جو میں نے تمہیں دیئے ہیں تو تمہارے دل کی ہر خوشی چاہتی تھی۔ اور میں نے تمہاری ہر مانگ پوری کر دی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں عورت ہوں۔ اور عورت کی طلب ایک مرد بھی ہوتا ہے۔ تم میرے مرد بن گئے اور میں تمہاری دیوانی ہو گئی۔ مجھے ہر وقت یہ غم کھائے جاتا تھا۔ کہ تم بوڑھے ہو جاؤ گے پھر میں کیا کروں گی لیکن میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا البتہ میں اپنے ذہن میں مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ تمہیں کیسے امر کروں۔ خیر..... یہ الگ بات ہے اب جبکہ مجھے تمہارے دل کی بات معلوم ہو چکی ہے مجھے یہ پتہ چل چکا ہے کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔

”کیا فیصلہ.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں خود کو تمہاری پولیس کے حوالے کئے دیتی ہوں۔ میں انہیں پوری تفصیل بتا دوں گی ان سے کہہ دوں گی کہ قیصر شاہ کے قتل اور اب شاہ میر کے قتل میں ڈیٹان عالی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس کی ذمہ داری میں ہوں۔ وہ میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں۔“



میں اس کے الفاظ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ”نہیں کوروتی میں یہ نہیں چاہتا دیکھو۔ میں انسان ہوں ایک نئی دنیا سے میرا تعلق ہے۔ تم خود سوچو۔ بس میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

”تم جو چاہتے ہو وہ بھی کر سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیا.....؟“

”یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے کہا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ شاہ میر کی شکل میں خاموش بیٹھی رہی۔ پھر یولی۔

”شاہ میر کے بدن کا کیا کریں۔“

”یہ تو مر چکے ہیں۔“

”ہاں اور اب گلنا سڑنا شروع ہو گیا ہوگا۔“

”تم ان کے بدن میں رہو۔“

”نہیں، تمہیں یاد ہو گا ثنا کے بدن میں بھی میں زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ بدن شاید اتنا بھی ساتھ نہ دے سکے۔ میں محسوس کر رہی ہوں ایک صورت یہ ہے کہ ہم اسے یونہی چھوڑ دیں اور یہاں سے چلیں۔“

”یہ بہتر نہیں ہوگا۔ اسے ان کے لواحقین کے پاس پہنچنا چاہئے تاکہ وہ ان کی جھیمڑ و تحفین کر سکیں میں کسی لاش کی یہ بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اور میری.....؟“ وہ طنز سے بولی۔

”ایسی باتیں نہ کرو کوروتی۔“

”ایک آخری بات بتا دو براہ کرم ایک آخری بات بتا دو۔“

”پوچھو.....!“

”جب تک زندگی ہے۔ میرا ساتھ پسند کرو گے۔“

سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک بے گناہ مجرم تھا۔ لیکن میرے ہم وطن کبھی نہیں مانیں گے کہ میں بے گناہ ہوں۔ زندہ صدیاں بھی ان کے قبضے میں ہے۔ کوروتی کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا کروں گا۔ وہ کم از کم اپنی پراسرار قوتوں کا سہارا تو دے گی۔ چنانچہ میں نے کہا۔

”ہاں..... میں تمہارا ساتھ پسند کروں گا۔“

”دل سے۔“

”ہاں.....“

وہ خوش ہو گئی جس کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ یعنی شاہ میر کی آنکھوں سے۔ پھر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

”شاہ میر کی حیثیت سے اس کے گھر میں رہنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ پولیس والے بہر حال ذہین ہوتے ہیں۔ اور پھر تمہارا شاہ میر کے ساتھ رہنا کوئی مقصد نہیں رکھتا۔“

”ہاں ایسا ہے۔ لیکن میں شاہ میر کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا اسے ان کے گھر والوں تک پہنچنا چاہئے۔ میں نے کہا۔“

”یوں کرتے ہیں تم معمول کے مطابق کار لے کر چلو کسی معروف جگہ میں شاہ میر کا بدن چھوڑ دوں گی اور اسے کار میں پڑا رہنے دیں گے۔ لوگ خود اسے اس کے گھر پہنچا دیں گے۔“

”اور ہم.....“ میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”تمہارا ہم کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ہم بھی اپنا کوئی بندوبست کر لیں گے۔ بس اب ساری باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو بھروسہ کرو گے۔“

میں نے گردن ہلا دی۔ پھر ہم وہاں سے واپسی کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اور وہ کار کی پیچلی سیٹ پر بیٹھ گئی شاہ میر کی حیثیت سے۔ کار چلاتے ہوئے مجھے شاہ میر کی موت کا بہت دکھ ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا تھا لیکن ایک اور احساس بھی مجھے ہو رہا تھا وہ یہ کہ کوروتی اب خون خوار ہو گئی تھی مجھے خوف تھا کہ اب وہ بے دریغ قتل کرے گی اور جو قتل ہوں گے میرے ہم وطن ہوں گے۔ اس بدروح کو میں اپنے ہاتھوں سے فنا کر دیتا اگر یہ میرے لئے ممکن ہوتا۔

میں کار چلاتا رہا۔ پھر ہم شہر پہنچ گئے۔ ایک ہری بھری جگہ کوروتی نے کار روکنے کے لئے کہا اور میں نے کار روک دی۔ وہ بولی۔ ”وہ سامنے ایک ریسٹورنٹ نظر آ رہا ہے۔ اس طرف۔“

”ہاں.....“ میں نے کہا۔

”آؤ وہاں چل کر بیٹھیں گے۔“

”خیریت وہاں کیوں۔“

”کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔“

”کیا.....“

”میں اپنا پروگرام تھوڑا سا بدل رہی ہوں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”شاہ میر کا بدن یوں سرعام نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہم پھر کسی روپ میں یہاں سے آگے بڑھیں گے۔ تم بھی عوام کے شناسا ہو اور میں بھی۔ گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”پھر.....“

”یوں کرتے ہیں چلتے ہیں یہاں سے۔ ابھی ہمارے پاس ایک ٹھکانہ ہے۔ جو نبی میں محسوس کروں گی کہ مجھے شاہ میر کے بدن سے لگتا ہے۔ ہم وہاں سے چل پڑیں گے۔ اس دوران یہ فیصلہ کر لیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔“

”جیسے تم پسند کرو۔ پھر تم نے اتنی تک دو کیوں کی۔ مجھے شاہ میر کی حیثیت سے اپنے پاس بلایا پھر اس ویران عمارت میں لے گئیں اور اب.....“

”تم مجھے کیوں نہیں ہو عالی! میں نے بیٹک قدیم دور سے آج تک وقت گزرا ہے۔ لیکن میں ہر دور سے اچھی طرح آشنا نہیں ہو پاتی جب اسے سمجھنے میں کامیاب ہوتی ہوں تو دور بدل جاتا ہے۔ جس دور میں اب ہوں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی وہ تو بس نکلے لگاتی ہوں۔ کتاب کی گہرائیوں میں اتر کر میں بکرماجیت کے دور میں پہنچی لیکن وہاں میں نے زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ میرا منصوبہ یہی تھا کہ شاہ میر کے گھر آ کر میں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کروں جہاں میں اور تم قیام کریں۔ میں نے شاہ میر کے ڈرائیور کو پھانسا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک ایسی ویران عمارت کی تلاش ہے جہاں مجھے ایک کام کرنا ہے۔ ڈرائیور نے اس عمارت کی نشاندہی کی۔ بس یوں سمجھ لو میرے ذہن

میں کچھ واضح نہیں ہے۔ عمارت میں جا کر مجھے احساس ہوا کہ یہاں آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔“  
”پھر اب۔“

”چلو واپس چلو۔ دیکھیں گے آگے کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ سچی بات ہے کہ میری عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ الغرض میں نے دوبارہ گاڑی دوڑائی شاہ میر کی کوٹھی کی طرف بڑھا دی۔ وہاں پہنچا تو پولیس کے کچھ افسران کو شاہ میر کا منتظر پایا۔ شاہ میر کے اس طرح میرے ساتھ تھا آنے پر وہ تشویش کا شکار ہو گئے تھے۔“

انہوں نے مجھے مشتہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”کورتی“ شاہ میر کے ایک ایک انداز کی اداکاری کر رہی تھی۔ اس نے شاہ میر کے پردقار لہجے میں ان کی آمد کی وجہ پوچھی۔

”سر آپ سے کچھ کام تھا۔“ ایک آفیسر نے کہا۔

”ہوں ڈیٹان تم میرے کمرے میں جاؤ۔ میں آتا ہوں۔“ کورتی نے کہا اور میں اندر چل پڑا۔  
کوئی بیس منٹ کے بعد کورتی شاہ میر کے روپ میں اندر آگئی۔

”کچھ کھانا پینا چاہتے ہو۔“

”بالکل نہیں..... خیریت یہ لوگ کیوں آئے تھے۔“

”بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور جوتے وغیرہ اتار کر صوفے کی بجائے بستر پر آگئی۔ ”تھک گئی ہوں بری طرح۔“

”ہوں.....“ میں نے مختصراً کہا۔ پھر بولا۔ ”کیوں آئے تھے وہ لوگ۔“

”تمہارے بارے میں تشویش کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم قابل بھروسہ نہیں ہو۔ کورتی کسی بھی وقت تاریخ سے واپس آسکتی ہے اور تمہیں اس آزادی سے میرے پاس نہیں رہنا چاہئے۔ یعنی شاہ میر کے پاس۔“  
”تم نے کیا کہا۔“

میرے اس سوال پر کورتی شاہ میر کے انداز میں مسکرائی پھر بولی۔ ”کافی وقت ہو گیا ہے تمہاری دنیا میں۔ تھوڑی سی عقل تو آگئی ہے۔ میں یعنی شاہ میر ان سب سے بڑے عہدے کی حامل ہوں میں نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ میں اپنے عمل کی خود ذمہ دار ہوں پھر میں نے نرم رویہ اختیار کر کے ان سے کہا کہ ڈیٹان ایک نیک نام صفت انسان ہے وہ صرف حالات کا شکار ہو گیا ہے ورنہ وہ برا انسان نہیں ہے۔ وہ مجھ سے تعاون کر رہا ہے اور اس بات کے لئے تیار ہے کہ اگر کورتی اس کے پاس آئی تو وہ اسے مفلوج کر کے آخر کار ان کے حوالے کر دے گا۔“  
میرے دل میں بے ایمانی آئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ اسے مفلوج کیسے کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ موقع ملنے پر میں ایسا ہی کروں۔ لیکن پھر میں خاموش ہی رہا۔

”بس میں نے انہیں اطمینان دلادیا کہ وہ فکرنہ کریں۔ وہ کم بخت میری رہائش گاہ میں کتاب کے پاس رہ کر اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ تاکہ جیسے ہی کورتی اس سے باہر آئے اسے گرفتار کر لیں۔“  
”پہلے تو وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”ہاں..... اب شاہ نے یہ ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔ یہ ان کی خام خیالی ہے عالی! وہ اسے کبھی تباہ نہیں کر سکیں گے۔“

”یہ کتاب آخر ہے کیا کورتی تم نے اسے کیسے تعمیر کیا ہے؟“

میرے اس سوال پر وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر گردن اٹھا کر بولی۔ ”کسی اور وقت اس کا جواب دوں گی۔ اس وقت ضروری نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”ایک طرح سے ہمیں آزادی ہی ہے۔ میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔ جس کا اظہار تم کر چکے ہو۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ لیکن عالی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنی انا کو سامنے رکھ کر بہت سوچا ہے کہ تمہارا پیچھا چھوڑ دوں تم سے دور چلی جاؤں۔ لیکن عالی! میں ایسا نہیں کر پاؤں گی۔ عالی! یہ سوچ کر ہی میں عجیب کیفیت کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں تمہیں اپنی اس کیفیت کے بارے میں بتا نہیں سکتی۔ اس وقت ایک خیال بڑی شدت سے مجھے بے بسی کا شکار کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کاش میں بھی عام انسانوں کی طرح مر سکتی۔ اگر موت مجھے آسکتی تو میں اسے خوشی سے گلے لگالیتی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش کوئی ایسا عمل ہو سکے جس کی بنیاد پر مجھے موت آجائے۔ آہ اب بھی لاتعداد انسانوں کے دل میں ایسی خواہش جاگی ہوگی کہ انہیں لمبی عمر حاصل ہو جائے۔ انہیں آب حیات یا امرت جل پینے کو مل جائے۔ لیکن وہ پاگل نہیں جانتے کہ موت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ جیسے پورے دن کی مشقت کے بعد آرام دہ بستر اور کالی رات کی نیند۔“

اس کی آواز خواب آلود ہوگئی۔ وہ دیر تک اس میں ڈوبی رہی۔ پھر ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ”ایک بات پوچھوں؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموش رہی۔ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”چلو ٹھیک ہے نہیں پوچھتی۔“

آپ میری پریشانی میری الجھن کا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ میں ایک محب وطن انسان ہوں اپنے وطن اپنے لوگوں سے مجھے پیار ہے۔ ایک بدروح نما عورت کے ہاتھوں میرے وطن کے کسی شخص کو کوئی نقصان پہنچنے مجھے بالکل گوارہ نہیں، بد نصیبی سے ایک طلسماتی جال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے ایک منفرد کتاب لکھنے کے لئے ان دو کرداروں سے رابطہ کیا جو اتفاقاً مجھے مل گئے تھے کیسے اس کی تفصیل میں آپ کو ضرور بتاؤں گا لیکن اس وقت جب تقدیر مجھے زندہ صدیاں مکمل کرنے کا موقع دے گی تو پھر اب..... آگے کے کسی دور کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہوگا۔

اس نے مجھے آواز دی۔ ”ڈیٹان۔“ اور میں چونک پڑا۔ ”کس خیال میں کھو گئے۔“

”بس.....“ میں نے نیچے سے انداز میں کہا۔

”پریشان ہو۔“

”سو نا چاہتا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔“

”چلو سو جاؤ۔“

”کہاں.....؟“ میں نے کہا۔

”بیمیں..... اور کہاں۔ تم میرے مہمان ہو میں تمہیں جہاں چاہوں رکھوں۔“ اس نے کہا۔ میں ایک گہری سانس لے کر وہیں ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ واقعی ذہن بھی تھکا ہوا تھا بدن بھی۔ نیند آگئی نہ جانے کتنا سو یا آنکھ کھلی تو گہری رات ہو چکی تھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ بہت رات گزر چکی ہے۔ پھر ایک اور احساس ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں صوفے پر سو یا تھا لیکن اس وقت میں مسہری پر تھا میرے بدن کے نیچے نرم فوم کا گدا تھا۔ اور ایک گداز بدن میرے جسم سے لپٹا ہوا تھا میرے سارے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا

میں نے ٹٹول کر اس جسم کو دیکھا تو مجھے ایک بے حد خوبصورت آواز سنائی دی۔

”میں ہوں۔“

”کون.....؟“

”کوروٹی۔“

”ایں۔“ میں بے اختیار بولا۔ اور میں نے کافی حد تک بے اختیاری کے عالم میں دوبارہ اس بدن کو چھو کر دیکھا۔ بدن میں شدید سنسنات دوڑ گئی۔ یہ تو بے حد نرم و ملائم اور پر گوشت بدن تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔ گھورتاریکی کی وجہ سے اس کے خدو خال تو نہیں نظر آرہے تھے لیکن ایک خاکہ سا ضرور محسوس ہو رہا تھا کسی نوجوان متناسب شباب وجود کا۔

”ڈیشان ا!“ اس بار آنے والی آواز کوروٹی کی تھی۔ جذبات سے بوجھل غماز میں ڈوبی ہوئی۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ ”ڈیشان۔“ اس نے پھر غماز آلود لہجے میں مجھے پکارا۔ اور میں مسہری سے اٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شاہ میر کی خواب گاہ ہی ہے جہاں میں سویا تھا۔ میں مسہری سے نیچے اتر آیا اور اندازے سے آگے بڑھ کر میں نے دیوار کا سوچ تلاش کر کے روشنی کر دی۔ پھر میری نظریں مسہری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی باریک نائی میں ملبوس لیٹی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”کیوں..... خوبصورت نہیں ہوں۔“ آواز کوروٹی کی تھی۔

”کوروٹی.....؟“ میں نے کہا۔

”ہاں..... میں ہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”لیکن یہ سب۔“

”تمہارے لئے کیا ہے۔“

”کیا مطلب.....!“

”مطلب تم جانتے ہو، تمہیں بدن کی دلکشی چاہئے۔ روح کی دلکشی سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا سوکھا ہوا پنجر تمہارے لئے ناقابل برداشت تھا اور اب میں تمہیں ایک دلکش پیشکش کرتی ہوں۔“

”پیشکش۔؟“

”ہاں..... اپنی پسند کی کسی بھی دلکش حسینہ کی طرف اشارہ کر دو۔ کوئی مقبول اداکار ہو، کوئی آرٹسٹ ہو، سونا کشی سہنا، آشا ٹاکیہ یا مادھوری ڈکشت یا کوئی بھی۔ وہ اپنے اصلی وجود کے ساتھ تمہارے پاس ہوگی لیکن اس کے وجود کے اندر کوروٹی ہوگی۔“

”تم پاگل ہو چکی ہو کوروٹی۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”مجھے کب انکار ہے۔“ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ کس کا بدن ہے۔“

”شاہ میر کی بیٹی خوشبو کا۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے اچھی لگی۔ میں نے تمہارے لئے منتخب کر لیا۔“ اس نے کہا لیکن میرا دل لرز گیا۔ ایک اور واردات۔ اس

دیوانی نے ایک اور واردات کر ڈالی۔ وہ بتا چکی تھی کہ وہ کسی زندہ وجود میں نہیں داخل ہو سکتی۔ اس کا مطلب تھا کہ خوشبو بھی..... میں نے رندمی آواز میں پوچھا۔

”تو کیا تم نے.....!“

”ہاں..... موبائل فون پر اپنے کسی محبوب سے محبوبانہ گفتگو کر رہی تھی۔ میں اس کی مسہری کے نیچے چھپی اس کی باتیں سن رہی تھی پھر جب اس نے فون بند کر کے رکھا اور سونے کے لئے لیٹ گئی تو میں مسہری کے نیچے سے نکل آئی..... اور..... میں نے گردن دبا کر اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ پھر اس کے بدن میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کی الماری میں سے اس کے لباس تلاش کئے اور یہ لباس مجھے پسند آیا۔ سو میں نے اسے تمہارے لئے پہن لیا۔“

”کوروٹی..... تم میرے لئے کتنی پھالیاں تیار کرو گی۔“ میں نے رندمی ہوئی آواز میں کہا۔ اور وہ کس قدر غضب ناک ہو گئی۔ اس کی آواز میں غماز پیدا ہو گئی۔

”کیا نہیں کر رہی میں تمہارے لئے کسی بھی عمل کو سراہنے کے بجائے تم صرف میری مذمت کرتے ہو۔ مجھے ذہنی مریض مت بناؤ..... ورنہ میں..... ورنہ میں..... چن چن کر ایک ایک حسین لڑکی کو کھل کر دوں ہر اس لڑکی کے چہرے کی شکل تیزاب سے بگاڑ دوں گی جو خوبصورت ہوگی۔ سمجھ رہے ہو تم۔ مت آمادہ کرو مجھے اس کام کے لئے اور میں جو بھی ہوں تم صرف میرے لئے ہو۔ اور مجھے قبول کرو گے۔“

اس کا خوف ناک لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے وہ ضرور کر ڈالے گی۔ میری وجہ سے کتنی زندگیاں جا میں گی کس کے ساتھ کیا ہوگا اس کا مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔

جس لڑکی کا اس نے نام لیا تھا۔ اسے میں نے اس کوٹھی میں ایک بار دیکھا تھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا تو میرے دل کو شدید دکھ کا احساس ہوا۔ کافی خوبصورت اور چھوٹی سی عمر کی لڑکی تھی۔ اس کی قاتل کوروٹی نہیں بلکہ میں تھا۔

میرے تن بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ میں نے خونی نگاہوں سے کوروٹی کو دیکھا اور وہ مسکرا دی۔

”مجھے سو بیکار کرو عالی! میرا شریر پیاسا ہے۔“ اس نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں بے اختیار ہو گیا۔ میں دانت بھیج کر اس پر جھپٹا اور میں نے اس کی خوبصورت صراحی دار گردن دبوغ لی۔

”میں..... میں تجھے فنا کر دوں گا۔ شیطان کی بیٹی!“ میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ اور میں اس کی گردن دبانے لگا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے وہ ساکت ہو گئی۔ اسی وقت تھوڑے فاصلے پر مجھے کوروٹی کی ہنسی سنائی دی اور میرے ہاتھ لرز گئے۔ میں نے خوشبو کی گردن چھوڑ دی اور مڑ کر دیکھا۔ کوروٹی کا مکروہ ڈھانچہ سامنے کھڑا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”مری ہوئی کو مار رہے ہو۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی مر چکی ہے۔“

میں ساکت رہ گیا۔ کوروٹی لڑکی کے بدن سے نکل گئی تھی اور میں ایک مردہ وجود کی گردن دبا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ خوشبو کے مظلوم بدن کو دیکھا جس کے ساتھ میں نے بھی زیادتی کی تھی۔ میں خود پر اختیار نہ رکھ سکا اور بے اختیار رو پڑا۔ اس قدر بے اختیار ہو گیا۔ میں نے خوشبو کے پاؤں پکڑ لئے۔

”مجھے معاف کر دینا میری بہن! میری بیٹی مجھے معاف کر دینا۔ میں اس چیزیل کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ کوروٹی خاموش کھڑی تھی۔ میں دیر تک روتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ پھر میں خاموش ہوا تو اس کی سگتی آواز ابھری۔

”تم اس کے لئے رو رہے ہو۔ میرے لئے رونے والا کون ہے۔ میں بھی تو انسان ہوں، جیتی جاگتی انسان پریم کے آگے مار کھا گئی ہوں۔ ورنہ صدیاں خوشی سے گزارتی میں۔ مگر کیا کروں اب پتہ چلا کہ پریم روگ سنسار کا سب سے بڑا روگ ہے۔ یہ بیماری جسے لگ جائے سمجھو اس کا سنسار بھر شٹ ہو گیا۔ مجھ پر یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ وہ پانی تو صدیوں سے مجھے رو رہا تھا۔“

”سن کو روٹی! تو نے کہا تھا کہ تو میرے لئے کسی کے بھی بدن میں جا سکتی ہے۔ اب میں تجھے بتاؤں کہ آکاش کی اپسرا بھی بن کر آئے تو میں تجھے قبول نہیں کروں گا۔ آج سے میں ہوس کے یہ دروازے بند کر رہا ہوں۔“ میری جلتی آواز ابھری۔

”تو تم بھی سن لو عالی۔ میں روز ایک لڑکی کو قتل کر کے اس کی لاش تمہارے سامنے پھینکتی رہوں گی۔ اگر تم مجھے میری اس حقیقت میں سو بیکار نہ کرو گے تو۔“ اس نے کہا اور اس کا ڈھانچہ آگے بڑھ کر صوفے پر لیٹ گیا۔

مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں اگر اس ڈھانچے پر حملہ بھی کرتا تو مجھے اس سے کیا حاصل ہوتا۔ اگر میں اس کی ہڈیاں توڑنے کی کوشش کرتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے موت تو پھر بھی نہ آتی اور یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی یہ ہڈیاں ٹوٹیں گی بھی یا نہیں۔

میں بے چاری خوشبو کی لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا، مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ وہ جنونی ہے۔ طاقتور ہے۔ بے خوف ہے۔ ہزار بندے بھی مل کر اسے مارنے کی کوشش کریں تو نہیں مار سکیں گے اور وہ اودھ میرے خدا واقعی ایک لڑکی کو روزانہ قتل کر دے گی۔ بے گناہ لڑکیاں ماری جائیں گی۔

کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر گزر گئی آخر کار میں نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ”کوروتی؟“ میں نے اسے آواز دی۔

”ہوں۔“

”میرے پاس آؤ۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا اور وہ صوفے سے اٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مسہری تک آئی اور اس کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ”تم کیا سوچ رہی ہو۔“

”کچھ نہیں۔“

”آگے کیا کرتا ہے۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”شاہ میر کی لاش کہاں ہے۔“

”تھوڑے فاصلے پر ایک بند کمرے میں۔“

”کیا اس کا بدن ستر چکا ہے؟“

”کافی حد تک۔“

”اس سے بدبو اٹھ رہی ہے؟“

”ہاں، لیکن میں نے کمرے کی کھڑکیاں بند کر دی ہیں۔ دروازہ بھی ایئر ٹائٹ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آؤ..... ہم یہاں سے چلیں۔“

”کہاں۔“

”تو کیا یہاں مرو گی۔“ میں پھر جھلا گیا۔ لیکن غیر متوقع طور پر وہ ہنس پڑی۔

”کیا مزے کی بات کی ہے۔ یہاں مرو گی۔ واہ چلو ٹھیک ہے مر جائیں گے اگر تم کہو گے۔“

”ہاں، تمہیں فکر نہیں ہے کیونکہ تمہیں موت نہیں ہے۔ مرنا مجھے ہو گا ویری گڈ! یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا، لیکن وہ کچھ بے چمن ہو گئی کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر جب میں کچھ نہ بولا تو خود بول پڑی۔

”تم نے اپنا آئیڈیا نہیں بتایا۔“

”صبح کو میں ان لوگوں کو پوری تفصیل بتا دوں گا اور کہوں گا کہ خوشبو کو میں نے اس کی عزت لوٹنے کے لئے قتل کیا ہے۔ اپنی گرفتاری پیش کر دوں گا اور مجھے سزائے موت ہو جائے گی۔ اس خوف کی زندگی سے تو بہتر ہے کہ موت اپنا لی جائے۔ کچھ دوسرے تو زندہ بچ جائیں گے۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”نہیں ایسا نہیں کرنا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں میری جسمانی قربت نہیں چاہئے ٹھیک ہے۔ میں بھی اس سے کنارہ کش ہو جاتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنے قریب تو رہنے دو۔ تم کہو گے تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی اپنے سارے جرم قبول کر لوں گی۔ وہ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں۔ ختم تو نہیں کر سکیں گے مجھے۔ قید کر دیں گے موت کی سزا دیں گے پھانسی پر چڑھا دیں گے تو خود شرمندہ ہوں گے۔ ویسے بھی میں جب چاہوں گی ان کی قید سے نکل آؤں گی۔ مجھے مشکل نہیں ہوگی۔ بس تم محفوظ رہو۔“

”کوروتی جی۔ میرے محفوظ رہنے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”کیوں۔“

”یہ بات میں جانتا ہوں۔“

”مجھے بھی بتاؤ۔“

”مجھے تمہارے برابر کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔ ہم دونوں کی سزا ایک ہے۔ یعنی سزائے موت اور وہ سزا وہ تمہیں نہیں دے سکیں گے۔ میں خاموشی سے پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤں گا۔“

”اودھ.....“ وہ تشویش سے بولی۔ پھر کہنے لگی۔

”پھر بتاؤ کیا کریں۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں تمہاری جسمانی قربت سے کنارہ کش ہوتی ہوں۔ اب تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔“

”وعدہ.....“ میں نے کیا۔

”ہاں۔“

”تو پھر ہمیں یہاں سے فوراً نکل چلنا چاہئے۔ یہاں دو دو لاشیں موجود ہیں۔ اور ان دونوں کے ذمہ دار ہم ہی ہیں۔ ان کے برآمد ہونے کے بعد ہمارا جو حشر ہو گا وہ سنیں اسی کوٹھی میں ہو جائے گا۔“

”چلو.....“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

مجھے بھی چڑھ گئی۔ چنانچہ میں بھی فوراً آمادہ ہو گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”میں اس کا بدن لے لوں۔ بعد میں تم کہو گے تو چھوڑ دوں گی۔“

”نہیں وہ اس گھر کی بیٹی ہے۔ کیسے گئی ہے کوئی نہیں جانتا۔ گھر سے غائب ہو گی تو طرح طرح کی باتیں ہوں گی۔ لوگ الزامات لگائیں گے۔ کہیں گے کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وغیرہ، موت کے بعد بھی بے چاری رسوا ہو گی اور اس مظلوم خاندان کے سر شرم سے جھک جائیں گے۔“

”ارے واہ..... ویری انٹرسٹنگ۔“ وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ”ٹھیک ہے آؤ چلتے ہیں۔“  
ہم دونوں باہر نکل آئے۔ لیکن کمرے سے باہر قدم رکھا تھا کہ گھر کے دو افراد جو کسی وجہ سے جاگ رہے تھے اچانک ایک کمرے سے نکل آئے۔ کمرے ایک راہداری میں لائن سے بنے ہوئے تھے اور راہ داری میں تیز روشنی تھی چنانچہ ان دونوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ حیران ہوئے پھر جو انہوں نے بھیا نک چھیں ماریں انہوں نے میرے بھی کان پھاڑ دیئے۔ کوروتی اتنی جذباتی ہوئی تھی کہ اس نے باہر نکلنے ہوئے کوئی چادر بھی نہیں اوڑھی تھی جبکہ کوئی چادر وغیرہ بستر سے اٹھائی جاسکتی تھی مجھے بھی کوئی خیال نہیں آیا تھا۔

راہداری میں موجود کمرے روشن ہوئے۔ ”کیا ہے۔ کون ہے؟“ کئی آوازیں ابھریں اور ہمیں دوڑ لگانی پڑی۔ راہداری کے ایک درمیانی حصے میں سیزھیاں بنی ہوئی تھیں جو باہر پورچ میں اترتی تھیں ہم ان سیزھیاں سے نیچے اتر گئے۔ پورچ میں کھڑی کاروں کے پاس دو ڈرائیور چار پائیوں پر سو رہے تھے وہ شور سے اٹھ گئے۔ پھر وہ بھی حلق پھاڑ کر چیخنے لگے۔ انہوں نے کوروتی کے ڈھانچے کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پولیس افسر اعلیٰ کی کوشی تھی اس لئے باہر کئی پولیس والوں کی ڈیوٹی تھی۔ ہم گیٹ کی طرف بھاگے اور کچھ ہی لمحوں میں ہمیں پولیس کی چلائی ہوئی گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ گولیاں ہمارے آس پاس سے گزر کر گیٹ میں لگیں۔

اصل میں ہر طرف روشنی ہو رہی تھی اور ہمیں ہر جگہ بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ اس لئے صورت حال بے حد سنگین ہو گئی تھی۔ گیٹ پر بھی پولیس کے سپاہی تعینات تھے گیٹ پر گولیوں کی باڑھ لگی تو وہ بھاگ کر کیمین میں جاتے تھے کیونکہ انہیں صورت حال معلوم نہیں تھی۔ گولیاں چونکہ اندر سے آئی تھیں اس لئے گیٹ کے محافظوں نے کچھ نہ سمجھ کر اندر کی طرف گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ اندر سے کئی چھین سنائی دی تھیں۔ ان کی یہ غلط فہمی اور افراتفری ہمارے لئے کار آمد رہی اور ہم دونوں گیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

”بھاگو..... ابھی ہمارا تعاقب شروع ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں پوری قوت سے دوڑنے لگے کوروتی بھی مجھ سے پیچھے نہیں تھی پیچھے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن وہ آپس ہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود میں بھاگتا رہا پھر ایک چھوٹا سا پارک نظر آیا جس میں اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کھلا پارک تھا میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا سینہ دھکنی بنا ہوا تھا۔ میں نے پارک کے کنارے رک کر اس کا جائزہ لیا اور پھر اس میں اندر داخل ہو گیا۔

پارک میں بچیں پڑی ہوئی تھیں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ میں ایک بچہ پر جا بیٹھا۔ کوروتی میرے پاس آ بیٹھی تھی کچھ دیر خاموش رہی پھر وہ بولی۔

”تمہارا تو برا حال ہے سانس بری طرح پھولا ہوا ہے۔“

”ہاں اور تمہارا.....“ میں نے بمشکل کہا۔ اور وہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

”سانس کا تعلق پھیپھڑوں سے ہوتا ہے۔“

”تو پھر.....“

”میرے پھیپھڑے ہی نہیں ہیں۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اندر کا پورا نظام خالی ہونے کے باوجود وہ زندہ تھی۔ سانس اس بارے میں کیا کہتی تھی مجھے نہیں معلوم تھا لیکن وہ کائنات کا بہت بڑا عجوبہ تھی۔ وہاں تو خوب جنگ شروع ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ میں سوچ رہا تھا کہ اب تو میں کوروتی سے بڑا مجرم گردانا جاؤں گا اور سارے

پھندے میری گردن میں لگیں گے۔ دفعتاً میری نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں ہسپتال کے نیون سائن نظر آرہے تھے یہ وہی ہسپتال تھا جہاں مجھے ثناء معصوم ملی تھی اور ایک چھوٹی سی کہانی نے جنم لیا تھا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”کوروتی تم صبح کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔“

”صبح ہمیشہ خوبصورت ہوتی ہے۔ پرندوں کے نغموں سے سچی ہوئی اجالا زندگی جیسا۔“ اس نے کہا۔

”اور پولیس والوں کے بوٹوں کی دھمک موت کے فرشتوں جیسی۔“ میں نے بے شکے لہجے میں کہا۔

”تمہیں موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”ہاں..... میں صدیوں پرانا بوڑھا نہیں ہوں۔ نوجوان ہوں۔ امنگوں بھرا..... زندگی بلکہ مختصر زندگی سے لطف

اندوز ہونے والا۔“

”مجھ پر طنز کر رہے ہو۔“

”کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔“

”تمہیں ڈر ہے کہ تم مر جاؤ گے۔“

”تو اور کیا۔“

”ہائے کتنے خوش نصیب ہو۔ موت کتنی دلکش چیز ہے۔ اس کے بعد سکون ہی سکون کیسا لگتا ہوگا مرنے کے بعد۔“

”فرشتے آتشیں گرز سے وہ کٹ لگاتے ہیں کہ بس نہ جانے کیا کیا یاد آ جاتا ہے۔“ میرے بدن میں اس کی بکواس

سے آگ لگ رہی تھی۔ وہ بھرنس پڑی۔

”بہت غصہ آ رہا ہے۔“

”کوروتی..... صبح سے پہلے اس پارک سے نکل جانا ہے۔ تم لطف لے رہی ہو۔“

”یہ تمہاری دنیا ہے۔ تمہارا شہر ہے۔ میں اس دور کی مہمان ہوں۔ تم میرے میزبان ہو جو سلوک چاہے مہمان کے

ساتھ کرو۔“

آرڈر تو یہ تھی کہ اس معزز مہمان کو پولیس کے حوالے کر کے کہوں کہ لو سنبا لو اپنا مجرم اور جو سلوک اس کے ساتھ

چاہو کرو..... لیکن..... اپنے دیس کی اپنے شہر کی پولیس کو بھی جانتا تھا سب سے پہلے تو وہ میرا ہی حساب کتاب کرے گی

اور کہے گی کہ مہمان اکیلا کہاں جائے گا عالم بالا میں فرشتوں کو کہاں تکلیف دو گئے وہاں بھی تم ہی اس کی میزبانی کرنے

کے لئے اس کے ساتھ جاؤ۔“

”کیا سوچنے لگے؟“ کوروتی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کچھ سوچ رہا ہوں۔“

”مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”بتایا تھا نا۔“

”دوبارہ بتاؤ۔“

”دن کی روشنی ہونے سے پہلے ہمیں یہ پارک چھوڑنا ہوگا۔“

”کہاں جائیں گے۔“

”اس ہسپتال میں۔“

”وہاں کیوں۔“

”میں نے کچھ سوچا ہے۔ آؤ اٹھو۔ میں نے کہاں اور وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ اس ہسپتال میں میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے گھوما پھرتا تھا۔ وہیں سے ایک جگہ سے میں نے وارڈ بوائے کی وردی حاصل کی تھی مجھے یاد تھا کہ اس اسٹور سے ملحق سردخانہ تھا جہاں لاوارث مردے رکھے جاتے تھے۔ اس جگہ مردہ گھر کا یورڈ لگا ہوا تھا۔

مردہ گھر..... میں نے سوچا پھر کوروتی نے کہا۔ ”کوروتی! ایک بات بتاؤ۔ جو میں کہوں گا وہ کروگی۔“

”اب تک ایسا نہیں کیا.....“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے آ جاؤ۔“ میں اسے لے کر ہسپتال کی طرف بڑھ گیا۔ ہسپتال کے گیٹ پر کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مریض اور ان کے لواحقین آ جا رہے تھے۔ میں نے ایک سنان جگہ منتخب کی اور کوروتی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے انتہائی احتیاط سے تاریک راستوں کا سفر اختیار کیا اور کسی نہ کسی طرح مردہ گھر تک پہنچ گیا۔

چونکہ رات کا آخری پہر چل رہا تھا اس لئے ہسپتال کے ملازمین بھی متحرک نہیں تھے۔ سردخانے کا سلائیڈنگ دروازے سامنے تھا۔ کچھ فاصلے پر ”مردوں کا محافظ“ زمین پر پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔

”شکر ہے باباجی..... آپ سو رہے ہیں۔ ورنہ اندر داخل ہونے کے لئے آپ کے ساتھ بدتمیزی کرنی پڑتی۔“ میں نے دل میں سوچا۔ کوروتی خاموشی سے میرے ہر قدم کی پیروی کر رہی تھی۔ میں نے بہت بڑے سلائیڈنگ ڈور پر طاقت صرف کی لیکن وہ اتھ کی معمولی سی کوشش پر ہی کھل گیا۔ اندر سے انتہائی سرد ہوا کا جھونکا باہر نکلتا تھا۔ کوروتی کو اندر آنے کا اشارہ کر کے میں اندر داخل ہو گیا۔

اندر جدید قبرستان آباد تھا۔ اس شہر خوشاں میں مٹی کی قبریں نہیں تھیں بلکہ انتہائی جدید اسٹیل کے ریک بنے ہوئے تھے جن کے اندر موت کا شکار ہونے والے اپنی قبر کے انتظار میں سو رہے تھے۔ مدہم سا بلب روشن تھا جس سے ماحول اور خوف ناک ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے میں نے دروازہ بند کیا اور اس جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا کہ کوئی اندر آئے تو آسانی سے چھپا جا سکے۔ ایسی دو تین جگہیں مجھے نظر آ گئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد میں اسٹیل کے قبرستان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے ایک ریک بار گھسیٹا اس میں انسانی جسم کے تین ٹکڑے رکھے ہوئے تھے جو ریک کے کھلنے بند ہونے کی وجہ سے بے ترتیب ہو گئے تھے۔ میں نے گہری سانس لے کر اسے بند کر دیا۔ دوسرے ریک میں ایک بھاری بدن کا مرد لیٹا ہوا باہر نظر آنے والے کسی بھی شخص کو گھور رہا تھا مگر اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ مختلف انداز کے کئی مردہ جسم دیکھنے کے بعد ایک بدن پر میری نظر ٹک گئی۔ یہ کوئی بھکارن عورت تھی۔ ظاہر ہے لاوارث ہوگی۔ اس کے بدن پر اس کے اپنے ہی کپڑے تھے۔ دھوپ سے جھلسا ہوا چہرہ سادہ سے نفوش خاص بات یہ تھی کہ اس کے بدن میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ غالباً دم گھٹنے یا دل کے دورے وغیرہ سے مری تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کوروتی کو آواز دی۔

”کوروتی۔“

”ہوں.....“ وہ پر خیال لہجے میں بولی۔

”دیکھ رہی ہو۔“

”ہاں..... میرے لئے نیا تجربہ ہے۔“ وہ متاثر کن لہجے میں بولی۔ ”میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”آؤ..... اسے نکالیں۔“

”کیوں..... وہ چونک کر بولی۔“

”ہاں..... اسے ریک سے نکالیں۔“

”کیوں.....“

”تمہیں اس کے بدن میں جانا ہے۔“

”کک..... کیا بکواس کر رہے ہو۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”ہاں کوروتی..... تم صرف مردہ جسموں میں داخل ہوتی ہو۔ کسی زندہ انسان کو ہلاک کرنے کے بجائے ایک مردہ جسم کیوں نہ اپنا لیا جائے۔ میں تمہیں شپ دے رہا ہوں۔ یہ جسم گل جائے تو دوسرا ایسا ہی بدن تلاش کر لیا جائے۔“

کوروتی کچھ دیر خاموش رہی پھر گھمبیر لہجے میں بولی۔ ”تم مجھ سے انتقام لے رہے ہو عالی!“

”کیوں؟“

”یہ جسم منتخب کیا ہے تم نے۔ ایک گندی بھدی بد صورت بھکارن۔“

”تو تم حسینہ عالم بن کر کیا کروگی۔ میں تمہیں اپنے وطن کی اپنے شہر کی معصوم لڑکیوں کو ہلاک کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔“

”تم اس بات سے خوش ہو گے۔“

”تم جانتی ہو مجھ پر یہ افتاد تمہاری وجہ سے پڑی ہے کوروتی۔ میرے لئے جینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ جان بچانے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ آؤ اسے نکالیں۔“ بھکارن کے بدن صیب جسم کو ریک سے نکالا گیا۔ اسے سیدھا زمین پر لٹا دیا اور کوروتی اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی میری آنکھیں دنیا کا سب سے انوکھا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک ناقابل یقین منظر۔ کوروتی کا ڈھانچہ آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا اس کا سر غائب ہوا تو بھکارن کا سر ملنے لگا۔ باقی بدن کی بھی کیفیت تھی۔ ہاتھوں نے اپنی ڈائریکشن بدلی پھر پیروں نے اور پوری کوروتی غائب ہوئی تو بھکارن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پیارا منڈ آیا۔

”خوش ہو۔“ ایک ناناوس آواز سنائی دی۔

”ہاں کوروتی..... تمہیں کسی نہ کسی جسم میں آنا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے کسی بے گناہ کی زندگی بچالی۔ کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ افسردہ تھی اور مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ کوروتی کا تو مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب میں رہ گیا تھا۔ لیکن مجھے کوئی ایسا عمل نہیں نظر آتا تھا جس سے میں اپنا حلیہ بدل لوں۔

الغرض یہاں سے لکنا ضروری تھا چنانچہ میں کوروتی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہمیں ہسپتال سے باہر آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ کوروتی کا موڈ بھی بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔

”عالی.....“ اس نے کہا۔

”ہوں۔“

”تمہیں بھیک مانگنا آتی ہے۔“

”جی نہیں۔“

”مجھے بھی نہیں آتی۔ لیکن مزہ آئے گا۔ ہم بھیک مانگیں گے۔“

”تمہارے ساتھ رہ کر یہی کرنا تھا۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس نے میری بات کا برا نہیں مانا تھا۔ اور بھکارن کے روپ میں بدستور مسکرا رہی تھی۔ میرا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ میرے بدن پر صاف سترے کپڑے



تھے البتہ شیو وغیرہ کافی دن سے نہیں بنا تھا مجھے کچھ سوچھی اور میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ کچھ فاصلے پر مجھے ایک گلی سی نظر آئی۔ سامنے ایک ڈھابہ تھا اور یہ اس نچلے درجے کے ہوٹل کا پچھلا حصہ تھا۔ جس میں ڈھابے کے جھوٹے بچے کچے کھانے کے ڈرم پڑے تھے آس پاس کافی گندگی تھی۔

”آؤ کوروتی۔“ میں نے کہا اور گلی کی طرف بڑھ گیا۔ کوڑے کے ڈبے کے پاس پہنچ کر میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر گندے گلے سڑے کھانے اور سڑے ہوئے بدبودار پھلوں کو اٹھا کر اپنے کپڑوں پر ملنے لگا۔

”ارے ارے۔ یہ..... یہ کیا.....“ کوروتی کے منہ سے حیرت کی آواز نکلی۔ لیکن میں نے اپنے کپڑے خوب گندے کر لئے۔ اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”کیسا لگ رہا ہوں؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”گندے..... چھی۔“ وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

”تمہیں بھی ایسا ہی کردوں۔“ میں نے شرارت سے جھک کر کہا۔ اور وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹکا لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں جا کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے اور پھر اپنے بال بری طرح منتشر کر لئے۔ اب میں بھی واقعی پورا فقیر لگ رہا تھا کوروتی نے شاید اب میرا مقصد سمجھا تھا اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”اے بھگوان! تم کتنے چالاک ہو عالی! مجھے بھکارن بنایا اور خود بھکاریوں کا روپ دھارن کر لیا۔ اب تو تم میرے بچی لگ رہے ہو۔“

”بچی نہیں شوہر۔“ میں نے بھی خوشگوار موڈ میں کہا۔ اور وہ خوش ہو گئی۔

ہر طرف صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑکوں بازاروں میں زندگی جاگ مئی تھی۔ ساری رات جاگنے سے طبیعت بوجھل تھی۔ ہم دونوں ایک مسجد کے سامنے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ٹھکن بری طرح سوار تھی دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ جاویں۔

”ایک گدڑی کا بھی انتظام کرنا ہو گا کوروتی۔“

”یہ کیا ہوتا ہے۔“

”فقیروں کا بیڈروم بستر۔“ میں نے کہا۔ اسی وقت ایک کار ہمارے سامنے آ کر رکی۔ اور اس میں سے کسی نے آواز دی۔

”اے..... تم دونوں ادھر آؤ۔“ روح فنا ہو گئی تھی۔ ”یہ کیا ہوا۔ یہ کون ہے؟“..... آواز پھر سنائی دی۔

”سانہیں تم نے ادھر آؤ۔“

میں لرزتے قدموں سے اٹھا کوروتی بھی میرے ساتھ اٹھ گئی تھی۔ تھوڑا اور قریب پہنچا تو بس دم ہی نکل کر رہ گیا۔ جس شخص نے مجھے آواز دی تھی اسے میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ ثناء مرحوم کا وہ رشتہ دار تھا جس کا تعارف کراتے ہوئے عبدالکیم صاحب کے بیٹے نے بتایا تھا کہ وہ سینٹرل انٹیلی جنس کا چیف آفیسر اشتیاق احمد ہے۔ اور جس نے میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔

◆\*◆

لیکن کمال تھا۔ اس شخص نے چلتی کار سے مجھے پہچان لیا تھا۔ دل اندر سے چیخ رہا تھا کہ بھاگ جاؤں! لیکن یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتا۔ کار کے اندر عبدالکیم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اشتیاق احمد نے کہا۔

”برتن ہے تمہارے پاس۔“

”ایں؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”یہ ناشتہ لے لو..... ہماری بچی کا چالیسواں ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا کرنا۔“ اس نے کہا۔ ایک لمحے تو اس کی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جب ان کے ملازموں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں آگے بڑھائیں تب سب کچھ سمجھ گیا۔ برتن نہیں تھے وہ بھی انہوں نے خود دیئے اور پھر گاڑی آئے بڑھ گئی۔

میں سنائے میں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا اٹو کھا تھا کہ میرے اعصاب ابھی تک کشیدہ تھے۔

”کیا ہوا! کیا بات ہے؟“ کوروتی نے آواز دی تو میں چونکا۔ ”کیا ہوا! اتنے پریشان کیوں ہو گئے۔ وہ دوبارہ بولی۔“

”ان لوگوں کو پہچانا نہیں تم نے۔“

”نہیں..... کون تھے۔“ اس نے حیرانی سے کہا۔ اور میں اسے ٹاکے گھر والوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے

اس سے کہا کہ وہ ٹاکے روپ میں کئی دن ان کے ساتھ گزار چکی ہے پھر بھی انہیں نہیں پہچان سکی۔

”تو میں کون سی ٹاکہ تھی۔ ویسے ایک بات کہوں۔ جب میں ٹاکے روپ میں تھی تو تم..... بہت خوش تھے۔“

پہلے تو میں اس کی بات نہیں سمجھا لیکن جب اس کی بات سمجھ میں آئی تو مجھے اس سے بڑی نفرت محسوس ہوئی۔ تاہم میں نے اسے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہاں بھی مجھے عورت کی فطرت کا ایک اور اندازہ ہوا۔ وہ کسی بھی شکل میں اپنا رقیب برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے پھر کہا۔

”چلو..... تمہارے کھانے پینے کا تو بندوبست ہوا۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہی کسر رہ گئی تھی کہ اب خیرات کا کھانا کھاؤں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”تمہارا ہی شوق تھا بھکاری بننے کا۔ میرے لئے سردخانے میں ایک بھکاری کی لاش ہی رہ گئی تھی۔ کوئی اور بھی بدن

لے سکتے تھے۔ اب بھی پیشکش کرتی ہوں کوئی بہت اچھی فیملی تلاش کرتے ہیں۔ میں وہاں کسی خوبصورت لڑکی کو تاڑ لوں

گی۔ تمہارے بھی عیش ہو جائیں گے۔“ وہ فرمائشی انداز میں ایک آنکھ دبا کر بولی۔

”اور تم اس خوبصورت لڑکی کو قتل کر دو گی۔“ میں نے کہا۔

”کیا کروں۔ یہ میری مجبوری ہے۔“

”کوروتی..... مجھے پاگل مت کرو.....“ میں نے شدید غصے سے کہا۔

”کیوں..... آخر کیوں؟ کیا تم چاہتے ہو میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ گو تم بھنسالی

میرے ساتھ ایسا سلوک صدیوں نہ کرتا۔ اگر وہ تم سے رقابت کا شکار نہ ہو جاتا۔“

”آہ..... کاش میں تمہیں قانون کے حوالے کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”قانون میرا کی اگاڑ لیتا۔“

”تمہارے لئے ایک ایسا قید خانہ بنا دیتا۔ جہاں تم زندہ تو رہتیں وہاں سے باہر نہ نکل سکتیں۔“

”خام خیالی ہے تمہاری۔ میں وہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتی۔ آخر میں نے اتنے علوم سیکھے ہیں۔“ وہ مجھے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔ بھکارن کی حیثیت سے اس کے چہرے پر شرارت کے آثار تھے۔

”تم اب ایک بھی قتل نہیں کرو گی سمجھیں۔“

”ایک شرط پر۔“

”کیسی شرط؟“

”تم مجھے اس حیثیت میں بھی قبول کرو گے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ مجھے خاموش ہونا پڑا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کر سکتی تھی اور میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن میں اپنے وطن کی معصوم اور پیاری بچیوں کو موت کے گھاٹ اترتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے مجھے قربانی دینی ہوگی۔ اپنے طرف کی اپنے ہر احساس کی۔ بظاہر اس بلا سے بچھا چھڑانے کے امکانات نہیں نظر آ رہے تھے۔ کوئی معجزہ ہی اب مجھے اس سے بچا سکتا تھا۔ ابھی تو اسے ہوش میں لانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ ثنا کے رشتے دار دیکھ کر میری جان نکل گئی تھی۔ اشتیاق احمد اٹیلی جس کا آدمی تھا اور پولیس بے وقوف نہیں ہوتی۔ اس وقت بھیک دیتے ہوئے بھی اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ممکن ہے اسے میرے خدوخال پر شک ہوا ہو۔ اور..... اور۔۔۔۔۔

”اٹھو.....“ میں نے بدحواسی سے کہا۔ اور کوروتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اٹھا تو وہ بھی بادل خواستہ اٹھ گئی۔

بتاؤ تو..... کیا ہوا؟“ وہ بولی لیکن میں نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی۔ پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں چلتا رہا، میرا ذہن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ کسی ایسی جگہ جہاں اور بھی بہت سے فقیر پائے جاتے ہیں۔

اپنے شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر ایک ایسا مزار شریف تھا جہاں دو تین بار جانا نصیب ہوا تھا۔ بڑے پینچے ہوئے بزرگ کا مزار تھا اور وہاں عقیدت مند فقیہ مرادیں پوری کرانے جاتے تھے۔ میں نے وہاں فقیروں کے ڈیرے دیکھے تھے۔ مزار کے آس پاس لاتعداد درخت تھے۔ جن کے نیچے فقیر اور دوسرے حاجت مند قیام کرتے تھے اور وہاں کافی رونق رہتی تھی۔

بس یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ گیا کہ مجھے وہاں جانا چاہئے۔ جس طبقے میں اس وقت تھا اس کے لئے وہ مناسب ترین جگہ تھی۔ پہلے جب بھی وہاں گیا تھا اپنی کار لے گیا تھا۔ اکثر میں نے وہاں بسیں اور دیکھیں جاتے ہوئے دیکھی تھیں۔ مجھے ان بسوں کے روٹ اور نمبر بھی یاد تھے۔ چنانچہ کافی پیدل چل کر میں ان بسوں کے اڈے کے پاس پہنچ گیا۔

”اب بھی کچھ نہیں بتاؤ گے۔“ کوروتی نے کہا۔

”کوروتی..... تم جانتی ہو ہمیں پولیس کا خطرہ ہے۔“

”ہاں..... جانتی ہوں۔“

”ہم ایک ایسی جگہ چل رہے ہیں جہاں اس حملے میں آسانی سے رہ سکتے ہیں۔“ میں نے مختصراً اسے مزار کے

بارے میں بتایا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

”وہاں تو میں خوشی سے جاؤں گی۔“

”کوئی خاص وجہ۔“

”تمہیں بتایا نہیں تھا۔“ کوروتی نے کہا۔

”کیا؟ دوبارہ بتاؤ۔“

”میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کی کہانی مجھے نہیں بھولتی جس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے تھے اور جسے کسی بزرگ کے بتائے ہوئے تیل نے ٹھیک کر دیا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے بھی کسی ایسے ہی بزرگ کے مزار پر لے چلو۔ ہو سکتا ہے میرے لئے بھی ایسا کچھ ہو جائے۔“

مجھے ہنسی آگئی تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ ”کیوں..... ہنسنے کیوں؟“

”وہ لڑکی بعد میں مر گئی تھی۔“

”یہی تو افسوس ہے۔“

”کیا؟“

”کاش یہ آسانی مجھے بھی حاصل ہوتی، کاش میں بھی مر جاتی۔“ اس کے لہجے میں اتنی حسرت تھی کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ قدرت آہ قدرت کتنی مہربان ہے۔ موت بھی انسان کے لئے ایک نعمت ہے۔ نہ ہومرنا تو جینے کا مزہ کیا۔

بس آگئی اور ہم اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔ اچھا خاصا طویل سفر تھا جو آخر کار طے ہو گیا۔ میں نے یہ جگہ پہلے دیکھی ہوئی تھی۔ سب کچھ حسب معمول تھا۔ عقیدت مندوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ فقیر بھی مزار پاک پر کھیموں کی طرح بجنہنا رہے تھے اور لوگوں کو تنگ کر رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال لیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے کھانے پینے کی وہ اشیا نکال لیں جو مجھے وہ لوگ دے کر گئے تھے۔ پیٹ بھرا تو وہیں لیٹ گیا۔ کوروتی نے بھی درخت کے تنے سے لپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ذہن میں پھر خیالات کا چرخہ چل پڑا۔ کاش کسی رائٹر کے بجائے کسی دفتر میں کلرک کی نوکری کر رہا ہوتا۔ یہ حال تو نہ ہوتا..... انہی سوچوں میں نیند آگئی۔ جاگا تو شام ہو چکی تھی..... درگاہ پر خوب رونق تھی۔ کوروتی وہ سب دیکھ رہی تھی مجھے جاگتا دیکھ کر بولی۔

”وہ سامنے پانی ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو۔“

چشمہ جیسی جگہ تھی۔ پانی ابل رہا تھا اور نیچے جمع ہو کر ایک چوڑی کیر بناتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا واپس آیا تو کوروتی نے ایک دسترخوان سا بچھا رکھا تھا۔ اس پر مختلف چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ تمکین ٹیٹھے چاول، کھیر کی دو پیال، جلیبیاں وغیرہ۔

”ارے..... یہ کہاں سے آئے۔“

”جو بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ دے کر چلا جاتا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ کاش میں بھی یہ سب کھا سکتی مگر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔“

”تمہارے دھرم میں نہیں کرتے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... اسے پر ساد کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”ہمارے ہاں اسے لنگر کہتے ہیں۔“

”عالی! تمہیں میری بات یاد ہے۔ وہاں بزرگ کے دوا اکب چلو گے؟“

”جیسے تم کہو۔ آج ہی چلتے ہیں۔ مگر کسی بات کی گارنٹی تو نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”چلو تو سہی یہاں کچھ نہ ہوا تو کہیں اور چلیں گے۔“ ان مہاراج کو تلاش کریں گے جنہوں نے ان بنجاروں کو تیل بتایا تھا۔“ کوروتی نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

رات ہو گئی۔ یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مزار پر قوالیاں شروع ہو گئیں۔ قوال سازوں پر سر ملا رہے تھے۔ کوروتی نے اس بارے میں پوچھا تو میں نے اسے تفصیل بتائی۔ مزار کی بلندیوں پر جانے کے لئے تین طرف سیزھیاں بنی ہوئی تھیں سامنے والی سیزھیوں سے زائرین اوپر جا رہے تھے۔ بلندی پر پہنچ کر بہت کشادہ جگہ تھی جہاں قوالیاں ہو رہی تھیں۔

ہم دونوں تیار ہو کر چل پڑے۔ سیزھیوں کے سامنے کے حصے پر داغی دروازہ تھا جس سے زائرین اندر جا رہے تھے یہی مین دروازہ تھا جبکہ دوسری سیزھیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور ان پر اندھیرا بھی تھا۔ ہم دونوں مین دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ہم نے اندر قدم رکھا تھا کہ دونوں طرف سے دو غلام جو سبز لباس پہنے ہوئے تھے نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی نوکدار چھڑیاں دبی ہوئی تھیں جنہیں انہوں نے سیدھا کر کے ہمارے سینوں پر رکھا اور ہمیں اندر جانے سے روک دیا۔

”کافر..... کافر..... پیچھے ہٹو..... پیچھے ہٹو۔“ دونوں ایک وقت بولے۔

”کون کافر.....؟“ میں نے کہا۔

”یہ..... یہ..... کافر..... کافر..... باہر جاؤ۔“

”اور میں.....؟“ میں نے کہا۔

”بے دین..... بے دین..... مشرک..... مشرک..... پیچھے ہٹ جاؤ۔ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تم مزار پاک کو ناپاک کرنے جا رہے ہو تو تمہیں مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ چلو باہر نکلو۔“ انہوں نے چھڑی سے اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے سینے میں سخت تکلیف کا احساس ہوا۔

ہم باہر آ گئے۔ کوروتی بھی صورت حال سمجھ گئی تھی۔ اس نے حیرانی نے کہا۔ ”انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں ہندو دھرم سے ہوں۔“

”یہ مزار پاک ہے۔ یہاں کیا کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ اور پھر بات ہندو مسلمان کی نہیں ہے۔ بہت سے مزار پر ہندو عقیدت مند بھی جاتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں لیکن تمہارا ماضی جادو ٹوٹوں سے بھی منسلک رہا ہے اور جادو ہر مذہب میں حرام ہے۔“

”اور تمہیں کیوں روک دیا گیا۔“ تم تو مسلمان ہو۔“

”مجھے آج ایک اور غم ملا ہے کوروتی۔“ میں نے مغموم لہجے میں کہا۔

کوروتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی..... پھر بولی۔

”کیوں؟ تمہیں کیا غم ملا۔“

”تمہارے ساتھ رہ کر میں بھی بے دین اور مشرک ہو گیا۔ آہ میرا ایمان بھی گیا۔“ میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ بات سچ تھی نادانستہ ہی سہی کوروتی کے ساتھ رہ کر میں نے جو کچھ کیا تھا وہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

ہم مایوس وہاں سے واپس چل پڑے۔ ”اچانک کوروتی نے کہا۔“ عالی ہم بابا دوارا ضرور جائیں گے۔“

”کیسے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ دوسری سیزھیاں ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وہاں اندھیرا بھی ہے۔“ اس نے ان سیزھیوں کی طرف اشارہ کیا

جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔

”وہ بری طرح ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ ادھر سے کوئی اوپر نہیں جاتا۔“

”ہم جا سکیں گے۔“

”یہ غلط ہوگا کوروتی۔ مجھے منع کر دیا گیا ہے۔ میں یہ کناہ نہیں کروں گا۔“

”میں کروں گی میں ان سیزھیوں کے اوپر جاؤں گی۔ پہلے میں جاؤں گی اور اگر میں اوپر پہنچ جاؤں تو پھر تم بھی آ جانا۔“ اس نے منہ ادھر کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانی، میں نے دل میں سوچا کہ بھاڑ میں جائے مرنے ہے تو مرے۔ اسے جو بھی نقصان پہنچا اس کی وجہ میں نہیں ہوں گا۔ وہ سیزھیوں کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے پہلی سیزھی پر قدم رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اوپر چڑھنے لگی۔ میں نیچے کھڑا اسے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ اوپر..... بالکل اوپر مزار پاک کے گنبد پر روشنی کے بلب لگے ہوئے تھے جن سے کچھ روشنی اس طرف آرہی تھی۔ وہ کوئی بیس فٹ اوپر پہنچ گئی۔ اچانک میں نے اسے ٹھٹھکتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر ٹھٹھکنے کی وجہ بھی مجھے نظر آ گئی۔ وہ ایک کالا ناگ تھا جس نے اس کا راستہ روکا تھا۔

کوروتی رک گئی تھی۔ کالے ناگ نے پوری سیزھی پر اپنا پھن پھیلا رکھا تھا۔ اچانک مجھے کوروتی کی آواز سنائی دی۔ ”میں بابا دوارا ضرور جاؤں گی ناگ مہاراج۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے ڈس لو گے مگر میرا کیا بگڑے گا تم اتنا بھی نہیں جانتے میں۔“ امر“ ہوں۔“

لیکن اس کی امر تا دھری کی دھری رہ گئی۔ سانپ نے اپنا پھن اونچا اٹھا کر اس کے سینے پر مارا اور میں نے اسے فضا میں اچھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بیس فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہی تھی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا کہ کہیں میری ہڈیاں پسلیاں ایک نہ ہو جائیں۔ وہ دھب سے نیچے آ گری تب میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”میں نے منع کیا تھا کوروتی، آؤ اٹھو۔ تمہیں چوٹ تو لگی ہوگی۔“ میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دینا چاہا مگر اس نے قبول نہیں کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”چوٹ لگی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ جھجکے دار آواز میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیس فٹ سے گری تھی اور انسانی بدن میں تھی۔ چوٹ لگنا تو فطری بات تھی۔ مگر وہ بھی ہٹ دھرم تھی۔ اس نے میرا سہارا بھی قبول نہیں کیا اور آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ اس درخت کے پاس نہیں رکی جہاں میں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

”سنو کوروتی۔“ میں نے اسے آواز دی۔

”خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔“ اس کی آواز میں ایک تحکم تھا۔ میرے قدم رک گئے مجھے اس کے لہجے پر غصہ آ گیا تھا۔ میں اس کا حکوم تو نہیں ہوں۔ وہ تھوڑی سی آگے نکل گئی پھر اسے احساس ہوا کہ میرے قدم اس کے ساتھ نہیں اٹھ رہے۔ اس نے رک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”ارے..... کیا ہوا۔“

”کہاں جا رہی ہو۔“

”آگے کہیں رکھیں گے۔“

”کیوں..... یہاں کیوں نہیں.....“ میں نے سر د لہجے میں کہا۔ اور وہ مجھے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔

”بڑے کھوڑ ہو تم۔ مجھے بد صورت بھکارن بنا دیا اور خود۔“

”خود کیا؟“ میں نے بدستور غصے سے کہا۔

”اتنے کے اتنے سندر ہو۔“ وہ پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔  
عورت کیا شے ہے۔ برے حالات سے گزر رہی تھی کچھ سے کچھ بن گئی تھی بیس فٹ کی بلندی سے نیچے گری تھی لیکن نہ جانے اس وقت اسے میری کون سی بات پسند آگئی تھی کہ ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر عجب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

”آؤ نا.....“ اس نے ناز بھرے انداز میں کہا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“

”بس تھوڑی دور۔“

”یہاں کیوں نہیں؟“

”اب یہاں کیا کریں گے جس کام سے آئے تھے وہ نہیں ہوا۔ بابا جی نے سویکار نہیں کیا۔ ہر کوشش کر لی۔ اب یہاں نہیں رکھیں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ پتہ نہیں ان راستوں کے بارے میں کیسے جانتی تھی۔ ہم بہت دور نکل آئے۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ ایک جگہ میں رک گیا۔ تو وہ بھی رک گئی۔ ”میں تھک گیا ہوں کوروتی۔“ اب آگے نہیں جاؤں گا۔

”ٹھیک ہے.....“ اس نے کہا۔ اور ہم ایک جگہ منتخب کر کے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ”بھوک لگی ہے۔“

”نہیں.....“ میں نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

وہ پھر فیس پڑی۔ ”اتنے اونچے سے میں گری ہوں اور ناراض تم ہو رہے ہو۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی شرم کا احساس ہو رہا تھا وہ ہندو تھی۔ دوسرے مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے اس مزار پاک پر اسے لے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ پتہ نہیں دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ تمہیں ایک گندی اور ناپاک روح کو مزار مقدس پر لے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ خود تمہارا بھی ایمان خراب ہو چکا ہے۔ میں نے اس بات کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اچانک اس نے مجھے آواز دی۔

”عالی۔“

”ہوں.....“ میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

”ایک بات کہوں۔“

”بولو۔“

”میں نے ہندو دھرم کا اہمان تو نہیں کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارے دھرم کے بزرگ نے تو میری مشکل دور نہیں کی۔ لیکن ہمارے دھرم میں بھی تو بھکت ہوتے ہیں۔ دھرم اتنا ہوتے ہیں سادھو سنیا سی ہوتے ہیں۔ اور کالے جادو والے ہوتے ہیں کیوں نہ اب کسی ایسے مہاتما کو تلاش کیا جائے۔“

”تم چاہو تو ایسا کرلو۔“

”صرف میں؟“

”تو پھر کیا.....؟“

”نہیں..... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اور ایسی بات مت کرؤ میں تم سے دور بھی ہو گئی تو بھی اب تو تم مجرم بن گئے ہو۔“ تمہارے اپنے ہی تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے میں تو پھر بھی تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہوں گی۔  
”مجھ پر احسان مت رکھو۔“

”پریم احسان نہیں ہوتا۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ میں خاموش ہو گیا، ایک طرح سے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے پاس اب کیا رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ جان بچانے کے لئے چھپتا پھروں۔ نہ ڈیشان رہا نہ عالی۔ بہت دیر گزر گئی تو میں نے کہا۔ ”تو تم اب کسی مہاتما کو تلاش کرو گی۔“

”ہاں.....“

”کہاں ملے گا وہ تمہیں۔“

”تلاش کرنے سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے۔“ اس نے کہا۔

دوسرے دن ہم چل پڑے۔ فقیروں کے تو بڑے مزے ہوتے ہیں۔ یہ اب پتہ چلا تھا۔ ہم ترس کھا کر اور خدا کے خوف سے انہیں اپنی ضرورتیں روک کر دیتے ہیں اور یہ عیش کرتے اور ہم پر ہنستے ہیں۔ ہمیں بھی خوب بھیک مل رہی تھی حالانکہ ہم بٹے کٹے تھے کسی سے مانگتے بھی نہیں تھے۔

میرا دل ہر وقت کتنا رہتا تھا۔ آہ کیا حسین زندگی تھی اور اب..... واہ ڈیشان عالی واہ۔ آوارہ گردی صرف آوارہ گردی کہیں بھی بیرا کر لینے کہیں بھی نکل جلتے۔ میری حالت بھی بس عجیب تھی۔ کبھی کوئی پولیس والا نظر آ جاتا تو جان نکلنے لگتی۔ حالانکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو اس بار پھانسی کی سزا سنائی جائے گی۔ ان سوچوں کے درمیان دم گھٹتا تھا۔ کم بخت کوروتی ان حالات میں بھی خوش تھی اور مجھ پر اپنی اداؤں کے تیر برساتی رہتی تھی۔ اس دن بھی ہم ایک بستی کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اب کہیں ایک جگہ تو ٹکتے نہیں تھے۔ بس کوروتی کو کسی بھکت کی تلاش تھی اور مجھے زندگی کی۔ اس دن ہم نے ابتداء میں ایک بس سے سفر شروع کیا تھا ہم ایک بستی جا رہے تھے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بس راستے میں خراب ہو گئی۔ بستی زیادہ دور نہیں تھی اس لئے بس کے مسافروں نے بس ٹھیک ہونے کا انتظار نہیں کیا اور چل پڑے۔ ہم دونوں بھی چل پڑے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ ہم پریشان ہو گئے۔ پھر ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آئی تو ہم اس کی طرف دوڑے۔ عمارت بہت پرانی اور کالی زدہ تھی لیکن اس میں بارش سے پناہ مل گئی۔ اور ہم دونوں ایک چھت کے نیچے بیٹھ گئے۔

بارش کا زور بڑھتا گیا۔ پھر کسی اور نے بھی اس عمارت کے نیچے پناہ لی۔ یہ ایک جٹا دھاری سادھو تھا کوروتی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

”جے رام جی کی مہاراج!“

”جے درگا کنڈنی جے کرم کنڈالی۔“

”آپ درگا پنتھ سے ہیں؟“ کوروتی نے پوچھا۔

”ہاں درگا مائی کا درس۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مہاراج۔“

”تو کون ہے؟“ سادھو نے پوچھا۔

”بس ایک دکھوں کی ماری ہوں۔ جیون کوروگ لگ گیا ہے۔ کسی رشی مہی کی تلاش میں ہوں۔“

”پنڈت تلک کشوری سے بڑا دادانی کون ہو سکتا ہے دیوی ان کے پاس سارے دکھوں کے علاج ہیں۔“

”اچھا..... کہاں ملیں گے پنڈت تلک کشوری۔“

”یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ میں انہیں کے دوارا جا رہا تھا کہ راستے میں برکھارانی آئیں اور میں یہاں ٹھہر سکوں۔“

”وہ بھی درگا پنتھی ہیں۔؟“ کوروتی نے پوچھا۔

”کے درگا پنتھی۔ پر تمہیں کیا روگ ہے دیوی۔“

”آپ مجھے ان سے ملا دیں گے مہاراج!“ کوروتی نے سادھو کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”ادھر ہی جا رہا ہوں..... میرے ساتھ چل پڑنا۔“ سادھو نے کہا۔

رات ہو گئی۔ سادھو ہم سے دور ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔ ہم دونوں نے بھی ایک گوشہ اپنا لیا۔ میں نے کوروتی سے پوچھا۔

”تم تلک کشوری کو اپنے بارے میں کیا بتاؤ گی؟“

”پہلے تو یہ دیکھوں گی کہ وہ خود کتنا گیانی ہے۔ میرے بارے میں اس کا گیان اسے کچھ بتاتا ہے یا نہیں پھر کوئی فیصلہ کروں گی۔“

”یہ درگا پنتھی کیا ہوتا ہے۔“

”پنتھ مسلک کو کہتے ہیں۔ کالے جادو کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ اور اسے سیکھنے والے جادو کے دیوی دیوتاؤں کے داس ہوتے ہیں۔ ان کا واسطہ کالے جادو کے تمام استھانوں سے پڑتا ہے۔ پہلے درجے کے ”ویر“ چھتر، ”بھیر“ دھنوا، ”چماری“ سرکے، پھر پدم، ”شکھا“ اور ”کھنڈو“ بھوت اور چنیل دوسری آتما ہیں۔ جس طرح کالی دیوی کلکتے والی کالے جادو کی کھنڈولی ہے اسی طرح درگا دیوی کا پنتھ الگ ہے اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔“

”تو تلک کشوری کالے جادو والا ہے۔“

”ہاں.....“

میں خاموش ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ دوسری صبح بارش رک گئی تھی۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں جو ہمیں خیرات میں ملی تھیں۔ کوروتی کو تو کچھ کھانے پینے کی حاجت نہیں ہوتی تھی میں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ہم سادھو کے ساتھ چل دیے۔

سفر زیادہ لمبا نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت ہم اس پرانے مندر کی عمارت کے پاس پہنچ گئے جو ویرانے میں تھی اور بہت بھیا تک نظر آ رہی تھی۔

”یہ تلک مہاراج کا استھان ہے۔“ سادھو نے بتایا۔

”وہ یہاں رہتے ہیں؟“

”ہاں پاتال میں۔“

”پاتال میں؟“

”ہاں..... مندر کی اس عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے۔ وہیں پردہ درگا دیوی کے جاپ کرتے رہتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔“

”ہمیں ان کے پاس لے چلے مہاراج۔“

”تھوڑا سے بتاؤ۔ سورج ڈوب جانے دو۔“ سادھو نے کہا۔

مندر کی اس بھیا تک عمارت کو دیکھ کر میرے دل پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ لیکن بس تقدیر پر گزارہ کر رہا تھا جو بھی تقدیر میں لکھا ہو۔

شام ہو گئی اور سادھو ہمیں تلک کشوری سے ملانے لے چلا۔ مندر کے ایک گوشے میں بیچے جانے کے لئے سبزھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سادھو نے کہا۔ ”میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ.....“ یہ کہہ کر وہ تہہ خانے میں اتر گیا۔ میں اور کوروتی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

سبزھیاں تھیں کہ شیطان کی آنت۔ یہ کم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اوپر سے گھور اندھیرا نہ جانے کتنی دیر ہم سبزھیاں اترتے رہے۔ تب کہیں جا کر روشنی نظر آئی۔ یہ مشطوں کی روشنی تھی جو تہہ خانے کی دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ آخری سبزھیاں عبور کر کے ہم تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہاں مشطوں سے کافی روشنی ہو گئی تھی اور اس روشنی میں تہہ خانے کے بچوں بچ ایک اور سادھو ایک مرگ چھالہ پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔

”جے درگا مائی کی۔“ ہمارے ساتھ آنے والے سادھو نے دوسرے سادھو کو ڈنڈوت کیا۔

مرگ چھالہ پر بیٹھے سادھو نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔ ”اس مسئلے کو بھی ساتھ لے آئی کوروتی۔“

میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ مسئلے، یعنی مسلمان، تلک کشوری کو کیسے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ دوسری طرف کوروتی بھی دنگ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اسے تو سادھو نے اس کا نام بھی لے کر پکارا تھا۔ دوسرے لمحے وہ پہلے گھنٹوں کے بل بیٹھی پھر سجدے میں چلی گئی۔

”اہم جو.....“ تلک کشوری نے پکارا۔

”جی مہاراج۔“

”یہ کیونکر مسلمان ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا مہاراج۔“

”ہمیں معلوم ہے۔“

”بھول ہو گئی مہا کشی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہمارے دوار سب کے لئے جگہ ہے۔ بیٹھ جاؤ کے۔“ تلک کشوری نے کہا۔ میرے ہیروں کی جان نکل رہی تھی اس لئے میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ کوروتی اب تک سجدے میں پڑی تھی۔ تب تلک کشوری نے کہا۔ ”اٹھ جا کوروتی۔“ تب کوروتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیکھا جیون مرن کا کھیل کوروتی۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چولی نہ ہو تو دامن بیکار ہے اور دامن نہ ہو تو چولی۔“

”جی مہاراج۔“

”تو امرت جل پی کر امر تو ہو گئی پر اب جیون کے نہ کور میں جلتی رہ۔“ تلک کشوری نے کہا۔

میں حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ یہ سادھو تو کوروتی کی پوری کہانی سن رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ کوروتی حیران تھی اور دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

”میں کیا کروں مہاراج!“ کوروتی نے کہا۔

”اپنے کئے کا پھل بھوگ اور کیا کرے گی۔“

”میرے ساتھ اور جو کچھ ہوا ہے اس کے لئے کیا کروں گرتھی۔“

”اپائے ہے اس کا۔“

”میں داری جاؤں مہاراج۔ میری سہانچا کریں۔“ کوروتی بولی۔

”آپ مجھے جو بتائیں گے کروں گی۔“

”وچن دیتی ہے۔“

”جی مہاراج۔“

”پھر تجھے اس مسئلے کا خون پینا پڑے گا۔“ تلک کشوری نے کہا اور ہم دونوں دھک سے رہ گئے۔ کچھ منٹ خاموشی

رہنے کے بعد سادھو نے کہا۔ ”بول کرے گی ایسا؟“

”نہیں مہاراج۔“ کوروتی نے سرد لہجے میں کہا۔ اور میرے دل پر ایک عجیب سا احساس ہوا۔ کوروتی نے جواب

دینے میں ایک لمحہ تاخیر نہیں کی تھی۔

”پھر ہمیشہ اسی میں رہے گی۔“

”ٹھیک ہے مہاراج اسی میں رہ لوں گی۔“

”بہت پریم کرتی ہے اس سے؟“

”ہاں.....“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اور سادھو خاموش رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔

”اپائے یہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے؟“ اس کے ان الفاظ پر کوروتی چونک پڑی۔ ”ہم نے بس تیرا امتحان لیا تھا کہ تو

اس مسئلے سے کتنا پریم کرتی ہے۔“

”میں اسے بہت چاہتی ہوں مہاراج!“ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔“

”چل چھوڑ۔ اپائے یہ ہے کہ تجھے پورا ایک چندر ماہ ایک قبر میں دفن رہنا پڑے گا پورے ایک ماہ تو اس اندھیری

قبر میں رہے گی اس کے بعد جب اس سے نکلے گی تو تیرا گوشت پوست واپس آ جائے گا اور تیرا شریر پہلے جیسا ہو جائے

گا۔“ سادھو نے کہا۔

”میں اس کے لئے تیار ہوں۔“ کوروتی جلدی سے بولی۔

”تو قبر میں رہے گی۔“ سادھو نے پوچھا۔

”ہاں مہاراج.....“ کوروتی نے جواب دیا۔

میرے دل پر اس وقت ایک عجیب اثر ہوا تھا۔ اس سے پہلے کوروتی سے نفرت کرتا آیا تھا۔ اور ہر وقت اس سے

پچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے میرے لئے جس ایثار کا اظہار کیا تھا وہ قابل قدر تھا۔ میں

بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

”نہیں کوروتی! یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ایک قبر میں زندہ دفن رہو۔“

”میں جہاں بھی رہوں گی عالی جیتی رہوں گی! کیونکہ موت مجھ سے دور چلی گئی ہے تم اس کی چننا مت کرو۔“

”لیکن کوروتی.....“ میں نے کہا۔

”میری بات سن لو۔ جیسا کہ بھگت مہاراج نے کہا اس کے بعد جب میں قبر سے نکلو گی تو پہلے جیسی ہوں گی۔“

”مگر میری بات سنو۔“

”نہیں عالی..... میں خوشی سے تیار ہوں! لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

”کیا.....؟“

”جب میں پہلی جیسی ہو کر آؤں گی تو تم پیار سے میرا سواگت کرو گے۔ اس سچ تم میری لگن لگا کر یہاں مندر کے

آس پاس میرا انتظار کرو گے۔ ایک چندر ماہ ایک مہینے کی ہی تو بات ہے آنکھ بند کئے بیت جائے گا۔“

”تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو.....؟“

”تمہارے یہ شہد میرے لئے جیون جیسے ہیں۔ تمہیں میرے نقصان کی فکر ہے۔ یہ میرے پریم کی جیت ہے۔

پورے مہینے قبر میں دفن رہ کر میں تمہارے ان شہدوں میں کھوئی رہوں گی۔“ میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔

اس وقت بھگت کی آواز ابھری۔

”تمہاری پریم کتنا ختم ہو گئی۔“

”جے ہو مہاراج کی۔“ کوروتی نے کہا۔

”تم تیار ہو۔“

”ہاں بھگو کی پورن۔“ وہ بولی۔

”اسمہو چن۔“ تلک کشوری نے ہمارے ساتھ آنے والے سادھو کو آواز دی۔

”جے بھگو کی۔“ وہ بولا۔

”اس کے لئے قبر تیار کر۔ ہمارے بیروں کو ساتھ لگالے۔“

”جو آ گیا پریمو۔“ سادھو نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

”تم لوگ بھی باہر جا کر بیٹھو۔ اور غور کر لو۔“

ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں ایک ایک لمحہ کوروتی سے جان چھڑانے کی ترکیبیں

سوچتا رہتا تھا لیکن اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ آخر کار اسمہو چن آ گیا۔

”چلو دیو! تمہارا امتحان تیار ہو گیا ہے۔ تم بھی آؤ۔“ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بھی اٹھ گیا بہت برا وقت تھا

مجھ پر۔ وہ کچھ دیکھنے جا رہا تھا جس کا خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

اسمہو چن پھر ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور یہ سیڑھیاں واقعی تخت الشری تک گئی

تھیں۔ ہمیں سینکڑوں فٹ کی گہرائی اترنا پڑا تھا۔ پھر ہم جس ہال نما جگہ پہنچے وہاں خوب روشنی تھی۔ یہ روشنی مشعلوں کو جلا کر

کی گئی تھی۔ یہاں انتہائی بھیاں تک شکلوں کے بے شمار مجسمے نظر آ رہے تھے۔ ہال میں کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں

سے ایک پر تلک کشوری بیٹھا ہوا تھا۔ تلک کشوری سے کچھ گز کے فاصلے پر زمین پر ایک قبر کھدی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

تلک کشوری نے کہا۔ ”یہ تیری قبر ہے کوروتی جس میں تو ہمیں بھر رہے گی۔ تو تیار ہے؟“

”جی مہاراج۔“

”چل پھر اس میں اتر جا۔“ تلک کشوری نے کہا۔

بھکارن کے روپ میں کوروتی نے آخری بار میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور قبر کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت میرے

دل کی حالت کیا ہو رہی تھی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کوروتی آرام سے قبر میں اتر گئی میں زندگی میں پہلی بار کسی زندہ

انسان کو دفن ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قبر میں لیٹی چاروں طرف سے کوئی ڈھائی فٹ کے قد والے بونے نکل

آئے۔ ان کی تعداد کافی تھی۔ وہ قبر کے نزدیک آ کر اس پر مٹی ڈالنے لگے۔ اور کچھ ہی منٹ میں قبر برابر ہو گئی۔

تب تلک کشوری اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کسی دعوات سے بنا ہوا ایک ترشول قبر کے بچوں سچ گاڑ دیا۔ پھر

میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”کام پورا ہو گیا میاں جی۔“ مجھے اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔ میں



نے کہا۔

”اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔“

”اس کا جواب‘ مہالکھ تروتیری سنگھان شری دیں گے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میری نظریں اس کے اشارے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میری رگوں میں خون جما دیا۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوا اور اس سے..... گوتم بھنسا لی باہر نکل آیا۔ رنگین دھوئی میں ملبوس تھا اوپری جسم برہنہ تھا اور اس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پیٹھ پر ابھرے کو بڑ پر بارہ سنگھے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بے حد بھیاں تک نظر آ رہی تھی۔

میرے بدن میں ایک لمحے کے لئے تھر تھری دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہے۔ گوتم بھنسا لی اور یہاں؟ اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کو ندر رہی تھیں۔

تک کشوری اور امہو چرن مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بونے بیر بھی ایک قطار میں کھڑے ہو گئے تھے۔ گوتم بھنسا لی آگے بڑھا۔ قبر کے پاس پہنچا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کھڑا رہا پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”کوروٹی..... اس سنسار میں جتنا پریم میں نے تجھ سے کیا ہے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا۔ میں اب بھی تجھ سے پریم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ صدیاں بیت گئیں تو نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی، مگر پریم کی نفرت بھی محبت کی جگہ ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے مگر کسی اور سے پریم بھی نہیں کرتی۔ یہ بات میرے لئے اطمینان والی تھی۔ لیکن۔“

اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولا۔ ”اس پاپی نے میری برسوں کی تپسیا بھنگ کر دی۔ ارے میں تو اسے سدا سے چاہتا تھا۔ وہ مجھے نہیں چاہتی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر تو نے مجھ سے سب کچھ جھین لیا۔ تو نے اس سے وہ سب کچھ لے لیا ہے جسے میں نے اپنا بھگوان مان رکھا تھا اور میں میں راکھ ہو گیا۔ ہائے تو نے مجھ سے میرا مان جھین لیا۔ میں نے“ میں نے مجبور ہو کر وہ کیا اس کے ساتھ جو.....“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میری تو آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ ہوش دھواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ”میں نے اس کا شریر بھسم کر دیا۔ اس پاپن نے میری امانت کسی اور کو دیدی تھی۔ میں نے اسے خاک میں ملا دیا جبکہ میں نے اس کے سر سے ٹوٹ کر گرے ہوئے ایک ایک بال کو بھی دھرتی سے اٹھا کر پلچے سے لگا کر رکھا تھا۔ میں نے..... میں نے اسے مٹا دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے گہری سرخ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”اس کا کارن تو ہے۔ صرف تو اور میں۔ میں تجھے ماروں گا نہیں پاپی تھیں ارے وہ سزا دوں گا تجھے..... کہ.....“ وہ ہنس پڑا۔

میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو رہا ہے۔ بہت بڑا جال پھیلایا گیا تھا میرے اور کوروٹی کے گرد۔ اور کوروٹی اس جال میں پھنس گئی تھی وہ ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ ”وہ جو کہتے ہیں سوسنار کی ایک لوہار کی۔ میں نے جیون بھر اس کے وار صرف بچائے اس پر کوئی وار نہیں کیا مگر..... وہ میرے پہلے وار میں چت ہو گئی۔ ہائے مگر..... سن بتاؤں۔ میں نے کیا کیا۔“ وہ رکا اور بولا۔

”بڑا کام کیا ہے میں نے۔ بڑا کام کیا ہے۔“

میں خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے اپنی حالت سنبھال لی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ”ہر ترکیب ناکام ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں تو نے اس کے من میں کیا پھونک دیا تھا۔ میں نے اس کا شریر راکھ کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس کا شریر نہیں آتا پیاری ہے۔ جب کچھ باقی نہ رہا تو میں نے یہ کیا۔ میں اس کے سامنے کسی بھی روپ میں آتا وہ مجھے

پہچان لیتی کیونکہ ہماری صدیوں کی شناسائی ہے۔ اس لئے میں نے ان دونوں کو تیار کیا۔ یعنی تلک کشوری اور امہو اور تم پر جال ڈالا تم دونوں یہاں آ گئے۔ آؤ..... میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ صرف تیرا کرم کر دیتا مگر اس نے اپنے گیان سے تجھے میرے ہاتھوں سے محفوظ کر دیا۔ میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ یہ میری سب سے بڑی مجبوری تھی لیکن میرا بھی ایک گیان ہے۔ میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا ہے وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی جب تک میں اسے نہ نکالوں اسے وہاں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا بلکہ اس کے شریر کو کیڑے کوڑے ٹھیک کر دیں گے۔ وہ اس کے ہنجر میں اپنے گھر بنا لیں گے اور اس کا شریر بھر جائے گا۔ جب وہ اس قبر سے نکلے گی تو پہلے جیسی ہوگی لیکن تو.....“ اس نے ایک ہڈیانی قہقہہ لگایا۔ ”تو اس سے تک مر چکا ہوگا۔ مر چکا ہوگا تو..... پھر دیکھوں گا وہ کیسے چاہتی ہے۔ تجھے میرے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

میرا سر بری طرح چکرارہ اٹھا۔ آہ وہ شیطان کا دوسرا روپ تھا۔ کم بخت نے کیا عمدہ ترکیب سوچی تھی۔ وہ پھر بولا۔

”اب تو اپنے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ کہ تیرا کیا ہوگا کا لیا۔“

”کیا ہوگا میرا.....“ میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔ اب میرے دل سے خوف دور ہو چکا تھا۔

”وہ جو کسی کا نہ ہوا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”جئے گا تو جئے گا، لیکن مر مر کر جئے گا۔“

”وہ کیسے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”بتاؤ رے اسے وہ کیسے.....؟“ گوتم بھنسا لی نے ان نغصے بھیاں بولوں کو اشارہ کر کے کہا۔ اور اچانک وہ اس طرح منتشر ہوئے جیسے شہد کی مکھوں کے چھتے میں پتھر مار دیا جائے۔ لیکن کم بخت مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نفی نفی لائیں، گھونے چھڑ بظاہر تو سب کچھ نھا نھا تھا لیکن میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ خوب مرمت کی انہوں نے میری اور میرے حواس جواب دینے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اور پھر یہ اندھیرا مستقل ہو گیا۔

آنکھ ہی کھلی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کا احساس بھی بدن کی تحریک سے ہوا تھا۔ کیونکہ ایسا بھیاں اندھیرا تھا کہ شاید اس سے گہری تاریکی کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ بدن کے نیچے پکی زمین تھی جس کا احساس ٹٹول کر ہو گیا۔

کیا کم بخت نے میری آنکھیں نکال لیں۔ میں نے سوچا اور میرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر چلا گیا۔ میں نے انہیں اچھی طرح چیک کیا دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔

پھر یہ تاریکی اپنی حیات سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس تاریکی کا راز کیا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات بھی یاد آئے۔ انہوں نے کوروٹی کو قبر میں دفن کر دیا تھا۔ تو کیا مجھے بھی کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے؟ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اتنی گہری تاریکی قبر کی ہی ہو سکتی ہے۔

جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر پھر اندازہ لگایا کہ کیا یہ قبر ہے۔ لیکن فرش تو پکا تھا۔ اور آس پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ قبر اتنی کشادہ کہاں ہوتی ہے۔ نہیں یہ قبر نہیں ہے کوئی تاریک کمرہ۔ لیکن روشنی کیوں نہیں ہے۔

”کوئی ہے..... یہاں کوئی ہے؟“ میں نے آواز لگائی اور یوں لگا جیسے میری آواز دور تک گونجی ہو۔ کافی بڑی جگہ تھی۔ آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہوئی گئیں۔ کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ ایک لمبی سرنگ نما جگہ تھی۔ جو دور تک چلی گئی تھی۔ اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ کھڑا بھی نہیں ہوا جاسکتا تھا۔

میں نے کچھ توقف کیا۔ کمرے ہونے کی کوشش کی تو صاف اندازہ ہو گیا کہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جھکے جھکے چلتا ہوا اس سرنگ کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے پلٹا تو دوسرے سرے تک آیا عجیب و غریب جگہ تھی۔ ناقابل یقین حد تک عجیب۔ ہو سکتا ہے مندر کے نیچے کوئی اور تہ خانہ ہو۔

لیکن اس کا دروازہ کہاں ہے؟..... آہ کم بخت بھنسا لی نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی عذاب بنا دے گا۔ اور اس عذاب کا آغاز ہو گیا۔ تہ خانے میں ایسے روزن بنے ہوئے تھے جن سے ہوا اندر آسکے رات اور دن کا تعین ہو سکے اس وقت گہری رات تھی میں تھک کر زمین پر ایک جگہ لیٹ گیا۔ اور میرے ذہن پر سوچوں کی یلغار ہو گئی۔ پھر نیند آگئی۔ دوسری صبح جاگا تو سورج کی ایک کرن ایک روزن سے سیدھی میری آنکھ پر پڑ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شدید پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن پوری سرنگ میں کچھ نہیں تھا کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اچانک دور سے ایک کھڑکڑکی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ایک چوہا تھا۔ جو بل میں گھس گیا تھا۔ دوپہر ہو گئی پھر شام آہ اندازہ ہو گیا تھا۔ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح بھوک پیاس سے جان دینی پڑے گی۔

دوسرا دن تیسرا دن اب زمین پر لیٹ گیا تھا۔ موت کی آہٹیں آس پاس سے گزرتی محسوس ہو رہی تھیں بس انتظار تھا۔ موت کا انتظار نیم غشی کے عالم میں کروٹ بدلی تو ہاتھ کسی شے پر پڑا۔ کوئی برتن تھا۔ وہم ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ لیکن وہم نہیں تھا برتن ہی تھا اور برتن میں کوئی سیال شے موجود تھی بس کوئی سیال شے ہے چاہے وہ زہر کا پیالہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اٹھا اور اسے منہ سے لگا لیا۔

کیا مزہ ہے۔ کیا شے ہے۔ کچھ نہیں معلوم تھا بس اتنا معلوم تھا کہ ہاتھ پیروں میں شدید سنسنی ہو رہی ہے۔ پلکیں جھکی آ رہی ہیں۔ اور پھر دماغ سو گیا۔ پھر دو دن رات یہ گزرے دن رات مجھ سے میری ذہنی قوتیں چھین رہے تھے۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ وقت کا احساس بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں تھا کہ اب کیا ہوگا یا آگے کیا ہونے والا ہے۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ گلے سڑے پھل سبزیاں پینے کے لئے عجیب عجیب سیال آجاتے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کون لانا تھا اب تو یہ خیال بھی دل سے نکلتا جا رہا تھا۔

یوں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اب مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ سب کچھ بھول گیا تھا کیا کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں کہاں سوتا ہوں لباس کی کیا کیفیت ہے۔ دماغ سن ہو رہا تھا سوچنے سمجھنے کی قوتیں تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔ بس کبھی بھی خیالات کی ہلکی لکیروں میں اپنا تصور جاگ اٹھتا تھا۔

بہت دن گزر گئے پھر ایک دن جب آنکھ کھلی تو ماحول بدلا بدلا سا تھا۔ میرے بدن کے نیچے کھردری زمین نہیں تھی بلکہ ایک جانی پہچانی سی نرمی تھی۔ یہ نرمی..... میں نے سوچا پتہ نہیں کیا ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جہاں بیٹھا تھا اور اس پر نرم گدرا بچھا ہوا تھا۔ اور..... اور میرے بدن پر..... میرے بدن پر نیا لباس تھا مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ میں اس غار میں نہیں تھا بلکہ یہ ایک کمرہ تھا۔ ہاں اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ یہ ایک کمرہ ہے۔ اور میں یہاں موجود ہوں۔

کچھ فاصلے پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک بات ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہ کہ مجھے اس جگہ سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے اور یہ کوئی نامانوس جگہ ہے۔

پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے جیسا انسان تھا بس کچھ عجیب سا

تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ قد چھوٹا سا تھا پیٹھ پر جیسے گھڑی سی بندھی ہوئی تھی وہ میرے پاس آ گیا۔ ”کیسے ہو عاشق نامراد.....؟“ اس کی آواز ابھری۔

”اچھا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ویسے عاشق نامراد تو میں ہوں۔ تم نے تو گھر بیٹھے ساری مرادیں پوری کر لیں۔ اب بھی یاد آتی ہے۔“ ”کون؟“ میں غیر اختیاری طور پر بول رہا تھا۔ اب جبکہ اس نے مجھ سے باقاعدہ باتیں شروع کی تھیں تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔

”کوروٹی کی بات کر رہا ہوں۔“

”کوروٹی.....؟“ میں نہ سمجھنے والے لہجے میں بولا۔

”بھول گیا اسے۔“ اجنبی کبڑے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”میں کسی کوروٹی کو نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔

”بھول مجھ سے ہوئی تھی۔“ وہ بولا۔ نہ جانے کیوں اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ یہ منحوس شکل کا کبڑا بکواس کئے جا رہا ہے۔ اس کی بکواس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرا سر بھی جھکا رہا تھا اور شاید مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

”میں بھوکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”چل ٹھیک ہے۔ پہلے تیری پیٹ پوجا کر اذی جائے اس کے بعد تجھ سے باتیں کریں گے۔ اب مزہ آئے گا تجھ سے باتیں کرنے کا۔ اور سن یہاں سے باہر جانے کی کوشش مت کرنا مزید جو کچھ ہوگا اس کا ذمہ دار تو خود ہوگا۔“ کبڑا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھیں لیکن میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں کون ہوں کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ وہ گندی جگہ مجھے یاد تھی جہاں میں رہتا تھا وہ تاریک سی جگہ جہاں بدبو بھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔ تاریکی بھی نہیں ہے۔ بدبو بھی نہیں ہے۔ اور یہ سب اچھا ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔

کیا میں اس جگہ کو پہلے سے جانتا ہوں؟ کیا میں پہلے بھی کسی ایسی جگہ رہتا تھا؟ مگر کہاں اور یہ بد شکل انسان؟ اس سے بلاوجہ نفرت محسوس ہوتی تھی۔ یہ کون ہے؟ اور یہ ایک نام لے رہا تھا۔ وہ کون ہے۔ کیا نام تھا.....؟ ہاں کوروٹی ضرور کہیں یہ نام سنا ہے۔

ساری باتیں اپنی جگہ کوئی اہم بات یاد نہیں آ رہی تھی لیکن ایک احساس ضرور تھا۔ کچھ تھا کچھ ضرور تھا جو میرے دماغ میں کھویا ہے۔

دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ میرے لئے کھانا لائے تھے۔ آہا کیا عمدہ کھانا ہے۔ کیسی اچھی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ پیٹ بھر گیا اور آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ میں مسہری پر جا کر سو گیا۔ جاگا تو پھر وہی اندھیرا تھا۔ لیکن یہ اندھیرا اس غار کا نہیں تھا۔ بلکہ رات کا وقت تھا اور میں اسی نرم گدے والے بستر پر سو رہا تھا۔

میں نے ست انداز میں نرم تکیہ بازوؤں میں لیا اور پھر سو گیا۔ پھر نہ جانے کب جاگا تھا۔ یہ سب مجھے برائیں لگ رہا تھا۔ نہ ہی دل میں کوئی احساس تھا کہ کہیں باؤں۔ یہاں سب ٹھیک تھا۔ اس وقت خوب تیز روشنی تھی جب وہی کبڑا منحوس میرے کمرے میں آ گیا۔ مجھے پتہ اس کی شکل سے چڑھتی تھی۔ لیکن اس وقت وہی میرے لئے سب سے

مہربان شخص تھا وہی میری ضرورتیں پوری کر رہا تھا۔

”کیسے ہو شام سندر جی۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”مجھ سے کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... یہاں اور کون ہے۔“

”میرا نام شام سندر ہے؟“

”ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ چلو اپنا نام خود بتا دو۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب؟“

”کہ تمہیں اپنا نام نہیں معلوم۔“

”مجھے میرا نام بتاؤ۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”سندر تو تم ہو میں نے شام لگا دیا ہے۔ تمہارا نام شام سندر ہی ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے۔“ میں نے پوچھا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر گردن ہلا کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے تم سوچ سکتے ہو۔ اور کیا کیا سوچ سکتے ہو تمہیں کوروتی یاد ہے؟“

”نہیں..... یہ نام تو پہلے بھی لے چکے ہو۔“

”ہائے..... ایسا پہلے ہو جاتا۔ وہ اپرا ہے سنسار کا سارا حسن اس کے اندر رہتا ہے.....“ وہ رکا پھر بولا۔ ”رہتا تھا.....“ اس کے لہجے میں درد تھا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔“

”سمجھاتا ہوں۔ سمجھانے ہی آیا ہوں۔ وہ اپرا تھی راجہ اندر کی سجا میں بھی اس سے سندر اپرا نہیں ہوگی کوئی۔ میں اس سے پریم کرتا تھا۔ بھگوان تھی وہ میری۔ مگر اسے اپنی سندرتا پر بہت گھمنڈ تھا۔ اور میں بد صورت تھا۔ پھر اسے امرت جل مل گیا۔ وہ اسے پی کر امر ہو گئی۔ مگر..... مجھ سے بھول ہو گئی۔ بہت بڑی بھول۔“

وہ خاموش ہو کر سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ کہانی اچھی لگی تھی۔ میں کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”اے گے کہو۔“

”ہاں..... مجھ سے بھول ہو گئی۔“

”کیسی بھول؟“

”بچا کچا امرت جل میں نے پی لیا۔“

”امرت جل کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سنسار کی سب سے بڑی چیز۔ بھگوان نے جیون مرن رکھا۔ جیون اس لئے دیا کہ منش بھگوان کے بنائے ہوئے سنسار سے مزے لے اس میں رہ کر جیون کے سکھ اٹھائے اور پھر دوسروں کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ بھگوان کے سنسار کو چھوڑ کر نہ کھیا سورگ میں چلا جائے۔ مگر کچھ جیون کے لو بھی“ (زندگی کے لالچی) سنسار کی جان نہیں چھوڑنا چاہتے۔ وہ موت سے ڈرتے ہیں اور جیون سے چپے رہنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بھگوان کے اصولوں سے اس کے دچاروں سے منہ پھیرنے والی بات ہے۔ اس نے ترازو کھڑی کر دی۔ سچ بولو۔ پورا تو لو اگر اس کے دچاروں سے منہ پھیرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ جیون تو دیا گیا ہی مرنے کے لئے ہے۔ بھگوان نے امرت جل بھی بنا دیا کہ بچو گے تو تمہیں موت نہیں آئے

گی۔ پرتو لبا جیون سنسار کی سب سے بری چیز ہے۔ ہائے کوئی موت کے مزے کو جانے۔“

اس کی آنکھیں ٹپکی ہو گئیں جیسے وہ موت کی شراب پی رہا ہو۔

دوسری طرف اس کی باتیں کافی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔

”کیا نام ہے تمہارا۔“

”ایں.....؟“ وہ جیسے سوتے سے جاگ گیا۔ پھر بولا۔ ”دھت تیرے کی سارے سپنے توڑ دیے۔“

”تم پہنا دیکھ رہے تھے۔“

”ہاں رے..... بڑا ہی سندر پہنا۔ پتہ ہے کیا دیکھ رہا تھا میں؟“

”تمہارے سپنوں کا مجھے کیا پتہ۔“ میں نے کہا۔ اس سے بات کر کے مجھے مزہ آ رہا تھا۔

”میں دیکھ رہا تھا کہ میرا دیہانت ہو گیا ہے۔“

”دیہانت کیا.....؟“ میں نے کہا۔

”اے میں دیکھ رہا تھا کہ میں سر گیا ہوں۔“ اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو اردو میں مردنا۔“ میں بولا۔

”اردو کا بچہ.....“ وہ بڑبڑایا۔

”تو تم نے دیکھا کہ تم مر گئے ہو۔“

”ہاں اور میری ارتھی رکھی ہے۔ میرے کریا کرم کی تیار ہو رہی ہے۔ مجھ پر سیندور اور گلاب کا عرق چھڑکا جا رہا ہے۔ لوگ رو رہے ہیں اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے ہیں۔“

”یعنی تم اپنی موت پر خوشی سے رو رہے ہو؟“

”تو اور کیا..... مرنے کے کتنے مزے ہوتے ہیں۔ تو کیا جانے پاپی۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہارا نام پوچھا تھا۔“ میں نے کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ میں نے خود کو بھولے ہوئے گزارا تھا لیکن بعد میں جب میری یادداشتیں واپس آئیں تو مجھے گزرے ہوئے یہ لمحے بھی من و عن یاد آ گئے جو میں نے اس لمحے میں گزارے تھے۔ اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

”گو تم بھنسالی ہے میرا نام۔“

”اوہ ٹیڑھا نام ہے۔“ میں نے کہا۔

”سب بھول گیا سرے۔ اچھا ہوا۔ اب مزے کرو میری محبوبہ قبضے میں کر لی تھی۔ مجھے جو کرنا پڑا ہے۔ تیری وجہ سے کرنا پڑا ہے۔ درندہ اور کچھ نہیں تو..... تو..... وہ کسی اور کی تو نہیں تھی۔“

”کون.....؟“ میں نے پوچھا۔

”کوروٹی، کوروٹی، کوروٹی۔“

”میں کسی کوروٹی کو نہیں جانتا۔ میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔“ وہ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تو میں بتا رہا تھا کہ بچا کچا امرت جل میں پی گیا۔ ہائے کتنا اچھا ہوتا۔ میں اسے پریم تو کرتا تھا مگر اسے صدیوں جیتا نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بھی مر جاتی میں بھی مر جاتا پریم کہانی ختم ہو جاتی۔ مگر دونوں کشت میں آ گئے۔ میں اس پر جان دیتا تھا اور وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ وہ بھی صدیوں کا سفر کرتی رہی میں بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس نے بڑے بڑے رشی مینوں سے گیان سیکھے گیان چھینے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے بھی کچھ گیان سیکھے مگر

اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ پھر ہم تیرے ہاتھ لگ گئے اور برائے آگیا۔  
”میرے ہاتھ؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”جانے دے جانے دے۔ شامِ سندھ آخر تیرا کھیل تو ہو گیا مگر تو پوری کہانی سن۔ وہ پتہ نہیں کیسے تیرے پریم جال میں پھنس گئی اور..... اور..... وہ ہو گیا جو جیون بھر نہیں ہوا تھا۔ ہائے جو میرا تھا وہ تیرا ہو گیا ہائے ہائے تو نے مجھے مار دیا پاپی! جب تک برداشت ہوا کرتا رہا۔ پھر..... پھر.....!“ اچانک اس کا سانس میری طرح پھولنے لگا۔  
”تم پھر رک گئے۔“

”بتا رہا ہوں ہتھیارے۔ بتا رہا ہوں۔ میں نے تیرا روپ دھارن کر کے اس کا شریر گلا دیا۔ اس سے اس کی سندرتا چھین لی۔ جو میرا تھا اس پر تیرا قبضہ ہو گیا تھا۔ اب نہ کچھ تیرا رہا نہ میرا وہ ڈھانچہ بن گئی۔ مگر اس نے تیرا پیچھا چھوڑا نہ تو نے اس کا۔ وہ جس کی میں نے لاکھوں سال پوجا کی اسے میں نے چڑیل بنا دیا۔ چڑیل بنا دیا میں نے۔ پر اس نے تجھے حاصل کرنے کا کام جاری رکھا اور سندرتا ریوں کی جان لے کر ان کے ذریعہ تجھے خوش کرنے لگی تو خود سوچ مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچانے کے لئے اپنے گیان سے کام لیا اور اک ایسی چال چلی کہ میں تجھے نہیں مار سکتا ورنہ اب تک تو تیری ہڈیاں بھی بسم ہوئی ہوتیں اور پھر میرا مہر ختم ہو گیا۔ میرے سن کی آگ نے مجھے پھونک دیا اور میں نے وہ قدم اٹھا لیا۔“  
اس کی آواز لرز گئی۔

”کون سا قدم.....؟“ میں سوال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

”بتا تو چکا ہوں تجھے ہتھیارے میں نے اسے گلا کر ڈھانچہ بنا دیا۔ اب وہ تیری رہی نہ میری مگر مجھے گلتا ہے میں نے اب ٹھیک کام کر دیا ہے۔“  
”وہ کیا.....؟“

”میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا ہے اور تجھے۔ تجھے میں نے مہان بے کال کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تو بے کالی بن کر رہے گا۔ گیان گردھاری کا داسی کال منی کالی دیوی کا بھرنکی سادھو منشی میا منی کے چروں کی دھول پھانک لے گا تو لوگ تجھے سادھو منشی سمجھ کر تیری سیدا کریں گے۔ تجھے تو روکی سوکی کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی..... پھر..... پھر تو مر جائے گا اور..... اور ہم جیتے رہیں گے۔ میں بھی..... اور کوروتی بھی! میں اسے قبر سے نکال لوں گا۔ اور تو میری مان لے ایک دن وہ پھل جائے گی..... وہ سوچے گی کہ گوتم بھنسا لی بد صورت ہے تو کیا مجھ سے لاکھوں سال سے پریم تو کر رہا ہے۔ اور..... اور..... وہ مجھے سو بیکار کر لے گی۔“

اس کے چہرے پر پھر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ میری ذہنی حالت جوں کی توں تھی۔ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ ذہن پر کچھ مٹے مٹے سے نقوش تو ضرور تھے۔ یہ احساس تھا کہ میں شامِ سندھ نہیں کچھ اور ہوں۔ لیکن کچھ اور کیا ہوں یہ یاد نہیں تھا۔

”جا اور دے دعا اسے کہ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچا لیا ہے۔ ورنہ.....“ وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر مجھے اس کی فضول باتیں یاد آنے لگیں۔ پتہ نہیں کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔  
”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یادداشت گم ہو جانے کے دور کی باتیں مجھے کیسے یاد رہ گئیں اور میں ان کے بارے میں کیسے لکھ رہا ہوں تو میں اس کے بارے میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گا پہلے سے بتانا قبل از وقت ہو گا۔  
غرض کہ وہ شخص جس نے مجھے اپنا نام گوتم بھنسا لی اور مجھے میرا نام شامِ سندھ بتایا تھا وہ گیا مقبول اس کے کہ وہ

دونوں جو مجھے اس مندر میں ملے تھے اس کے ہر کارے تھے جنہوں نے اس کا کام اس لئے کیا تھا کہ وہ عورت کوروتی گوتم کو آسانی سے پہچان لیتی اور پھر اسے قبر میں اتارنا ممکن نہ ہوتا۔

سب کچھ بھاڑ میں جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں کیا کروں۔ پتہ نہیں یہ کون سی عمارت ہے۔ کہاں واقع ہے۔ میں اس عمارت میں کسی کے قبضے میں ہوں۔ یا آزاد ہوں۔ اور کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ جب اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکی تو جا کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دماغ کسی بھی قوت کی میراث نہیں ہوتا۔ اس پر صرف نیند کی قوت حاوی ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے۔ باقی سب اس کی غلط کاریاں ہوتی ہیں جو اس سے محبت چھین لیتی ہیں۔

میں سو گیا! اللہ کی عطا کی ہوئی ساری قوتیں میرے ساتھ تھیں جن میں نیند بھی ہے۔ کیسی مزے کی بات ہے شیطان انسان کو بہکا تو سکتا ہے۔ اس سے گناہ تو کر سکتا ہے لیکن اس پورے وجود کے ساتھ جو اللہ کی عطا ہے وہ اس سے نیند نہیں چھین سکتا بھوک نہیں چھین سکتا یہاں وہ بے بس ہے۔

خوب جی بھر کر سویا..... پھر آنکھ کھل گئی۔ وہی کمرہ تھا وہی جگہ تھی۔ لیکن رات ہو چکی تھی ماحول پر اندھیرا طاری تھا۔ پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔  
”تم جاگ گئے؟“

سوال مجھ سے ہی تھا۔ میرے سوا یہاں کون تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ہندو مندروں کی دیوداسی جیسی ایک عورت تھی جو پرانے ہندوانہ طرز کے لباس میں ملبوس تھی۔ وہی مجھ سے مخاطب تھی۔ اس نے پھر سوال کیا۔

”تم جاگ گئے.....“

”ہاں..... میں جاگ رہا ہوں۔“

”اٹھو..... میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں.....؟“

”دھون کٹھ میں..... میا منی گیان گردھارن کے دوار۔ تاکہ تم ان کے چروں میں جا کر پورا استھان حاصل کر لو۔“  
میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن ان کے درمیان تھا۔ اور ایک بڑی اذیت ناک جگہ سے نکلا تھا۔ اور دوبارہ اس جگہ نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ ان کے ساتھ تعاون ضروری تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

لباس وغیرہ تو انہوں نے دوسرا پہنا ہی دیا تھا اور میں صاف ستھرا ہی تھا چنانچہ میں اس عورت کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی۔ اس ہال کے بارے میں کیا بتاؤں تا حد نظر پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں بے شمار سادھو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں نہیں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہال کے درمیان ایک بہت بڑا بت نظر آ رہا تھا جس کے پیروں کے پاس ایک چٹان تھی اور اس چٹان پر ایک لمبے چوڑے بدن کا سادھو بیٹھا تھا جس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کی گردن سے ایک کالا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کا چوڑا پھن کھلا ہوا تھا اور یہ پھن اس کے سر پر پھیلا ہوا تھا۔

یہ تنگی سانپ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کا پھن کبھی کبھی ہلتا تھا اور گردن سے لپٹا اس کا بدن جگہیں بدل رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ ہے۔ پھر اچانک نیم تاریک ماحول روشن ہونے لگا۔ یہ روشنی اس دیو بیگل مجھے کی آنکھوں سے نکل رہی تھی۔ ہال اتنا روشن ہو گیا کہ سب کچھ صاف نظر آنے لگا۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں

میں آئی۔

”شلام سندر!“

میں نے یہ آواز سنی لیکن ابھی میں نے اپنا نام پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اس لئے میں خاموش کھڑا رہا۔ تبھی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے مجھے شلام سندر کے نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ اسی وقت میرے ساتھ کھڑی عورت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تمہیں آواز دی جا رہی ہے۔“

میں چند قدم آگے بڑھ کر مجھے کے سامنے پہنچ گیا۔ تبھی مجھے کے قدموں میں بیٹھے بچاری کی آواز ابھری۔

”مہاشی! تیرا تیا داس تیرے چروں میں آیا ہے۔ اس کی سیوا سونیکار کر۔“ پھر وہ میری طرف رخ کر کے بولا۔

”چل شلام سندر مہاشی کو سجدہ کر۔ یہ تجھے آشیر باد دے گا۔“

”کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک کھڑا ہے۔ سجدے میں گر جا مہاشی کے چروں میں۔“ اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ اسی وقت نہ جانے کیا ہوا اور ایک دم ہی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ اذان کی آواز تھی۔ مجھے اذان کی آواز سنائی دی اور میں جبر جبری سی لے کر رہ گیا۔

”تو نے سنائیں شلام سندر۔ سجدہ کر مہاشی کے سامنے۔“

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔ یہ آواز مولوی قدرت اللہ کی تھی جو ہمارے محلے کی مسجد کے پیش امام تھے۔

اور جب بھی کسی کے ہاں بیٹے یا بیٹی کی ولادت ہوتی تھی مولوی قدرت اللہ ہی اس کے کان میں اذان دیتے تھے۔ بڑے ہو کر میں نے اکثر سوچا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ بھلا اس آواز کو کیا سنا ہو گا وہ تو دنیا سے ناواقف ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ آواز مجھے بتا رہی تھی کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اسی کو سجدہ جائز ہے۔ ایسے بت اور پتھر کے ٹکڑے لاکھوں ہیں انہیں سجدہ کرنا حماقت ہے۔ گناہ ہے۔ شرک ہے۔

بہت سی آوازیں ابھریں۔

”کیا یہ مہاشی کو سجدہ نہیں کرے گا۔ کیا یہ مہاشی کا اپمان کرے گا۔ یہ ادھر می ہے۔ یہ ہمارا دھرم سونیکار نہیں کر رہا مارو اسے جیتا جلا دو۔ مارو پانی کو اس نے گمان گردھاری کا اپمان کیا ہے اس نے.....“

”خاموش.....“ ہادلوں جیسی گرج ابھری۔ اور آوازیں بند ہو گئیں۔ ”یہ دوسرے دھرم کا ہے۔ مہاشی کا دھرم سونیکار کرنے میں اسے سے لگے گا۔ ہم کون ہوتے ہیں اسے سزا دینے والے جس کا مجرم ہے وہ جانے۔“

یہ آواز مجھے کے پیروں میں بیٹھے بھگت کی تھی۔ جسے یہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے مخاطب کر رہے تھے۔ ”تم لوگ اپنی بھگتی کر ڈیوے ٹھیک ہو جائے گا اور ایک دن تمہارے ساتھ بھگتی میں شامل ہو گا۔“ بھگت نے کہا۔ پھر بولا۔ ”جاؤ رے۔ اسے اس کے استھان پر پہنچا دو۔“ فوراً ہی چار پانچ لمبے چوڑے سادھو اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے بازو پکڑ لئے۔ وہ مجھے تقریباً تھینتے ہوئے اس جگہ سے باہر نکال لائے۔ یہ مندر نما جگہ بے حد وسیع تھی اور تو بڑے بڑے ہال اور راہداریاں تھیں جن کا ماحول بے حد پراسرار اور بھیاں تک تھا۔ پھر وہ ایک جگہ رکے ایک دروازہ کھلا جس کے دوسری طرف سیزھیماں تھیں۔ ان سیزھیماں کو عبور کر کے مجھے ایک تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

یہ تہہ خانہ بھی بہت وسیع تھا۔ لیکن اندر قدم رکھ کر خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن کو لرزائی گئی۔ یہاں دیواروں

کے ساتھ لاتعداد انسانی مجسموں کے سوکھے ہوئے منجر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری خوف ناک بات یہ تھی کہ ان کی کھوپڑیوں میں چراغ روشن تھے جن کی روشنیاں ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے باہر آرہی تھی۔

”تم یہاں آرام کرو۔“ مجھے لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”سنو..... میری بات سنو۔“

”بولو.....“

”تم مجھے یہاں سے کہیں اور نہیں لے جا سکتے۔“

”نہیں۔“

”لیکن یہ.....“ کسی نے کہنا چاہا لیکن جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”تم نے مہاشی کو سجدہ نہ کر کے اپنے لئے برا وقت بلا لیا ہے۔ یہ سب جو اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں تم جیسے ہی ہیں۔ آرام کرو۔ اور سوچو۔“

وہ چلے گئے اور میں دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آخر کار میں ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت ایک بات کا مجھے خصوصی احساس ہوا۔ حالات کتنے ہی بدلے ہوں وقت کیسا ہی خراب کیوں نہ آ گیا ہو قدرت نے انسان یا انسان ڈھانچوں کے ساتھ تنہا ہو اور پھر نیند آ جائے۔ لیکن میں زمین پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسری صبح بھی بس نیند پوری ہو جانے پر جاگا تھا۔ ورنہ اس تہہ خانے میں روشنی کسی طرف سے نہیں آتی تھی۔ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ڈھانچوں کی فوج نظر آرہی تھی۔ سب کے سب اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔

بہت دیر گزر گئی۔ پھر روشنی کی ایک رقی تہہ خانے میں ابھری اور میں چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ لوگ تہہ خانے کی سیزھیماں سے نیچے اتر آئے تو میں نے انہیں دیکھا۔ ان میں سے ایک وہی ہے کال تھا جسے میں نے مجھے کی گود میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ آگے تھا اور باقی لوگ جو سادھوؤں کے لباس میں تھے اس کے پیچھے تھے۔

”کھڑا ہو جا.....“ وہ میرے قریب آ کر بولا اور میں کھڑا ہو گیا۔ ”تو نے مہاشی کے چروں میں سر نہیں جھکایا تھا۔“ وہ بولا۔

”ہاں.....“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔

”یہ جانتا ہے تو کون ہے؟“

”نہیں.....!“ میں نے جھٹکے دار آواز میں جواب دیا۔

”ہمارے لئے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن گمان گردھاری تجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے تیری اتنی خبر گیری کی جا رہی ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ تجھے کو تم بھنالی ہمارے پاس لایا ہے۔“

”میرا دماغ خراب مت کر ڈیو مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ کو تم بھنالی کون ہے؟“ میں نے غصے سے کہا۔

جے کال نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”ابھی کچا ہے پکا ہونے میں سے لگے گا۔ اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

”اس کا کیا کریں؟“  
 ”یہی جگہ اس کے لئے ٹھیک ہے۔“ جے کال نے کسی قدر غصے سے کہا۔ پھر وہ سب باہر نکل گئے۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور ایک دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں بہت سے خیالات آرہے تھے۔  
 وقت گزرتا رہا۔ مجھے بھوک پیاس لگ رہی تھی۔ بدن نڈھال ہو رہا تھا۔ یہ دن اور پھر رات بھی گزر گئی۔ اور میرے اندر وحشت بیدار ہونے لگی۔ کیا میں موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر کیوں۔ کوئی جدوجہد ضروری ہے۔ یادداشت الگ ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کون ہوں..... کیا ہوں..... یہاں کیوں ہوں۔ سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا۔

میری نظر ان ڈھانچوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا ڈھانچہ بھی انہی کے درمیان کھڑا ہوگا۔ میرے ساتھ ایک اور اذیت ناک عمل یہ تھا کہ میں ہوش مند تھا ایک ایک چیز کا احساس تھا بس یہ یاد نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ میرا ماضی کیا ہے وہ کم بخت گوتم بھنساالی کون تھا جو مجھے اس اذیت میں پھنسا گیا تھا۔ اور جس عورت کا وہ نام لے رہا تھا وہ کون تھی۔ میں تو کسی کوروتی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اب میں کیا کروں۔

یہ دن بھی گزر گیا۔ تیسری صبح دو افراد میرے لئے کھانا لائے۔ کھانے میں کیا تھا میں نے غور بھی نہیں کیا بس کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر کچھ دیر کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ کھانے میں کوئی نشہ آور شے بھی شامل تھی۔ پھر نہ جانے کب آنکھ کھلی۔ بدن میں توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ ہی لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ جگہ پھر بدل گئی ہے۔ میں پھر کسی بہتر جگہ ہوں۔ یہ تو خاص جدید کمرہ تھا۔ عمدہ بستر، عمدہ فرنیچر دیواروں پر حسین تصاویر آویزاں۔ لیکن یہ سب نامانوس تصویریں تھیں۔

پھر دو لڑکیاں میرے لئے کھانے پینے کا سامان لائیں۔ ”مہاراج مندریتانے کہا ہے کہ آپ فارغ ہو جائیں تب وہ آپ سے ملیں گے۔“

”مہاراج مندریتانے۔“ میں نے کہا۔

”جی.....“

”یہ کون ہیں.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ دونوں ہنس پڑیں۔

”مہاراج ہیں اور کون ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ اور کھانا اپنے سامنے کر لیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ وہی دونوں لڑکیاں پھر اندر داخل ہوئیں لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں ان کے پیچھے گیروارنگ کے لباس میں وہی شخص جے کال تھا۔ میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی فرحت طاری تھی۔

”جے گیان گردھاری۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہیں اپنا نام یاد ہے۔“

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔

”شیام سندر ہے تمہارا نام۔“

”میرا یہ نام نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنا اصل نام بھی یاد نہیں ہے۔“  
 ”تمہیں تمہارا اصل نام بھی یاد آ جائے گا۔ اس سے ہم تمہیں سندر ہی کہیں گے۔ سندر۔ گیان گردھاری کسی منٹ کا

نام نہیں ہے۔ ایک تحریک ہے۔ ایک منصوبہ ہے اور اس سے سنسار کے بے شمار ملکوں میں اس تحریک پر کام ہو رہا ہے۔ میں تمہیں مختصر طور پر اس تحریک کے بارے میں بتاتا ہوں۔ تم دیکھو سنسار میں جو کام منٹس کو سکون اور اس کے جیون کو خوشیاں دے سکتے ہیں وہ کہاں ہو رہے ہیں۔ دو ٹانگوں دو ہاتھوں والا ہی درندہ جسے انسان کہتے ہیں کیا کر رہا ہے؟ کون کس کا ہمدرد ہے کسی ایک کا نام بتاؤ گے۔ ہر جگہ وہ ہو رہا ہے جس سے انسان تیزی سے تباہی کی طرف جارہے ہم نے ایک پر یوار بنایا ہے گیان گردھاری پر یوار۔ ہم نیکیوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ ہم سنسار سے ان بچے کچے نیکوکاروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو بلاوجہ نیکیوں کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ تم بس مجھے ایسے نام بتاؤ جو پوری سچائی سے اپنے کام کر رہے ہوں۔ کسی دیس کسی ملک اور اس میں بسنے والوں کا نام لے لو کہیں سائنس کے نام پر کام کیا جا رہے ہے۔ بیماروں کے حوالے سے ہسپتال کھولے جا رہے ہیں ان کی پبلیٹی ہو رہی ہے کہ یہ ہسپتال ان غریبوں کے لئے ہیں جو اپنا علاج نہیں کرا سکتے۔ ذرا ان ہسپتالوں میں جا کر تو دیکھو ان بیمار غریبوں کے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ اور علاج کے نام پر ٹرغا دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے نام پر کروڑوں کی دولت امداد کے طور پر حاصل کی جاتی ہے۔ گلوکاروں اداکاروں کھلاڑیوں نے اور کسی بھی شہرت یافتہ نے یہ منافع بخش کاروبار شروع کر دیا ہے۔ یہ تو چھوٹے پیمانے کی بات ہے بڑے پیمانے پر میں نے ان سائنسی تجربات کی بات کی ہے جو بڑے بڑے ممالک میں ہو رہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار بنائے جا رہے ہیں۔ چاند ستارے اور سیارے تسخیر کئے جاتے ہیں۔ کیمیاوی ہتھیار بنا کر ان کے تجربے کئے جا رہے۔ یہاں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا کر یہ تجربہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں بیمار کر کے شفا کیسے دی جاسکتی ہے۔ تندرست انسانی زندگی کی تندرستی کو کیسے گھن لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ہو رہا ہے شیام سندر! تمہارے سنسار میں لاکھوں تنظیمیں ہیں جو انسانیت کی بھلائی کے نام پر کام کر رہی ہیں۔ ہاہا۔۔۔۔۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔۔“  
 وہ تپتے لگانے لگا پھر بولا۔

”وہ نیکوکاروں کی انجمنیں ہیں وہ نیک لوگ ہیں جن کے پاس دین دھرم کی ٹھیکیداری ہے۔ ذرا ان کے اندر اتر کر دیکھو۔ تمہیں ایک انوکھا سنسار نظر آئے گا۔ اور ہم گیان گردھاری پر یوار ہم برے لوگ ہیں۔ جو برائی کے نام پر جمع ہوئے ہیں اور ان اچھوں کو برا بنا رہے ہیں جو سارے سنسار کو اچھا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

میں سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ خاموش تھا۔ وہ پھر بولا۔

”تمہیں بھی اس پر یوار کا ایک رکن بنایا گیا ہے۔ تمہیں بہت سے کام دیئے جائیں گے اور تمہیں وہ انجام دینے ہوں گے۔ تم پر ایک تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جانتے ہوں کیا تجربہ ہے۔“

”نہیں.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”تم کوئی دھرم داس نہیں ہو ایک عام آدمی ہو۔ لیکن جب اتنی تکلیفوں کے بعد جس سے نجات پانے کے لئے منٹس سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ تم نے مہاشی کو سجدہ نہیں کیا تھا بار بار کہنے پر بھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمارے لئے حیرانی کی بات تھی۔“

”میں بتاؤں کیوں؟“ میرے منہ سے آواز نکلی۔ بڑی سے بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ آواز میری نہیں تھی۔ یہ الفاظ میرے ساختہ نہیں تھے۔ کوئی اور میرے اندر سے بولا تھا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”ہاں بتاؤ..... یہ ہمارے لئے بہت بڑی باگ ہوئی۔ ہم جاننا چاہتے ہیں وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو ہمارے راستے کی اتنی بڑی رکاوٹ ہے۔“



”ہمارے ہاں..... مذہب اسلام میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کانوں میں سب سے پہلی آواز جو پہنچائی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور یہ آواز دنیا میں ہماری آمد کی تکمیل کر دیتی ہے۔ ہمیں اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ آواز موت کے وقت تک ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ موت ضرور آتی ہے۔“

اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ پتھرایا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر جنونی لہجے میں بولا۔ ”ہماری جنگ اسی آواز کے خلاف ہے۔ اور ہم..... اور ہم..... اور ہم.....“ وہ ایک بھی جملہ پورا نہیں کر پا رہا تھا۔ سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

میرے اندر کوئی تاثر نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ میرے اندر کی آواز تھی اور بس۔ اس وقت میری ذہنی حالت ہی ٹھیک نہیں تھی۔

پھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر خاص بات ہو گئی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنے مخصوص انداز میں کرتے تھے۔ ہوش کے عالم میں نہیں کرتے تھے اور ایک صبح پھر ماحول بدل گیا۔ صبح کو جاگا تو ماحول بدلا ہوا تھا۔ وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں قیدی تھا۔ گویا مجھے قید سے رہا کر دیا گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تھوڑے فاصلے پر آبادی نظر آ رہی تھی۔ یہ سب میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ذہنی طور پر کم ضرور تھا لیکن کسی بھی طرح کے ماحول سے ناواقف نہیں تھا۔ دور تک خوبصورت مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے قدم غیر محسوس انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ اب میں آبادی کے کنارے آ گیا تھا۔ اور سب سے پہلے جو مجھے نظر آیا وہ ایک نوجوان لڑکی تھی وہ مجھے دیکھ کر رک گئی تھی۔

میں تو اس کے قریب نہیں گیا۔ لیکن وہ چند قدم چل کر میرے پاس آ گئی۔ میرے قدم رک گئے وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے نے کہا۔

”تم گیان گردھاری ہو۔“

”گیان گردھاری۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ یہ نام مجھے یاد تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

”نہیں۔“

”نہیں ہو.....“ وہ حیرت سے بولی۔

”نہیں.....“ اس بار میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”مگر تمہارے شریر پرکڑے تو گیان گردھاریوں جیسے ہیں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے چونک کر اپنے لباس کو دیکھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے بدن پر سادھوؤں جیسا لباس تھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایں.....؟ نام؟“

”ارے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جیسے اپنے بارے میں سب کچھ بھول گئے ہو۔ ویسے ہو بڑے سندر۔“ اس نے بیٹھے لہجے میں کہا۔

”ہاں..... سندر..... سندر۔“ میں جلدی سے بولا۔ مجھے اپنا وہ نام یاد آ گیا جو ان لوگوں نے مجھے دیا تھا۔

”کیا سندر..... سندر۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”شیام سندر.....“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا نام ہے۔“

”ہاں۔“

”چلو چھٹی ہوئی..... تمہارا نام پتہ چل گیا۔ میرا نام سنایہ ہے۔ یاد رہے گا میرا نام۔“

”ہاں۔“

”وہ دو چٹائیں دیکھ رہے ہو۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور میں نے اس طرف دیکھا۔ ”رات کو چوتھی چندرما نکلے گا۔ میں وہاں آ جاؤں گی مجھے تم سے کام ہے۔ میں چلتی ہوں مگر تم رات کو وہاں ضرور آ جانا بھولنا مت۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت پھر میرے ذہن میں کچھ انگلیاں ریگننے لگی تھی۔ مجھے کچھ یاد آ رہا تھا۔ کچھ..... نہ جانے کیا۔

مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں۔ وہی چلتے پھرتے انسان اپنے روزمرہ کے کاموں میں معروف۔ میرے بدن پر چونکہ سادھو کا لباس تھا اس لئے لوگ میری عزت کر رہے تھے۔ کھانے پینے کے لئے بھی انہوں نے ہی مجھے دیا تھا۔ دن کی باتیں مجھے یاد نہیں رہی تھیں لیکن نہ جانے کہاں سے گھومتا پھرتا البتہ شام کو مجھے وہ دونوں چٹائیں نظر آ گئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی سنایہ بھی یاد آ گئی۔ میرے قدم اس طرف اٹھ گئے اور کچھ دیر کے بعد میں ان چٹانوں کے پاس پہنچ گیا۔

چٹانوں کے درمیان وقت گزرنے لگا۔ پھر چاند نکل آیا۔ اور میں نے دور سے اسے آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بڑا خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ بالوں میں پھول لگائے ہوئے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر وہ مسکرائی۔

”مجھے پہچان گئے۔“

”ہاں۔“

”کیا نام ہے میرا؟“

”سنایہ.....“ میں نے کہا۔

”ارے واہ۔ اس کا مطلب ہے میں تمہیں اچھی لگی جب کوئی کسی کو اچھا لگتا ہے تب ہی وہ یاد رہتا ہے۔ جیسے مجھے

تمہارا نام یاد ہے شیام سندر۔“

”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے کام ہے۔“

”ہاں۔“

”بتاؤ..... کیا کام ہے۔“

”اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو۔ ابھی تو چند زمانے کھ دکھایا ہے چاندنی دھرتی پر اتاری ہے پھول مہک رہے ہیں جھرنے سونا اگل رہے ہیں۔ ہواؤں کو کچھ اور ٹھنڈا ہونے دو یہ ہمیں آوازیں دیں گی ہم سے کہیں گی۔“ ”آؤں جاؤں ہم سوگند اور سمن کی طرح۔ ایک ہو جائیں چلو چاند اور سمن کی طرح۔“ اس کی آواز خوابناک ہو گئی اور میں اسے پریشانی سے دیکھنے لگا۔

”سنایہ۔“

”ہوں۔“

”تم کون ہو؟“

”بدھو ہونرے۔ بدھو کے بدھو۔ سنو بتاتی ہوں۔ میرے پتا کا نام الاگا ہے۔“

”ہوں۔“

”بھائی کا نام سلوگا۔“

”اچھا..... پھر۔؟“

”اور وہ جس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں اس کا نام پوگا س ہے۔ میڑھے منہ اور چند ہی آنکھوں والا پوگا س۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر سب مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ تب مہمانی بے کال نے میرے سینے میں آکر مجھے میری مشکل کا اپنا بتایا۔“

”مہمانی بے کال تو تم کیسے جانتی ہو؟“

”بس وہ میرے سینے میں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں گیان گردھار بن جاؤں تو میری مشکل حل ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے گیان گردھاروں کے بارے میں بتانے لگے اور میں تیار ہو گئی۔ تم سامنے آئے تو مجھے پتہ چل گیا کہ تم گیان گردھاری ہو۔“

”کیسے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے کپڑوں سے گلے سے مجھے بھی بتایا گیا تھا۔“

”وہ اپنا کیا ہے۔“ میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”تم مجھے اپنے شریر میں سو بیکار کرلو۔ ہمارے ہاں نرن گیت مندر ہے جہاں نرن گیت کا بت رکھا ہوا ہے۔ جب کسی کی شادی طے ہوتی ہے تو لڑکی کو نرن گیت کے چروں میں جا کر سو گند کھانی پڑتی ہے کہ وہ کنواری ہے۔ اگر وہ کنواری ہوتی ہے تو نرن گیت مہاراج شانت رہتے ہیں اور اگر وہ کنواری نہیں ہوتی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے سرخ ہو جانے سے سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے سو میں پوگا س سے شادی سے بچنا چاہتی ہوں۔“

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب اس کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں خود نرن گیت بن گیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ عجیب پینکشن تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں لیکن میرے دل میں ایک کراہیت سی ابھری تھی۔ اس سے یہ پوچھنے کو دل نہیں چاہا کہ جب نرن گیت یہ بتا دیتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے تو پھر کنیا پر کیا بنتی ہے۔ اس کے اہل خاندان اس کے قبیلے والے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے سانس بوجھل ہوئے جا رہے تھے۔ جب یہ خاموشی طویل ہو گئی تو اس کی لرزتی آواز ابھری۔

”سندر جی۔“

ابھی میں اسے کوئی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ آبادی کی طرف سے کچھ شورا بھرا۔ پھر بہت سی مشعلیں نظر آئیں۔ جو اسی طرف دوڑ رہی تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہائے دیا..... کسی کو پتہ چل گیا۔ میں نے حمیادی سوریا کو بتا دیا تھا اس نے کسی کے کانوں میں نہ خبر پھونک دی ہو۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

وہ جاتی جہنم میں اور سوریا جاتی چو لہے میں۔ میرے ساتھ جو ہونے والا تھا اس کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ مشعلوں کی روشنی کے سائے میں میں نے بہت سے لٹھ بردار پھرے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تھا جو غاہر ہے

میرے لئے مٹائی لے کر نہیں آ رہے ہوں گے۔ اب اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ وہیں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا۔ میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور بھاگتا چلا گیا اس بے چاری مصیبت کی ماری نے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا لیکن میں اب رکے بغیر دوڑ رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہے۔

میری رفتار بہت تیز تھی اور میں کسی گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ پھر میرے کانوں نے ایک مسلسل دھاڑ سنی۔ یہ پانی کی آواز تھی۔ سمندر..... میرے ذہن میں ایک نام گونجا۔ ہاں سمندر۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور پھر مجھے اپنے سامنے سفید جھاگ اڑاتی ہوئی لہریں نظر آئیں۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد میں ان کے قریب تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا نکل جاؤ۔ جیسے بھی بن پڑے وہاں سے نکل جاؤ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مجھے اسے پر اسرار طلسم سے توجہات مل جائے گی۔

میں سمندر میں کود گیا۔ شاید میں تیرنا جانتا تھا۔ طوفانی لہروں کو چیرتا ہوا میں اور آگے نکلتا چلا گیا۔ ایک انوکھا سفر جس نے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ نہ جانے میں کیوں تیر رہا تھا۔ نہ جانے میں کیوں آگے بڑھ رہا تھا۔ سمندر کوئی مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بگولے بے حد بردبار تھے جیسے اس نے مجھے مہمان کی حیثیت سے قبول کر لیا ہو۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں سمندر میں آگے بڑھنے کے لئے کوئی جدوجہد کر رہا ہوں کہ نہیں لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا بدن متحرک ہے ہوا میں مجھے آگے دھکیل رہی تھیں حیرت کی بات تھی کہ میں ڈوبا نہیں تھا۔

پھر میں سو گیا۔ پانی کا بستر سورج کی روشنی اور پھر جاگنے کا احساس زندگی نے میری حفاظت کی تھی۔ میں اس وقت پانی میں نہیں تھا بلکہ بھورے رنگ کی ریت میرے لئے نرم بستر بنی ہوئی تھی۔ آسمان پر پرندے اڑ رہے تھے اور ماحول بڑا سہانا لگ رہا تھا میں دیر تک اسی طرح لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوئی جزیرہ تھا۔ ساحل سے دور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے پتہ نہیں یہاں آبادی تھی یا نہیں۔ کالہوں کی طرح لیٹا رہا۔ مجھے بس وہ لمحات یاد تھے جب میں نے خود کو ان شیطان زادوں کے چنگل میں پایا تھا اور وہ مجھے اپنے پیر و کاروں میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ شیطانی عمل قبول نہیں تھا۔ اس کے بعد سے اب تک کی صورتحال مجھے یاد تھی۔ آخری عمل اس لڑکی کا تھا۔ پتہ نہیں اس کے قبیلے والوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہو۔

اب یہاں پڑے رہنا بے کار تھا۔ لباس بھی بری طرح گندا ہو رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کچھ لمبے خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں اٹھ کر ان درختوں کی طرف چل پڑا۔ جو دور نظر آ رہے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ ایسے پھل مل جائیں جو کھانے پینے میں کارآمد ہوں۔ میں انہی کی تلاش میں تھا آخر کار ان درختوں کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔ یہ غلط نہیں تھی خوشبو آ رہی تھی اور یہ گوشت پھنے کی خوشبو تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ درختوں ہی کے درمیان یہاں سے خاصے فاصلے پر دھوئیں کا غبار اٹھ رہا تھا۔ ہاں گوشت پھنے کی خوشبو بھی ادھر سے ہی آ رہی تھی۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کا مطلب ہے وہاں کوئی ہے۔ ضرور وہاں کوئی ہے۔ میرے قدم تیزی سے اس طرف چل پڑے۔



”یہ تو جان۔“ بوڑھا بولا۔

”تو اب میں اس کا کیا کروں؟“

”اچار ڈال کر منکے میں رکھ دے۔“ بوڑھے نے کسی قدر غصے میں کہا اور لڑکی ہنس پڑی پھر بولی۔

”ہائے دیا اتنا بڑا منکا میں کہاں سے لاؤں گی۔ چل رے کوشش کرتی ہوں کہ کوئی بڑا سا منکا مل جائے تو تجھے اس

میں ٹھوس دوں۔“ اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

میں جب تک کرکھڑا رہا تو اس نے بے تکلفی سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”اب چل بھی یا تجھے دھکیلنے کے لئے انجن منگواؤں۔“ آخر کار میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ درختوں کے پیچھے ایک کافی بڑی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ جس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ احاطے کے آگے لکڑی کا گیٹ بنا ہوا تھا وہ مجھے اندر لے گئی۔

”ہاں رے بھوکے۔ اب بول کیا کھائے گا؟ ارے ہاں اپنا نام تو بتا۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا نہیں معلوم؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”نام۔“

”تجھے اپنا نام نہیں معلوم؟“

”ہاں..... یہ لوگ مجھے شام سندر کہتے ہیں لیکن میرا دل اس نام کو نہیں مانتا؟“

”عجیب بات ہے۔ دیے تیرا نام شام سندر نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ خالی سندر ہونا چاہئے کیونکہ تو بڑا سندر ہے۔ میں تیرے لئے کھانے کو لے آؤں۔“ یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل گئی اور کچھ دیر کے بعد ایک پیالے میں دودھ اور بہت سے پھل لے آئی۔

میں نے انتظار نہیں کیا۔ جب تک میں کھاتا رہا وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر میں حکم سیر ہو گیا۔ تو اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ کنیا پڑی ہے جا کر سو جائیںد بھر جائے تو جاگ جانا“ تجھ سے پھر باتیں کروں گی۔“

”سو جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”تو اور کیا۔ اب کیا میں تیرا سر گود میں رکھ کر تجھے سلاؤں۔“ اس نے کہا اور پھر ہنس پڑی۔ میں خاموشی سے پلنگ کی طرف چل پڑا۔ وہ بھی جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر میں تھوڑی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر سو گیا۔

جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب کیا کروں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسی وقت مجھے ایک سایہ سا نظر آیا اور بس ادھر دیکھنے لگا۔ بوڑھا سادھو تھا لیکن جس انداز میں وہ چل رہا تھا اس میں کہیں بڑھاپا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ پھر وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔

”آؤ.....“ اس نے کہا اور ایک طرف مڑ گیا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑا فاصلہ طے کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں پتھروں کی سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ”میرا نام گیان چندر ہے۔ لوگ مجھے گیانی کے نام سے پکارتے ہیں۔“

”جی مہاراج!“

”لکشی کہتی ہے اس نے تمہارا نام سندر رکھ دیا ہے۔“

”جی۔“

دھومیں کا غبار آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میں اسی کی سیدھ میں سفر کر رہا تھا اور گوشت بھنے کی خوشبو میری رہنمائی کر رہی تھی۔ پھر مجھے وہ آگ نظر آ گئی جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بہت سی لکڑیاں ایک دوسرے پر جتی ہوئی تھیں لیکن ان پر گوشت کہیں نہیں نظر آ رہا تھا۔ ہاں ان لکڑیوں کے پیچھے ایک تنگ دھڑنگ چٹا دھاری سادھو در نظر آ رہا تھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے پاس ایک بڑے سے مٹی کے برتن میں ایک برادہ سا رکھا ہوا تھا جس میں سے وہ مٹھی بھر بھر کر برادہ جلتی لکڑیوں پر ڈالتا اور گوشت بھنے جیسی جڑاندھی برادے کے دھومیں سے اٹھ رہی تھی۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اگر کوئی گوشت بھون رہا ہے تو اس کا تھوڑا بہت حصہ مجھے بھی مل جائے گا، لیکن۔

اسی وقت سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ انگارہ آنکھیں وہ کچھ لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”کون ہے تو؟“

”داس ہوں مہاراج، منٹس ہوں۔“ میری آواز نکلی۔ یہ الفاظ میرے دل سے نہیں زبان سے نکلے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا تھا۔

”منٹس کا کوئی نام بھی ہوتا ہے؟“

”نام..... نام..... میں نے اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کی لیکن صحیح نام یاد نہیں آ سکا“ ہاں ایک نام میرے ذہن میں آیا۔ ”شیام سندر شیام سندر۔“ میں نے یہی نام دہرایا۔

میرے الفاظ پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔ ”شیام سندر مگر میرا گیان کہتا ہے تمہارا یہ نام نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہے؟“ میں نے کسی قدر غصے سے جھلائی ہوئی آواز میں کہا کیونکہ میرا دل بھی اس نام کو نہیں مانتا تھا۔ لیکن مجھے یاد کیوں نہیں آتا کہ میرا اصل نام کیا ہے؟“

”یہ تو سے بتائے گا۔“ بوڑھے سادھو نے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”بھوکے ہو؟“

”ہاں.....“ میں نے بے مکان سے کہا۔

”لکشی۔ اری او لکشی.....“ بوڑھے کی آواز کے جواب میں درختوں کے پیچھے سے پائل کی چمن چمن سنائی دی اور پھر ایک اپسرا سامنے آ گئی۔ دیہاتی طرز کے کپڑے پہنے چاندی کے زیور چھنکاتی وہ سامنے آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بھی چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”ارے یہ کون ہے؟“

”بھوکا۔“ بوڑھے سادھو نے کہا۔

”سدا کا بھوکا۔“ لکشی نے کہا۔

”یہی نام اچھا ہے۔“  
”تمہیں اعتراض تو نہیں ہے؟“  
”نہیں۔“

”سندر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“  
”ضرور گیانی جی!“

”تم خود کو بھول گئے ہو اور بھٹکتے پھر رہے ہو لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے سارا سنسار خود کو بھول گیا ہے اور بھٹکتا پھر رہا ہے۔ رشتے ناطے اپنے کہاں رہ گئے ہیں۔ صرف ایک نام ہے جسے اب نبھایا بھی نہیں جاتا۔ کوئی کسی کا نہیں ہے۔ سب اپنے لئے جی رہے ہیں۔ اس لئے سندر منٹ کو سنسار سے سمجھوتا کرنا چاہئے، جتنا بھی جیون ہے اپنے لئے جیو میری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔“  
”جی گیانی جی۔“

”لیکن ایک چیز ایسی ہے جو تمہارے جیون کے لئے بہت ضروری ہے۔“

”کیا.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”شکتی، مہاشکتی طاقت، اگر تم طاقتور ہو تو سمجھ لو سنسار تمہارے چٹوں میں ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو گیانی؟“ میرے اندر ایک عجیب سا احساس ابھرا اور اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔

”ابھی ابھی مجھے تمہارے اندر سے ایک نیا انسان جھانکتا نظر آیا، لیکن تم جو کچھ بھی ہو مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ دھرتی مہان ہے۔ آکسموں کی حد سے دور ہے۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو لیکن جیون میں اگر کہیں سے سکھنا مل جائے تو اس پر غور ضرور کرنا چاہئے۔ میں نے تمہیں شکتی کے بارے میں بتایا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری اس راستے پر رہنمائی کر سکتا ہوں۔“  
”وہ کیسے؟“

”درگا بھکتی کر کے۔ درگا دیوی کے چٹوں میں سر جھکا دو اس کے آشیر باد میں آکر تمہیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔“

”یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے ساتھ رہ کر، میں منت گنگوتری درگا داس ہوں، درگا مائی نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ تم میرا جو یہ روپ دیکھ رہے ہو وہ اصل نہیں ہے۔“

”اصلی نہیں ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میرے بہت سے روپ دیکھو گے تم۔ یہ میری گیانی شکستی ہے۔ اب آخری بات بتا دو، لیکن خوب سوچ سمجھ کر۔“

”بولو۔“

”شکتی حاصل کرو گے؟“

میں نے کچھ دیر سوچا۔ کانوں میں ایک باریک سی آواز آرہی تھی۔ یہ آواز کہیں باہر سے نہیں آرہی تھی۔ بس اندر ہی اندر اٹھ رہی تھی۔ ”اللہ اکبر! اللہ اکبر!..... اللہ اکبر! اللہ اکبر!“  
”کس سوچ میں پڑے گئے؟“

”میں ابھی جواب نہیں دے سکتا؟“ آخر کار میں نے کہا۔  
”کیوں.....؟“

”مجھے سوچنے کا وقت دو۔“

”ہوں.....“ وہ پر خیال نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”چلو ٹھیک ہے سے تمہیں بہت کچھ سمجھا دے گا۔ چلورات بہت ہو گئی ہے۔ سو جاؤ۔ پورا گھر پڑا ہے جو جگہ اچھی لگے وہاں سو جاؤ۔ اس گہری میں تم پوری طرح سوکشت ہو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مزید کچھ کہے بغیر ایک طرف چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسری صبح بہت خوب صورت تھی۔ دن کی روشنی میں یہاں کے مناظر بے حد دلکش تھے۔ میں نے ایک جگہ سے منہ ہاتھ دھویا، پھر مجھے وہی لڑکی لکشمی نظر آئی جو اس وقت کے بعد سے اب نظر آئی تھی۔ وہ میرے لئے ناشتہ لائی تھی۔  
”ارے لکشمی تم کہیں چلی گئی تھیں؟“

”تمہیں میرا نام معلوم ہے۔“

”ہاں..... کیوں نہیں؟“

”کیسے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”اس وقت گنگوتری جی نے تمہیں تمہارے نام سے پکارا تھا۔“

”اوہ اچھا۔“

”تم اداس کیوں ہو لکشمی اس وقت تم پہلے سے بہت مختلف لگ رہی ہو۔“

”میں درگا بھون جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“

”درگا بھون، درگا دیوی کے مندر اب مجھے وہیں رہنا ہو گا۔“ لکشمی نے اداسی سے بتایا۔ مجھے نہ خوشی ہوئی، نہ افسوس۔ اس سے ایک ہی بار ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ میرے پاس آئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لباس تھا۔ ”اسے پہن لو، کچھ دیر کے بعد تمہیں گنگوتری مہاراج کے ساتھ جانا ہو گا۔“  
”کہاں.....؟“

”شہر.....“ اس نے مختصر کہا۔

”کون سے شہر، کچھ تو بتاؤ؟“

”یہ مہاراج ہی بتائیں گے۔“ اس نے کہا اور بے رخی سے چلی گئی۔ میں نے اپنا لباس دیکھا جوتے تک موجود تھے۔ لباس بے حد خوب صورت تھا لیکن لیکن دماغ میں تھوڑی سی الجھن ضرور تھی۔ ابھی تک تو یہ بھی پتہ نہیں لگا کہ میں کون سی جگہ ہوں؟ یہ صرف ایک غیر آباد علاقے کا ساحل ہے یا کوئی آبادی؟ بظاہر تو دور تک بس جنگل ہی جنگل نظر آتا ہے۔ خیر جو کچھ بھی تھا ابھی تک مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔

میں نے گردن جھٹکی اور پھر ایک طرف چل پڑا۔ لباس میرے بدن پر بالکل فٹ تھا۔ جوتے بھی مکمل میرے سائز کے تھے۔ واقعی میں خوب سچ کیا تھا۔ لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب درختوں کے دوسری طرف سے دھوئی کرتے میں گنگوتری آتا نظر آیا۔ پہلے بھی اس کا چہرہ اس کی صحت کے مطابق نہیں لگتا تھا اپنی فٹنس کے لحاظ سے وہ ایک شاندار تندرستی کا مالک نظر آتا تھا۔ بس چہرہ بوڑھوں کا تھا لیکن اس وقت وہ بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے

پسندیدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

”تم سچ مچ سندر ہو۔ بہت اچھے لگ رہے ہو۔ جانتے ہو میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں؟“

”نہیں مہاراج!“

”ایک ایسی دنیا میں جو تمہیں بہت اچھی لگے گی۔ سنسار میں عورت مرد کے لئے جینے کا راستہ ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جا رہا ہوں جہاں جیون کا سب سے بڑا سکھ ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا میرے بہت سے روپ ہیں۔“

”جی۔“

”دیکھو میرا نیا روپ۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے ایک ماسک جیسی چیز اتار دی اور ایک نیا چہرہ نمودار ہو گیا۔ اس کا رنگ تانے جیسا تھا۔ نقوش بھی اچھے تھے۔ صحت کی سرفی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ بالکل ہی جدید انسان لگ رہا تھا۔

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر میں نے کہا۔

”یہ آپ کا اصل چہرہ ہے گیانی مہاراج؟“

”نہیں؟“

”وہ اصل چہرہ تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.....“ اس نے کہا پھر تہمتہ مار کر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”سنسار میں کسی کا چہرہ اصل نہیں ہے۔ ایک ایک منٹ کے انیک روپ ہوتے ہیں۔ سامنے کچھ اندر کچھ چلو چھوڑو۔ میں کیسا لگ رہا ہوں؟“

”بہت شاندار۔“ میں نے کہا۔ اس وقت مجھے کسی انجن جیسی گھر گھر اٹھ سنائی دی اور میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ یہاں اس جھونپڑی کے آس پاس کوئی پلڈنڈی بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ قیمتی کار اچھلتی کودتی اس طرف آرہی تھی اور کچھ لمحوں کے بعد وہ ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈرائیور قسم کا آدمی نیچے اترا اور اس نے خاموشی سے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”آؤ.....!“ گنگوتری نے کہا اور کار کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے اس نے اپنے پاس ہی بیٹھایا تھا۔ کار پہلے رپورس ہوئی پھر سیدہ میں چل پڑی۔ میں حیرت سے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آج تک مجھے اس جگہ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا جہاں سمندر کی لہروں نے مجھے لا پھینکا تھا۔

کار آگے بڑھتی رہی۔ پھر وہ جنگل سے نکل کر ایک پکی سڑک پر آ گئی۔ اب اکا دکا عمارتیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھر باقاعدہ شہر شروع ہو گیا۔ اچھی خاصی عمارتیں تھیں۔ بازار تھے راستے طے ہوتے رہے۔ پھر کار ایک سڑک پر مڑ گئی اور پہلی بار گنگوتری نے مجھے مخاطب کیا۔

”سندر۔“

”جی مہاراج!“ میں نے چونک کر کہا۔

”اس جگہ کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں مہاراج!“ میں پہلے یہاں کبھی نہیں آیا۔

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ جس طرح بہت کچھ تمہارے من سے نکل گیا ہے اسی طرح یہ جگہ بھی خیر میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔“

”جی مہاراج!“

”یہ جگہ سنسار کا سب سے بڑا جنجال ہے۔“

”جنجال ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! ناگ منڈل ہے یہ۔ لیکن یہاں ناگ نہیں ناگنیں ہوتی ہیں! خوبصورت ناگنیں جن کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگ سکتا۔ یہ مکڑیوں کی طرح اپنے پریم جالوں میں پھنستی ہیں اور بس۔ منٹس سارا جیون ان جالوں میں لپٹا رہتا ہے۔ یہ حسن کی منڈی ہے مگر تمہیں ہوشیار رہنا ہے کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے جیون کی سانسیں دوبھر ہو جائیں۔“

پھر ہم دونوں ایک خوبصورت گھر میں داخل ہو گئے۔ جیسے ہی ہم نے اندر قدم رکھے کسی طرف سے دو خوب صورت لڑکیاں نمودار ہوئیں اور انہوں نے بڑی تہذیب سے ہاتھ جوڑ کر ہمیں تعظیم دی اور پھر ایک طرف اشارہ کر کے ہمارے آگے چل پڑیں۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور جھک کر کھڑی ہو گئیں۔ گنگوتری بڑی شان سے اندر داخل ہو گیا۔

دوسری طرف بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ قالینوں پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ جا بجا گاؤں تکتے لگے ہوئے تھے اور ان گاؤں کیوں سے معزز لوگ تکتے بیٹھے تھے۔ باہر سے اس ماحول کا اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایک دم میرے ذہن میں جیونیاں سی رہنے لگی تھیں۔ یہ ماحول میرے لئے اجنبی نہیں ہے میں اس ماحول کا شناسا ہوں، کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں میں نے یہ سب دیکھا ہے۔ کب؟ کہاں؟ یہ یاد نہیں تھا۔

ہال کے درمیان ایک خوب صورت لڑکی رقص کر رہی تھی۔ ساز والے ساز بجا رہے تھے۔ کچھ اور لڑکیاں بھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ایک کسی قدر عمر رسیدہ عورت بھی تھی۔ عورت کی نگاہ ہم پر پڑی تو اچانک اس نے ہاتھ اٹھایا۔ اور سارے ساز رک گئے۔ رقص کرنے والی لڑکی بھی رک گئی۔ عورت جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ دو قدم آگے بڑھی اور بڑے ادب سے بولی۔

”ارے گنگو مہاراج! اور اس طرح اچانک۔“

”کیوں بھاگ بھری کیا ہم ایسے نہیں آ سکتے؟“ گنگوتری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں مہاراج! آپ کے چروں سے دیکھ جلتے ہیں۔ میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔“

”تو پھر اپنا کام جاری رکھو۔“ گنگوتری نے کہا۔

”آپ ادھر آ جائیے۔“ بھاگ بھری نے کہا اور ہم دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ بھاگ بھری نے اشارہ کیا۔ سازندوں نے پھر سے ساز چھیڑ دیے اور رقص دوبارہ جاری ہو گیا۔ البتہ ایک بات میں نے محسوس کی تھی وہاں بیٹھی تمام لڑکیاں بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایک عجیب سی جھجک کا احساس ہو رہا تھا۔

بھاگ بھری گنگوتری سے راز و نیاز کر رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف اشارہ کر کے گنگوتری سے کہا۔

”یہ کون ہیں؟ ان سے پرستے نہیں ہوا۔“

”شیام سندر!“

”سچ مچ شیام سندر ہیں پر ان کا نام کیا ہے؟“

”سندر کہہ سکتی ہو۔“

”پر ایک بات کہیں۔“

”ہاں ضرور۔“

”بڑی بڑی مرقی ہوں گی ان پر۔“

”یہ تو معلوم نہیں۔“  
”آپ کیا جانیں؟“  
”کیوں.....؟“

”پتہ نہیں کتنے دلوں پر راج کرتے ہوں۔“ بھاگ بھری نے بھوکے نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں رقص کرنے والی لڑکی میرے قریب آئی اور دوازنو بیٹھ گئی۔ جب میں نے اسے قریب سے دیکھا۔ بہت خوبصورت تھی۔ سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، حسین مسکراہٹ۔

ادھر گنگوڑی نے بھاگ بھری کے کانوں میں کچھ کہا اور بھاگ بھری نے گردن ہلا دی۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک اور لڑکی اندر سے نکل کر آئی۔ یہ پہلی لڑکی سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ بھی میرے سامنے آ بیٹھی اور مجھے دیکھنے لگی۔ مجھے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

”سنئے۔“ دوسری لڑکی کی مترنم آواز ابھری۔

”جی.....؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”بری لگ رہی ہوں میں۔“

”جی.....؟“ میں حیرت سے بولا۔

”میں آپ کو اچھی نہیں لگی۔“

”م..... میں کیا بتاؤں۔“ میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

”بتا دیجئے ناں!.....“ وہ بڑی ادا سے بولی۔ ذہن میں ایک ہوس اٹھی، کیا میں اس کے الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ رہا؟ کیا میں اس ماحول کو نہیں سمجھ رہا؟ اتنا معصوم نہیں ہوں لیکن..... اس لیکن سے آگے دماغ بند تھا۔ ”بتا دیجئے۔“ اس نے پھر کہا اور میں سنبھل گیا۔

”آپ بہت اچھی ہیں۔“ میں نے کہا اور چور نظروں سے گنگوڑی کو دیکھا، مگر وہ ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔

”شکریہ۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”سندر۔“

”یہی ہونا بھی چاہئے۔“ وہ بولی۔

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ آپ بہت سندر ہیں۔ میرا نام نہیں پوچھیں گے؟“

”بتائیے۔“

”سوئم۔“ اس نے کہا۔ پھر بولی۔ ”آپ کچھ بہکے بہکے سے ہیں۔“

”پتہ نہیں۔“

”پہلے یہاں نہیں آئے؟“

”نہیں پہلی بار آیا ہوں۔“

”میرا مطلب ہے اس جیسی کسی دوسری جگہ۔“

”نہیں۔“

”سچ بول رہے ہیں۔“

”ہاں۔“

”آئیے کہیں اور چل کر باتیں کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ برا مان رہے ہوں گے۔“ اس نے کہا اور میں نے گنگوڑی کی طرف دیکھا اس کی اجازت کے بغیر کیسے کہیں جاسکتا تھا۔ لیکن سوئم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر اٹھانے لگی تو میں نے ایک بار پھر گنگوڑی کی طرف دیکھا۔ گنگوڑی کو شاید میری پریشانی کا احساس ہو گیا۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ جاؤ..... یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ کوئی کسی کا پابند نہیں ہے۔ آرام سے جاؤ بچی کیا کہہ رہی ہے۔ کہاں لے جا رہی ہے۔ اس کی سنو۔“ گنگوڑی نے مجھے اجازت دے دی اور سوئم مجھے لئے ہوئے اس ہال کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ دوسری لڑکی نے پھر رقص شروع کر دیا تھا۔

یہ جگہ بہت شاندار تھی۔ ہر طرف قیمتی قالین، خوبصورت پردے وہ مجھے لئے ہوئے ایک بیرونی برآمدے جیسی جگہ پہنچ گئی جسے بڑی خوب صورتی سے گملوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ان گملوں میں پھول لگے ہوئے تھے جن کی مہک چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ رکی پھر بولی۔

”آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں سندر مہاراج!“

”بس یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“ میں نے اوپری اوپری سانسیں لیتے ہوئے کہا اور وہ خوب ہنسی پھر بڑے پیار سے بولی۔

”ہائے کتنے پیارے لگ رہے ہیں آپ ایسی معصوم باتیں کرتے ہوئے۔ یہ ناچنے گانے والوں کے گھر ہیں اور یہاں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ گنگوڑی مہاراج نے آپ کو یہاں لاتے ہوئے یہ سب نہیں بتایا تھا۔“

”یہی بات ہے۔ آپ کو یہ سب اچھا لگ رہا ہے یا برا۔ آپ نے اس لڑکی کو ناچتے ہوئے دیکھا۔“

”ہاں آپ بھی رقص کرتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مورنی کو کبھی مور کے لئے ناچتے ہوئے دیکھا ہے آپ نے۔“

”کبھی نہیں۔“

”اپنے مور کے لئے ناچتی ہے وہ۔ میں بھی آپ کے لئے ناچ سکتی ہوں۔“

”اوہ مگر میں۔“ میں آگے کچھ نہ بول سکا۔

”اچھا اک بات بتائیے۔“

”ہاں پوچھیں؟“

”گنگو جی سے آپ کا کیا سبب بندھ ہے؟“

”دوست ہیں میرے۔“

”کیا یہ دوستی پرانی ہے؟“

”نہیں زیادہ پرانی نہیں۔“

”ہاں میں اس لئے یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ اس سے پہلے کبھی ان کے ساتھ نہیں آئے۔“

”وہ اکثر یہاں آتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں اکثر بڑے من موچی اور بڑے امیر ہیں۔ جب بھی آتے ہیں لاکھوں لٹا کر جاتے ہیں۔ سب لوگ ان کا



انتظار کرتے رہتے ہیں۔“

یہاں گزرنے والا وقت بے مثال تھا۔ سوئم نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ گنگوتری بھی ساری رات وہاں رکا تھا۔ دوسری صبح بھاگ بھری نے ہمیں بہترین ناشتہ کرایا تھا۔ جب ہم یہاں سے واپس چلے تو میں نے سوئم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ راستے میں گنگوتری نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ یہاں آکر گنگوتری نے اپنا روپ بدل لیا تھا۔ جھونپڑی میں اب کسی کا وجود نہیں تھا۔ رات کو کہیں جا کر گنگوتری نے مجھ سے ملاقات کی۔ ہم دونوں ایک درخت کے نیچے پڑی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ گنگوتری نے آہستہ سے کہا۔

”سندرا“

”جی مہاراج!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ گنگوتری مجھے پسند تھا۔ اس شخص کی ذات سے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی بلکہ وہ بڑے خلوص سے میری ہر ضرورت پوری کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے خوش رکھنے کا اہتمام بھی کیا تھا جس کے لئے میں اس کا شکر گزار بھی تھا۔ یہی سوال اس نے کیا۔

”ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں؟“

”جی مہاراج!“

”تم میرے ساتھ خوش ہو۔“

”ہاں آپ بہت اچھے انسان ہیں۔“

”میں تمہارا گرو بھی ہوں، لیکن غلط مت سمجھنا میں نے ابھی تک تمہیں کوئی سکھایا نہیں دی۔ پرتو میں ایک دوست ایک گرو بننا چاہتا ہوں تمہارے لئے۔“

”مجھے اعتراض نہیں ہے۔“

”اصل میں میں تمہیں ایک بڑا فکری مان دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں آپ کا احسان مانتا ہوں۔“

”اس سنسار میں جیتے جیتے تو سبھی ہیں لیکن کچھ لوگ رو رو کر جیتے ہیں اور کچھ خوش رہ کر اور خوش رہ کر جینے کے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں تمہیں پہلا سبق یہ دینا چاہتا ہوں کہ دین دھرم جو کچھ بھی ہے لیکن سنسار میں فکری ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔ تم فکری مان بنو سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تمہیں ایک بڑی عیبی کا داس بنانا چاہتا ہوں۔“

”کون سی عیبی؟“

”راس منی۔ اس کے بہت سے نام ہیں جو تمہارے سامنے بھی آ چکے ہیں۔ میا منی، درگا پنچم، مگر اس کا اصل نام راس منی ہے۔ اس کے بارے میں بس اتنا جان لو کہ وہ سنسار کی بہت بڑی فکری ہے۔ اس کا ساتھ مل جائے تو دنیا تمہارے سامنے بہت چھوٹی ہو جائے گی۔ ماضی میں تمہارے ساتھ جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ بہت کچھ ہو گا تمہارے من میں سب کو مٹا دو۔ حال کے بارے میں سوچو۔ راس منی کا داس بن کر تمہیں جو کچھ مل جائے گا اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم اس سنسار کو حیران کر دو گے اور پھر سنسار تمہارے چروں میں ہو گا۔“

”مجھے یہ کیسے کرنا ہو گا؟“ میں نے کہا۔

”میں سکھاؤں گا۔ گرو جو کہہ رہا ہوں خود کو تمہارا۔“

”ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کل رات سے ہم اپنا کام شروع کریں گے۔“

”رات سے؟“

”ہاں تم نے آکاش پر ستاروں کے کھیت دیکھے ہوں گے۔ ان ستاروں میں ہر ستارے کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ تمہیں ان سے دوستی کرنی ہوگی اور یہ قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیں گے۔ تمہیں سارے سنسار کے بارے میں بتائیں گے۔“

”کیا سمجھے؟“

”یہ تو بہت عجیب ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بہت عجیب لیکن اتنا دلچسپ کہ تمہیں اور کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“ اس نے کہا۔ میری اپنی تو کوئی قوت فیصلہ نہیں رہی تھی۔ گیانی میرا استاد بنا ہوا تھا۔ دن زیادہ تر آرام کر کے گزرتا تھا۔ ہاں ہماری رات جاگتی تھی۔ ہر رات ہم کھلے آسمان کے نیچے ہوتے اور گیانی مجھے ایک ایک ستارے کے بارے میں بتاتا۔ واقعی یہ انوکھا کھیل تھا۔

ایک رات گیانی نے اپنے بارے میں بتایا۔ ”راس منی بہت بڑی فکری ہے۔ میں نے بھی بڑے روپ اپنائے ہیں کہ نہ جانے کبھی کیسی منزلوں سے گزرا ہوں پھر میں نے راس منی کے چروں میں جگہ پائی۔ میرے انیک روپ میں ابھی تم نے میرے بس دو روپ دیکھے ہیں۔“

”دو روپ؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں ایک یہ دوسرا وہ جب ہم بھاگ بھری کے پاس گئے تھے۔“

”آپ کے اور بھی روپ ہیں؟“

”بہت سے۔“

”مگر مجھے کیسے معلوم ہو گا؟“ میں نے کہا۔

”کیا.....؟“

”میں آپ کو کسی اور روپ میں کیسے پہچانوں گا؟“

”پہچان لو گے۔ پہلے ستاروں کو پہچان لو۔“ اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا لیکن پھر ایک دن اس نے وہی روپ دوبارہ بدل لیا جس میں ایک دن وہ مجھے شہر لے گیا تھا۔ اس کی ساری باتیں پراسرار تھیں۔ کون کون لوگ اس سے منسلک تھے یہ میں آج تک نہیں جان سکا تھا۔ وہ کار کہاں سے آتی تھی؟ وہ ڈرائیور کون تھا؟ میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ لطف آ رہا تھا۔

کافی دن کے بعد ہم شہر آئے تھے۔ گیانی گنگوتری مجھے لے کر ایک ہوٹل میں جا پہنچا۔ اس نے کہا۔ ”وہ لڑکی جس کے ساتھ تم نے رات بتائی تھی کیسی تھی؟“

”سوئم؟“ میں نے سوال کیا۔

”آہا تمہیں اس کا نام یاد ہے۔“

”ہاں۔“

”کیسی تھی وہ؟“

”جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں؟“

”اس کے بعد تمہیں یاد نہیں آئی؟“

”بہت یاد آئی۔“

”تم نے بھی اس کے پاس دوبارہ جانے کی خواہش نہیں کی۔“

”اس کی وجہ تھی۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیا؟“ وہ دلچسپی سے بولا۔

”میں نے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا گیانی مہاراج! میں نے کہا تھا جو کچھ کروں گا آپ کی مرضی سے کروں گا۔

آپ اگر مجھے وہاں لے جانا پسند کرتے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ نہیں۔“

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری بات سے بہت خوش ہوا ہے۔ کافی دیر تک وہ خاموش رہا، پھر اچانک بولا۔

”اس منٹ کو دیکھ رہے ہو؟“

”کون.....؟“

”وہ جو بائیں سمت میز پر بیٹھا ہے اسے غور سے دیکھو۔“ میں نے اس کی ہدایت پر اسے دیکھا۔ اچھی حیثیت کا

آدمی معلوم ہوتا تھا۔ شاندار سوٹ میں لباس تھا۔ ہاتھوں میں ہیروں کی بیش قیمت انگلیاں پہنی ہوئی تھیں۔ میں نے

گردن ہلائی پھر بولا۔

”ہاں دیکھ لیا۔“

”اپنے دوستوں کا امتحان لو۔“

”کون سے دوستوں کا؟“ میں حیرت سے بولا۔

”ستاروں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے بھاگوں کے ستارے اس کے ماتھے پر چمک رہے ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر

اس کے بارے میں بتاؤ اور اسے حیران کرو تمہیں مزا آئے گا۔“ مجھے عمل دلچسپ لگا اور میں نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ

کر لیا۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس شخص کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔

”آپ کا تھوڑا سا وقت لینا چاہتا ہوں جناب!“ میں نے بڑی تہذیب سے کہا اور اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

چہرے کی بناوٹ سے مغرور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بھیک مانگنے کا جدید طریقہ استعمال کر رہے ہو، کہو کیا چاہئے؟“

”میں بھیک مانگنے نہیں بھیک دینے آیا ہوں۔ بس دور سے آپ کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ آپ جیسے لوگ بھی کمال

کرتے ہیں۔ ایسے ایسے روپ بنا لیتے ہیں کہ یقین نہ آئے۔“ میں نے کہا اور اس شخص کا چہرہ بگڑ گیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟“ وہ غرا کر بولا۔

”جانتا ہوں تمہی تو آپ کے پاس آیا ہوں لیکن افسوس آپ نے ابھی تک مجھے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔“

”تم بہت بڑے فراڈ معلوم ہوتے ہو ضرورت سے زیادہ چالاک۔“

”نہیں جناب! یہ اعزاز آپ کو حاصل ہے مجھے نہیں۔ آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ آپ کی تو پانچوں انگلیوں سے

خون ٹپک رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے۔“ میں نے کہا اور اس پر خاطر خواہ رد عمل ہوا۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو

دیکھا پھر بولا۔

”کک کیا بکواس کر رہے ہو؟“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ میں کرسی مٹھٹ کر بیٹھ گیا اور میں نے کہا۔

”ان پانچ انسانوں کا خون جنہیں آپ نے قتل کیا ہے۔“

اس کا بدن بری طرح لرز اٹھا، پھر اس نے کہا۔ ”تم یہاں سے اٹھتے ہو یا میں اپنا پستول تم پر خالی کر دوں۔“

جواب میں میں ہنس پڑا۔

”پستول آپ کے پاس ہے کہاں؟ اس وقت تو آپ ایک شریف آدمی بنے ہوئے ہیں۔ ویسے آپ کے ہاتھوں کی

لکیروں میں صرف پانچ قتل ہیں چھٹا نہیں۔ اس لئے میں محفوظ ہوں۔“

”تم آخر ہو کون؟“ وہ کافی مضبوط اعصاب کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بڑی جیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پھر

وہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”جاسوس سی آئی ڈی؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا مصیبت ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”ایک شوقیہ فنکار۔“

”بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔“

”تھوکتا ہوں اس لفظ پر۔ بس دل چاہا آپ کو آپ کے بارے میں بتاؤں۔“

”چلو بتاؤ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ واقعی بے حد مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔

”پہلا قتل آپ نے بارہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ وہ آپ کا ہم عمر لڑکا تھا۔ آپ کا دوست تھا۔ آپ اسے قتل کر کے

اپنے گاؤں بھاگ آئے اور آٹھ سال تک بھٹکتے رہے۔ بیس سال کی عمر میں آپ کے ماں باپ دوبارہ آپ سے ملے غلط تو

نہیں کہا میں نے۔“

اس کی مسکراہٹ پھر کافور ہو گئی۔ وہ پچھٹی پچھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر دردنگی ابھر آئی

اور وہ بولا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ تم میرے ہاتھوں سے بچ سکو گے؟“

”چھٹا قتل ہی نہیں تمہارے ہاتھوں میں ستارے یہی بتاتے ہیں۔“

”ستارے۔“

”ہاں میں صرف ایک فنکار ہوں۔ نہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ نہ میں کوئی بلیک میلر ہوں۔ میں ایک ستارہ شناس

ہوں جو اپنے علم سے سب کچھ بتا دیتا ہے۔“

”تم کوئی جوکر معلوم ہوتے ہو اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بکواس ہے۔ میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔“ اس نے

بیجانی لہجے میں کہا۔

”دوسرا قتل آپ نے بائیس سال کی عمر میں کیا۔ یہ قتل آپ نے اپنے ایک رقیب کا کیا تھا اور وہ ایک لڑکی کے سلسلے

میں کیا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد آپ نے تیسرا قتل کیا یہ دولت کے حصول کے لئے تھا۔ باقی دو قتل بھی آپ

نے دولت کے لئے کیے اور اب شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔“

”میں سچ سچ تمہیں قتل کر دوں گا۔ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ وہ زنج ہو گیا۔

”نہیں جناب! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چھٹا قتل آپ کبھی نہیں کریں گے۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے

اٹھنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے بولا۔

”ارے بیٹھو بیٹھو کہاں چلے۔ تمہارے آنے کا مقصد ہی میں نہیں سمجھا۔ کیا تم مجھے صرف یہ بتانے آئے تھے کہ میں

پانچ افراد کا قاتل ہوں۔“

”جی بس میرا اتنا ہی کام تھا۔“ میں نے کہا۔ حقیقتاً مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ گنگوتری نے مجھے یہاں کیوں بھیجا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کیا چاہتا تھا لیکن اس نے کہا۔

”تمہیں میرا نام معلوم ہے؟“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تم جیسے باکمال شخص سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ میرا نام جیکسن ہے اور میں ریس کورس کا بادشاہ کہلاتا ہوں۔ میرے پاس بیس گھوڑے ہیں اور لوگ میرے پاس اپنی تقدیر بنانے آتے ہیں۔ میرا خیال تھا تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔“

”نہیں مجھے اپنی تقدیر خود بنانا آتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ پیو میرے ساتھ۔“

”نہیں شکریہ۔“

”اچھا میرا یہ کارڈ رکھ لو۔ اگر کبھی میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور مل لیتا۔“ اس نے جیب سے اپنا خوبصورت کارڈ نکال کر مجھے دیا اور میں اسے جیب میں رکھ کر واپس گیا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ کہنے لگا۔

”تمہارے اندر ایک بڑی خوبی ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جو کام تمہیں دیا جاتا ہے اسے بڑی خوبی سے کرتے ہو۔ میں دیکھ رہا تھا تم نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ تم نہیں جانتے وہ کتنے کام کا آدمی ہے۔ ہم اس کے ذریعے بے شمار لوگوں کو غلط راستوں پر ڈال سکتے ہیں۔“

”غلط راستوں پر؟“ میں نے چونک کر کہا اور مجھے یوں لگا جیسے گنگوتری کو اپنی کسی غلطی کا احساس ہوا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔

گنگوتری میرے لئے کوئی برا انسان نہیں تھا۔ وہ اندر سے کیا تھا میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی مجھے جاننے کی خواہش تھی۔ زندگی کو کیا چاہیے ہوتا ہے۔ کبھی کوئی انسان خود اس بارے میں فیصلہ نہیں کر پاتا۔ ہمارے گھر ہوتے ہیں رشتے ہوتے ہیں ان رشتوں کے لئے جذبات ہوتے ہیں اور ہم ان کے پیار میں ڈوبے زندگی گزار دیتے ہیں اور بس۔

گنگوتری کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اصل میں کیا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس دوران ہمارے درمیان کسی نئے کردار کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ایک دن میں نے گنگوتری سے کہا۔

”ایک سوال کرنا چاہتا ہوں مہاراج!“

”ہاں پوچھو۔“

”میں کون ہوں؟“

میرے اس سوال پر وہ چونکا۔ پھر مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

”جو کوئی بھی ہو۔ یہ بتاؤ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو؟“

”نہیں.....“ میں نے کہا اور اس کی آنکھوں میں حنین کے آثار پیدا ہو گئے۔

”یہ بہت بڑی خوبی ہے تمہارے اندر۔“

”کیا.....؟“

”جودل میں ہوتا ہے بے دھڑک بول دیتے ہو۔ اچھا خیر یہ بتاؤ میرے پاس تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“

”تکلیف نہیں الجھن ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ نے مجھے جیون کا ہر سکھ دے دیا ہے۔ قیمتی لباس، قیمتی کھانا، زندگی کے اور بہت سے لوازمات لیکن آپ کے ہر عمل کا اختتام ایک نفسی چھوڑ جاتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”بھاگ بھری اس کے پاس موجود وہ لڑکی جس کے ساتھ میں نے رات گزار دی تھی۔ جیکسن جس کے پاس مجھے بھیج کر آپ نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے لیکن آپ نے دوبارہ ان سے ملنے کے لئے کبھی نہیں کہا۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ ”ٹھیک کہتے ہو لیکن میں نے تمہیں دوسرا علم دیا ہے۔ تم دوسروں کے بارے میں جان لیتے ہو۔“

”دوسروں کے بارے میں۔“

”ہاں جیسے جیکسن کے بارے میں۔“

”بالکل۔“

”کیسے جان لیتے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”ستاروں کی چال سے۔“ میں نے پھٹ سے کہا۔

”تو کیا پورے آکاش میں تمہیں اپنا کوئی ستارہ کبھی نظر نہیں آیا۔“ اس نے کہا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ کتنی سادہ سی بات کہہ دی تھی اس نے۔ میں دوسروں کے بارے میں معلومات کر کے انہیں حیران کر سکتا تھا اپنے بارے میں نہیں جان سکتا تھا۔

پھر دوسرے دن سے میں نے اپنی تلاش شروع کر دی۔ میری پوری پوری راتیں اس تلاش میں گزرنے لگیں لیکن میں خود کو نہ ملا۔ ستارے تو میرا ساتھ نہیں دے سکے لیکن اپنی ذات کے کچھ مٹے مٹے سے نقوش میرے ذہن میں ابھرنے لگے۔ کچھ گھر، کچھ لوگ، کچھ واقعات، مگر ان کی کوئی وضاحت نہیں ہو سکی وہ کون تھے؟ کہاں تھے؟ میرا ان سے کیا واسطہ تھا؟

پھر ایک دن گنگوتری نے کہا۔

”اور وہ ایک مشکل کام ہے۔“

میں چونک گیا۔ میں نے تعجب سے کہا۔

”کیا؟“

”جو تم کر رہے ہو یعنی اپنی تلاش۔“

”وہ مشکل کیوں ہے؟“ میں نے کسی قدر کراخت لہجے میں کہا۔

”اس لئے کہ اس مٹی نہیں چاہتے کہ ابھی تم اپنے آپ میں واپس آؤ۔“ گنگوتری کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔

”گو یا مجھے ایک کھلو بنا کر رکھا گیا ہے۔“

”مگر تمہارے ساتھ کوئی سختی ہوئی ہے۔ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کے بارے میں بتاؤ، ورنہ تم سے کچھ کام لینے ہیں اور بس پھر تم جو من چاہے کرنا۔“

میں خاموش ہو گیا۔ تنہائی میں میں نے سوچا کہ واقعی مجھے اس سے تعاون کرنا چاہئے۔ میں نے خاموشی اختیار کر

لی۔ کافی دن گزر گئے پھر ایک دن اس نے کہا۔ ”شیام سندر ہمیں کچھ وقت کے لئے یہاں سے چلنا ہے۔“

”کہاں؟“

”اس بارے میں تمہیں بتا دیا جائے گا لیکن ابھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم چاہو۔“

”ایک بہت اہم سوال کرنا چاہتا ہوں تم سے۔“

”جی مہاراج!“

”کام کچھ ایسا ہو جو تمہیں اچھا نہ لگے لیکن میرے لئے ضروری ہو، تم اسے صرف میرے لئے انجام دے لو گے۔ کیا میں تمہاری نگاہ میں اتنی عزت رکھتا ہوں۔“

”آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ گنگوتری مہاراج! میں چاہوں تو بھی تمہارے حکم کے خلاف نہیں جا سکتا۔ مگر ایسے کسی کام کے لئے میرے دماغ میں جس بہت پیدا ہو چکا ہے۔ تاہم میں تیار ہوں۔“ میرے ان الفاظ پر وہ خوش ہو گیا تھا۔

بات ختم ہو گئی، مجھے اس بارے میں تجسس ضرور تھا لیکن میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ البتہ گیانی کافی مصروف رہا تھا۔ اپنی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد آخر کار اس نے کہا۔ ”شیام سندر! تمہیں راجہ پور جانا ہے۔ ایک خوبصورت آبادی ہے وہاں تم جس حیثیت سے جانے والے ہو اس میں تمہاری خوب آؤ بھگت ہوگی۔“

”کب؟“ میں نے سوال کیا۔

”کل تمہاری رواجی ہے۔“

”آپ میرے ساتھ ہوں گے۔“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور میں چونک پڑا۔ وہ مسکرانے لگا پھر بولا۔ ”لیکن بے فکر رہنا میں تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔ پرنتو تمہیں خود پر بھی بھروسہ کرنا ہو گا اور کسی اڑی بھڑی پر اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنا ہو گا۔“ میں خاموش ہو گیا۔

پھر دوسرے دن تقریباً رات کو نو بجے میں ایک وین سے راجہ نگر کے لئے چل پڑا۔ میرے لئے سیٹ بک کرادی گئی تھی۔ ٹرین کے مسافر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سفر جاری رہا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ گنگوتری نے مجھے ایک غریب آدمی کا روپ دیا تھا۔ مجھے راجہ نگر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ اس وقت اجالا پھوٹ رہا تھا جب ٹرین راجہ نگر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی اور میں اپنے مختصر سے سامان کا تھملا اٹھائے نیچے اتر گیا۔

ماحول سویا سویا تھا۔ میں نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ کچھ دوسرے مسافر بھی نیچے اتر رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے پاس کچھ لوگ کسی عمر رسیدہ شخص کو نیچے اتار رہے تھے۔ دفعتاً کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک چپتی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی۔

”طاہر.....!“

میں نے چونک کر پیچھے گردن گھمائی۔ ایک پروقاری عمر رسیدہ عورت تھی۔ اس نے مضبوطی سے میرا کندھا پکڑ لیا۔ میں صرف تمہارے لئے اسٹیشن آئی تھی۔

”آپ آپ کون ہیں؟“ میں نے کسی قدر پریشانی سے پوچھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔ میں نے بتایا تھا کہ میں صرف تمہارے لئے اسٹیشن آئی تھی۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

گنگوتری نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر مجھ سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ راجہ نگر میں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اس لئے میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور عورت کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی جو کمپارٹمنٹ سے ایک عمر رسیدہ شخص کو نیچے اتار رہے تھے۔ دہلے پتلے بدن کے مالک اس شخص کی عمر 80 سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا چہرہ بڑا پر نور نظر آ رہا تھا۔ عورت نے سرگوشی میں کہا۔

”یہی بابا گل نیاز ہیں۔“

”کون؟“ میں نے چونک کر کہا اور عورت نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”تم نہیں جانتے۔“

”سنو! میری طرف سے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو۔“

”کیوں؟“ وہ بولی۔

”تم نے مجھے ظاہر کر کے پکارا ہے۔“

”اوہ خاموش ہو جاؤ، تمہیں بتا دوں گی۔ چلو خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑو۔ وہ اسٹیشن سے باہر نکل رہے ہیں۔“ عورت نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ بڑا پراسرار انداز تھا۔ میری وہی کیفیت تھی۔ گنگوتری نے مجھے کوئی تفصیل تو بتائی نہیں تھی۔ چنانچہ جو ہو رہا تھا اور جیسے ہو رہا ہے اسے جاری رہنے دیا جائے۔ چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کئی قیمتی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بابا گل نیاز کو ایک شاندار گاڑی میں بیٹھایا گیا اور دوسرے لوگ دوسری گاڑیوں میں بیٹھنے لگے۔

عورت میرے پاس آئی اور بولی۔

”تمہارا نام طاہر ہے اور تم بستی مددگرمی سے یہاں آئے ہو۔“

”جی کیوں آیا ہوں؟“

”نوکری کرنے، تمہیں نوکری مل گئی ہے۔“

”کس نے دلائی ہے؟“

”میں نے، میرا نام سعیدہ باجی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی اور خود دوسری گاڑی میں بیٹھ گئی۔

بہت بڑے لوگ معلوم ہوتے تھے اور یہ بابا گل نیاز ان کے لئے بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس گھر کے سب سے بڑے بزرگ ہوں۔ کئی ملازم بھی ساتھ آئے تھے جو ایک بڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں بھی اسی گاڑی میں چڑھ گیا تھا۔ شعبان نامی ایک ملازم نے میری طرف توجہ دی۔

”تم مددگرمی سے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سعیدہ باجی کے بندے ہو۔“

”ہاں۔“

”میرا نام شعبان ہے۔ سب مجھے شابو کہتے ہیں، میں تمہارا بندہ و بست کردوں گا۔“

”جی شابو بھائی۔“ مجھے اطمینان ہوا۔

گاڑیاں ایک حویلی میں داخل ہو گئیں۔ بس حویلی کی مکمل تھا پورا۔ دنیا میں انسانوں کے پاس نہ جانے کیا کیا ہے۔

دینے والے کی دین ہے۔ انسان اس بارے میں کیا جانے۔ سب لوگ حویلی میں اتر گئے تو سعیدہ باجی بھی خاص طور پر شعبان ہی کے پاس آئی تھیں۔

دوسری بات ایک اور تھی وہ یہ کہ سعیدہ باجی بھی مجھے بہت غور سے دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک ہوتی تھی۔

پھر ایک واقعہ ہو ہی گیا۔ میں کسی کام سے بابا نیاز کے کمرے میں گیا تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ بابا صاحب نماز کے لئے تیار تھے۔ ایک دم بول پڑے۔

”طاہر.....“ پہلی بار وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔

”جی بابا صاحب!“

”ادھر آؤ۔“ انہوں نے کہا اور میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے اس کرسی پر بیٹھا دو۔ آج پاؤں بالکل ساتھ نہیں دے رہے۔ بیٹھ کر نماز پڑھوں گا۔“

”جی بابا صاحب!“ میں نے کہا۔ بڑے احترام سے کرسی اٹھا کر اس جگہ رکھی جہاں بابا صاحب نے کہا تھا۔ پھر انہیں اس کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی تو وہ بولے۔

”کسی کام میں مصروف تو نہیں ہو؟“

”نہیں بابا صاحب!“

”تب ایک تکلیف کرو۔“

”فرمائیے۔“

”ایک صاف سترے گلاس میں پانی لے آؤ۔ گلاس اچھی طرح دھو لینا۔ میں نماز شروع کر رہا ہوں۔ پانی لا کر میرے پاس رکھنا سمجھ گئے۔“

”جی بابا صاحب!“ میں نے کہا اور ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ بابا صاحب کا کسی کام کے لئے کہہ دینا تو بڑی خوش قسمتی تھی۔ گھر کا ہر فرد ان کے کاموں کے لئے تیار رہتا تھا۔ میں ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے گلاس مجھ سے مانگا تو میں نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے گلاس ہاتھ میں لے لیا اس پر کچھ پڑھتے رہے پھر گلاس میری طرف بڑھا کر بولے۔

”لیو۔“

میں گھبرا گیا۔ یہ غیر متوقع تھا۔ میں نے گلاس ہاتھ میں لے لیا لیکن پانی نہیں پیا۔

”سنا نہیں تم نے اسے لیو۔“ اس بار ان کی آواز میں بادلوں جیسی گرج تھی۔ میں نے بادل خواستہ گلاس ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ”مجھے بستر پر پہنچا دو۔“

”جی۔“ میں نے کہا اور ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

”کرسی رکھ کر میرے پاس بیٹھو۔“

”میں آپ کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا۔“

”جبکہ تم جانتے ہو تم وہ نہیں ہو جس حیثیت سے یہاں ہو۔“ بابا صاحب بولے۔

”جی۔“ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے سہمی ہوئی نظروں سے بابا صاحب کو دیکھا، لیکن ان کی

آنکھیں بند تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نئے ہی جہان میں ہوں۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ انہوں نے آنکھیں بند کئے ہوئے پوچھا۔

”طاہر۔ طاہر۔“

”نہیں تم طاہر نہیں ہو تم شام سندر بھی نہیں ہو بلکہ تم ایک خوش نصیب انسان ہو۔“

میرے بدن پر لرزش طاری ہو گئی۔ بابا صاحب نے میرا دوسرا نام بھی لیا تھا لیکن ایک بات میں جانتا تھا میرا نام شام سندر بھی نہیں ہے۔

”بابا صاحب!“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں تمہارا نام گم ہو گیا ہے۔ اسے ابھی تم رہنے دو میں نے تمہیں خوش نصیب اس لئے کہا ہے کہ کہیں بھی کسی بھی جگہ تمہاری کوئی غلطی نہیں نظر آئی۔ کوئی لالچ، کوئی طلب تمہیں اس منزل تک نہیں لائی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کر رہا ہے جاؤ۔“

”بابا صاحب!“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”جاؤ۔“ بابا صاحب بولے۔ اتنی دیر میں گھر کے کچھ لوگ اندر آ گئے تھے۔ میں سر جھکائے باہر نکل آیا۔ لیکن میرے پورے بدن میں لرزشیں تھیں۔ یہ بابا صاحب تو کوئی بہت بڑی چیز تھے۔ انہوں نے شام سندر کہہ کر پکارا تھا۔

اپنے کوارٹر میں آ کر میں بے سدھ لیٹ گیا۔

آج میری کیفیت بہت خراب تھی۔ سارے بدن میں سنائے دوڑ رہے تھے۔

شام ہوئی، پھر رات ہو گئی۔ اُس وقت کوئی آٹھ بجے ہوں گے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ میں نے آواز پر قابو پا کر پوچھا۔

”سعیدہ ہوں کیا کر رہے ہو اندر؟“

میں جلدی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ ”بیار ہو گیا؟“ سعیدہ باجی نے ہمدردی سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر کیوں لیٹے ہو؟“

”آؤ جوتے پہن لو۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا اور میں نے جلدی سے جوتے پہن لئے۔ پھر میں باہر چل پڑا

لیکن سعیدہ باجی اس حویلی کے بڑے گیٹ سے بھی باہر نکل گئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں اور ہی جا رہی ہیں۔ ہمیں کافی دور تک چلنا پڑا تھا۔

میں اس علاقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جس عمارت میں سعیدہ باجی مجھے لے کر گئیں وہ کھنڈر تھی۔ وہ ایک بڑے ہال میں پہنچ گئیں۔ پھر بولیں۔ ”یہاں آرام کرو۔“

”یہاں؟“ میں نے حیرت سے کہا لیکن سعیدہ باجی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے ہال سے باہر نکل گئیں۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بہت بڑی گڑبڑ اندازہ ہو رہا تھا۔ لیکن کیا گڑبڑ صرف ایک ہی ہو سکتی تھی بابا نیاز سے ملاقات۔

نہ جانے کتنی دیر اس ہال کے فرش پر بیٹھا رہا۔ پھر میں نے سوچا باہر نکل کر تو دیکھوں یہ سب کیا مصیبت ہے اور میرا ہو گا کیا۔ رات خوب گہری ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ میں ہال کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک وسیع صحن تھا۔ صحن کے دوسرے حصے میں ایک دروازہ سا نظر آ رہا تھا۔ میں صورت حال جاننے کے لئے اس دروازے کی

طرف بڑھ گیا۔ پھر میں نے دروازہ کھولا۔ اندر سے روشنی کی لکیر باہر نکل آئی۔ اندر کوئی تھا۔ میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اندر داخل ہو گیا۔

”کون ہے یہاں؟“ میں نے آواز لگائی تو کچھ کھربڑی سنائی دی۔ ”یہاں کون ہے؟“ میں نے دوبارہ آواز لگائی۔ ”میں۔“ ایک مٹھی سی نسوانی آواز ابھری۔

”کون ہو تم کہاں ہو؟“ میں نے پکارا اور جواب میں اس دوسرے بڑے ہال کے ایک گوشے میں پھر کھڑی ہوئی۔

”میں یہاں ہوں۔“

”کیا تمہیں زنجیروں سے باندھا گیا ہے؟“

”ہاں۔“

”ٹھیک۔ میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس طرف بڑھ گیا۔ اس گوشے میں ایک عمر رسیدہ عورت دیوار سے لپک لگائے بیٹھی تھی لیکن اس کی صورت دیکھ کر میں چونک پڑا بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”سعیدہ باجی۔“

”ایں۔“ عورت نے بھی حیرانی سے کہا اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

”یہ کیا ہوا؟ آپ کو؟“

”کون ہو تم؟“ سعیدہ باجی کی آواز ابھری۔

”طاہر۔“

”کون طاہر؟“

”ارے آپ۔“ میرے منہ سے سخت حیرت کے عالم میں نکلا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ ان سعیدہ باجی میں اور دوسری میں کچھ فرق ہے۔ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے نہیں جانتی سعیدہ باجی!“

”نہیں۔“

”آپ یہاں کب سے بندھی ہیں؟“

”دس دن ہو گئے۔“

”آپ حویلی میں ہی کام کرتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے آپ کو باندھا ہے۔“

”میں نہیں جانتی لیکن ایک اور عورت نے میری جگہ لے لی۔ وہ ہو بہو میری ہمشکل تھی اور پھر اس نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ پھر مجھے یہاں ہوش آیا۔ انہوں نے مجھے باندھ کر یہاں رکھا ہوا ہے۔“

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ عرصہ قبل ذہنی قوتیں ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ میں ایک طرح دنیا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ لیکن اب کبھی کبھی میرے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے نقوش نمایاں ہونے لگے تھے۔ کوئی بھولی ہوئی کہانی دماغ میں کلبلانے لگی تھی۔ بس اس کی کوئی واضح شکل نہیں بنتی تھی۔

اور پھر بابا گل نیاز.....

ان کے الفاظ۔

”تم طاہر نہیں ہو۔“

”تم شام سندر بھی نہیں ہو۔“

”تم ایک خوش نصیب انسان ہو۔“

”تیسرا نام گم ہو گیا ہے۔“

”کیا ہے میرا تیسرا نام۔ کیوں گم ہو گیا ہے اسی تیسرے نام میں میری کہانی کھو گئی ہے۔“ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بندھی ہوئی عورت نے کہا۔

”مگر تم کون ہو؟“

”ایں؟“ میں چونک پڑا۔

”کیا تم ان کے ساتھی نہیں ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں؟“ میں نے کہا اور اسی وقت پورے ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ میں اچھل پڑا تھا۔ اس روشنی میں مجھے دو انسان نظر آ رہے تھے۔ واضح اور شناسا ایک گنگوڑی تھا۔ دوسری سعیدہ باجی۔ دونوں اپنی جگہ خاموش کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

”تم نے ایسا کیوں کیا شام سندر؟“ گنگوڑی نے کہا اور آگے بڑھ آیا۔ اس کے انداز میں نرمی تھی لیکن میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ”یہ زود کا ہے۔ زود کا سدھو جس نے سعیدہ کا روپ اپنایا تھا صرف تمہارے لئے۔“ وہ پھر بولا۔ اور اس بار اس نے ساتھ کھڑی عورت جو سعیدہ باجی نہیں تھی کے ہال پکڑے اور اس کے چہرے سے ایک نقاب سی کھینچ دی۔ ایک بے حد مکروہ چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔

”ہمیں وہاں تم سے کام تھا۔ بہت ضروری کام لیکن۔“

”میں کون ہوں؟“ میرے منہ سے سرد آواز نکلی۔

”ایک بد نصیب انسان۔“ گنگوڑی نے کہا۔ اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ان دونوں کو میری اس بے موقع ہنسی پر حیرت ہوئی تھی۔

”تم ہنس رہے ہو؟“ گنگوڑی بولا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ بابا نیاز مجھے خوش نصیب کہہ رہا تھا اور تم بد نصیب کہہ رہے ہو۔“

”خوش نصیب اصل میں بابا گل نیاز ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ میں خود بھی اپنے آپ پر حیران تھا۔ جو ماحول اور جو حالات میرے سامنے تھے ان پر مجھے خوفزدہ ہونا چاہئے تھا لیکن میں بالکل نڈر تھا اور اس وقت میرے دل میں خوف کی کوئی کیفیت نہیں تھی اور میں پرسکون تھا۔

”خوش نصیب بابا گل نیاز ہے کہ اس بڑے جال سے بھی بچ گیا۔“

”بڑے جال سے۔“

”ہاں ہماری اس سے پرانی دشمنی ہے۔ اس نے ہم پر کئی وار کئے ہیں لیکن ہم نے تمہارے ذریعے اس پر جو دار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا وہ اس کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوتا۔ وہ ایک سوکھے ہوئے مکڑے کی شکل اختیار کر جاتا۔



ایسا ہونے والا تھا کہ تم غداری کر گئے۔“

”میں نے غداری کی ہے؟“

”سو فیصدی۔“

”جبکہ میں بابا گل نیاز کی بات سے متفق ہوں کہ میں خوش نصیب ہوں کہ ایک بزرگ کو میرے ہاتھوں نقصان نہیں پہنچا۔ مگر تم مجھے بد نصیب کیوں کہہ رہے ہو؟“

”اس لئے کہ مستقبل میں شام سندر بہت بڑا نام ہوتا، ایک ارب پتی سیٹھ، ایک بہت بڑا کاروباری جس کی دولت ساری دنیا میں پھیلی ہوتی۔“

”اوہ اور اب کیا ہوگا؟“

اس کا فیصلہ اس منی کرے گی۔ چل تو اس عورت کے ساتھ اس سے اس منی سے تیرے بارے میں جو حکم ملا ہمیں وہی کرنا ہوگا۔ چل ری ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔“ اس نے ساتھ کھڑی منحوس شکل عورت سے کہا اور دونوں باہر جانے والے دروازے کی طرف مڑ گئے۔ میں خاموشی سے انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ اسی وقت مجھے سعیدہ باجی کی آواز سنائی دی۔

”میں تجھے کس نام سے پکاروں بیٹا۔“

”نام ہی تو کھو گیا ہے ماں جی۔“ میرے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

”مل جائے گا۔ وہ بھی مل جائے گا۔ میں تجھے طاہر ہی کہوں گی۔“ سعیدہ باجی نے کہا۔

”جو آپ کا دل چاہے کہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”تو کون ہے بیٹا مجھے اپنے بارے میں بتا۔“

”نہیں سعیدہ باجی! میرے دل و دماغ قابو میں نہیں ہیں۔ میں آپ کی یہ زنجیریں کھول دیتا ہوں رات گزر جائے صبح کو سوچیں گے ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ خاتون نے بے چارگی سے کہا۔ میں نے پوری کوشش کر کے ان کی زنجیریں کھول دیں۔ اس وقت پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دماغ کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں تھوڑے فاصلے پر جا لیٹا۔

لیکن سعیدہ باجی میرے قریب کھسک آئیں۔

”تھوڑی سی باتیں تو کر مجھ سے طاہر۔“ ان کے لہجے میں ایسی عاجزی تھی کہ مجھے ان پر پیار آ گیا۔

”جی سعیدہ باجی۔“

”جگہ کون سی ہے؟“

”میں نہیں جانتا بس یہ ایک کھنڈر ہے۔“

”میں حویلی کیسے جاؤں گی؟“

”کل دن کی روشنی میں حویلی تلاش کریں گے۔“

”تو میری مدد کرے گا۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ ویسے سعیدہ باجی یہ بابا گل نیاز کون ہیں؟“

”درویش ہیں اللہ والے ہیں حویلی میں سب ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔“

سعیدہ باجی سے کوئی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں سوچنے بجھنے کی قوتیں ہی ختم ہو گئی تھیں بھر نیند آ گئی۔

نہ جانے کب صبح ہوئی اور صبح بھی ایسے ہوئی کہ کمر پر ٹھوکر پڑی تھی اور ایک آواز سنائی دی تھی۔

”کیوں بے سو رہا۔“

میں بڑا کر اٹھ گیا۔ دو پولیس والے کھڑے مجھے خستہ ناک نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے پچٹی پچٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی کھنڈر تھا نہ عمارت، ایک پارک تھا جس میں درخت جھول رہے تھے۔

”باہر لگا بورڈ نہیں دیکھا۔“ ایک پولیس والے نے کہا۔

”بورڈ۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”جس پر لکھا ہے کہ پارک میں سونا منع ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں افسر جی۔“ غلطی ہو گئی میں نے بورڈ نہیں دیکھا۔“ میرا افسر جی کہنا کام آ گیا۔ پولیس والے نرم ہو گئے۔

”چلو بھاگو یہاں سے پارکوں میں سونا منع ہے۔ چور لٹیرے وارداتیں کر کے پارکوں میں آ کر سو جاتے ہیں۔“ دونوں پولیس والے آگے بڑھ گئے۔ میں نے بھی فوری طور پر وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ انہوں نے دوبارہ مجھے یہاں دیکھ لیا تو چڑ جائیں گے۔ پولیس سے ویسے ہی میری جان نکلی تھی لیکن اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اللہ کے بھروسے پر چل پڑا۔

زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن نظر آ گیا۔ قدم اسی طرف بڑھ گئے۔ ریلوے پلیٹ فارم پر سٹال لگے ہوئے تھے۔ ایک سٹال سے چائے اور دو کیک ہیں خریدنے شکر ہے میرے جیب سے پیسے غائب نہیں ہوئے تھے۔ تھوڑی سی حکم سیری کے بعد ایک طرف جا بیٹھا اور پھر اپنے بارے میں سوچا۔

”کون ہوں میں؟ کتنے نام ہیں میرے؟ جو میرے اوپر تسلط جمائے ہوئے ہیں وہ کون ہیں؟ کیوں وہ ایسا کر رہے ہیں؟ اور وہ اور پتہ نہیں بے چاری سعیدہ باجی کا کیا ہوا؟“ مجھے سارے واقعات یاد آ گئے۔ مجھے پراسرار طریقے سے اس کھنڈر سے پارک میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ مجھے ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اس کھنڈر سے تو میری لاش بھی دستیاب نہ ہوتی۔

ارے..... ہوں گے کوئی، جہنم میں جائیں۔ اب کیا کروں۔ دور سے ایک مسافر ٹرین آتی نظر آئی اور معا میرے ذہن میں ایک خیال آیا کیوں نہ ٹرین میں بیٹھ جاؤں۔ جہاں بھی جا رہی ہے جائے۔ اس جہنم سے تو فرار حاصل کروں۔ یہ خیال دل میں جڑ پکڑ گیا۔

نیم دیوا لگی تو ذہن پر سوار ہی تھی۔ ٹرین پر مسافر اترنے چڑھنے لگے۔ میں بھی ایک جگہ سے اٹھا اور ایک کمپارٹمنٹ میں ٹھس گیا۔ یہ بھی غور نہیں کیا کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اس میں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے کسی پر غور ہی نہیں کیا تھا اور ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اس وقت مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ میرا حلیہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا نہیں تھا۔

کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی پھر آنکھیں کھولیں تو سامنے نظر پڑی۔ ایک سادہ سا پروقار چہرہ میرے عین سامنے تھا۔ خوب صورت نقوش والی ایک تقریباً بیس سالہ خاتون تھیں جن کی آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں اور وہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان پر سے نگاہ ہٹائی۔

غالباً کسی مسافر نے میرا حلیہ دیکھ کر میرے بارے میں شکایت کر دی تھی کیونکہ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک ریلوے افسر دو پولیس والوں کے ساتھ میرے پاس آ گیا۔

”آپ کا ٹکٹ۔“ افسر نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا سامنے والی لڑکی جلدی سے بولی۔

”معذرت خواہ ہوں آفیسر۔ یہ میرے ساتھ ہیں۔“

”جی.....!“ افسر حیرت سے بولا۔

”آپ ان کے چلنے پر نہ جائیے۔ انہیں میرے ساتھ جانا تھا انتہائی ایمرجنسی میں یہ آئے اور ٹرین میں میرے پاس آ گئے۔ آپ ان کا ٹکٹ بنادیں جتنا جرمانہ چاہیں لگا دیں۔“ لڑکی یا خاتون نے اپنا پرس نکال لیا۔

ٹکٹ بن گیا اور افسر چلے گئے تو خاتون نے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”جی میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ پیسے آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ درحقیقت میں۔“

”آپ پیسے مجھے دیجئے لیکن مجھے باتیں کرنے کی اجازت تو دیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”جی۔“

”اپنا نام بتائیں گے؟“ وہ بولی۔

”نام..... میرا نام.....“ میں رکا۔ ”کیا نام بتاؤں۔“

”طاہر شایام سندر۔“

”میں بتاؤں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ کا نام ذیشان عالی ہے۔“

ایک بھیا نک دھماکہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے ٹرین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو۔ پوری ٹرین تباہ ہو گئی ہو۔ خوف ناک دھماکے مسلسل ہوتے رہے۔ لڑکی کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ اس نے میرا چہرہ دیکھا۔ پھر جھک کر اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک بگ نکالا اور اس میں سے کچھ چیزیں نکالنے لگی۔ غالباً وہ میڈیکل بکس تھا۔ کہنے لگی۔

”پلیز میں آپ کو انجکشن لگانا چاہتی ہوں۔ آپ کا چہرہ سفید پڑ گیا ہے پلیز۔“ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ انجکشن نے مجھے سکون دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میری حالت بہتر ہو گئی لیکن وہ نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”ذیشان عالی! ہاں ذیشان عالی! یہی تو میرا نام ہے۔ میں نہ طاہر ہوں نہ شایام سندر میں ذیشان عالی ہوں۔ ایک مصنف۔“

”کیسی طبیعت ہے؟“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہوں۔“

”میرا نام ٹانا ہے۔ ڈاکٹر ہوں۔“

”آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میری عمر اس وقت تیس سال ہے لیکن میں دس سال سے آپ کو پڑھ رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں ہمیشہ میرے دل میں آرزو رہی کہ میں زندگی میں ایک بار آپ سے ملوں۔ بس کچھ خواہشیں اتنی مشکل نہیں ہوتیں لیکن پوری نہیں ہوتیں اور آج۔“

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ”آپ پورے وثوق سے کہہ سکتی ہیں کہ میں ذیشان عالی ہوں۔“

”ہاں۔“ اس نے پتھر پلے لہجے میں کہا۔

”کیا کہوں آپ سے۔ آپ کو یہ اعتماد کیوں ہے؟“

”بہت سی باتیں انسان کے اندر ہوتی ہیں اور انہیں اندر ہی رہنا چاہئے۔ کتابوں کی ایک نمائش میں صرف چند منٹ لیٹ ہو گئی اس وقت آپ وہاں سے جا چکے تھے۔“

”ڈاکٹر ٹانا! میرے بارے میں کچھ اور بھی معلوم ہے آپ کو؟“

”بہت کچھ۔ آپ جن پر اسرار حالات کا شکار ہوئے تھے ان کی تفصیل اخبارات میں بھی آتی رہی ہے۔ آپ کی تصویریں بھی چھپی رہی ہیں اور آپ سے متعلق خبریں اخبارات کی زینت بنی رہی ہیں۔“

”اوہ.....!“ میں نے کہا۔ مجھے واقعی سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ میں ذیشان عالی تھا۔ ایک رائٹر کہانیاں لکھتا تھا۔ اور پھر زعمہ صدیاں شروع کی۔ میں تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کے بارے میں لکھ رہا تھا کہ مجھے وہ دو منٹوں کا کردار مل گئے اور سب کچھ ہی بدل گیا۔

”میرا خیال ہے آپ کو بعد کے حالات معلوم نہیں؟“

”بعد کے حالات۔“

”ہاں۔“

”وہ کیا ہیں؟“

”ضرور ایسی ہی بات ہے آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟“

”مجھ پر بہت برا وقت پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ٹانا! میں طلسمی جال میں پھنسا رہا ہوں۔“

”آپ کی یادداشت بھی متاثر ہوئی تھی۔“

”ہاں لیکن مجھے بعد کے واقعات کے بارے میں بتائیے۔“

”اخبارات پتھر کی ایک کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک طلسمی کتاب کا۔ پتھر کی اس کتاب میں قبروں جیسے تعویذ ابھرے ہوئے ہیں اور ان تعویذوں میں صدیاں چھپی ہوئی ہیں۔“

”ٹھیک۔“

”اسی کتاب میں محکمہ پولیس کے کمشنر اور ان کے ایک ساتھی گم ہو گئے تھے۔ انہیں مردہ تصور کر لیا گیا تھا لیکن اک دن وہ اس کتاب سے نمودار ہو گئے اور انہوں نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی۔ وہیں سے انہیں کوروتی اور گوتم بھنسال کی وجہ کے بارے میں معلوم ہوا اور پتہ چلا کہ ذیشان عالی بے قصور ہے۔ جو کچھ ہوا تاریخ کے ان دو پر اسرار کرداروں کی وجہ سے ہوا۔“

ڈاکٹر ٹانا بول رہی تھی اور میرے رگ و پے میں مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ میرے اوپر سے الزامات ہٹ گئے تھے۔ مجھے بے قصور قرار دے دیا گیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر ٹانا میرے بارے میں جو کچھ بتا رہی تھیں اس کے مٹے مٹے نقوش میری آنکھوں میں ابھرتے آرہے تھے۔ مجھے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔ اپنا گھر، کوروتی، گوتم بھنسال، اپنے سارے مشاغل، ڈاکٹر ٹانا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”آپ کو یاد آ گیا ذیشان عالی؟“

”ہاں کافی حد تک۔“

”مجھے خوشی ہے اب آپ کہاں جا رہے تھے؟“

”یقین کریں میں نہیں جانتا۔“

”مجھے اندازہ ہے اور میں آپ سے مل کر سخت حیران ہوں۔ میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے اپنی تحریروں کے سحر میں جکڑ لینے والا ناول نگار اس طرح مجھے مل جائے گا۔ وہ بھی خود سحر میں جکڑا ہوا۔ ویسے کوروتی کی کہانی درست ہے نا؟“

”ہاں۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”میں تو خود اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی کیا خبر؟ بلکہ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جب اس کے بارے میں حکومت کو یہ پتہ چل گیا کہ وہ مجرم ہے اور میں بے قصور اس کا شکار تو انہوں نے اس کے لئے کیا کیا؟“

”وہی جو حکومت کرتی ہے۔“ شائقی سے بولی۔

”مطلب؟“

”ایسی خبروں کی مزید تشہیر سے اخبارات اور میڈیا کو روک دیا جاتا ہے۔ بھلا حکومت کے پاس ایسے کیا ذرائع تھے کہ وہ انہیں تلاش کر کے گرفتار کرتی۔ چنانچہ خاموشی اختیار کر لی گئی۔“

”میرے بارے میں کوئی خبر چھپی۔“

”ہاں ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ کہا گیا کہ کوروتی نے اپنے دشمن کو بھی ہلاک کر دیا ہوگا۔“ ڈاکٹر ثناء نے بتایا۔

”دشمن؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔“ ثناء بولی۔ میں خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر ثناء بھی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اچانک اس نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ کو اپنا ماضی یاد آ گیا۔“

”ہاں ڈاکٹر ثناء کسی حد تک۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ وہ غنڈی سانس لے کر بولی۔ پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ ماحول پر ایک اداسی سی طاری ہو گئی۔ ویسے بھی ہر طرف خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ حالانکہ دماغ میں بہت سے خیالات تھے لیکن نیند ان پر غالب آ گئی۔ ٹرین کی گڑگڑاہٹ نے لوری کی سی کیفیت پیدا کر دی اور میری نیند گہری ہوتی گئی۔

لیکن پھر ایک عجیب سا وحشت ناک احساس ہوا۔ میں نے خود کو ایک سنائے کے سے عالم میں محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بڑے سے کمرے میں ہوں۔ کمرے میں چھت کے قریب بہت بڑا روشن دان ہے۔ اس روشن دان کے دوسری طرف سے چاند جھانک رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے روشنی کی کرنیں سفید سفید چروں کا روپ دھارتی جا رہی ہوں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا یہ بھیاں تک چہرے انسانی کھوپڑیاں تھیں جن کے جڑے مل رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ان سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہلے ہوئے جبروں سے کچھ آوازیں بھی نکل رہی تھیں جو جھنجھٹا ہٹ جیسی تھیں اور سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

لیکن منظر اتنا خوفناک تھا کہ میرا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

پھر منظر تبدیل ہوا۔ روشن دان سے اندر آنے والی کھوپڑیوں نے دروازے کھڑکیوں کو کھانا شروع کر دیا۔ وہ چاروں طرف پھیل گئی تھیں اور جو چیز ان کے سامنے آ رہی تھی اسے کھا رہی تھیں۔ دیواروں پر لگے ہوئے پردے کمرے میں پڑا دوسرا فرنیچر یہاں تک کہ وہ میری مسہری کے پاس آ گئیں اور انہوں نے اس کے پائے کھانے شروع کر دیئے پھر

وہ میرے جسم پر حملہ آور ہوئیں اور انہوں نے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا۔ میں نے مسہری سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت مسہری کا ایک پایہ میرے ہاتھ آ گیا جو انہوں نے کاٹ کر مسہری سے جدا کر دیا تھا۔ میں نے جھک کر پایہ اٹھایا اور ان کھوپڑیوں پر حملہ کر دیا۔ میرے ہر وار پر کھوپڑیوں کے پرچے اڑ جاتے تھے۔

اچانک مجھے ایک سکوت کا سا احساس ہوا جیسے ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔ ایک وحشت ناک سناتا چاروں طرف پھیل گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ٹرین کی دسل سنائی دی تھی۔ وہ بھیاں تک منظر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آہ کیا بھیاں تک خواب تھا۔ میرے پورے بدن میں جیسے آگ لگ رہی تھی۔ بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ خود کو پانی میں ڈبو دوں۔

میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا لیکن دور دور تک کوئی انسان نہیں نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا البتہ کہیں کہیں مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ پانی کا ٹنکا لگا ہوا تھا۔ دل بے اختیار ہو گیا۔ شدت سے خواہش ہوئی کہ منہ دھوؤں اور زیادہ سے زیادہ پانی خود پر بہا دوں۔

اپنی جگہ سے اٹھا اور نیچے اتر گیا۔ ٹنکا کا ٹی دور لگا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف چل پڑا۔ ابھی اکڑوں بیٹھ کر پانی کی طرف ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ اچانک ٹرین کی دسل دوبارہ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی وہ ریٹنے لگی۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ٹرین کی جس دسل پر میری آنکھ کھلی تھی وہ اس کی روٹا کی پہلی دسل تھی۔ دوسری دسل دے کر چل پڑی۔ چھوٹا اسٹیشن تھا یہاں اس کے زیادہ دیر رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اب کیا کروں۔ بادل غواستہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرین کی طرف بھاگا لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ اس تک پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ریلوے لائن تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ آخری ڈبہ بھی دور نکل چکا تھا۔

”واہ کیا بات ہے ڈیشان عالی!“ میں نے دل میں سوچا لیکن اس سوچ نے ایک دم دل کو خوشی بخشی تھی۔ ”میں ڈیشان عالی ہوں۔ نہ میں شام سندر ہوں نہ طاہر ڈیشان عالی ایک شریف انسان شریف شہری اور میری پوزیشن صاف ہو چکی ہے۔ میں کوروتی کے جرائم کا شریک کار نہیں ہوں۔ حکومت یہ بات جان چکی ہے۔ اب میں ایک آزاد انسان کی حیثیت سے رہ سکتا ہوں۔“

ٹرین کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ہاں کچھ فاصلے پر ایک سڑک ضرور نظر آ رہی تھی جس پر سے اس وقت بھی دو ٹرک آگے پیچھے گزر رہے تھے۔ سڑک تک جانے کے لئے تھوڑا سا ناہوار راستہ عبور کرنا تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔

اسٹیشن کسی بھوت گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کسی آدم زاد کا نشان و نشان نہیں تھا۔ میں نے سڑک پر ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تک پتہ نہیں تھا کہ یہ سڑک کہاں جا کر کون سے شہر پر ختم ہوتی ہے۔ آخر کار میں سڑک پر پہنچ گیا اور پھر اسی طرف چل پڑا جدھر ٹرین گئی تھی۔

کچھ بے خیالی کا عالم تھا۔ کچھ سوچیں دامن گھیر تھیں۔ اب کیا کرنا ہے؟ کیسے آگے وقت گزارنا ہے؟ سڑک کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ وہ شہر پیچھے رہ گیا تھا جہاں نیچے اتر تھا۔ پھر کافی دور روشنیاں نظر آئیں۔ پتہ نہیں تھا شاید کوئی پٹرول پمپ تھا۔ اس دوران کئی گاڑیاں ٹرک وغیرہ بھی گزرے تھے لیکن نہ میں نے ان پر توجہ دی تھی نہ انہوں نے مجھ پر۔

یہ سفر بھی ختم ہو گیا۔ وہ پٹرول پمپ نہیں ایک فینسی ریسٹوران تھا جس میں تیز روشنیاں ہو رہی تھیں۔ باہر دو قیمتی کاریں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جیب کا جائزہ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ بے حد نفیس ہال تھا۔ اکا دکا لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن کے سامنے برتن سجے ہوئے تھے۔

میں نے ویٹر کو کافی وغیرہ لانے کے لئے کہا اور کرسی سے پشت نکالی۔ ویٹر نے کافی لوازمات لا کر میرے سامنے لگا

دیئے اور میں کافی پیئے لگا۔

اچانک سامنے والی میز سے ایک عورت اس طرح اٹھی کہ اس کی کرسی لڑھک گئی تیز آواز پر میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ اصولی طور پر میری میز الٹ جانی چاہئے تھی لیکن میں بس ہتھرا کر رہ گیا تھا۔ عورت نے جھک کر اپنے ساتھ بیٹھے مرد سے کچھ کہا اور وہ بھی پلٹ کر مجھے دیکھنے لگا۔

تب میں نے خوب غور سے انہیں دیکھا وہ کوروتی اور گوتم بھنسالی تھے۔ کوروتی ایک انتہائی پروقار اور خوبصورت لباس میں ملبوس تھی اور گوتم بھنسالی ایک جدید سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی صورت وہی کی وہی تھی اور کو بڑ بھی جوں کا توں تھا۔

دونوں اپنی جگہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر آپس میں کوئی بات کی اور اس کے بعد دونوں میری طرف چل پڑے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ میری میز پر پہنچ گئے۔

”سوری! ہم تم سے بیٹھنے کی اجازت نہیں لیں گے۔“ گوتم نے کہا۔ لیکن میری توقوت گویائی ہی سلب ہو گئی تھی۔ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ دیوانگی کے عالم میں تو دیکھا جاسکتا تھا عالم ہوش میں نہیں۔ انہوں نے بیٹھنے کی کوئی اجازت نہیں لی اور کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

میں بدستور پاگلوں کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ کوروتی کے چہرے پر نفرت کے آثار تھے اور گوتم بھنسالی کے چہرے پر حشر کے۔ پھر گوتم بھنسالی نے کہا۔ ”تمہارا دل جانا ایک دلچسپ اتفاق ہے۔ ذیشان عالی! ہم تمہیں تلاش کر کے ضرور ملتے اور تمہیں اپنے بارے میں بتاتے لیکن تم خود مل گئے۔ خیر! لیکن تمہاری کتاب کے بارے میں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ پوری ہوگی یا نہیں لیکن ہماری کتاب میں بہت سے دلچسپ واقعات تحریر ہو گئے ہیں۔ تم نے تاریخ میں بہت بڑا اپ سیٹ کیا ہے۔ تم جانتے ہو ہم صدیوں سے زندہ ہیں اور آگے نہ جانے کیا ہوگا؟ میں اسی لمحے سے کوروتی کو چاہتا ہوں جب ہم ”امر“ نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہم نے امرت جل پی لیا۔ میں نے ہر دور ہر ماحول میں کوروتی کا پیچھا کیا اور اس کی نفرت ہی پائی لیکن اس نے اپنے من میں کسی اور کو نہیں بسایا۔

ہاں یہ تمہارے سامنے بے بس ہو گئی اور اس نے اپنا پریم اپنا شریہ تمہیں سونپ دیا۔ یہ غلط تھا۔ اس نے تمہیں میرے ہاتھوں سے محفوظ کر دیا ورنہ تمہاری تو اب راکھ بھی باقی نہ ہوتی۔ جب میں رقابت کی آخری منزل تک پہنچ گیا تو آخری عمل میں نے اس کے ساتھ کیا اور اسے بھجر بنا دیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا جیون تو نہیں چھین سکتے، لیکن جو میں کر سکتا تھا میں نے کیا۔ میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا تاکہ جب تم قدرتی موت مر جاؤ تو میں اسے نکال کر اس کا شریہ اسے واپس دوں کیونکہ یہ عمل مجھے معلوم تھا۔ میں نے اپنے چیلے گنگوتری کو تمہارے پیچھے لگا دیا تاکہ وہ تمہاری قدرتی موت تک تمہیں الجھائے رکھے لیکن پھر حالات بدل گئے جس کے بارے میں کوروتی تمہیں بتائے گی۔“

میری نظریں کوروتی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بدستور نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں تم پر مرثی تھی عالی! میں نے اپنی صدیوں کی تپسیا بھنگ کر دی تھی لیکن تم کبھی میرے مرد نہیں بن سکے۔ میں ہمیشہ تمہاری مجبوری بنی رہی۔ اس سے بھی جب میں اپنے اصل روپ میں تھی اور اس سے بھی جب میں دوسروں کے شریہ اپنا کر تمہارے سامنے آتی رہی۔ عالی! کیسے لکھک ہو عورت کی کہانی آج تک نہیں جان سکے۔ عورت پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ عورت پریم کا دوسرا روپ ہے۔ اس کے سنسار کا سارا سکھ پریم ہے۔ باقی سب بعد میں آتا ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں کبھی اپنے لئے پریم نہیں دیکھا۔“

تب وہ رکی۔ پھر بولی۔ ”میں قبر میں دفن تھی۔ بھنسالی نے اوجھا داؤ مارا تھا۔ مجھے قبر ہی میں رہنا پڑتا۔ یہ مجھے تمہاری موت کے بعد ہی باہر نکالتا۔ تمہیں طبعی موت ہی مرنا تھا کیونکہ یہ تمہیں سے سے پہلے مار نہیں سکتا تھا۔ میں قبر میں رہتی، لیکن..... ایک دن اس پر پھر پریم کی دیوانگی سوار ہو گئی۔ اس نے مجھے قبر سے نکالا اور روتے ہوئے بولا۔

”کوروتی! قبر میں تمہیں تکلیف ہوتی ہے ناں۔ یہ تکلیف میں نے تمہیں دی ہے۔ تم بڑیوں کا بھجر بن گئی ہو۔ یہ کام بھی میں نے کیا ہے۔ بس کوروتی! میں پریم کرتا ہوں تم سے۔ حصہ حسد اور رقابت میں جو کچھ کر بیٹھا کر لیا بس میرے پاس تمہارا علاج ہے کوروتی! میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا اور بس۔ پھر تم سے دور چلا جاؤں گا“ تم عالی کے ساتھ رہنا جب تک وہ جیتا رہے۔“

اس نے مجھے میرا شریہ دے دیا۔ بڑی محنت کی اس نے مجھ پر اور میں ٹھیک ہو گئی۔ پھر اس نے مجھ سے دور نکل جانے کا عمل شروع کر دیا، لیکن میں نے اسے دیکھا اس کے من میں تمہارا اور حیران رہ گئی، مجھے جس سکھ پریم کی تلاش تھی وہ تو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے من میں تھا جبکہ تم دوسری لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ تب میں نے اسے روک لیا اور اس کی چھاتی سے سر ٹکا کر کہا۔ ”بھنسالی! میں تم سے پریم کرتی ہوں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

بہت دیر کے بعد میں نے پوچھا۔ ”اب تم دونوں کہاں جا رہے تھے؟“

”اپنی کوٹھی میں۔“ وہاں سے اپنی کتاب میں ہم صدیوں کے اور روپ دیکھیں گے۔ یہ صدیاں تو لاکھوں سالوں پر محیط ہیں۔“

”انھیں ڈارلنگ!“ گوتم بھنسالی نے کہا اور کچھ دیر کے بعد دونوں باہر نکل گئے۔ میں بھی باہر آ گیا۔ تب میں نے ان دونوں قیمتی کاروں میں سے ایک کار کو ہونٹ سے باہر جاتے ہوئے راستے پر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک اس کی سرخ روشنیاں نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔

(تمت بالخیر)